UNIVERSAL LIBRARY
OU_224493
UNIVERSAL LIBRARY

رجسٹرڈ نمبر ا ۱۰ ۱۲   جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت:- چھ روپے سالانہ

دفتر   دار المصنفین   اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس لئے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصہ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۴۹۵ صفحے قیمت: [illegible]

تاریخ اسلام حصہ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :۔ ۲۶۳ صفحے

قیمت :۔ [illegible]

"منیجر"

تاریخ اسلام حصہ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابواسحاق متقی باللہ ۳۳۳ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت [illegible]

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت :۔ ۴۳۲ صفحے

قیمت :۔ [illegible]

"منیجر"

جلد ۶۶ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۵۰ء عدد ۱

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲ - ۴

مقالات

جن سے میں متاثر ہوا	سید سلیمان ندوی	۵ - ۱۲
البحریہ	جناب مولانا سعید انصاری صاحب	۱۳ - ۲۵
	سابق رفیق دار المصنفین	
تاریخ بابل	مولانا ابو الجلال صاحب ندوی	۲۶ - ۴۸
فتاوی بابری	جناب شیخ فرید صاحب برہان پوری	۴۹ - ۵۷
کشمیر میں شاہان مغلیہ کے چند آثار	جناب بدر الدین صاحب استاذ	۵۸ - ۶۱
	عربی مسلم یونیورسٹی	
ایک نادر کتاب کا تعارف	جناب سید نجم الحسن رضوی خیرآبادی	۶۲ - ۶۴

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان میں مسلمانوں کے تمدنی اثرات	ع ع	۶۵ - ۷۶
مطبوعات جدیدہ	" م "	۷۷ - ۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

حکومت کی زبان ہندی قرار پاجانے کے بعد اردو زبان کی خدمت کی نوعیت اور اس کے طریقۂ کار مین کچھ نہ کچھ تبدیلی ناگزیر ہے، اس لئے انجمن ترقی اردو ہند نے نئے حالات کے مطابق اپنے اغراض و مقاصد اور لائحۂ عمل متعین کیا ہے، اس مین دوسرے کامون کے ساتھ ہندوستانی زبان کی اشاعت اور دیوناگری اور رومن رسم الخط مین اردو کی معیاری کتابون کا منتقل کرنا بھی ہے، غالباً اس کی مصلحت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان اور ہندی رسم الخط کے ذریعہ جو خاص بعض اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے مقابلہ مین ہندی سے زیادہ قریب ہے، اردو کے مخالفون کی شدت کم اور ان کو اس کی جانب مائل کیا جائے، اور جو نئی زبان بن رہی ہے، اس کو ہندوستانی سے متاثر کیا جائے، اس طرح کسی نہ کسی حد تک اردو کا وجود باقی رہ جائے گا، گو یہ مصلحت حقیقت سے یکسر خالی تو نہین ہے لیکن اس مین حسن ظن کو زیادہ دخل ہے، جس ذہنیت کو آسان ہندی تک گوارا نہین، وہ ہندوستانی کو کس طرح برداشت کر سکتی ہے،

درحقیقت موجودہ حالات مین جو کچھ خطرہ ہے وہ علمی و ادبی اردو کے لئے ہے، عام بول چال کی زبان کو جسے اردو کہا جائے یا ہندوستانی کوئی نقصان نہین پہنچ سکتا، اور اسے کوئی طاقت نہین مٹا سکتی، زبانین جبر اور قانون کے ذریعہ نہین بنائی جاتین، بلکہ وہ مختلف طبعی عوامل کے ماتحت صدیون مین خود بخود بنتی اور بگڑتی ہین، اس لئے جو نئی مصنوعی زبان بنائی جارہی ہے، وہ کبھی عوام کی زبان نہین بن سکتی، اور اس کا دائرہ حکومت کے دفاتر اور علم و فن تک محدود رہے گا، روزمرہ کی زبان پر اس کا بہت کم اثر پڑیگا، زیادہ سے زیادہ اس مین ہندی کے کچھ الفاظ داخل ہو جائین گے، اور وہ تھوڑے تغیر کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالفین بھی بجز اس کے کہ نیل گھوڑی کی طرح اس کا نام بدل دین اسکو نہیں چھوڑ سکتے، اس لئے اس کو بچانے کے لئے ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہین، اور علمی و ادبی اردو کو جو خطرات ہین، انکے لئے یہ تدبیر کارآمد نہین ہے، اور وہ اپنے حامیوں کی کوششون ہی سے قائم رہ سکتی ہے،

نئی زبان کو اردو سے متاثر کرنے کے لئے بھی ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہین، اس مقصد کے لئے اردو اور ہندوستانی دونون برابر ہین، اس لئے کہ جب ایک مقام پر ایک سے زیادہ زبانین رائج ہون گی تو وہ فطری طور سے ایک دوسرے سے متاثر ہون گی، اس مین اردو اور ہندی کی تفریق نہین، بلکہ اُن کے بجائے اگر ہندوستان مین عربی اور فارسی بھی بول چال کی زبان ہوتی، تو ہندی ان سے بھی متاثر ہوتی، جس طرح ایک زمانہ مین ہو چکی ہے، اس لئے نئی زبان پر اثر ڈالنے کے لئے بھی ہندوستانی کی ضرورت نہین ہے، وہ اردو دشمنی کے باوجود اس سے متاثر ہو کر رہے گی، اور ان دونون کے میل جول سے جو زبان پیدا ہوگی، وہی اصلی ہندوستانی ہوگی،

اس تحریر کا مقصد ہندستانی زبان کی مخالفت نہین ہے، اگر کوئی ادارہ اسکی تبلیغ و اشاعت کرتا ہے تو یہ بھی ایک مفید کام ہے، لیکن انجمن ترقی اردو کا یہ کام نہین ہے، اس کو ہندوستانی کلچر سوسائٹی الہ آباد اور اس کا رسالہ عرصہ سے انجام دے رہا ہے جس مین ہندو مسلمان دونون شریک ہین، انجمن کا مقصد خالص اردو کی خدمت ہونا چاہئے، اردو کی معیاری کتابون کو ہندی رسم الخط مین منتقل کرنے کی تجویز البتہ معقول و مفید ہے، اس سے ہندی زبان اور ہندی دان طبقہ دونون متاثر ہون گے، لیکن رومن رسم الخط کی مصلحت سمجھ مین نہین آتی، یہ محض اندھی تقلید ہے جس کا کوئی فائدہ نہین،

انجمن نے دوسرا مفید کام اپنے ذمہ یہ لیا ہے کہ سرکاری اسکولون مین اردو کے ساتھ جو بے اعتنائی بلکہ دشمنی برتی جارہی ہے، اور اسکو ان حقوق سے بھی محروم کیا جارہا ہے، جو دوسری مقامی زبانون کے طفیل مین اس کو حاصل ہوئے ہین، اُن کی تحقیقات و تدارک کے لئے ایک کمیٹی بنا دی ہے، جس نے اپنا کام شروع کردیا ہے، اس کا مرکز لکھنؤ ہے، اب یہ اردو کے بہی خواہون کا فرض ہے کہ وہ شعبۂ تعلیم کے حکام کی اردو دشمنی اور اسکولون مین اردو کی حق تلفی کے صحیح واقعات سے کمیٹی کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کے پتہ پر مطلع کرین،

پاکستان کی قومی زبان اردو مان لی گئی ہے، لیکن اخبارات کی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے، کہ سرکاری دفترون اور تعلیم گاہون مین بھی بدستور انگریزی مسلط ہے، گو اس بارہ مین اتنی عجلت اور سختی کی ضرورت نہین کہ تمام دشواریون اور مقامی زبانون کے حقوق کو نظر انداز کرکے فوراً اردو کو جبری رائج کردیا جائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ مقامی زبانون کی اہمیت کو قائم رکھتے ہوئے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جائین جن سے جلد سے جلد

اردو دفتری اور تعلیمی زبان بن سکے، اور انگریزی کی احتیاج باقی نہ رہ جائے۔ اردو کسی ضرورت کی تکمیل سے بھی قاصر نہیں ہے، حیدرآباد میں اس کا پورا تجربہ ہو چکا ہے، اور مدتوں برسوں سے حکومت کے تمام شعبوں اور یونیورسٹی کی تعلیمی زبان رہ چکی ہے، اسی کے ذریعہ ہر فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ہوتی رہی ہے جس کے نتائج سب سامنے ہیں، اور کسی شعبہ کو اس کی تنگ دامانی کی شکایت نہیں ہوئی، اب یہ بار امانت پاکستان کو اٹھانا ہے، اس کے لئے اردو کی اہمیت تنہا لسانی نہیں بلکہ مذہبی اور تمدنی بھی ہے، مذہب کے بعد وہی اہل پاکستان میں قومی اور تمدنی وحدت کا ذریعہ ہے، اس لئے اس کو جلد سے جلد عملاً قومی زبان بنانے کی ضرورت ہے،

ہم نے لاہور کے اس ناشر کے خلاف جس نے سیرۃ النبی جلد اول چھاپ لی تھی، پاکستان کی حکومت اور وہاں کے اخبارات کی توجہ دلائی تھی، ہم کو مسرت ہے کہ ان دونوں بلکہ اہل پاکستان نے بھی اپنی اخلاقی وعملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور لاہور کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی صاحب کے ذریعہ یہ معاملہ بخیر و خوبی طے ہو گیا، دار المصنفین اپنے ان تمام ہمدردوں کا شکر گذار رہے، اب اس کی قانونی بندش بھی کر دی گئی ہے اس لئے آیندہ کوئی صاحب دار المصنفین کی کسی کتاب کے چھاپنے کا قصد نہ کریں،

سکہ کے اختلاف کی وجہ سے عرصہ سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وی پی آ جا نہیں سکتے، اب ایک نئی دشواری یہ پیدا ہو گئی ہے کہ پاکستان کے تاجر کتب حکومت سے لائسنس حاصل کئے بغیر ہندوستان سے کتابیں نہیں منگا سکتے، اس لئے فی الحال پاکستان سے تجارت بالکل بند ہے، لیکن یہ صورت عارضی ہے، اور یقین ہے کہ تاجر کتب جلد لائسنس حاصل کر لیں گے، لیکن سکہ کے تبادلہ کی دشواری پھر بھی باقی رہ جائیگی، اس لئے جب تک اس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور دار المصنفین کے ایجنٹ ہیں، جن لوگوں کو یہاں کی کتابوں کی ضرورت ہو وہ شیخ صاحب سے طلب کریں، اور پاکستان کے معارف کے خریدار اپنا چندہ بھی انہیں کے پاس بھیجیں ان سب کا چندہ ختم ہو چکا ہے لیکن ان کے اعتماد پر رسالہ بند نہیں کیا گیا، اس لئے ان کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ فوراً اپنا چندہ ادا کر دیں،

مقالات

جن سے مین متاثر ہوا

از

سید سلیمان ندوی

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے کئی سال ہوئے "نا کردہ بارا" عنوان سے ہندوستان کے ممتاز علماء و مشاہیر سے تقریرون کا ایک سلسلہ نشر کرایا تھا، اس سلسلہ مین حضرت الاستاذ مدظلہ نے بھی تقریر فرمائی تھی، یہ تقریر مختلف حیثیتون سے قابل اشاعت تھی، لیکن اس کی نوبت نہ آسکی اور اب کئی سال کے بعد یہ تحفہ ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کیا جاتا ہو۔ (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

انیسوین صدی ختم ہو رہی تھی، تو میرے ہوش اور تمیز کی آنکھین کھل رہی تھین، پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا، اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بنا ہوا تھا، کانون مین دو قسم کی تحریکون کی آوازین دمبدم آرہی تھین، ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت، اور مذہب مین عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش، اور دوسری علماء کو نئے زمانہ کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کرکے پرانی عربی تعلیم کی ازسرِ نو تنظیم کی تحریک، جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اٹھے تھے، اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڈھ کی ایک عربی درس گاہ تھی، جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی، اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا، جہان مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے،

کانوں میں یہ دونوں آوازیں پڑیں، مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لئے اسی دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی، اور وہ بڑھتی گئی، اور پھیلتی گئی، اور وہی میری زندگی کا جز بن گئی،

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علما نے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی عربی درسگاہ کے قیام کی کوشش کی، اور سب سے پہلے مولوی سید نذیر حسین صاحب کے مشہور شاگرد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے آرہ صوبہ بہار میں مدرسۂ احمدیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ میں اپنا نیا مدرسہ دار العلوم کھولا، میرے والد مرحوم نے مدرسۂ احمدیہ میں مجھے بھیجنے کا ارادہ کیا، مگر میرے خاندان کے چند عزیزوں کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا، اس لئے دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں داخلہ کی تجویز میرے لئے مناسب بتائی گئی، مگر ابھی اسکے داخلہ میں کچھ تاخیر تھی، تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری میں مجھے رکھا گیا، یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا خاصہ چرچا تھا اور ہے، میں نے بھی اس فضا میں سانس لی، اور یہیں سب سے پہلے میں نے مولوی عبد الحلیم شرر کا ناول "منصور موہنا" دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا، کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا،

ایک برس کے بعد مجھے دربھنگہ کے ایک اور نئے مدرسہ امدادیہ میں جو دار العلوم ہی کے خاکہ پر بنا تھا، اور ابتک ہی چند ماہ رکھا گیا، یہاں سب سے پہلے میں نے طلبہ کی انجمن دیکھی، اور لوگوں کی تقریریں سنیں، اور دوسرے ہی ہفتہ میں وقت کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباش ملی،

میں نے جس ندوۃ العلماء کا اوپر ذکر کیا، وہ علما کی ایک مجلس کا نام ہے جس نے سب سے پہلے علماء کی منتشر جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور قوم و ملت اور علم و فن کی خدمت کے نئے راستوں اور نئے طریقوں سے ان کو مانوس کیا، اس کے جلسے سال بسال ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتے تھے، ۱۹۰۰ء پورا ہو رہا تھا جب اس مجلس کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا، یہ جلسہ کیا تھا، جوش و خروش کا ایک سمندر تھا، یہ پہلا موقع تھا جب عمامے اور ہیٹ لگے ہوئے علما اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھکر قوم و ملت

کی چارہ نوازی کی فکر میں کیں، میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ میں شریک تھا، میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا، میں نے اسی جلسہ میں یہ پُراثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے، اور خود رو رہے تھے، اور بڑے بڑے جبہ و دستار والے علما، اور مشائخ کو رُلا رہے تھے،

اسی جلسہ میں سب سے پہلے میں نے اس سلسلۂ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ (سر) عبد القادر لاہور کو دیکھا، وہ اس وقت آبزرور کے اڈیٹر تھے، وہ اپنی اس تقریر کی تمہید میں ٹرانسوال میں بوئر دن کی لڑائی کی مختلف خبریں جو اس وقت آرہی تھیں، دلچسپ انداز میں اُن کا حوالہ دیکر یہ کہہ رہے تھے کہ اخبار نویسوں کی بات پر اعتبار کیوں کر کیا جائے،" اس تمہید کے بعد انھوں نے کہا کہ "میں بھی اخبار نویس ہوں، اور اگر تم سے یہ کہوں کہ تمھارے بزرگوں کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریوں اور صندوقوں میں بند پڑی ہے، مگر تم کو خبر نہیں، تو تم کو بھی میری اس بات کا کیونکر یقین آئے گا" یہ کہکر انھوں نے ندوۃ العلمار کی نگرانی میں اگلے بزرگوں کی کتابوں کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی، ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی کہ جس نے پورے جلسہ کے ساتھ مجھے بھی محو حیرت بنا دیا، اور دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا، جس کی مشق بعد کو ہوئی، جلسہ کے اختتام پر میرے شوق نے پر و بال پیدا کئے، اور میں اُڑ کر لکھنؤ پہنچا، اور ندوۃ العلمار کی درسگاہ میں داخل ہو گیا، اور یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علمار کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا، یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا، اور کانوں نے سب کچھ سُنا،

یہاں ہندوستان کی ایک مشہور ہستی صدر مدرس تھی، مولانا فاروق چریا کوٹی، یہ اپنے زمانہ میں ادب اور معقولات کے امام تھے، ان کی خاص چیز اُن کے پڑھانے کا طریقہ تھا، وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور سے پڑھاتے تھے اور اسکی مشق کراتے تھے، صرف و نحو، ادب، عروض منطق و فلسفہ ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا، دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہ تھے، یعنی وہ کتاب نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا تھا، ان کو طرز تعلیم کی

بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درسگاہ سے پیدا ہوا،

بہرحال موصوف کے طرز تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کر دی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آئے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے، یہ پہلی شخصیت تھی، جس نے میرے دل و دماغ پر اپنا پرتو ڈالا،

میں کہہ چکا ہوں کہ اردو ادب کی پہلی کتاب مولانا شرر کی منصور موہنا میرے ہاتھ میں آئی، اس لئے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرز تحریر کا پڑا،

۱۹۰۱ء میں شیخ عبد القادر نے لاہور سے مخزن نکالا، آج کل کے بہتیرے بوڑھے اہل قلم اس کے نوجوان مضمون نگار تھے میں نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مضمون اسی میں لکھا، بلکہ اسی کو پڑھ کر مضمون لکھنے کی تحریک دل میں پیدا ہوئی،

۱۹۰۴ء میں خود ندوہ کی طرف سے الندوہ نکلا، مولانا سید عبد الحئی صاحب مددگار ناظم ندوہ نے مجھے اس میں مضمون لکھنے کی طرف متوجہ کیا، میں نے ایک مضمون علم حدیث اور دوسرا منطق پر لکھ کر پیش کیا، دونوں قبول ہوئے اور الندوہ میں لکھنے کو دیئے گئے، مگر عین وقت پر میری علمی زندگی کے اصلی رہنما مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوہ آگئے، یہ دونوں مضمون شرر مرحوم کے طرز میں تھے، مولانا نے پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دیکر باقی رکھا، اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا، اس وقت سے مولانا کے رنگ کی تقلید شروع کی، مگر اصل منزل تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی کیونکہ ابھی یہ رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں شمس العلماء آزاد دہلی کی سخندان پارس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا، ایک دو مضمون اس رنگ میں لکھے، مگر یہ طرز تحریر ایسا تھا کہ جو آمد ہو تو کیا کہنا، اور بدقسمتی سے اگر وہ آورد ہو تو اس سے برا کوئی اور نہیں، ناچار ادھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بتائی ہوئی شاہ راہ پر آجانا پڑا، کیونکہ علمی مضامین کے لئے ان کے طرز تحریر سے بڑھکر کوئی دوسرا طرز کارآمد نہیں، اس لئے بار بار

اُن سے اصلاحیں لیں، اُن کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی، اور سالہا سال اُن کی صحبت اٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک نہج تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا،

میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے، وہ اٹھارہ برس سر سید کے ساتھ رہنے کے باوجود اُن کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے، پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے، جب ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال نکالا، تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا، اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لئے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں، ان میں ابوالکلام کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں، اور میری پہلی کتاب ارض القرآن میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے،

معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا، لیکن معارف میں آکر ہلالیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا،

لیکن بہر حال چند روز ادھر اودھر بہک کر پھر اسی راستہ پر آگیا، جس پر استاد مرحوم نے لاکر مجھے کھڑا کر دیا تھا، خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے جانتے اُن کے طرز ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے،

میں نے شروع ہی میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپاتا رہا۔ ہلکا سا اقبال کر لیا ہے، یعنی شعر و سخن کا ذوق میں نے جب آنکھ کھولی، تو ملک میں امیر اور داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاذ شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس دار العلوم جو جنرل عظیم الدین خان کے زمانہ میں رامپور میں رہے تھے، اور وہاں منشی امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت برسوں اٹھائی تھی، وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا

کرتے تھے، اور اُن کے شعر سُناتے تھے، ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانک پوری جواب نواب فصاحت جنگ سے مخاطب ہین، اُن کے بڑے صاحبزادہ مولوی صدیق صاحب (متوسل سرکار نظام) میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ مین پڑھتے تھے، ان کے ذریعہ سے حضرت امیر کی بہت سی غزلین میری نظر سے گذرین اور دل مین امیر مرحوم کی قدر و منزلت گھر کر گئی، اُنکا دیوان مرآۃ الغیب اکثر مطالعہ مین رہتا، دارالعلوم مین لڑکون کے مشاعرے ہوتے تھے غزلین پڑھی جاتی تھین، ایک صاحب داغ کا روپ بھرتے تھے، اور مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا، لیکن ۱۹۱۲ء مین جب مولانا شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی، تو دل نے اس مین بھی استاد کی پیروی کا حق ادا کرنا چاہا، متعدد نظمین اس رنگ مین لکھین جن کا خاتمہ استاد کے ماتم پر ہوا، جو نوحۂ استاد کے نام سے ۱۹۱۵ء مین پونہ مین چھپا، جہان ان دنون دکن کالج مین فارسی کا لکچرر تھا، مین نے جب یہ نوحہ لکھا تو اکبر الٰہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شروانی وغیرہ اور استاد مرحوم کے اکثر دوستون اور قدر دانون کے پاس اس کو تحفہ بھیجا، سب نے تعریفین کین، اور دل بڑھایا، مگر ایک آزمودہ کار صاحب کمال ایسا تھا جس نے شفقت کی راہ سے مجھے لکھا کہ معاف کیجئے آپ شاعر نہین، اور اس کے بعد ایک ایسا نکتہ مجھے بتایا جو میرے دل مین پیوست ہو گیا، انھون نے فرمایا کہ جب تک انسان کسی فن مین کامل نہ ہو جائے، اس کو دوسرون کے سامنے عرض ہنر نہین کرنا چاہئے، مین نے اسی دن بساطِ سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کر لی، اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا، اور اگر چھپ نہ سکا، اور چھپ گیا، تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا، یہ آزمودہ کار صاحب کمال جنھون نے مجھے یہ قیمتی نصیحت کی، جس نے میرے رُخ کو نظم سے تمامتر نثر کی طرف پھیر دیا، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے،

اسی طرح طالب علمی کے زمانہ مین ایک اور بزرگ نے عین وقت پر میری ایسی رہبری کی جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی، یہ بزرگ ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی صاحب ہین، مجھے

اُس زمانہ مین عربی ادب اور منطق کا شوق تھا، ایک دن اونھون نے مجھے بلوا کر پوچھا کہ تم کو کس کس فن سے ذوق ہے، مین نے عربی ادب اور منطق کا نام لیا، فرمایا کیون، مین نے کہا اس لئے کہ یہ دونون دوسرے اصل مقصود علوم کے خادم اور ذریعہ ہین، ارشاد ہوا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف توجہ کب ہوگی، عرض کی جب اُن مین کمال پیدا ہو جائے گا، فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم مین تو ہمارے علماء کی پوری عمرین بسر ہو جاتی ہین، اور اصل مقصود کی نوبت نہین آتی، اس پر انھون نے یہ حکایت بیان کی، کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہان تک کہ تمام کمرہ قلمون سے بھر گیا، کسی نے اُن سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیون رکھ رہے ہین؟ تو متانت سے ارشاد ہوا کہ "میرا ارادہ تصنیف کا ہے"، پوچھنے والون نے کہا کہ "پھر وہ کب ہوگی"؟ فرمایا "جب ان قلمون سے فرصت ملے گی"،

یہ تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب تعلیم کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھایا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعۂ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، مولانا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ مین نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہین کھایا،

دار العلوم ہی مین تھا کہ ایک اور بزرگ سے نیاز حاصل ہوا، یہ مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب بی اے تھے، یہ عربی کے عالم اور انگریزی کے گریجوایٹ تھے، فلسفہ مین وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے اور ادب مین مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد تھے، یہ ان لوگون مین تھے جو تمام ذریعۂ علوم کی تکمیل کی بھول بھلیون سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے، سالہا سال سے وہ قرآن پاک کے حقائق و معانی پر غور کر رہے تھے، اُن سے قرآن پاک اور فلسفۂ جدیدہ کے سبق تو کم ہی پڑھے، مگر صحبت بار بار اُٹھائی، اور مشکلات مین مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد مین جو معجزات پر ہے، انہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے،

سب جانتے ہین کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کے دامن مین پرورش پایا ہے، استاذ مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نوآموزون کو پہلے مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے، کبھی وہ عنوان خود بتاتے تھے، اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے، پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سراغ کتابون مین بتاتے تھے، طالب علم اپنی محنت سے ان کا کھوج لگاتے تھے، اور جب کافی معلومات جمع ہو جاتے تو اُن کو لکھ کر اُن کے سامنے پیش کرتے، وہ اس مین کاٹ چھانٹ کرتے، مضمون کے بعد پھر رسالون کی، اور اس کے بعد کتابون کی تصنیف کی باری آتی، تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو ہر کونہ اور گوشے سے اس محنت سے ڈھونڈ و کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اُس سے تمھارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے، حوالہ مین سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے، نحوی کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے، پامال معلومات، تبذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے، یہ ان کا طریقہ تھا، اور اسی طریقہ کی پابندی ہمارے دار المصنفین مین جس مین علمار اور گریجویٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دیجاتی ہے، اب تک کیجاتی ہے،

خطباتِ مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۵ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پہ آٹھ خطبے دیئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے ان کو بیحد پسند کیا،

ضخامت ۱۹۴ صفحے،

قیمت ۸/ (چوتھا اڈیشن)

"منیجر"

الجزیہ

از

جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دارالمصنفین

"جزیہ کے متعلق غیر مسلموں میں مدتوں سے جو غلط فہمی چلی آرہی تھی، اس کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے الجزیہ لکھ کر دور کیا لیکن اسکے بعض پہلو پھر بھی تشنۂ تحقیق تھے، اس مضمون میں تمام ضروری پہلوؤں پر مفصل بحث کرکے جزیہ کی حقیقت واضح کی گئی ہے"

جزیہ کا لفظ جزیہ کس زبان کا لفظ ہے؟ اس کے متعلق دو خیال ہیں،

(۱) پہلا خیال یہ ہے کہ وہ عربی ہے، اس کا مادہ ج ز ی ہے، یہی خیال زیادہ عام ہے، طبری (۳۱۰ھ) جصاص (۳۷۰ھ) ابوبکر سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) جوہری (۳۹۳ھ) راغب اصفہانی (اوائل ۵۰۰ھ) محی السنہ بغوی (۵۱۶ھ) زمخشری (۵۳۸ھ) معافری (۵۴۳ھ) مرغینانی (۵۹۳ھ) امام رازی (۶۰۶ھ) جمال قرشی (۶۸۱ھ) بیضاوی (۶۸۵ھ) نسفی (۷۰۱ھ) ابن مکرم (۷۱۶ھ) ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) فیروزآبادی (۸۲۰ھ) مہائمی (۸۳۵ھ) بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) جلال الدین محلی (۸۶۴ھ) جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) ابوسعود (۹۵۱ھ) شربینی (۹۶۰ھ) محمد طاہر (۹۸۶ھ) زبیدی (۱۲۰۵ھ) محمد اشرف (۱۲۴۴ھ) آلوسی (۱۲۷۰ھ) سید صدیق حسن خان (۱۳۰۷ھ) جو مشہور کتب تفسیر، فقہ اور لغت کے مصنف ہیں، یہی لکھتے ہیں،

(۲) دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ فارسی ہے، اصل میں گزیت تھا، جس کے معنی خراج کے ہیں، یہ خیال

ابو عبداللہ محمد بن احمد بن یوسف خوارزمی (۳۸۷ھ) نے مفاتیح العلوم (ص ۵۹) مین ظاہر کیا ہے، اس کی کتاب ۱۸۹۵ء مین G. Van Vloten نے شائع کی ہے، اور ایک کتاب منتخب اللغات کے قلمی نسخہ مین بھی جو ناقص الاطراف ہے، یہی لکھا ہے، اس کتاب سے مراد اگر منتخب اللغات شاہجہانی ہو تو اس کا مصنف عبدالرشید حسینی مدنی ٹھٹہ (سندھ) کا رہنے والا تھا، جس نے اس کتاب کو حسب روایت ریو، سخاؤ، اور ایتھے ۱۰۴۶ھ مین تمام کیا،

گزیت کے دو تلفظ ہین، فردوسی کے ان اشعار

گزیتے نہادند بر یک درم ۔ گرا یدون کہ دہقان بود گر ژرم

گزیتے زبا ر ورش درم ۔ بجز باستان برنہین زد رقم

اور نظامی کے اس شعر

گہش قیصر گزیت دین فرستد ۔ گہش خاقان خراج چین فرستد

مین گزیت امیر کے وزن پر ہے، لیکن مفاتیح العلوم کے ناشر نے اس کو رہبر کے وزن پر پڑھا ہے،

جزیہ کا تلفظ | جزیہ کو جو لوگ معرب نہین مانتے، بلکہ عربی سمجھتے ہین، وہ اس کا تلفظ دو طرح پر کرتے ہین،

الف :- جزیہ جیم کے نیچے زیر، یہ عام تلفظ ہے، جیسے شکوہ بمعنی شکایت،

ب :- جَزیہ جیم کے اوپر زبر جیسے قعدہ اور جلسہ، یہ امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) نے اپنی مشہور تفسیر جامع البیان (ص ۷۰ ج ۱۰) مین اور امام ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) نے بحر المحیط (ص ۳۰ ج ۵) مین لکھا ہے، دوسری کتاب مین قعدہ کی جگہ پر عقدہ چھپ گیا جو غلط ہے،

تنقید | میرے نزدیک عربی جزیہ، معرب جزیہ سے زیادہ قدیم ہے، اور اس کے حسب ذیل دلائل ہین،

(۱) یہ لفظ قرآن مجید مین موجود ہے، اور چونکہ آیت جزیہ ۹ھ مین نازل ہوئی ہے[۵۱] اس لئے عربی ادبیات مین اس کو رواج پائے ہوئے تیرہ سو ساٹھ برس کا زمانہ گذرا ہے،

(۲) عرب کے ایک جاہلی شاعر ابو کبیر ہذلی (عامر بن حلیس[۵۲]) جنھون نے اسلام کا زمانہ بھی پایا ہے، اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فیضِ صحبت سے مشرف ہوئے ہین[۵۳]، لسان العرب ابن مکرم (۷۱۶ھ) مین جو عربی زبان مین لغت کی سب سے بڑی کتاب ہے ان کا ایک شعر نقل کیا ہو (ص ۵۹ جلد ۱)

وإذا الكماة تعاوروا طعن الكلى

تذر البكارة في الجزاء المضعف

اس مین جزاء کا لفظ جزیۃ اور جزیٰ کی جمع ہے، اور یہ دونون لفظ جزیہ کی جمع ہین،

(۳) حدیث کی کتابون مین یہ لفظ عام طور پر ملتا ہے،

(۴) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے کتاب الخراج، خاص خراج اور جزیہ پر لکھی ہے لیکن جزیہ کو معرب نہین کہا ہے،

(۵) امام یحیٰی بن آدم (۲۱۳ھ) نے بھی کتاب الخراج تصنیف کی ہے، اور اس مین بعض ایسے الفاظ بھی آئے ہین، جو معرب ہو کر مستعمل ہو چکے ہین، مثلاً زمین کے خراج کے لئے طَسق (ص ۵۷) بیعنامہ کے لئے وِصَر (ص ۵۹) یا دستجہ جو غالبًا دستہ کا معرب ہے، (ص ۱۴۴) لیکن جزیہ کو معرب نہین لکھا ہے،

(۶) ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری (۲۸۱ھ) نے الاخبار الطوال مین بعض معرب الفاظ لکھے ہین، جیسے شُمرتَج جو سہ مرہ کا معرب ہو لیکن جزیہ کے متعلق وہ بھی خاموش ہین،

---

۵۱ تفسیر ابن جریر ص ۶۵، ۶۸، ج ۱۰: ۵۲ کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ (۲۹۶) مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۲ء
۵۳ اصابہ وغیرہ،

(۷) تمام مفسرین اور فقہا نے جزیہ کو عربی الاصل سمجھا ہے،

(۸) کوئی اہلِ لغت اس کو معرب نہین کہتا،

(۹) گزیت کا سب سے قدیم عربی ماخذ خوارزمی ہے، جس نے ۳۸۰ھ مین وفات پائی،

(۱۰) فارسی ماخذ مین گزیت کا لفظ سب سے پہلے فردوسی کے ہان ملتا ہے، جس نے ۴۱۱ھ مین استعمال کیا تھا، اس لحاظ سے اس لفظ کو فارسی اسلامی ادبیات مین آئے ہوئے نوسو اٹھاون برس ہوئے، اور یہ مدت عربی جزیہ سے بقدر ۴۱۶ برس کم ہے،

(۱۱) فارسی مین علم لغت کی پہلی کتاب ابوالحسن علی بن احمد اسدی طوسی نے لکھی، جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ چھٹی صدی ہجری سے قبل فرض کیا جاسکتا ہے، اس کتاب کا نام لغتِ فرس ہے، اور بقول مصنف بلخ، ماوراء النہر اور خراسان (گویا ایران و ترکستان) کی فارسی کے الفاظ جمع کئے ہین، جو عربی کی آمیزش سے بالکل پاک ہین، اور ان کی سند مین اشعار بھی پیش کئے ہین، لیکن باین ہمہ اس کتاب مین گزیت کا لفظ نہین ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزیت فارسی نہین، بلکہ جزیہ کا مفرس ہے،

(۱۲) گزیت کے جو معنی خوارزمی (۳۸۰ھ) نے لکھے ہین، بالکل وہی معنی جزیہ کے اُن عربی مصنفین نے لکھے ہین، جو اُن سے متقدم تھے، مثلاً طبری (۳۱۰ھ) اور سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ معرب نہین، بلکہ گزیت مفرس ہے

(۱۳) چونکہ صحیح لفظ گُزِیت بروزن امیر ہے، جیسا کہ فردوسی اور نظامی کے اشعار سے ثابت ہے اس لئے جزیہ اُس سے معرب نہین ہوسکتا،

(۱۴) ان تمام باتون کے باوجود یہ امکان ضرور ہے کہ اسلام سے پیشتر یہ لفظ ایران سے یمن آیا ہو اور معرب ہوکر عرب مین رائج ہوگیا ہو، لیکن یہ امکان ہی امکان ہے، شواہد سے اس کی تائید مشکل ہے،

(۱۵) یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اسلام سے پیشتر نہ صرف ایران، بلکہ چین اور ہندوستان مین بھی جزیہ کا رواج تھا، اور اہلِ عرب تجارتی سلسلہ سے ان مقامات مین آتے جاتے تھے، اس لئے جس طرح یہ ممکن ہے کہ جزیہ کا لفظ ایران سے لیا گیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ چین یا ہندوستان مین جزیہ کا طریقہ دیکھ کر اہلِ عرب نے اس کا عربی نام جزیہ رکھ لیا ہو،

جزیہ کے معنی: مفسرین فقہاء، اور ائمہ لغت نے جزیہ کے معنی خراج کے لکھے ہین،

(ا) امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (۳۱۰ھ) جامع البیان (۸ ج ۱۰ مصر) مین لکھتے ہین،

حتّٰی یعطوا الخراج عن رقابھم	یہان تک کہ وہ اپنی گردنون کی طرف سے خراج دین،

(ب) امام ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی جنھون نے ۳۳۰ھ سے قبل وفات پائی، اپنی تصنیف غریب القرآن (عرف نزہۃ القلوب) (ص ۸۳ (مصر ۱۳۲۵ھ) مین فرماتے ہین،

الجزیۃ، الخراج المجعول علی راس الذمّی،	جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کی ذات پر لگایا جاتا ہے،

(ج) شمس الائمہ ابوبکر محمد بن ابوسہل سرخسی (۴۸۳ھ) مبسوط (ص ۷، ج ۱۰ مصر) مین لکھتے ہین :-

وضع خراج علی رؤوس الرجال	آدمیون پر فی راس خراج لگانا (جزیہ) ہے،

(د) محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی (۵۱۶ھ) کی معالم التنزیل (ص ۲۷ جلد ۲ بمبئی ۱۲۶۹ھ) مین ہے :-

وھی الخراج المضروبۃ علی	اور وہ جزیہ ان (ذمیون) کی گردنون پر

مقررہ خراج ہے،

ہ۔ علامہ ابوالقاسم جاراللہ محمود زمخشری (۵۳۸ھ) کی اساس البلاغۃ (ص ۶۵ جلد ۱، مصر) میں مرقوم ہے،

واشتری من دھقان ارضا	اور اس نے کسی زمیندار سے زمین
علیٰ ان یکفیہ جزیتھا ای	اس شرط پر خریدی کہ اس کا جزیہ
خراجھا،	یعنی خراج ادا کرے گا،

و۔ علامہ جمال الدین محمد بن مکرم (۷۱۱ھ) نے لسان العرب (ص ۱۵۹ ج ۱۸ مصر) میں لکھا ہے،

والجزیۃ خراج الارض والجمع جِزًی	جزیہ زمین کے خراج کو کہتے ہیں،
وجِزْی،	جِزْی اور جِزًی اسکی جمع ہے۔

ز۔ علامہ اثیر الدین ابوحیان محمد بن یوسف غرناطی اندلسی (۷۴۵ھ) اپنی تالیف تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب (ص ۲۰، حماۃ ۱۳۴۵ھ) میں جس کا نام سیوطی نے نحاۃ (ص ۲۲) میں اتحاف الاریب لکھا ہے فرماتے ہیں،

الجزیۃ خراج المجعول علی راس	جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کے سر
الذمی،	پر لگایا گیا ہو،

ح۔ علامہ مجد الدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی (۸۱۷ھ) نے القاموس المحیط (ص ۱۳ ج ۴) میں تحریر فرماتے ہیں،

والجزیۃ بالکسر خراج الارض	جزیہ (جیم کو زیر) زمین کا خراج ہے اور
وما یوخذ من الذمی	جو ذمی سے لیا جائے (وہ بھی جزیہ) ہے،

ط - علامہ ابن احمد صنائی (۸۳۵ھ) کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان (ص ۲۹۰ ج ۱) میں ہے،

وھی الخراج المضروب علی الرقاب،	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنوں پر لگایا جاتا ہے،

ی - علامہ جلال الدین محمد بن احمد محلی (۸۶۴ھ) اور علامہ جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ) کی تفسیر جلالین (ص ۱۷۰) میں ہے،

الخراج المضروب علیھم کل عام	(جزیہ) ان ذمیوں پر مقرر کیا ہوا سالانہ خراج ہے،

ک - علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب، جنھوں نے سراج المنیر کے نام سے ایک تفسیر ۹۶۸ھ میں تالیف کی، اس کے ص ۲۰۳ ج ۱ میں لکھتے ہیں،

وھی الخراج المضروب علی رقابھم،	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو ان (ذمیوں) کی گردنوں پر مقرر کیا جائے

ل - مولینا محمد طاہر جنھوں نے ۹۸۶ھ میں مجمع البحار الانوار کے نام سے ایک لغت تصنیف کیا، اس کی جلد ۱ ص ۴۸۵ میں لکھتے ہیں

من اخذ ارضا بجزیتھا، ای بخراجھا،	جو شخص کوئی زمین جزیہ (یعنی خراج ادا کرنے کی شرط) پر لے،

م - علامہ سید محمد مرتضی زبیدی حسینی واسطی (۱۲۰۵ھ) نے تاج العروس (ص ۳، ج ۱۰ مصر) میں قاموس کی مندرجۂ بالا عبارت نقل کرکے اس کے ایک لفظ (وما یوخذ) کی یوں تشریح کی ہے:

(و) منہ (ما یوخذ)	اور جزیہ ہی ہے جو ذمی سے (قرض) لیا جاتا ہے

ن - مولانا محمد اشرف لکھنوی نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر، ضخیم جلدون مین تاج اللغات تصنیف کی تھی، اس کتاب کے مصنفین اور سنہ تصنیف کا کچھ پتہ نہین ہے، مولانا محمد اشرف کا نام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر تحریر فرمایا ہے، الفاظ یہ عبارت لکھی ہے،

"یکے از مولفینش مولانا محمد اشرف لکھنوی است در ۱۲۴۲ھ وفات یافت"

بہرحال اس کتاب کے (ص ۲۹۵) مین ہے:-

"جزیہ بالکسر حاصلِ زمین و چیزیکہ گرفتہ شود از کفار اہلِ ذمہ"

س - امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ) نے تفسیر فتح البیان (ص ۵۸ جلد ۴، مصر ۱۳۰۱ھ) مین لکھا ہے،

وھو الخراج المضروب علیٰ رقابھم کل عامٍ	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنون پر سالانہ مقرر کیا جاتا ہے،

غرض ۳۱۰ھ سے ۱۳۰۷ھ تک جتنے مشہور عالم گذرے ہین، بالاتفاق سب نے جزیہ کے معنیٰ خراج کے لئے ہین،

جزیہ کی اصطلاح | جزیہ کے لغوی معنی جو اوپر بیان کئے گئے، انہی سے اس کے اصطلاحی معنی متفرع ہوتے ہین، لغت مین جزیہ کے معنی خراج کے ہین، اب اگر وہ خراج رعایا کے ہر فرد سے بحساب فی کس سالانہ وصول کیا جائے، تو اس کو جزیہ کہا جائے گا، اور یہ عام معنی ہونگے لیکن اگر وہ خراج سلطنت اسلام مین صرف غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جائے، تو یہ شرعی اور اصطلاحی جزیہ ہوگا، اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

۱- لغت مین جزیہ اور خراج محصول کو کہتے ہین، خواہ وہ کسی چیز کا ہو، اور کوئی شخص ادا کرے

۲۔ مسلم اور غیر مسلم رعایا پر انفرادی حیثیت سے جو محصول عائد ہو، لغت کے لحاظ سے اس کا نام جزیہ ہے، اور اس مین کوئی تفریق نہین ہے،

۳۔ صرف غیر مسلم رعایا جو فرداً فرداً محصول ادا کرے، اوس کو شرع کی اصطلاح مین جزیہ کہتے ہین، اور مسلم رعایا جو محصول ادا کرتی ہے، اس کو زکوٰۃ، صدقہ، اور دوسرے نامون سے تعبیر کیا جاتا ہے،

جزیہ اقوام غیر مین جزیہ کے لغوی معنی سمجھنے کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کا رواج دوسری قومون اور ملکون مین بھی تھا؟ ہندوستان، ایران، اور چین، اس کا جواب اثبات مین دیتے ہین،

ہندوستان مین جزیہ منو شاستر سے جو ہندوستان کا مدنی اور سیاسی قانون ہے[1] اور جدید تحقیقات کے مطابق حضرت مسیحؑ کے دو تین سو سال پیشتر تالیف ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ (رقاب Poll-Tax) کا رواج ہندوستان مین کم از کم بائیس سو برس سے ہے، منوجی نے کتاب مذکور کے باب ۷ اور ۸ مین جزیہ کے متعلق حسب ذیل دفعات درج کئے ہین:۔

دفعہ ۱۲۸۔ جس طریق سے کام کرنے والے کو اور راجہ کو فائدہ ہو، اس طریق کو دیکھ کر راجہ اپنے محصولات کو تجویز کرے، جو کہ ہر شخص پر برابر ہو،

دفعہ ۱۳۳۔ ...... وید پڑھنے والے برہمن سے محصول نہ لیوے،

دفعہ ۱۳۷۔ راج مین چھوٹے آدمیون سے بھی تھوڑا ساگ، پتا، وغیرہ سال تمام مین بطور محصول کے لیوے،

دفعہ ۱۳۸۔ رسوئین بنانے والے وہر قسم کے کاریگر و شودر جسم کی تکلیف سے اوقات بسر کرنے والے

---

[1] تمدن ہند موسیو گستاولی بان مترجمہ مولانا سید علی بلگرامی ص ۲۱۰۔

(پلہ دار وغیرہ) ان سبھون سے ہر مہینہ مین ایک دن کام کرائے، ان کا یہی محصول ہی،

دفعہ ۱۳۹ - اگر بہ تقاضائے محبت، محصول رعیت سے نہ لیوے تو راجہ اپنی جڑ اُدکھاڑتا ہی،

دفعہ ۱۵۴ - آٹھ کامون کو.............. بچارے، آٹھ کام یہ ہین، رعیت سی محصول لینا،............ (باب ۸)

دفعہ ۳۹ - چیز مدفونہ یافتہ کے نصف حصہ کو لینے والا راجہ ہے، کیونکہ حفاظت کرتا ہی اور سب کا مالک ہے،

دفعہ ۳۹۴ - اندھا، بہرا، لنگڑا، ستر برس کی عمر والا، دھن دہانیہ سے ویدیا پاٹھیون کا اُپکار کرنے والا، ان سبھون سے راجہ باوجود خالی ہونے خزانہ کے اپنے لینے کے لائق محصول کو نہ لیوے،

دفعہ ۴۰۵ - گاڑی وغیرہ محمولہ اشیا، وغیرہ سے بلحاظ چیز ہائے محمولہ کے سارا سار بچار کرکے محصول مقرر کرنا چاہئے، اور جس گاڑی وغیرہ مین اشیا وغیرہ نہین ہے اور جو آدمی کچھ سامان وغیرہ نہین رکھتا اُنھون سے تھوڑا محصول لینا چاہئے،

ان دفعات سے اصولی طور پر پتہ چلتا ہے، کہ

(۱) پیشہ ور اور غیر پیشہ ور سب پر جزیہ تھا (۲) عورتین مستثنیٰ نہ تھین اور نہ بچے مستثنیٰ تھے (۳) غیر مستطیع لوگون کو بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا (۴) معذور، زیادہ معمر اور برہمن مستثنیٰ تھے (۵) مزدور، چمار، نوکر، جو محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، اُن سے محصول کے عوض ہر مہینہ مین ایک دن بیگار لی جاتی تھی (۶) خراج نہ لینا، سلطنت کی بیخ کنی کے مرادف تھا (۷) محصول ہر شخص پر برابر تھا،

ایران مین جزیہ | ایران مین جزیہ رقاب کب سے رائج تھا؟ اس کا صحیح جواب ہم نہین

دیکھئے، البتہ اتنا معلوم ہے کہ نوشیروان سے پہلے بھی اُس کے وصول کرنے کا دستور تھا، طبری (ص ۹۶۰ ج ۲) مین ہے،

وکان ملوک فارس یاخذون من کور من کورھم قبل ملوک کسری انوشروان فی خراجها الثلث ومن کور الربع، ومن کور الخمس ومن کور السدس علی قدر شربها وعمارتها، ومن جزیة الجماجم	اور ایران کے بادشاہ نوشیروان سے پہلے خراج مین بعض صوبون سے تہائی بعض سے چوتھائی بعض سے پانچوان بعض سے چھٹا حصہ شادابی، اور پیداوار کے مطابق لیا کرتے تھے، اور کھوپڑیون کے جزیہ مین بھی کچھ مقررہ رقم وصول کیجاتی تھی

قباد بن فیروز نے اخیر زمانہ سلطنت مین خراج کی صحیح تشخیص کرانی چاہی، لیکن اس کا انتقال ہوگیا، اور اس کام کو اس کے بیٹے نوشیروان نے انجام دیا، طبری (حوالہ سابق) مین ہے،

حتی اذا ملك ابنه کسری امر باستتمامها واحصاء النخل والزیتون والجماجم ..... وامر کاتب خراجه ان یقرء علیهم الجمل التی استخرجت من اصناف غلات الارض، وعدد النخل والزیتون والجماجم	جب اس کا بیٹا کسری بادشاہ ہوا تو اُس نے اس کام کو مکمل کرایا، کھجور، زیتون اور کھوپڑیان شمار کی گئین،... ..... اور محکمۂ خراج کے سکریٹری کو حکم ہوا کہ لوگون کو وہ الفاظ پڑھ کر سنائے جو زمین کے متعدد اقسام کے غلون اور کھجور، زیتون، اور کھوپڑیون کی تعداد کے متعلق درج تھے،

کسری نوشیروان نے اس تشخیص کی وجہ یہ بتلائی ہے،

انا قد رأینا ان نضع علی ما احصی
من جریان ھذہ المساحۃ
من النخل والزیتون والجماجم
وضائع، ونامر بانجامھا فی
السنۃ فی ثلثۃ انجم، وتجمع فی
بیوت اموالنا من الاموال مالو
اتانا من ثغر من ثغورنا او طرف
من اطرافنا فتق او شیٔ نکرھہ
واحتجنا الی تدارکہ او حسمہ
ببذل لنا فیہ مالا کانت الاموال
عندنا معدۃ موجودۃ، و
لم نرد استئناف اجتبائھا علی
تلک الحال (طبری ۲۰۹۰-۱۲ جلد ۲)

مابدولت کی راے ہے کہ مابدولت کھجور
اور زیتون کی پیمایش شدہ جریبون، اور
کھوپڑیون پر ٹیکس لگائین، اور سال
مین اُن کو تین قسطون مین ادا کرنے کا
حکم دین، تاکہ مابدولت کے خزانون مین
اس قدر دولت جمع رہے، کہ اگر کبھی کسی
سرحد یا کسی سمت سے کوئی بغاوت یا
بدامنی رونما ہو، اور مابدولت کو اس
کے تدارک یا قلع قمع کرنے مین روپیہ خرچ
کرنے کی ضرورت پڑے تو وقت پر
ہمارے پاس روپیہ موجود رہے اور
نئے سرے سے اس وقت مابدولت کو
روپیہ جمع کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے،

اوراس جزیہ کی شرح یہ تھی،

والزموا الناس الجزیۃ ما خلا
اھل البیوتات والعظماء و
المقاتلۃ والھرابذۃ والکتاب
ومن کان فی خدمۃ الملک،
وصیروھا علی طبقات اثنی

اور لوگون پر انھون نے جزیہ لگایا سواے
اونچے گھرانون معززین، فوج پیشوایان
مذہبی، محرر اور ملازمین شاہی کے، اور
اور اس (جزیہ) کی چند شرحین رکھین،
یعنی بارہ درہم اور آٹھ اور چھ اور چار،

عشر درهما وثمانية وستة و
اربعة كقدر اكثار الرجل و
اقلاله، ولم يلزموا الجزية
من كان اتى له من السنين
دون العشرين او فوق الخمسين
(طبری ص ۹۶۲ ج ۲)

آدمی کی ثروت اور فقر کے لحاظ سے، اُسی
جس شخص کا سن بیس سے کم یا پچاس سے
اوپر تھا، اوس پر جزیہ نہین لگایا،

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱- ایران مین انسانون پر محصول عائد تھا،

۲- ان محاصل کا مقصد بغاوتون کے رفع کرنے اور دشمنون کا مقابلہ کرنے کیلئے تیاری تھی

۳- بیس برس سے کم اور پچاس سال سے زیادہ کے آدمی محصول سے مستثنیٰ تھے،

۴- عورتین مستثنیٰ نہ تھین،

۵- جزیہ حسب حیثیت تھا،

۶- اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم جزیہ ادا نہین کرتے تھے

چین مین جزیہ چین مین جزیہ رقاب عرصہ سے تھا، مسلمانون مین پہلا مصنف جس نے اس کا تذکرہ کیا، سلیمان تاجر ہے، جس نے اپنا سفرنامہ ۲۳۷ھ کے حدود مین لکھا ہے، وہ لکھتا ہے،

ولكن عليهم جزية على الجماجم
المذكور حسبما يرون من الاحوال
وان كان بها احد من العرب
او غيرهم اخذ منه جزية ماله

اور لیکن ان پر حالات کے مطابق جزیہ ہر
جو سرون (مردون) سے لیا جاتا ہے
اور اگر وہان عرب یا دوسرے ملک کا
کوئی شخص ہوتا ہے، تو اس سے اس کے

لیحرز ماله،	مال کا جزیہ لیا جاتا ہے تاکہ اوس کے مال
(سفرنامہ ص ۴۰)	کی حفاظت کیجائے.

دوسری جگہ لکھتا ہے،

ولیس علیھم خراج فی ضیاعھم	اوران پر جائداد کا خراج نہین ہے، بلکہ
وانما یوخذ من الرؤوس علی	سرون (مردون) سے مال اور جائداد کا
قدر اموالھم وضیاعھم (ص ۴۴)	تخمینہ کرنے کے بعد (جزیہ) لے لیا جاتا ہی

آگے چل کر کہتا ہے،

فاذا بلغ ثمانی عشرة سنة اخذ	جب وہ (مرد) اٹھارہ برس کا ہوتا ہی
منه الجزیة فاذا بلغ ثمانین سنة	تو اس سے جزیہ لیا جاتا ہے، اور جب اسی
لم توخذ منه جزیة (ص ۵۲)	برس کو پہونچتا ہے، تو جزیہ نہین لیا جاتا

اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

(۱) چین مین دو قومین آباد تھین چینی اور مسلمان (۲) چینیون سے حسب حیثیت جزیہ لیا جاتا تھا (۳) جزیہ مین مردون کی تخصیص تھی (۴) عورتین مستثنیٰ تھین (۵) اٹھارہ اور اسی سال کے درمیان عمر والون سے جزیہ لیتے تھے، اٹھارہ سے کم اور اسی سے زیادہ عمر کے لوگ مستثنیٰ تھے (۶) عرب اور دوسری قومین جو تجارت کے سلسلہ سے وہان قیام پذیر تھین، ان سے جزیہ رقاب نہین لیا جاتا تھا، یہ لوگ صرف مال کا محصول ادا کرتے تھے (۷) غیر قومون سے جزیہ کی وصولی حفاظت مال کی غرض سے تھی،

اسلام مین جزیہ ہندوستان ایران اور چین کی طرح سلطنت اسلامیہ مین بھی رعایا پر جزیہ تشخیص کیا گیا جس کو لین پول اور سرکار کی طرح ہم بلا تامل جزیہ رقاب نہین کہہ سکتے، اسلامی سلطنت مین بھی چین کی طرح دو قسم کی رعایا تھی، مسلم اور غیر مسلم، اور چونکہ دونون مین سلطنت کی امداد اور ملک کی حفاظت

کے متعلق قدرتی طور پر نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے ضرور تھا کہ دونون کے لئے جزیہ کی شرح مختلف ہو اور اس کا علٰحدہ علٰحدہ نام رکھدیا جائے تاکہ سننے والون کو سمجھنے مین آسانی ہو، اسی بنا پر مسلمانون کے محصول کا نام زکوٰۃ اور غیر مسلمون کے خراج کا نام جزیہ رکھا گیا، معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ یا جزیہ مین شرف یا ذلت کا کوئی پہلو نہین ہے،

زکوٰۃ اور جزیہ کا فرق چونکہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کی ذمہ داریان کسی حد تک مختلف تھین، اس لئے ان کے محصولون (زکوٰۃ اور جزیہ) کے تشخیص مین بھی اس کا لحاظ رکھا گیا،

مسلمانون کی سلطنت قومی تھی اور ضرورت کے وقت ان کو مال تو مال خود جان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کے محصول مین "ایثار" کے جذبہ کو بہت زیادہ سامنے رکھا گیا، چنانچہ ان پر

(۱) زکوٰۃ مقرر کی گئی، جو مختلف انواع کی جامع تھی، مثلاً

(ا) اونٹون پر زکوٰۃ (ب) کھجور پر زکوٰۃ (ج) مسکوک سونے چاندی پر زکوٰۃ (د) معادن پر زکوٰۃ، (ہ) دفینہ پر زکوٰۃ (و) زیور، بے سکہ سونا اور عنبر پر زکوٰۃ (ز) یتیمون کے مال پر زکوٰۃ (ح) میراث پر زکوٰۃ (ط) قرض کی پر زکوٰۃ (ی) مال تجارت پر زکوٰۃ، (ک) بکریون پر زکوٰۃ (ل) گائے پر زکوٰۃ (م) تجارتی گھوڑون پر زکوٰۃ، (ن) پھلون پر زکوٰۃ، (س) عید الفطر کی زکوٰۃ،

ان انواع مین سے اگر چند کا بھی کوئی مسلمان محصول (زکوٰۃ) ادا کرے تو اچھی خاصی رقم ہوجاتی ہے بخلاف اس کے غیر مسلم رعایا کی ہمدردی زیادہ سے زیادہ "عزت وطن" کے نام سے حاصل کیجا سکتی تھی، جو اگرچہ اس وقت بھی اجنبیون (عرب) کے قبضہ مین تھا، تاہم دوسرے اجنبیون (مخالفین عرب) کے ہات مین جانے سے اس کے امن وامان اور نظم ونسق مین خلل پڑنے کا اندیشہ ہوسکتا تھا، اس بنا پر غیر مسلم رعایا سے واجبی محصول یا جبری مواجب (Compulsory dues) کا ایثار

لیحرز ماله،	مال کا جزیہ لیا جاتا ہے تاکہ اوس کے مال
(سفرنامہ ص ۴۰)	کی حفاظت کیجائے۔

دوسری جگہ لکھتا ہے،

ولیس علیھم خراج فی ضیاعھم	اوران پر جائداد کا خراج نہین ہے، بلکہ
وانما یوخذ من الرؤوس علی	سرون (مردون) سے مال اور جائداد کا
قدر اموالھم وضیاعھم (ص ۴۹)	تخمینہ کرنے کے بعد (جزیہ) لے لیا جاتا ہے،

آگے چل کر کہتا ہے،

فاذا بلغ ثمانی عشرة سنة اخذت	جب وہ (مرد) اٹھارہ برس کا ہوتا ہے
منه الجزیة فاذا بلغ ثمانین سنة	تو اس سے جزیہ لیا جاتا ہے، اورجب اسی
لم توخذ منه جزیة (ص ۵۰)	برس کو پہونچتا ہے، تو جزیہ نہین لیا جاتا

اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

(۱) چین مین دو قومین آباد تھین چینی اور مسلمان (۲) چینیون سے حسب حیثیت جزیہ لیا جاتا تھا (۳) جزیہ مین مردون کی تخصیص تھی (۴) عورتین مستثنیٰ تھین (۵) اٹھارہ اور اسی سال کے درمیان عمر والون سے جزیہ لیتے تھے، اٹھارہ سے کم اور اسی سے زیادہ عمر کے لوگ مستثنیٰ تھے (۶) عرب اور دوسری قومین جو تجارت کے سلسلہ سے وہان قیام پذیر تھین، ان سے جزیہ رقاب نہین لیا جاتا تھا، یہ لوگ صرف مال کا محصول ادا کرتے تھے (۷) غیر قومون سے جزیہ کی وصولی حفاظت مال کی غرض سے تھی،

اسلام مین جزیہ ہندوستان ایران اور چین کی طرح سلطنت اسلامیہ مین بھی رعایا پر جزیہ تشخیص کیا گیا جس کو لین پول اور سرکار کی طرح ہم بلا تامل جزیہ رقاب نہین کہہ سکتے، اسلامی سلطنت مین بھی چین کی طرح دو قسم کی رعایا تھی، مسلم اور غیر مسلم، اور چونکہ دونون مین سلطنت کی امداد اور ملک کی حفاظت

کے متعلق قدرتی طور پر نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے ضرور تھا کہ دونون کے لئے جزیہ کی شرح مختلف ہو اور اس کا علحدہ علحدہ نام رکھدیا جائے، تاکہ سننے والون کو سمجھنے مین آسانی ہو، اسی بنا پر مسلمانون کے محصول کا نام زکواۃ اور غیر مسلمون کے خراج کا نام جزیہ رکھا گیا، معنی کے لحاظ سے زکواۃ یا جزیہ مین شرف یا ذلت کا کوئی پہلو نہین ہے،

زکواۃ اور جزیہ کا فرق چونکہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کی ذمہ داریان کسی حد تک مختلف تھین، اس لئے ان کے محصولون (زکوٰۃ اور جزیہ) کے تشخیص مین بھی اس کا لحاظ رکھا گیا،

مسلمانون کی سلطنت قومی تھی اور ضرورت کے وقت ان کو مال تو مال خود جان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کے محصول مین "ایثار" کے جذبہ کو بہت زیادہ سامنے رکھا گیا، چنانچہ ان پر (۱) زکواۃ مقرر کی گئی، جو مختلف انواع کی جامع تھی، مثلاً

(ا) اونٹون پر زکواۃ (ب) کھجور پر زکواۃ (ج) مسکوک سونے چاندی پر زکوۃ (د) معادن پر زکاۃ، (ہ) دفینہ پر زکواۃ (و) زیور، بے سکہ سونا اور عنبر پر زکواۃ (ز) یتیمون کے مال پر زکواۃ (ح) میراث پر زکواۃ (ط) قرض کی پر زکواۃ (ی) مال تجارت پر زکواۃ، (ک) بکریون پر زکواۃ (ل) گاے پر زکواۃ (م) تجارتی گھوڑون پر زکواۃ، (ن) پھلون پر زکواۃ، (س) عید الفطر کی زکواۃ،

ان انواع مین سے اگر چند کا بھی کوئی مسلمان محصول (زکواۃ) ادا کرے تو اچھی خاصی رقم ہو جاتی ہے بخلاف اس کے غیر مسلم رعایا کی ہمدردی زیادہ سے زیادہ "عزت وطن" کے نام سے حاصل کیجا سکتی تھی، جو اگرچہ اس وقت بھی اجنبیون (عرب) کے قبضہ مین تھا، تاہم دوسرے اجنبیون (مخالفین عرب) کے ہات مین جانے سے اس کے امن و امان اور نظم و نسق مین خلل پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس بنا پر غیر مسلم رعایا سے واجبی محصول یا جبری مواجب (Compulsory dues) کا ایثار

چاہا گیا، جو زکوٰۃ سے مقدار مین کم اور اس کی طرح گوناگون نہ تھا، اور یہ ایک مرجح رعایت تھی،

(۲) مسلمانون کا محصول (زکوٰۃ) ایک مذہبی فرض تھا، جن کو وہ کارِ خیر سمجھ کر ثواب کے لئے اداکرتے تھے، اس لئے اس کی مقدار زیادہ ہونے مین کچھ ہرج نہ تھا، بخلاف اس کے غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) محض سیاسی تھا، جس پر ان کے عقیدہ کے مطابق کوئی اُخروی ثواب مرتب نہین ہوتا تھا، اس لئے اس کی شرح زیادہ نہین رکھی گئی،

۳۔ مسلمانون کا محصول معاف نہین ہوسکتا تھا، کیونکہ وہ مذہبی فرض تھا، لیکن غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) نقدی شکل مین معاف ہوسکتا تھا، موانید کا مسئلہ جزیہ کے باب کا ضروری مسئلہ ہے، مبسوط (ص ۸۲ ج ۱۰) مین اس کے متعلق جو کچھ ہے ذرا تفصیل کے ساتھ ہے، اور امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے اختلافات دکھائے ہین لیکن فتاوائے سراجیہ مین جو ۵۶۹ھ کی تصنیف ہے[۵۱] یعنی مبسوط کے بعد کی ہے، اس مسئلہ کو بلا اختلاف ذکر کیا ہے اور "موانید" کے معنی بھی تبلائے ہین، یعنی فی الفارسیۃ ماندہا[۵۲]،

اس مسئلہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ذمی (غیر مسلم) پر برسون سے جزیہ باقی چلا آتا ہو، تو اس کا مطالبہ نہ کیا جائے گا، بلکہ جس سال حاکم مطالبہ کرے گا، اسی سال کا جزیہ ادا کرنا ہوگا، اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فقہا، جزیہ کو قرض نہین سمجھتے، بلکہ عطیہ اور صلہ سمجھتے ہین، مبسوط مین ہے،

لان الجزیة صلة مالیة ولیست	اس لئے کہ جزیہ ایک مالی صلہ ہے ذاتی
بدین واجب (ص ۸۰ ج ۱۰)	قرض نہین،

(۴) مسلمانون کی زکوٰۃ مین تخفیف نہین ہوسکتی، لیکن جزیہ مین کمی کی جاسکتی ہے، چنانچہ نجران کے وہ عیسائی جو عراق چلے گئے تھے، انھون نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت مین تخفیف جزیہ کی درخواست کی تو امیر المؤمنین نے ولید بن عقبہ حاکم عراق کے نام ایک فرمان بھیجا، جس مین یہ فقرے

---

۵۱ کشف الظنون ج ۲ ص ۷، ۱۶، ۵۲ فتاویٰ سراجیہ قلمی باب الجزیہ،

بھی تھے،[۵۱]

وانی قد خففت عنھم ثلاثین حلۃ من جزیتھم، | مین نے اُن کے جزیہ سے تیس حلّے کم کردیئے،

یحیٰی بن آدم (سنہ ۲۰۳ھ) نے اپنی تصنیف کتاب الخراج مین جو ابھی حال مین چھپی ہے، لکھا ہے کہ حسن (شاید حسن بن صالح) کا قول تھا کہ جن لوگون پر حضرت عمرؓ نے ۴۸، ۲۴، ۱۲ کے شرح سے جزیہ مقرر کیا تھا، اُن پر اُس سے زیادہ نہ مقرر ہونا چاہئے، اور ان مین سے جو ادا نہ کرسکتا ہو اُس کے جزیہ مین تخفیف کردی جائے، کیونکہ حضرت عمرؓ یہ بھی فرماتے تھے کہ اُن کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے،[۵۲]

۵۔ مسلمانون مین جو صاحبِ نصاب ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہوسکتا، لیکن غیرمسلم خدمات کے صلہ مین نقد رقم جزیہ سے مستثنیٰ ہوسکتے ہین، چنانچہ عراق، آذربائیجان، آرمینیہ، جرجان کے فتوحات کے سلسلہ مین طبری نے حضرت عمرؓ کے فرامین اس مضمون کے متعلق نقل کئے ہین (واقعات سنہ ۱۷ھ و سنہ ۲۲ہجری)

۶۔ اگر کوئی اسلامی ملک دشمن کے نرغہ مین ہو تو مسلم رعایا کا محصول (زکوٰۃ) واپس نہین کیا جاتا، لیکن غیرمسلم رعایا کا جزیہ واپس کردیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابوعبیدہؓ نے شام کے تمام عمال سے نہ صرف جزیہ بلکہ خراج تک واپس کرادیا تھا،[۵۳]

۷۔ زکوٰۃ مسلمان عورتون اور بوڑھون بلکہ یتیم بچّون سے بھی وصول کیجاتی تھی، لیکن جزیہ غیرمسلم بچّون، عورتون اور بوڑھون سے نہین لیا جاتا تھا،

---

۵۱ کتاب الخراج امام ابویوسف ص ۴۲ ۵۲ کتاب الخراج یحیٰی بن آدم قرشی ص ۲۳،

۵۳ کتاب الخراج امام ابویوسف ص ۸۱،

۸- زکوٰۃ مسلمانون کے مختلف ذرائع آمدنی سے وصول کی جاتی تھی، لیکن جزیہ کی یہ حالت نہ تھی،

۹- روپیہ کی تعداد زیادہ ہونے سے زکوٰۃ کی رقم بڑھتی جاتی ہے لیکن جزیہ بڑے سے بڑے مالدار شخص کو بھی ۴۸ درہم سالانہ سے زیادہ نہین ادا کرنا پڑتا، رقم جزیہ کی زیادتی کے شاکی، اور غیر مسلم رعایا کی اقتصادی حالت کے مرثیہ خوان سر جدوناتھ سرکار کو حساب لگا کر دیکھنا چاہئے تھا کہ ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم پر محصول کا بار کس تناسب سے پڑتا تھا ؟

۱۰- زکوٰۃ کا نصاب متعین ہے لیکن جزیہ کی کوئی شرح متعین نہین، اسی لئے اس مین فقہاء مختلف الرائے ہین، جزیہ کا تقرر دو طرح پر ہوتا ہے، صلح سے کوئی رقم طے ہوجائے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے اور نجران کے عیسائیون سے جزیہ طے فرمایا تھا، ایسے جزیہ کی رقم پر اضافہ نہین ہوسکتا،

غلبہ کے بعد بادشاہ جزیہ مقرر کرے، اس مین بادشاہ کو کمی بیشی کا اختیار ہوتا ہے، احکام القرآن مصنفہ امام ابو بکر احمد بن علی رازی، الجصاص (۳۷۰ھ)، اور رمز الحقائق شرح کنز مصنفہ قاضی بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی (۸۵۵ھ) وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جزیہ کی رقم متعین کرنے مین فقہا نے اختلاف کیا ہے، حنفیہ اور حسن بن صالح ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ایک دو اور چار درہم ماہوار مقرر کرتے ہین، جو حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے ثابت ہے، امام مالکؒ کے نزدیک ہر بالغ پر چار دینار یا ۴۰ درہم ہین، امام شافعیؒ ایک دینار فی کس تجویز فرماتے ہین، اور امام احمدؒ تشخیص کا کام بادشاہ پر چھوڑتے ہین[۵]،

ان رعایتون اور خصوصیتون کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی ذی عقل جزیہ کو غیر ضروری "ٹیکس" خیال نہین کرسکتا،

جزیہ کی حیثیت | جیسا کہ اوپر کے عنوان سے معلوم ہوا ہوگا، جزیہ کی حیثیت محض سیاسی تھی، یعنی اس کو

---

[۵] احکام القرآن ج ۳ ص ۹۲ و رمز الحقائق ج ۱ ص ۳۲۰،

مذہب سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، اب یہ دیکھنا ہو کہ اس کے تعین کا باعث کیا تھا؟ کس مقصد کو سامنے رکھکر اس کی تشخیص ہوئی؟ اور اس کو کس چیز کا معاوضہ یا بدل قرار دیا گیا؟ اس مین علمار کے متعدد اقوال ہین،

جزیہ جان کا محصول ہی مبسوط وغیرہ مین بعض علمار کے جو اقوال نقل کئے گئے ہین، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ جان کا معاوضہ ہی کیونکہ غیر مسلم جزیہ قبول کرکے قتل سے محفوظ رہتے ہین یہ وہی خیال ہی جس کی بنیاد پر لین پول نے مڈیول انڈیا مین اور جدو ناتھ سرکار نے تاریخ عالمگیر مین جزیہ کو (ص ۵۰ ہدایت ۱۱۲) کہا ہو لیکن درحقیقت اس خیال کی کوئی اصل نہین شمس الائمہ سرخسی نے اس کو نقل کرکے خود تردید فرمائی ہے، وہ لکھتے ہین،

ثبوت الحقن لیس بالمال، بل بانعدام علۃ الاباحۃ وھو القتال،	قتل سے محفوظ رہنا مال کی وجہ سے ثابت نہین ہوا، بلکہ (خون) مباح ہونے کی علت یعنی لڑائی کے نہ ہونے کی وجہ سے (ثابت) ہوا ہے،
(مبسوط ص ج ۱۰)	

دوسری جگہ فرماتے ہین،

ولا ھو بدل عن حقن الدم، لان الآدمی فی الاصل محقون الدم، والاباحۃ بعارض القتال فاذا زال ذالك بعقد الذمۃ عاد الحقن	اور نہ وہ (محصول) حفاظتِ خون کا بدلہ ہے کیونکہ آدمی درحقیقت خون (جان) کے لحاظ سے محفوظ پیدا کیا گیا ہے یعنی اوس کو مارنے کا کسی کو حق نہین) اور (خون کا) مباح ہونا لڑائی پیش آنے کے سبب سے ہوتا ہے پس

الاصلی۔ جب یہ عارض (لڑائی) ذمہ کے معاہدہ
(صفحہ ۸ ج ۱۰) کے سبب سے دور ہو جائے، تو حقِ اصلی (جان
کے محفوظ رہنے کا اصلی حق) واپس آجائیگا

جزیہ جان و مال کا محصول ہے؟ یہ خیال بہت قدیم ہو کہ جزیہ جان و مال کا محصول ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ جان اور مال سے سلطنت کی امداد کرنے کے بجائے اس کو ایک خاص محصول رعایا ادا کرتی ہے، اور حفاظت کا کام فوج کے متعلق ہو جاتا ہے، منوشاستر (باب ۸، دفعہ ۳۴) سے ہندوستانیون کا، اور نوشیروان کے فرمان (مندرجہ طبری ص ۹۶۰ - ۹۶۱ ج ۲) سے ایرانیون کا جزیہ کے متعلق یہی خیال معلوم ہوتا ہے، مسلمانون مین قرن اول کے بعض حضرات مثلاً حضرت ابو عبیدہؓ وغیرہ نے اور فقہار مین مرغینانی (۵۹۳ھ) نے ہدایہ مین اور ابن نجیم (۹۷۰ھ) نے البحر الرائق مین اس کو ظاہر کیا ہے کہ غیر مسلمون کا جزیہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا محصول ہے،

تعجب ہو کہ سر جدو ناتھ سرکار اس کو جدید خیال کہتے ہین[1] اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہین کہ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) تک جزیہ خود ٹرکی مین مذہبی آزادی کا محصول سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد فوجی خدمت سے آزادی کا معاوضہ قرار پایا، لیکن اُن کو معلوم نہین کہ جس جدید مصنف (غالباً علامہ شبلی مرحوم) کی طرف وہ اس نظریہ کو منسوب کر رہے ہین، اس سے بہت پیشتر پہلی صدی ہجری مین خود صحابہ کرام اور چھٹی صدی ہجری کے بعض مشہور فقہار کا یہی نظریہ معلوم ہوتا ہے، رہا مذہبی آزادی کا معاوضہ ہونا تو یہ اکثر فقہار کا جزیہ کے متعلق خیال نہین ہے، اور نہ اس کو کوئی خاص وقعت علمی طور دی گئی ہے،

جزیہ کفر کا محصول ہو؟ امام ابو بکر جصاص (۳۷۰ھ) نے احکام القرآن مین قاضی ابو بکر محمد بن عبداللہ

[1] تاریخ عالمگیر حاشیہ ص ۲۷۴ ج ۳،

معافری اندلسی (م ۵۴۳ھ) نے جو "ابن العربی" کے نام سے مشہور ہیں، احکام القرآن میں، مرغینانی (م ۵۹۳ھ) نے ہدایہ میں، حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی (م ۷۱۰ھ) نے مدارک التنزیل میں یہی نقل کیا ہے کہ جزیہ کفر کا محصول تھا، یا بالفاظ دیگر مذہبی آزادی کا معاوضہ تھا، لیکن اس کا ثبوت قرآن مجید یا حدیث سے نہیں مل سکتا،

جزیہ مکان کا محصول ہے

شمس الائمہ سرخسی ۴۸۳ھ نے مبسوط میں، اور محمد بن احمد شربینی خطیب (موجود ۹۶۸ھ) نے تفسیر سراج المنیر میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جزیہ سکونت کا معاوضہ ہے، اس طرح اس کی حیثیت کرایۂ مکان یا محصول مکان (House-Tax) کی ہے، مبسوط میں اس کو بعض کا قول لکھکر اس طرح تشریح کی گئی ہے،

قد قیل انہ بدل من السّکنیٰ	بعض نے کہا ہے کہ وہ (جزیہ) سکونت
لانّہ مع الاصرار علی الکفر	کا بدلہ ہے، کیونکہ وہ (ذمی) کفر پر قائم رہ
لا یکون من اھل دار الاسلام	کر دار الاسلام کے (اصلی) باشندوں میں
اصلاً ولا یمکن من السّکنیٰ	کبھی شامل نہیں ہو سکتا، اور دوسرے
فی دار الغیر الا بکراء،	کے گھر میں سکونت کرایہ کے بغیر ممکن
(صفحہ ، ج ۱۰)	نہیں،

پھر آگے چل کر اس خیال کی تردید کرتے ہیں،

لانّہ بعقد الذمّۃ صار من اھل	کیونکہ وہ ذمہ کا معاہدہ کرکے ہمارے گھر
دارنا، فانّما لیسکن دار نفسہ	والوں میں سے ہوگیا، تو وہ اپنے گھر میں
ولا یسکن ملکہ نفسہ حقیقۃ	رہتا ہے، البتہ اپنی ملکیت میں در اصل
وقولنا دار الاسلام نسبۃ	نہیں رہتا، (کیونکہ اب اصلی ملکیت اسلام

للولایۃ، کی ہوگئی ہے،) اور ہمارا قول دار الاسلام

(صفحہ ج ۱۰) ولایت (تولیت) کی نسبت کے سبب ہے،"

اس تردید کے الفاظ پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ امام سرخسی غیر مسلم آبادی کو اس سے بلند سمجھتے ہیں کہ اس کو سلطنت اسلام کا کرایہ دار فرض کریں،

جزیہ امن کا محصول ہے

امام ابوحیان غرناطی اثیر الدین ابوعبد اللہ محمد بن یوسف جیانی (م ۷۴۵ھ) نے تفسیر البحر المحیط میں لکھا ہے کہ جزیہ امن کا معاوضہ ہے،

جزیہ کسی چیز کا محصول نہیں بلکہ مالی امداد ہے

ان نظریات کے نقل کرنے کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچے ہیں، جہاں دراصل غیر مسلم رعایا کی صحیح منزلت اور جزیہ کی اصل حقیقت نظر آتی ہے شمس الائمہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) جنھوں نے ۳۰ جلدوں میں المبسوط لکھی ہے، جو فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں سب سے بڑی کتاب ہے، جزیہ کے متعلق یہ خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا محصول نہیں ہے، بلکہ مالی امداد ہے' ان کے الفاظ یہ ہیں،

لان الجزیۃ صلۃ مالیۃ (ص ج ۱۰) کیونکہ جزیہ مالی امداد ہے،

دوسری جگہ لکھتے ہیں،

فاذا ثبت انّہ لیس بعوض عن شیٔ عرفنا انّہ صلۃ، (ص ۸۲) جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ (جزیہ کا مال) کسی چیز کا عوض نہیں، تو ہم نے سمجھا کہ وہ (مال) صلہ ہے،

ان الفاظ کو پڑھو اور بار بار پڑھو کیا یہ وہی جزیہ ہے جس کو یورپ اور ہندوستان کے غیر مسلم حد درجہ ذلت آمیز اور نفرت انگیز خیال کرتے ہیں، اور جس کو باعث ان کے دلوں میں اسلامی سلطنتوں کی طرف سے بغض و عناد بھرا ہوا ہے، محکوم قوموں کے محصول کا مالی امداد نام رکھنا فاتح و مفتوح کی

اس مساویانہ حیثیت کو نمایان کرتا ہو جس کی نظیر خود اعتراض کرنے والون کی قومی تاریخون مین بھی نہین مل سکتی،

جزیہ ایک خاص عطیہ ہو، شمس الائمہ سرخسی کا نظریہ بیان کرنے کے سلسلہ مین اب یہ دکھانا ضروری ہوگیا ہو کہ مشرق کی طرح مغرب بھی غیر مسلمون کا اسی فراخ دلی سے خیر مقدم کرتا تھا، اور سلطنتِ اسلامیہ کے پورے طول و عرض سے جزیہ کے متعلق ایک ہی آواز آتی تھی، ابن العربی اندلسی قاضی ابو بکر معافری (۵۴۳ھ) نے جزیہ کو ایک مخصوص عطیہ لکھا ہے، جس سے ان شریفانہ جذبات کا پتہ چلتا ہے، جو غیر مسلم رعایا کے احترام کے متعلق اسلامی قانون سازون اور قانون دانون کے دلون مین موجود تھے، اور جنھون نے فقہ (قانون) کی کتابون مین جگہ پاکر علمی حیثیت اختیار کرلی تھی، کیا وہ محصول جو "مالی امداد" ہو "عطیۂ خاص" ہو کسی شخص کی دل آزاری یا ذلت کا باعث ہو سکتا ہو؟ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است
گل است سعدی و در چشم دشمنان خار است

جزیہ نشان فرمانبرداری ہو اس حد تک لکھنے کے بعد اب یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ جزیہ فرمان بردار رعایا ہونے کی ایک علامت ہے، آج بھی جو رعایا محصول ادا نہین کرتی، باغی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے زمانہ مین جو لوگ جزیہ نہین دیتے تھے، حربی (جنگجو) سمجھے جاتے تھے، اور جزیہ ادا کرنے والے سلطنت کے مطیع اور فرمانبردار متصور ہوتے تھے شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہین،

لان الذمی ملتزم احکام الاسلام فیما یرجع الی المعاملات،	کیونکہ ذمی اسلام کے ان احکام کا پابند ہوتا ہے، جو معاملات سے متعلق ہین،

(مبسوط ص ۸۴ ج ۱۰)

(باقی)

تاریخ بابل

سلسلۂ اعلام القرآن

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

"مولانا ابو الجلال صاحب ندوی اعلام القرآن کے نام سے جو کتاب لکھ رہے تھے، افسوس ہے کہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے لیکن اس کے متفرق اجزاء لکھ گئے ہیں، ان میں سے بعض معارف میں شائع بھی ہو چکے ہیں جن کو اہل علم نے بہت پسند کیا، اور ان کو جاری رکھنے کی فرمائش کی اس لئے وقتاً فوقتاً اس کے مختلف ٹکڑے ہم شائع کرتے رہیں گے، م"

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں میں سے ایک کا نام احیا و تھا، سفر ملوک میں اسی کو نبی بتایا گیا ہے، حضرت سلیمانؑ کی زندگی ہی میں اس نے ان کے ایک نوکر کو حضرت سلیمانؑ سے ان پر کفر و شرک کا الزام لگا کر بھکایا، کہ ان کے خلاف بغاوت کر دو، یربعام نے بغاوت کی، ناکام ہو کر مصر بھاگ گیا، ان کی وفات کے بعد وہ مصر سے واپس آیا اور بنی اسرائیل کے دس قبیلوں کو یربعام نے خاندان سلیمان سے توڑ لیا، ۵ برس بعد فرعون مصر شیشق نے یروشلم پر چڑھائی کی، اور اس کو لوٹ مار کر چلا گیا، اس سے یربعام کی حکومت مستحکم ہو گئی، کچھ عرصہ بعد یربعام نے اپنے زیر اثر بنو اسرائیل کو بھکا کر بچھڑے دین سامری کو رواج دیا اور بنو اسرائیل کا یہ طبقہ بچھڑا پوجنے لگا،

یہ واقعہ سفر ملوک نمبر ۱ (۱۵: ۲۹، ۴۰، و ۱۲: ۲۰-، ۱۳، و ۲۵) اور سفر ۲ باب میں بہ تشریح مذکور ہے،

عرب کے اندر آغاز اسلام میں ایسے بنی اسرائیل بھی تھے، جو حضرت سلیمانؑ کی بابت اخبار کے فتوی پر ایمان رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتراض کرتے ہوئے اخبار کو نبی ماننے والے چند اہل کتاب نے کوئی ایسی بات کہی جس کے جواب میں خدا نے فرمایا،

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَى مُلْكِ سُلَيْمَانَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ، (بقرہ ۱۲: ۵-۶)	اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے، ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا، جیسے گویا اصلا علم ہی نہیں اور انھوں نے ایسی چیز کا اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، مگر شیاطین کفر کیا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے، اور اس کا بھی جو ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا،

حضرت سلیمان کے حالات سفر ملوک اور سفر ایام کے مؤلفوں نے ناتن نبی (؟) کی کتاب اور سیلانی

اخیاء کی پیشین گوئیون اور عبدوینی کی روایتون کی کتاب سے نقل کئے ہین' (سفر ایام ۹ - ۲۹) یہ کتابین اب ناپید ہین، حضرت سلیمانؑ پر اہل کتاب کے کفر کا فتوی دراصل سیلانی اخیاء کی کتاب کا اعادہ تھا، یہ کتاب نزول قرآن کے زمانہ تک موجود تھی، اور کلام اللہ سمجھ کر اس کی تلاوت کی جاتی تھی، اسی کتاب کا ذکر قرآن کی اس آیت مین ماتتلوا الشیاطین کے لقب سے آیا ہے، اس آیت مین خدا نے بتایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نہین بلکہ اُن پر کفر کا فتوی لگانے والے شیاطین خود کافر تھے، اُن کے کافر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو سحر کی اور ہاروت اور ماروت کے منتر یعنی سحر کی تعلیم دیتے تھے،

ہاروت اور ماروت کی حیثیتون (اور ان کے منتر یعنی سحر) کا یہ محل نہین ہے، یہ فرشتے کہلانے والے اشخاص بابل کے باشندے تھے،

وجہ تسمیہ | بابل کو یہ نام کیون دیا گیا؟ اس سوال کے جواب مختلف دیئے گئے ہین، یاقوت نے معجم البلدان مین لکھا ہے،

قال ابو المنذر ہشام بن محمد	ابو المنذر ہشام بن محمد نے کہا کہ......
......ومدینۃ بابل بناھا بیوراسب	بابل کا بانی بیوراسب جبار تھا، بابل کی
الجبار واشتق اسمھا من اسم المشتری	پرانی زبان مین مشتری کو بابل کہتے تھے
لان بابل باللسان البابلی الاول اسم	اسی کے نام سے یہ شہر موسوم ہوا،

([illegible])

بانی بابل کا نام بیوراسپ غالباً ایران کی کہانیون سے ماخوذ ہے، پرانی کلدانی مین بابل مشتری کو کہتے تھے یا نہین اس کا ہم کوئی فیصلہ نہین کرسکتے، یہ بات یاقوت نے تذکرہ بابل مین کہی ہے' فسطاط مصر کا ایک زمانہ مین کسی وجہ سے بابلیون نام تھا، بابلیون کے ذکر مین یاقوت نے لکھا ہے،

ذکر اھل التوراۃ ان مقام آدم	اہل توراۃ کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام
علیہ السلام کان ببابل فلما قتل	بابل مین رہتے تھے جب قابیل نے ہابیل

قابیل ھابیل مقت آدم قابیل — کو قتل کیا تو آدم علیہ السلام قابیل سے

فھرب قابیل باھلہ الی الجبال — نفرت کرنے لگے، اور قابیل پہاڑون کی

عن ارض بابل فسمیت بابل یعنی — طرف بھاگ گیا، اس لئے اس کا نام بابل

الفرقہ — یعنی "جدائی" رکھا گیا،

معلوم نہین اہل تورات کا یہ قول یاقوت نے کہان سے نقل کیا، سفر تکوین مین یہ ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم کے اسلاف اس دیار مین قدم سے آئے، اُن کے یہان آنے سے پہلے

وھی کل ارض شفتیم احد یعر — ساری زمین ایک ہونٹھ اور ایک

دوبریو احدیھو، — بولی تھی،

یہان پہنچنے کے بعد ان لوگون نے ایک برج بنانا چاہا، خدا کو یہ ارادہ ناگوار گذرا، اس لئے خداوند نے ان کی بولی بات مین اختلاف ڈال کر ان کو تمام روے زمین مین پراگندہ کیا، سو وے اس شہر کے بنانے سے باز رہے" یہ واقعہ نقل کرکے سفر تکوین کے جامع نے لکھا ہے، کہ

"اس لئے اس کا نام بابل (اختلاف) پڑا کیونکہ خداوند نے وہان ساری زمین مین کی زبانون مین اختلاف (ببل) ڈالا، اور وہان سے اُن کو تمام روے زمین پر پراگندہ کیا، (تکوین ۱۱: ۱ تا ۹)

یاقوت نے ابوبکر احمد بن مروان المالکی الدینوری کی کتاب المجالس کے حوالہ سے تقریباً یہی قصہ حضرت انس بن مالکؓ کی طرف منسوب کیا ہے، جس مین انھون نے اخیر مین فرمایا ہے کہ پھر لوگ بہتر زبانین بولنے لگے،

وتبلبلت الالسن فسمیت — اور زبانین گڈمڈ ہو گئین، اس لئے اس

بابل، — کا بابل نام پڑا،

کسی عمارت کی تعمیر اختلاف السنہ کا سبب نہیں ہو سکتی، جس عمارت کی تعمیر کے عزم کا توراۃ مین ذکر ہے، اور بتایا گیا ہے کہ بولی بات مین اختلاف کی بدولت وہ اس عمارت اور شہر کی تعمیر سے باز رہے، بعد مین ان لوگون مین جو بہین رہ گئے، اسے بنایا، اس عمارت کا نام سمیری زبان مین تنز کی کادنجر (دیوتا کا آستانہ) تھا، اسی کا ترجمہ یہان کے سامی باشندون نے باب ایل (خدا کا پھاٹک) اور باب ایلون (خداؤن کا پھاٹک) کیا، جو مختصر ہو کر بابل ہوگیا، یہ پہلے اسی برج کا نام تھا، جسے تورانی بیان کے مطابق تعمیر کرنے کے عزم کی بنا پر خدانے وہان والون کی بولی بات مین اختلاف ڈالا، پھر بتدریج یہ نام اس شہر کا جس مین یہ عمارت تھی، اور اس کے بعد اس پورے علاقہ کا نام ہوگیا، جس پر شاہان شہر بابل حکومت کرتے تھے، توراۃ مین جس قسم کی بولی بات کے اتحاد اور اختلاف کا ذکر ہے، وہ مذہبی کلمہ کا اتحاد اور مذہبی کلمہ کا اختلاف ہے، اس بولی بات کے اختلاف کی نظیر بابل کے دو بادشاہون کے نامون مین ملتی ہے؛

ایک شاہ بابل کا نام تھا سامو ابی یعنی میرا باپ سام ہے، اس نام مین کوئی بات ایسی ہی جس سے ایسے نام خدا کو ناپسند تھے، چنانچہ توراۃ کے بیان کے موجب حضرت ابراہیمؑ کا نام جو اُن کے باپ نے رکھا تھا، وہ ابی رام تھا، (میرا باپ رام ہے) خدانے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ یہ نام بدل دو، اور آج سے تمھارا نام ابی رام نہین، بلکہ ابراہام ہوگا، حضرت ابراہیمؑ کا نام جس سبب سے خدا نے بدلوایا، اس کو سمجھنے کے لئے حضرت یرمیاہ کے صحیفہ مین خدا کا ارشاد پڑھو،

"جس طرح چور جب پکڑ لیا جاتا ہے رسوا ہوتا ہے، اسی طرح اسرائیل کا گھرانا اور ان کے بادشاہ اور امیر اور کاہن اور جھوٹے موت کے نبی رسوا ہونگے، جو کاٹھ سے کہتے ہین کہ تو میرا باپ ہے، پتھر سے کہ تو نے مجھے جنا ہے، انھون نے میری طرف رُخ نہین بلکہ پشت پھیر رکھی ہے مگر مصیبت کے وقت کہیں گے اُٹھ اور ہمین بچا (یرمیاہ ۲: ۲۶، ۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ابی رام اور ساموابی جیسے نام رکھنے کا مطلب اس عقیدہ کا اعلان تھا کہ راموایلو (رام ایک خدا ہے) اور ساموایلو (سام ایک خدا ہے) اب ساموابی کے نام کا مطلب سمجھنے کے بعد اس کے ایک جانشین کا نام سنو، سامولوایلو (سام خدا نہین ہے) اس قسم کے بہت سے نام باشندگان بابل کے پیش کئے جاسکتے ہین مثلاً بل بانی (بعل خالق ہے) اور یا بنی (یا خالق ہے) ان نامون سے ظاہر ہے کہ بابل مین جاکر بسنے کے بعد وہان والون مین جس قسم کا اختلاف اُن کی بولی بات مین پڑا تھا، وہ مذہبی اختلاف تھا، اور اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے بابل کو باب ایل نہ ماننے والون نے اسے بدل کر بیل بنادیا، اور اب اس نام کے معنی طرح طرح کی بولی بولنا ہوگئے، بابل کی توراتی وجہ تسمیہ کو جدید تحقیقات کی روشنی مین غلط نہین کہنا چاہیے، بلکہ اسے ترمیم اسم کی وجہ قرار دینا چاہیے، بابل کے مندر کو باب ایل تسلیم کرنا سفر تکوین کے جامع کے لئے ناممکن تھا اسلئے اختلاف کلمات کے مطالب کو ملحوظ رکھتے ہوے اس شہر کے نام مین ترمیم کردی گئی،

محل وقوع | بابل عراق کے ایک شہر کا نام ہے، عراق دریاے دجلہ وفرات کی درمیانی وادی کا نام ہے، عرب کے نقشہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ طول بلد ۴۸، و ۵۰ اور عرض بلد ۳۰ تک خلیج فارس، ایران وعرب کے درمیان گھسی ہوئی ہے جس مین دریاے دجلہ وفرات گرتے ہین، جو واسط کے پاس پہنچکر ایک ہو جاتے ہین، واسط سے شمال کی جانب طول بلد ۴۵ اور عرض بلد ۳۲ کے پاس فرات کے مغربی کنارہ پر ایک مقام واقع ہے، جو تل نمرود کہلاتا ہے، اسی مقام کا نام بابل تھا، جسے عرصہ دراز کی بول چال نے دوآبہ دجلہ وفرات کے ثلث زیرین کا نام بنا دیا تھا،

باشندگان بابل | بابل کی وجہ تسمیہ مین ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہی مقام آدم کا ابتدائی مسکن تھا جہان سے قابیل جبل نود کو بھاگا تھا، یہ قول قابل استناد نہین ہے، یاقوت نے لکھا ہے،

ویقال ان اوّل من سکنہا نوح　　　اور کہا جاتا ہے کہ بابل مین سب سے پہلے

علیہ السلام و ھو اول من — حضرت نوح آباد ہوئے، اور یہان وہ
عمرھا وکان نزلھا بعقب الطوفان — طوفان کے بعد آئے،

قرآن مجید کے بیان کے مطابق جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی، اس کا نام جودی ہے، اور توراتی نام اس پہاڑ کا ارارا ط ہے، آشوری روایات کے مطابق اس پہاڑ کا نام نسر تھا، (دیکھو بحث جودی) حضرت نوحؑ اور اُن کے اصحاب کشتی اسی پہاڑ کے آس پاس بسے ہونگے، یہ آرمینیہ مین واقع ہے، حضرت نوحؑ کا بابل مین آباد ہونا مشکل سے یقین کیا جاتا ہے، مگر آشوری افسانۂ ازدوبار مین جس کا تذکرہ قصۂ نوح مین کیا گیا ہے، طوفان سے پیشتر حضرت نوحؑ کا آشوری نام تاپیت ناپشتم (سشیت کامل) تھا، شہر شدپاک کے باشندے اور اُبارا توتو (قوم اُبار) کے فرزند تھے، یہ شہر خود اس افسانہ کے مطابق "ساحل فرات" پر واقع تھا، غالبًا اسی روایت نے بعد مین یہ صورت اختیار کر لی کہ حضرت نوح کا مسکن بعد طوفان بابل مین تھا، توراۃ کے بیان کے مطابق بنی نوح جو اس دیار مین بسے یہان کے قدیم باشندے نہین تھے، بلکہ وہ اس دیار مین قدم سے آئے،

"اور جب وے قدم سے روانہ ہوئے، تو ایسا ہوا کہ انھون نے سنعار کے ملک مین ایک میدان پایا، اور وہین رہ پڑے، (تکوین ۱۱: ۲)

اسی ملک سنعار کے اس حصہ کا جس مین بنی نوح یا بالفاظ دیگر اسلاف ابراہیم علیہ السلام آباد ہوئے، دوسرا نام بابل ہے: (تکوین ۱۱: ۹)

توراۃ کی اس آیت مین میدان کی بجائے اصل عبرانی لفظ "قاعہ" ہے، "قاعہ" چٹیل میدان کو کہتے ہین، جہان نہ آدم ہو نہ آدم زاد، اور وہان نہ درخت ہو اور نہ کوئی اور سایہ دار چیز، بنی نوح یا اسلاف ابراہیم علیہ السلام یہان ایسے زمانہ مین آئے جب یہ علاقہ غیر آباد تھا،

حضرت ابراہیم کے اسلاف مین ایسے افراد بہت گذرے ہین، جو اپنے نام "ساموابی" جیسے رکھتے

تھے، اس لئے وہ بنو سام کہلائے، ان لوگوں کے یہاں آنے کے بعد لیکن اُن کے برسر عروج آنے سے پہلے ایک اور قوم اس دیار میں آبسی جس کی زبان اور طرز زندگی کے علاوہ صورت شکل بھی مختلف تھی، آثار باقیہ کے علمار نے اس قوم کو سمیریون کا نام دیا ہے، سفر تکوین کا جامع اور اس کے اتباع میں بعد کے عرب مورخین تمام اقوام عالم کو حضرت نوحؑ کے تین بیٹون کی اولاد بتاتے ہین جن مین سے ایک تو بنو سام کا مورث تھا سام، ایک بیٹے کا نام حام تھا، دراصل یہ نام مصری لفظ خم کی عبرانی صورت ہے، خم سرزمین مصر کا نام تھا کیونکہ وہان کی زمین سیاہ ہے، اور خم کے معنی ہین کالی مٹی، رفتہ رفتہ یہ اہل مصر اور ان کے ہم نسلون کے مورث اعلیٰ کا نام ہوگیا، تورات کے بیان کے مطابق بنو حام بھی ابتدا مین سرزمین بابل مین رہتے تھے، پھر مصر وغیرہ مین جا بسے' تیسری قوم کا تورانی نام بنو یافث ہے، یہ بھی ابتدا مین بابل مین رہتے تھے، ان بابلی بنو یافث کو ہم آثار قدیمہ کی سمیری قوم سے تطبیق دے سکتے ہین

حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ شنعار مین جو کہ بعد مین ارض بابل یا کلدانیون کی سرزمین کہلایا، ابتدا مین تین قومین آباد تھین (۱) بنو یافث (۲) بنو حام، (۳) بنو سام

لیکن بابلی آثار قدیمہ کے علمار اس علاقہ کی دو ہی قومون کو جانتے ہین جن مین سے ایک سومیری قوم تھی اور ایک سامری لیکن توراۃ کے بیان کو بالکل بے اصل نہین کہا جا سکتا،

اور کی حکومت کے قیام سے پہلے کش نام ایک شہر مین مسیلم نام ایک فرمانروا تھا جس کے جانشینون کا راج عروج و زوال کے ساتھ سنہ ۴۲۰۰ سے سنہ ۳۱۰۰ ق م تک قائم رہا، یہ خاندان سامی النسل تھا، قائم سنہ ۴۵۰۰ سنہ ۲۱۰۰ ق م تک شہر سپرلا نام ایک شہر مین جس کو جد سو، تن جہ سو، اور سنجر بھی کہا جاتا تھا، ایک بادشاہ اور کا جتا اور اس کے جانشین راج کرتے رہے، ان بادشاہون کو سمیرین قوم سے بتایا گیا ہے، مسلم کے برسر عروج آنے سے پہلے سنہ ۵۰۰۰ ق م مین ایک شاہ گنجی گذرا ہے، جس نے مسلم کے پیش رو حکام کش کو شکست دی یہان کا مال غنیمت آثار قدیمہ کی شہادت کے مطابق "زمینون کے خداوند ایل" کی

خدمت میں نذر پیش کیا تھا، اس بادشاہ کی بابت ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ کی پہلی جلد کے مولف نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس یہ بتانے کے لئے مواد موجود نہیں ہے کہ وہ کس قوم سے تھا سامی تھا یا سمیری تھا،

لیکن اس کا نام تھا، ان تنگ کوش انا، جو چار لفظوں کا مجموعہ ہے،

(۱) تنگ یا سنگ = سردار (۲) انا = آسمان رتبہ (۳) ان = آقا، (۴) کوش = یہ نام تورانی کوش بن حام کے نام سے ملتا جلتا ہے، جس کے فرزند نمرود کی بابت توراۃ میں ہے، کہ

اس کی حکومت کی ابتدا شنعار کی سرزمین میں بابل، ارک، اکاد اور کلنہ میں ہوئی مگر پھر وہ اشور کو نکل گیا، اور نینوی کا احاب عبر اور کلح کو بنایا، اور نینوی اور کلح کے درمیان اس کی تعمیر کی، جو بڑا شہر ہے، (تکوین ۱۰: ۱۰ تا ۱۲)

چونکہ بنو حام بالکل ابتدائی زمانہ میں اس دیار سے نکل گئے تھے، اسلئے اُن کے نشانات یہان نہیں ملتے، مگر واقعہ یہ ہو کہ اس دیار میں پہلے تین قومین آباد تھین، ان تینوں کو سفر تکوین کے جامع نے حضرت نوح کی اولاد بتایا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ کہان تک درست ہو کہ تمام زبانین بولنے والی دنیا بھر کی تمام قومین حضرت نوح کی اولاد ہین،

بنو سام یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلاف اس دیار میں قدم سے آئے تھے، قدم کے لغوی معنی سامنے کے ہین، مصر والے مشرق کو قدم کہتے تھے، توراۃ پر مصری محاورہ کا اثر ہے، قدم توراۃ مین خصوصیت کے ساتھ عرب کا نام ہے دوآبہ فرات و خابور کے علاوہ پورے عرب کو بشمول آرمینیہ جہان دجلہ و فرات کے سرچشمے واقع ہین، توراۃ میں قدم کہا گیا ہے جس قوم کو سمیری کہا جاتا ہے ہمارے خیال مین اسی کا قرآنی نام یاجوج اور ماجوج ہے،

افسانوی تاریخ | قرآن مجید کی جس آیت میں بابل کا ذکر ہے نہ صرف اُس کے بلکہ قرآن مجید کے

اکثر قصوں کے فہم کے لئے ابتدا سے بنی اسرائیل کی اسیری بابل کے عہد تک دوآبہ دجلہ و فرات کی اجمال کے ساتھ پوری تاریخ دینا زیادہ مفید ہوگا، ہر قوم خصوصاً ایسی قوم کی تاریخ جس کا زمانہ عروج فن تحریر کی ایجاد سے پہلے گذرا ہو خلاف عقل کتھاؤں سے شروع ہوتی ہے، ان کتھاؤں میں زمانہ دراز کی بھول بھلیوں اور شاعروں کی بلند پروازیوں نے بہت مشکلات پیدا کر دی ہیں لیکن ہر پرانی کتھا اپنے اندر قدیم تاریخ کو چھپائے ہوئے ہے۔

اہل بابل کی ایک کتھا کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں دو ہستیاں تھیں جن کے نام ہیں اپسو اور تیامت، یہ دونوں میاں بی بی تھے۔ ان سے لخمو اور لخامو پیدا ہوئے، جو انشر اور کیشر کے والدین تھے، ان دونوں نے انو، بل اور ایا وغیرہ دیبی دیوتاؤں کو جنم دیا، ان دیبی دیوتاؤں سے ناراض ہو کر تیامت نے چند شریر ہستیوں کو چن کر اُن کا امیر کنگو کو مقرر کیا، اور کنگو کی فوج دیوتاؤں سے ان کی خدائی چھیننے کو چلی، اس کی خبر انشر کو ہوگئی، اس نے اپنے ایلچی جاجا کو بھیج کر دیوتاؤں کو متنبہ کیا، چنانچہ مردوک اُن سے لڑنے کو اترا اور اس نے تیامت کو چیر کر دو حصے بنا دیئے جن سے آسمان اور زمین، پھر سیارے اور انسان وجود پذیر ہوئے، (ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ ج ا ص ۵۰۰)

اس افسانہ کے اندر قدیم تاریخ موجود ہے۔ قدیم زمانہ میں عرب کو خالدیہ والے ماتی تیامت، (ارض البحر) کہتے تھے، لخم عرب میں ایک خاص قسم کی مچھلی کو کہتے ہیں، اس لئے ماتی تیامت یعنی ارض البحر کے قدیم باشندے لخم کہلائے، یہ بنو لخم جب اس سرزمین میں پہنچے جس کا قرآنی نام بابل ہے، تو وہ انشر اور کیشر بن گئے یہاں انھوں نے انو، بل اور ایا وغیرہ بہت سے دیوتاؤں کو جنم دیا، اور وہ مشترک اور متعدد دیوتاؤں کے قائل ہوگئے، اس وقت کنگو نام ایک رئیس کے ماتحت تیامت یعنی ارض البحر کے رہنے والے ایک دوسرے گروہ نے دیوتاؤں کی خدائی سے محروم کرنے کی جد و جہد شروع کی، ان دونوں گروہوں میں جنگ ہوئی، ایک گروہ کا رئیس کنگو تھا، دوسرے کا مردوک، مردوک

کے گروہ مین ایک تیسرا گروہ بھی شامل تھا جس کا نام (Gaga) ہے یہ نام توراتی جوج کے نام سے ملتا جلتا ہی، جوج کا نام قرآن مین یاجوج اور آشوری کتبون مین اجی جی ملتا ہے، اس جنگ مین غلبہ اس گروہ کو ہوا، جس کو جوج کی تائید حاصل تھی، اور مردوک نے بھاٹہ کر تیامت کے دو حصے کر دئیے، ان مین ایک حصہ آسمان (سام) اور دوسرا حصہ زمین (حام) کے نام سے موسوم ہوا،

آخری تاریخ | یہ تاریخ اس زمانہ کی ہے، جب فن تحریر ایجاد نہین ہوا تھا، اس کی ایجاد کے بعد ہم کو اس دیار مین دو قومین ملتی ہین جن مین سے ایک کو آثار قدیمہ کے علماء نے سمیری قوم کا نام دیا ہے کیونکہ قدیم شاہان عراق جو شمالی اور جنوبی دونون حصون پر حکومت کرتے تھے، اپنے آپ کو "اکاو اور سومیر کا بادشاہ" کہتے تھے، اور دوسرے گروہ کو بنوسام نام دیا گیا ہے جن کی بولی عربی اور عبرانی وغیرہ بانون کے مطابق تھی،

انسانوی تاریخ مین سمیری قوم کا ذکر جاجا کے نام سے آیا ہے، جو توراۃ کا جوج اور قرآن کا یاجوج ہے اس زمانہ مین یہ قوم لخم اور کنجو کے مقابل غیر اہم تھی لیکن آخری زمانہ مین جو فن تحریر کی ایجاد کے بعد گذرا ہے ابتدا مین یہی قوم سب سے اہم تھی، اور سب سے پہلے اسی قوم نے اس دیار کے متعدد شہرون مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم کین، پھر کچھ عرصہ بعد سامی زبانین بولنے والون نے بھی حکومت اور اقتدار مین حصہ بٹانا شروع کیا، اسی زمانہ کی بابت توراۃ مین ہو کہ

"عابر سے دو فرزند پیدا ہوئے ان دو مین سے ایک کا نام فلج رکھا، کیونکہ اس کے زمانہ مین زمین بانٹی گئی، اور دوسرے کا نام یقطن رکھا گیا،

سب سے قدیم سامی بادشاہ جس نے ارض عراق مین اپنی حکومت قائم کی تھی، حال کی تحقیقات کے مطابق کش کا شہریار سیلم تھا، اس کا زمانہ اندازاً ۴۰۰۰ ق م قرار دیا جاتا ہے، اس کے جانشینون کی حکومت عروج و زوال کے ساتھ ۳۰۰۰ ق م تک قائم رہی، پھر پورے علاقہ ما بین دجلہ و فرات

پر ایک دوسرے سامی خانوادہ نے قبضہ کر لیا، جس کا مرکز حکومت اکاد تھا، اور اس خانوادہ کے بانی کا نام تھا،

شارجنی سارعلی بن اتی بل

اس کو آشوری روایتون کے مطابق سرجون اکبر بھی کہا جاتا ہے، یہ نام توراتی عابر کے پوتے سروج بن رعو کے نام سے ملتا جلتا ہے،

سرجون اکبر کے برسر عروج آنے سے پہلے ایک شہر سربرلامن پر جس کو جرسو، بن جرسو، اور سنجر بھی کہتے تھے، ایک سمیری خانوادہ حکومت کرتا تھا، جس کے قدیم ترین فرمانروا کا نام اور کاجنا ہے اس کی حکومت مسیلم سے تقریباً سو برس پہلے قائم ہوئی، اور سرجون اکبر کے زمانہ تک عروج وزوال کے ساتھ قائم تھی، سرجون اکبر کے پہلے اُور، اور گوئی نام دو شہرون مین دو اور حکومتین سومیریون کی تھین، خاندانِ سرجون کی حکومت ضعیف ہو جانے اور ابرخ، امی س، اور لارسا مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم ہوئین، ۲۰۴۰ ق م کے قریب ان تمام حکومتون کو ایک نئے خاندان نے جس کے بانی کا نام سامو ابی تھا، اور جس کا پایۂ تخت شہر بابل تھا ختم کر دیا، سوموابی کے خانوادہ کو عربی خاندان بتایا جاتا ہے،

اس طرح بابل مین یکے بعد دیگرے سات خانوادون نے ۶۲۵ ق م تک حکومت کی جن مین سے دوسرے خانوادہ کے گیارہ بادشاہون کے نام سومیریون کے سے ہین، اس خانوادہ کے خاتمہ (۱۸۵۰ ق م) کے بعد سے سمیری قوم بتدریج اس طرح نابود ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا سُراغ نہین ملتا،

۱۳۰۰ ق م کے قریب ملک اشور مین ایک اور سامی قوم نے اپنی عظمت ووقار کی بنیاد رکھی قرآن کریم مین قوم یونس کے نام سے اسی قوم کا ذکر آیا ہے، جس کے ایک بادشاہ تغلات پلاسر

(توکلتی اپلا اشور) نے ۶۲۰ء مین بابل کی حکومت کا خاتمہ کرکے اس علاقہ پر خود اپنا راج قائم کرلیا، لیکن ۶۰۶ء ق م کے بابل کے ایک اشوری گورنر نبو اپل اشور نے بابل مین ایک نئے خانوادہ کی بنیاد ڈالی جس کو ۵۳۸ھ ق م مین ایرانیون نے شکست دیکر اپنے ماتحت کرلیا،

یہ ہے بابل کے اس عہد تک کی مختصر تاریخ جس عہد کے بابل کا قرآن کریم مین ذکر آیا ہے،

نبو اپل اشور (نبو پلاسر) کے فرزند نبو کدرا وسر کا بائبل مین نبو کدصر کے نام سے ذکر آیا ہے، یہ نام نبو خد نصر پھر نبو خت نصر، پھر نبخت نصر ہو کر عربی تاریخون مین بخت نصر بن گیا ہے، اسی بخت نصر کے زمانہ کی تاریخ بنی اسرائیل کی طرف خدا نے سورۂ بنی اسرائیل کی پانچوین آیت مین اشارہ فرمایا ہے، نبو اسرائیل پر بخت نصر نے چڑھائی کی، اور بہتون کو گرفتار کرلیا اور لیجا کر بابل کی سرزمین میں انکو بسایا، ایرانیون کے زمانہ مین اُن کو وطن واپس آنے کی اجازت ملی، اسی اسیری بابل کے زمانہ مین نبو اسرائیل نے وہ چیز سیکھی جس کی بابت قرآن مجید مین ارشاد ہوا ہے کہ

يُعلمون النّاس السحر و مَا انزل على الملكين ببَابل هَارُوتَ وَ مارُوت،

اہل بابل کے دین و مذہب اور اُن کے طور طریقہ پر یاجوج و ماجوج، قوم ابراہیم، قوم یونس اور لفظ بنی اسرائیل کے تحت مشرح بحث کیجائے گی،

ارض القرآن حصہ اول

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے،

قیمت :- ۱ ؏ "منیجر"

فتاوی بابری

از

جناب شیخ فرید صاحب برہان پوری

دودمانِ گورگانیہ کے آخری جلیل القدر شہنشاہ حضرت محی الدین اورنگزیب عالمگیرؒ کے عہد کی بہترین علمی و مذہبی یادگار فتاویٰ عالمگیری محتاجِ تعارف نہیں، مقامِ حیرت ہے کہ اسی خاندان کے عظیم المرتبت فاتح، عدیم المثال سپاہی اور اولوالعزم بادشاہ ظہیر الدین بابر کے عہد کی فقہ حنفی کی ایک تصنیف فتاویٰ بابری کے ذکر سے تاریخ ادبیات فارسی کی معروف و معتبر کتب خالی ہیں[1]، اتفاق سے اس کا قلمی نسخہ مولانا سید احکام اللہ صاحب بخاری امام جامع مسجد، برہان پور کے ذخیرۂ مخطوطات میں راقم السطور کی نظر سے گذرا، اس مضمون میں اسی تاریخی تبرک کا تعارف مقصود ہے،

مصنف کتاب شیخ نور الدین خوافی کے حالات کتب متداولہ میں نہیں ملتے، نفائس المآثر میں مختصر حالات درج ہیں، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے میری درخواست پر متعلقہ حصہ نقل کر کے ارسال فرمایا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ شیخ زین الدین خوافی کی اولاد میں سے ہیں، سلطان حسین مرزا کے عہد میں انھوں نے ہرات میں نشو و نما پائی، شیخ الاسلام سیف الدین احمد

---

[1] معارف فتاویٰ بابری اگرچہ کمیاب ہے لیکن نایاب نہیں ہے، اور اس کے قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، پٹنہ لائبریری میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے اور اس کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں مصنف کے ساتھ تصنیف کے بھی مختصر حالات ہیں ملاحظہ ہو کیٹلاگ مخطوطات فارسی پٹنہ لائبریری، ج ۱۴ ص ۸۶)

کے شاگرد تھے، جو ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد مین سے تھے،

"از ابنا، حضرت شیخ زین خافی است، بہ غایت خوش طبع و فہم عالی داشتہ، شیخ نورالدین و شیخ زین بہ وفور کمالات ممتاز اند، ایشان در زمان سلطان حسین مرزا بہ ہرات نشو و نما یافتہ، بہ تحصیل فنون و فضائل کمال شتافتہ اند، شیخ نورالدین شاگرد شیخ الاسلام[۵۲] است کہ از ابنا، مولانا سعد الدین تفتازانی است"،

مرزا علاؤالدین قزوینی نفائس المآثر مین رقمطراز ہین کہ چودہ سال کی عمر مین سلطان حسین مرزا کے مدرسہ ہرات مین صغر سنی، جمال اور سادہ روئی کے باوجود مسند درس پر فائز ہوئے، دانش مندی اور مولویت مین وہ رتبہ اور استعداد بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے فاضل اُن کی مجالس افادات سے مستفید اور بہرہ مند ہوتے تھے،

"در صغر سن و عنفوان شباب رتبۂ مولویت و دانش مندی بجائے رسانیدہ کہ دانشمندان آن زمان از مجالس افادتش مستفید و بہرہ ور می بودند"،

"در زمان شاہی بیگ خان او را در چہاردہ سالگی باوجود سادہ روئی و جمال مدرس مدرسہ سلطان حسین مرزا ساختہ بودند"

شیخ مذکور کے کمال علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین :-

"بہ غایت جدت طبع و دقت ذہن در آوان شباب از تحصیل علوم عقلی و نقلی فراغت یافتہ، گوش ہوش تلامذہ از نتائج بحر خاطر فیض مآثر بہ لآلی نکات و دقیقہ گران بار گشت، و پایۂ قدر و منزلش در سلک زہد و تقوی و تجرد و فنون و علم فتوی از امثال و اقران درگذشتہ"

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بحث و مناظرہ مین شیخ موصوف کا پلہ اکثر بھاری رہتا تھا،

---

[۵۱] بابر کی مثنوی مبین کے شارح شیخ زین کے حالات بزم تیموریہ ص ۶۲ پر ملاحظہ کیجئے۔ [۵۲] بزم تیموریہ ص

"مثل ملایان عصر و ملا نورالدین مثل کشتی گیرے است کہ ہر یکے را بہ طریق خاص مغلوب می می سازد کہ ہرگز تصور آن نہ کردہ اند"،

نفائس المآثر مین ہے کہ شیخ نورالدین اور شیخ زین الدین ۹۲۲ھ مین قندھار آئے، اور حضرت فردوس مکانی بابر کی ملازمت اختیار کی،

"در سنہ ۹۲۲ھ (اثنیٰ وعشرین وتسعمایۃ) مجموع برادران بہ قندھار آمدہ بہ ملازمت حضرت فردوس مکانی رسیدہ"،

فتاویٰ بابری کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۲۵ھ کے آخر مین شیخ صاحب اپنے وطن سے روانہ ہوئے،

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بابر کی خدمت مین اُن کو باریابی کا شرف ۹۲۵ھ مین حاصل ہوا؟

دیباچہ کی سفر کی تاریخ اواخر خمس وعشرین وتسعمایۃ[۵] سے اگر آخری دو مہینہ مراد لئے جائین تو اس زمانہ کی طوائف الملوکی، خوافات، ہرات سے قندھار تک بُعدِ سفر کی مشکلات، راستہ کی دشواریون اور ان موانع اور قوانسہ کے پیش نظر جن سے استخلاص شیخ کو دشوار اور مہلک نظر آرہا تھا، بابر کے دربار سے شیخ کے توسل کا زمانہ ذی الحجہ ۹۲۵ھ یا محرم ۹۲۶ھ ہوگا،

شیخ بذلہ سنج اور خوش طبع بھی تھے، صاحب نفائس المآثر نے ان کی خوش طبعی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے،

"مولانا زلالی شاعر کہ یکے از خوش طبعان است و معمائی بودہ بجہت آن کہ سبز چہرہ بود او را بہ نملاے نسبت می کردہ اند، در سر چاہ ہری (مقام) بہ شیخ نورالدین رسید و احوال پرسیدہ از پریشانی حال خود شکایت کردہ گفتہ اند کہ بخانۂ ابناے روزگار می روید و حکایات بلا فائدہ

---

[۵] دیباچہ ملاحظہ کیجئے،

می گوئیم و می شنویم، ملا زلالی این بیت خوانده

تا کے بگرد دہر ہا چون شیخ و شیخ زادہ

گوئیم ہرزہ ہرزہ کردیم لا وہ لا وہ

دو بنیاد خندہ کردہ است، شیخ نورالدین در بدیہہ فرمودہ کہ این بیت گویا معمہ است باسم شما

کہ ہر ہر لالا ازان حاصل می گردد، شما را خندہ کردن عجب است ملا در ہم شدہ و ازین مطائبہ

خوش طبعی نادم گشتہ"

بدیہہ گوئی مین شیخ کو ید طولی حاصل تھا، وہ شعر و ادب کی محفلون مین جب دوسرے شعرار کے اشعار سناتے تو اسی ردیف و قافیہ مین خود فی البدیہہ بیس بیس شعر کہہ کر شامل کر دیتے، اور سامعین مشکل سے یہ تمیز کر سکتے، کہ شیخ موصوف اپنے اشعار سنا رہے ہین،

شیخ نورالدین نے کابل مین وفات پائی،

کیفیت مخطوطہ | فتاویٰ بابری کے زیر نظر قلمی مخطوطہ کی تقطیع ۹×۴ ۶ ہے، اور ۲۶۰ صفحات مین ہر صفحہ مین پندرہ سطرین ہین، خط نستعلیق، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنگرفی ہین، لوح کتاب مطلا و مینا کار، جدولین سرخ اور سنہری ہین، ناقص الآخر ہین،

سبب تصنیف | کتاب کے دیباچہ مین مولانا خوافی نے لکھا ہے، کہ وہ اپنے جوہر علم و فضل کو تصنیف کی شکل مین بادشاہ کی خدمت مین پیش کر کے اس کے وسیلہ سے دربار شاہی سے منسلک ہونے کی دیرینہ تمنا کو پورا کرنے کے لئے اپنے وطن سے ۹۲۵ھ کے آخر مین روانہ ہوئے، اور مراحل و منازل طے کرتے ہوئے "ممالک محروسہ" (؟) سے قریب ایک مقام پر پہنچے تھے، اور اس کشمکش مین تھے، کہ کس فن مین اپنی تصنیف پیش کرین، کہ بادشاہ کا حکم پہنچا کہ مسائل شرعیہ مین ایک کتاب فارسی مین تصنیف کیجائے، اس حکم پر مصنف نے مستند روایتون اور کتابون سے مسائل شرعیہ کو ضبط تحریر مین لانا شروع

کیا ، اور ہدایہ (ہ) ، کافی (ک) شرح وقایہ (شو) شرح مختصر وقایہ (ش) ، خزانہ (خ) فتاوی قاضی خان (ق) اور خلاصہ (ص) سے اس کی تالیف مین مدد لی ہے، تو ہین کی علامتین مصنف نے حوالہ کے لئے مقرر کی ہین ، جہان مختلف فیہ مسائل مین اپنی را ے ظاہر کی ہے ، وہان علامت ن سے کام لیا ہے ،

دیباچہ کتاب کتاب کا دیباچہ گو کسی قدر طویل ہے لیکن اس سے مصنف اور تصنیف کے بعض پہلوؤن پر روشنی پڑتی ہے ، اس لئے اس کو نقل کیا جاتا ہے :

"باز می نماید بندۂ درماندۂ عاصی جانی نورالدین بن قطب الدین بن احمد بن زین الدین الخوانی اصلح اللہ شانہ ، وصانہ عما شانہ کہ مدۃ مدید این حقیر قلیل البضاعت را داعیہ آن بود کہ خود را بہ سایۂ دولت پادشہ فضیلت پروری رساند کہ باوجود کمال فطنت ، بلند شرائف اوقات ارجمند را بہ ملاحظۂ نکاتِ علوم نقلی و عقلی صرف نمودہ نحوے کامل و حظے وافر از ہر علم حاصل کردہ باشند ، تا بمقتضائے انما یعرف ذوالفضل من الناس ذووہ درجہ از درجات فضائل و مرتبہ از مراتب ارباب آن بر ضمیر منیرش مخفی نماند و فرصت بعید این کبیر عدیم الاستطاعت عزیمت آن می نمود کہ مخزوناتِ خزانۂ سینہ را کہ حاصل حیوات و محصول اوقات دیرینہ است مطرح مجلس نامی و محفل گرامی دین پناہے معدلت گسترے گرداند کہ بمقتضاے عدالتِ ذاتی و موروثی رعایت ہر امرے بہ قدر مرتبہ آن فرمودہ ، اجتناب از ترجیح مرجوح و احتراز از تفضیل مفضول بر ذمت ہمت واجب داند والحق احضار این مفہومات در ذاتِ ملک صفات حضرت بادشہ اسلام پناہ مصداق مقولہ السلطان ظل اللہ سلیمان دیوان تاج بخشے و صاحب قرانے ، شہسوار میدانِ عالمگیری و کشورستانی مطیع فرمانِ شریعت متین ، متابع اعیان سلاطین ، صاحبِ تمکین ، تابع احکام ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ، قامع آثار آثام ارباب ظلمت طغیان ،

مشید ارکان دین و ملت، مخرب بنیان کفر و اباحت، حامی ارباب سنت و جماعت، ماحی اصحاب بدعت و ضلالت، افروزندۂ چراغ علم و تقوی بعد از انطماس و انطفا، افرازندۂ لوای درس و فتوی، بعد از اندراس و اشتفا، و والی ممالک جهانداری و رعیت پروری، بانی مبانی شهریاری و معدلت گستری، مہر سپہر جلالت و کامرانی، شاہ بارگاہ ایالت و جہانبانی، دُرّ درج حشمت و جلال دری برج سلطنت و اقبال

آنکہ چون در مدحش اندیشم مقال

ناطقہ حیران بماند عقل لال

الممدوح بلسان ارباب الخبرۃ و اصحاب الانتباہ، ظہیر السلطنت والدنیا والدین محمد بابر پادشاہ، شید اللہ ارکان الدین المتین بدوام وجودہ و بقایہ، و متع العالمین بتوالی جودہ و تعاقب عطایہ، چون اشتہار مفہوم نیر اعظم در جرم آفتاب ظاہر و روشن، بلکہ اظہر من الشمس و ابین من الامس است۔

لکل زمان واحد یقتدی بہ

وہذا زمان انت لاشک واحد

و علاوہ این امور آنکہ ہموارہ آبا و اجداد این بیچارہ بہ وظائف کہ دعوات درویشان است بخاندان عالی اشان آن حضرت اشتغال نمودہ، در ظل عواطف پادشاہان این دودمان متوالی الاحسان مرفہ و خوش الحال می بودہ اند، بنا برین مقدمات اکثر اوقات در تمہید اسباب آن می بود کہ سعی و کوشش نماید، تا بہ ہر حیلہ کہ از دست برآید، در سلک دعاگویان این دولت قاہرہ درآید، اما بواسطۂ کثرت موانع کہ بسبب بہ دمدوی طالع واقع بود، شاہد این مقصود از نقاب خفا چہرہ نمی کشاد، و وصول برین مطلوب در حجاب توقف می افتاد تا آنکہ در

آوا خر خمس و عشرین و تسع مایه (۹۲۵ھ) به عزیمت آنکه اولا طوافِ آن آستانه که قبلهٔ آمال
و کعبهٔ اہلِ سعادت و اقبال است، نموده، بعد از رخصت بجانبِ حرمین شریفین توجه نماید، از
وطنِ مالوف مہاجرت اختیار نمود، و بقدمِ سعی و اجتهاد بسیارے از مراحل و منازل پیموده
تا به موضعے که قریب به ممالک محروسه است، رسید، و در آن موضع آن مقدار موانع و قواطع
ظاہر گردید، که استخلاص از آن متعسر بلکه متعذر می دید، ناگاه نسیم اقبال از مہبّ عنایات
وزید و رائحهٔ قبول از نواب بارگه فلک اشتباه به مشام جان رسانید، بموجب جذبةٌ من جذبات
الحق توازی عمل الثقلین کمندِ شوق در گردنِ این مستحق انداخته موانع متنوع را مرتفع ساخته
در بسیاری از بوادیِ بیم ناک که مظنهٔ تلف و ہلاک بود، دوانید، تا آخرالامر رختِ اقامت را به برخے
از بلاد که در ظلِ نواب کامیاب از سائر مخافات مصئون و محروس است کشید، الحمد لله الذی
ہدانا لہذا وما کنا لنہتدی لو لا ان ہدانا الله، و قبل از استسعاد و تشرف بساط بوسی پرتو الطاف
و عنایاتِ آن آفتابِ فلک جاه و جلال برین ذرهٔ شکسته حال تافت و بانواع پرسش و نوازش
نواب گردون جناب شرفِ اختصاص یافت، شکر این مواهب را واجب بود که تحفهٔ دعا و صحیفهٔ
ثنائے معروض یافت مجلس عالی گرداند، بخاطرِ حیران افتاد که ادائے آن دعائے و القائے این
ثنائے بر وجہے مناسب باشد که بعد الایام بر صحیفهٔ روزگار باقی ماند، بنا بر آن عزیمت جزم
نموده که در فنے از فنون رساله تالیف نموده، موسوم باسمِ شریف سازد، فاما در تردد آن بود
که کدام یک از علوم در نظرِ اشرف مقبول تر است تا بنظم ترتیبِ آن پردازد، ہمانا که بموجب
کلمهٔ مشهورهٔ "ارباب الدول ملہمون" پرتوِ تردد این حقیر بر ضمیرِ منیر افتاده و کمال مرحمت
و شفقتِ پادشاہانه ابقاءِ آن تردد را در خاطرِ این کمینه رخصت نداده که درین اثنا حکم جہان
مطاع رسید که به جمع و تالیف قسم عبادات از مسائل شرعیه فرعیه اشتغال نموده، آن چه

راجح و معتبر عند الاکثر است بزبان پارسی در قید کتابت آورد، و سطح خلافیات در روایات ضعیف خود
خاطر بند کرا نہا مشغول ندارد، ایجاباً بالحکم المطاع واطاعةً لامر الواجب الاتباع با وجود قلت
بضاعت و عدم استطاعت درین امر خطیر شروع نمود، که بعد از اتمام بہ مقتضاے حدیث "رب
حامل فقہ الیٰ فقیہ اولیٰ من ہو افقہ منہ" در آن محفل عالی که ملجاے و ملاذ افاضل و اعالیست معروض
دارد، از کتب معتبر بجز ہفت کتاب بدست نیامد که اسامی آن کتب را عنقریب بتفصیل در می
آرد، لاجرم چنان که حکما بہ واسطۂ عدم اطلاع بر حرکات ثوابت مدار علوم نجوم را بر سبعۂ سیارہ
نہادہ اند بہ جہت طلب اختصار بر ستارہ را برقمی امتیاز دادہ، این فقیر ضعیف نیز چون کتاب
دیگر ندارد، بنیاد این رسالہ برین ہفت کتب می گذارد، و ہر روایتے را بانکہ متفق باشد بہ یکے
ازین کتب مستند ساختہ مرقوم برقمے می گرداند و ہر رقم را علامت کتابے می دارد چنان چہ

از ہدایہ بہ ہہ
و از کافی بہ ک
" شرح وقایہ " شو
" شرح مختصر وقایہ " ش
" خزانہ " خ
" خلاصہ " ص
" فتاوی قاضی خان " ق

تعبیر می نماید چندان که می تواند سخنان اکمل را بہ حکایات ناقص خود مقرون نمی گرداند، چرا که
ناقص مصاحبت کامل را نشاید و اگر احیاناً کلمہ چند ضرورت باشد مصدر بقسم آن که حرف اول
و آخر نقصان و تمام این ناتوان است می سازد تا من احول را بہ علامت نقصان سخن و قائل آن

از سخنان اہلِ کمال ممتاز گردیدہ کسے راور وغلط میندازد و از ہر رقم تا رقم دیگر منسوب بدان رقم اوّل می دارد و اصلاح سخن غیرے دران میان نمی آرد، مامول از مطالعہ کنندگان مصنّف آن کہ چون این ضعیف بکمال عجز و نقصان معترف است اگر بر خطاے خللے اطلاع یابند بذیل عفو واصلاح بپوشند و بسیار در خصلتِ عیب جوئی و بدگوئی نکوشند فامارجا، واثق وامید صادق است کہ چون از پرتو توجہ خاطر کیمیا، آثر کہ آئینہ جمال نمائی مخدرات عالم غیب است جلوۂ ظہور یافتہ از شوائب عیب و خلل و مواقع ریب و زلل مصئون و محفوظ ماند، الکون العصمۃ والعون بیضائر اولوالالباب پوشیدہ نماند کہ اوّل چیزے کہ بر مکلّف یعنی عاقل و بالغ فرض شود بعد از ایمان نماز است.......

نسخۂ مذکور ناقص الآخر ہے، کتاب الصلوٰۃ سے شروع ہو کر کتاب الحج کی عبارت ذیل پر ختم ہو جاتا ہے:

"حج در لغت قصد کردن است بچیزے از روے تعظیم و در شریعت عبارت است از ارکان مخصوصہ بشرائط مخصوص کہ تفصیل آن معلوم خواہد شد، و این ارکان را حج بواسطۂ آن می گویند کہ مشتمل است بر قصد کعبۂ معظمہ واین حج فریضہ است محکم و یکے از ارکان اسلام است و اگر کسے از فریضۂ آن منکر شود کافر گردد و در ہمہ عمر یک بار فرض است و مراد از شرائط است کہ چون وجود گیرد فرض شود بعد از استجماع ...."

نغمائے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں دوبارہ چھپ گیا ہے اس ایڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہوا اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے ضخامت :- ۱۴۴ صفحے، قیمت :- مجلد للعہ، غیر مجلد ہے "منیجر"

کشمیر میں شاہانِ مغلیہ کے چند آثار

از

جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاد عربی مسلم یونیورسٹی

مندرجۂ بالا عنوان سے میرا ایک بسیط مقالہ معارف اعظم گڈھ بابت ماہ مارچ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا، اس میں ملاحظہ ہو ص ۲۰۰، چشمۂ شاہی کے متعلق لکھا تھا کہ اس کا ذکر جب مجھ کو قدیم شاہی زمانے کی کتابوں میں نہ مل سکا، تو دوسرے وسائل سے کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکامی رہی، البتہ مندرجۂ ذیل قطعہ تاریخ غیر معلوم شاعر کا مل گیا،

دوشش دیدم نشستہ بر کوثر | شاہ مردان علی جہا ہی
گفتمش السلام گفت علیک | گفت، بر گو دگر چہ می خواہی
گفتمش بہر چشمہ تاریخے | گفت برگوئے، کوثر شاہی ۱۰۴۲ھ

اگست ۱۹۴۰ء میں میرا لکھنؤ جانا ہوا، اتفاقاً عزیزم مولوی نثار احمد صاحب ایڈووکیٹ چیرمین میونسپل بورڈ سیتاپور سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میرے پاس بیٹھتے ہی کچھ فارسی اشعار گنگنانے شروع کئے جن میں چشمۂ شاہی کا نام سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے، اور میں نے وہ اشعار اُن سے باواز بلند پڑھوائے، یہ ایک قطعہ کے اشعار تھے، جو اُن کے پردادا مولوی مظہر علی صاحب نے بزمانہ قیام کشمیر چشمۂ شاہی کی مرمت کے موقع پر کہا تھا، یہ قطعہ سنانے کے بعد انھوں نے وہ قطعہ بھی پڑھا، جو اوپر درج ہے، مولوی مظہر علی صاحب کے قطعہ سے میرے علم میں یہ اضافہ ہوا کہ سابق کا دستیاب شدہ قطعہ ابو طالب

کلیم کا ہے، مین نے اس وقت عزیز موصوف کو مختصراً اپنی دلچسپی کی وجہ بتادی اور یہ بھی کہدیا کہ اس وقت کا واقعہ معارف مین بطور ضمیمہ مضمون سابق شائع ہوگا،

لکھنؤ سے واپس آتے ہی ابوطالب کلیم کے کلیات اور اس کے حالات کی تلاش کی کہ اس کی جانب قطعہ کی نسبت جو معلوم ہوئی ہے، وہ بختہ طور پر ثابت ہوجائے، تذکرون مین حالات ملے، اور کشمیر سے اس کا شغف بھی معلوم ہوا، لیکن افسوس ہو کہ کلیات کا نسخہ نہ ملا، حیرت اور نہایت افسوس اس بات پر ہے کہ مطبوعہ ہوتے ہوئے بھی وہ نایاب ہے، جہان جہان سے مستعار مانگا وہان بھی نہ تھا، پرانی کتابون کے فروخت کرنے والون سے علی گڈھ اور لکھنؤ مین رجوع کیا، مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی، پھر قلمی نسخون کا خیال کیا، ایک ناقص نسخہ ہماری لٹن لائبریری مین ہے، اس کی بنا پر فیصلہ غیر مناسب تھا، بعض احباب کے ذریعہ سے کچھ اور قلمی نسخے ملے جن مین سے بعض ناقص اور بعض مکمل تھے لیکن اس قطعہ سے خالی، بالآخر مصداق

تجری الرياح بما لا تشتهي السفن

اسلئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے، کہ جیسا کچھ بھی ہے، اس انکشاف کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کردیا جائے،

مولوی منظر علی صاحب کا قطعہ تاریخ مرمت چشمہ شاہی درج ذیل ہے،

چشم بد دور چشمۂ ایست کہ ہست	آب و تابش ز ماہ تا ماہی
برر ہ او نہادہ سر تسنیم	سلسبیلش نمودہ ہمراہی
بود خاکش بسر ز حسرت شاہ	آبش افزود تیغ جم جاہی
پیش ازین کلک تر زبانِ کلیم	درفشان شد کہ چشمہ شاہی
سال تاریخ حال چشمۂ شیخ ۱۲۵۸	گفت منظر ز روئے آگاہی ۱۲۵۹

جو تھا شعر تبلا رہا ہے کہ پہلا قطعہ کلیم کا ہے، اور یہ کہ مادہ تاریخ چشمہ شاہی ہے، لیکن اس کے

اعداد ۴۶۶ ہین، اس وجہ سے یہ مادہ نہین ہو سکتا، بلکہ جیسا اصل قطعہ کے اندر ہے، مادہ کوثر شاہی ہے، جس سے ۱۰۴۲ھ برآمد ہوتے ہین، لہٰذا ع

درفشان شد کہ چشمۂ شاہی

سے مولوی صاحب کا مقصد اس نام کی طرف اشارہ کرنا ہے جس سے وہ مشہور ہے،

اس انکشاف کے بعد اپنے محولۂ بالا مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ خود اس کے اندر شاعر کا نام موجود تھا، جو ماخذ مین کتابت کی غلطی سے مخفی رہ گیا، کیونکہ وہان تحریر ہے کہ "کلم بدیہۃ تاریخ گفت" اسکو "کلیم بدیہۃ تاریخ گفت" ہونا چاہئے تھا،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مولوی مظہر علی صاحب کا مختصر حال لکھ دیا جائے، جو مولوی نیاز احمد صاحب مرحوم برادر کلان مولوی نثار احمد صاحب موصوف کی عبارت مین بعینہ ملاحظہ ہو،

مولوی مظہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر علماے عصر مین سے تھے، اور صاحب تصانیف بھی تھے، قبل تعین بصفت صدر امین و قاضی القضاۃ بریاست کشمیر مولوی صاحب مرحوم مدرسہ عالیہ کلکتہ مین پرنسپل تھے، اپنے ایک انگریز دوست کی فرمایش پر قلم برداشتہ ۲۹ روز مین ایک کتاب موسوم بہ اصول العلوم عربی زبان مین لکھی، جس مین دس علوم متداولہ پر ایسی اجمالی روشنی ڈالی کہ باریک سے باریک نکات بھی روشن ہوگئے ہین، اس کی نقل میرے پاس بھی موجود ہے، یہ کتاب خود اپنی نظیر ہے،

۱۲۷۲ھ مین جب کہ مولوی صاحب لاہور ہوتے ہوے وطن آرہے تھے، تو بغرض قدمبوسی خلاصہ دودمان مصطفوی نقاوہ خاندان مرتضوی سید السادات جناب مولانا سید رجب علی خان بہادر بمقام لدھیانہ قیام کیا، اور جناب مولانا کی فرمایش پر ایک کتاب بزبان فارسی الموسوم بالرحمۃ النازلہ فی شرح التحفۃ المرسلۃ لکھی جو کہ مطبع نیر اعظم انبالہ مین چھپی ہے، یہ کتاب ہم کو بہت تلاش کے بعد کتب خانہ انوری تکیہ شریفیہ کاکوری مین ملی جس کی نقل ہمارے پاس موجود ہے، علاوہ اس کے مولوی صاحب نے ایک تفسیر

کلام مجید بزبان عربی لکھی جس کا نام مجھکو یاد نہین، یہ تفسیر میرے یہان موجود نہین، اس کا مسودہ بھی مولوی صاحب نے اپنے ایک دوست کو دیا، اور ہنوز انہی کے پاس ہے اللّٰھمّ اردد الینا ضالتنا۔

مولوی صاحب کا کشمیر مین بزمانہ مہاراجہ گلاب سنگھ قاضی القضاۃ ہونا اُن کی مہر سے ثابت ہے جس کی نقل ذیل مین درج ہے، یہ نقل مجھ کو مولوی نیاز احمد صاحب مرحوم نے دی تھی،

بہادر مولوی مظہر علی
صاحب گلاب سنگھ ۱۲۶۳ ھ
متعینہ سرکار سر مہاراجہ ضی
مہر صدر امین و قا القضاۃ

اس مہر کی عبارت کو اس طرح پڑھنا چاہئے :- "مہر صدر امین و قاضی القضاۃ مولوی مظہر علی متعینہ سرکار سر مہاراجہ گلاب سنگھ صاحب بہادر ۱۲۶۳ھ"

مین نے چاہا تھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے مولوی صاحب کے حالات بحیثیت صدر مدرس معلوم کرون مگر اس مین بھی کامیابی نہ ہوئی، معلوم ہوا کہ ملک کی تقسیم کے وقت جو سامان کلکتہ سے ڈھاکہ کو گیا اس مین مدرسہ کی تاریخ بھی چلی گئی، اس لئے یہ پہلو بھی تشنہ رہ گیا،

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قومون کا ذکر ہے ان مین سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار، اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیل مباحث،

(زیر طبع)

ایک نادر کتاب کا تعارف

از

جناب سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی

مولانا فضل امام خیرآبادی (علامہ فضل حق رحمہما اللہ کے والد ماجد) دنیائے علم مین ایک نامور معقولی اور یگانہ روزگار فلسفی کی حیثیت سے متعارف ہین منطق مین آپ کی مشہور تصنیف مرقات ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے مدارس عربیہ کے نصاب مین داخل ہے لیکن بہت سے اہل علم بھی اس سے واقف نہین ہین، کہ مولانا کی جولانگاہ محض معقولات تک محدود نہ تھی؛ بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی آپنے طبع آزمائی کی ہے، آمدنامہ[1] جو فارسی قواعد کے تمام شعبون پر حاوی ہے، اور جس کی ایک فصل مین مشاہیر اہل علم کا بھی ذکر ہے، خاص خاص حلقہ مین روشناس ہوچکا ہے، حال مین موصوف کی ایک تاریخی تصنیف حکیم سید مشرف حسین مرحوم خیرآبادی کے کتب خانہ مین نظر سے گذری جس سے لوگ واقف نہین ہین، اس لئے اس کا تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوا،

یہ کتاب فن تاریخ و سیر مین ہے اور فارسی زبان مین ہے، اور اتنی خستہ اور بوسیدہ ہوچکی ہے، کہ جابجا اوراق کے ٹکڑے اڑ گئے ہین، کتاب مین کافی غلطیان موجود ہین بعض مقامات پر کاتب نے پورا صفحہ سادہ چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے اگلی اور پچھلی عبارت مین ربط باقی نہین رہ گیا ہے، پوری کتاب چھ سو ننانوے صفحات مین تمام ہوئی ہے، ہر صفحہ مین سترہ سطرین ہین، قلم متوسط ہے، مصنف نے اس

---

[1] اس کا قلمی نسخہ بخط مصنف کتبخانہ مولوی نور الحسن صاحب لاہرپور ضلع سیتاپور مین محفوظ ہے ۱۲

تصنیف کا سبب دیباچہ مین یہ بیان کیا ہی؛

"پس می گوید اضعف عباد اللہ المتوکل علی المفضل المنام الہادی محمد فضل امام بن محمد ارشد الخیرآبادی غفرلہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ کہ روزے بخاطر فاتر این بندۂ نحیف گزشت کہ چون انسان را احوال گزشتگان موجب عبرت وخبرت می باشد، وبسا امور دینی ودنیوی ازان انتظام می یابد لہٰذا اساتذہ در ہر زمان بتالیف کتب سیر وتواریخ پرداختہ اند ودفاتر ہا ازان پرساختہ ودرین زمان بسبب قصور فہم اکثر ابنائے روزگار ازین علم شریف عاری وعاطل اند، وبسبب قلت مبالات ازین فن شریف بسیارے ارباب زمانہ بے بہرہ وغافل اند، مناسب است کہ مختصرے از کتب متعارفہ التقاط کردہ آید کہ گزشتگان را تذکارے وبرائے آئندگان یادگارے باشد، بنا بران این چند اجزا از کتب معتبرہ مانند تاریخ فرشتہ وشمشیر خانی ومنتخب التواریخ و دیگر کتب بعبارت سلیس وواضح انتخاب کردہ درسلک تحریر کشیدہ شد، وبنائے این کتاب برچند گفتار نہادہ اند"

پوری کتاب سات گفتارون اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہی؛۔

"گفتار اول درذکر احوال خلقت آدم علیٰ نبینا علیہ السلام وذکر امتہائے دیگر وغیر مرسل گفتار دوم، درذکر صوفیائے کرام واولیائے عظام، گفتار سوم درذکر ملوک ایران، گفتار چہارم درذکر راجگان کہ حکومت بہ دہلی ودیگر بلاد داشتند، گفتار پنجم درذکر حکام غزنویہ ولاہور، گفتار ششم اساطین سلاطین سلجوقیہ گفتار ہفتم درذکر مشاہیر حکما واطبا ومشاہیر خوشنویسان، خاتمہ دربیان بلاد ہفت اقلیم وعجائب وغرائب بلدان"

کتاب کی تصنیف کا زمانہ وہ ہے جب مولانا دہلی مین افتاء کے منصب پر فائز ہوئے تھے، اس لئے مشاغل کی کثرت، دربار کی حاضری اور درس وتدریس کی مشغولیت نے کتاب پر نظر ثانی کا موقع بھی نہین دیا،

اور دوستوں کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر مسودہ اسی طرح انکے حوالہ کر دیا اگر مصنف کو اس کتاب کی تکمیل و تصحیح کا پورا موقع ملا ہوتا، تو اس کتاب کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا، اس کا مصنف کو افسوس تھا، وہ لکھتے ہیں۔

تالیف این کتاب وقتے اتفاق افتاد کہ قائد قضا وقدر این کمترین خلائق را در دہلی انداختہ بفتوی نویسی عدالت آنجا مبتلا ساختہ بود، وذلک فی ۱۲۲۲ھ[1] ہجری قدسی وچون انتحال این احوال بر سبیل ارتجال اتفاق افتادہ وفرصت آن نشد کہ نظر ثانی کردہ آید، چہ اکثر در دربار می گزشت وبرخے از اوقات در تدریس صرف می شد وآن قدر مہلت کہ برائے سیر کتب سیر وتواریخ وغیرہ گنجایش تواند داشت دست بہم نمی داد ودو بعضے دوستان در نقل گرفتن وانتساخ این سخت عجلت وجلدی فرمودند لاجرم ہمان نسخہ مسودہ حوالہ اوشان نمودہ شد، بنا بر آن از ناظرین توقع آن دارد کہ اگر بر سہوے وخطائے وقوف یابند آنرا از بے مائگی راقم وبے سوادی مولف حمل کردہ بہ ذیل عفو بپوشند، والعفو عند کرام الناس مقبول،

راقم ڈاکٹر سید انتظار حسین نبیرہ حکیم سید مشرف حسین مرحوم کا ممنون ہے جنھوں نے اس نایاب گران بہا گنجینہ کے جس کا غالباً اور کہیں وجود نہیں ہے، مطالعہ کا موقع دیا، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسکی نقل حاصل کی جائے تاکہ یہ تاریخی یادگار ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے۔

---

[1] غالباً کاتب نے ۱۲۲۲ھ کو غلطی سے ۱۲۲۲ھ لکھ دیا ہے، اس لئے کہ مرزا غالب نے مولانا کا سنہ وفات اپنے قطعہ تاریخ میں ۱۲۱۸ھ لکھا ہے، یعنی اس سے چار سال قبل آپ وفات پا چکے تھے، مرزا کے قطعہ کا شعر یہ ہے،

گفتم اندر سایۂ لطف نبی

باد آرامشگہ فضل امام

۱۲۴۴ھ

(باغی ہندوستان بحوالہ سبد چین غالب)

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان میں مسلمانوں کے تمدنی اثرات

"موجودہ عہد میں "ہسٹری آف اورنگ زیب" کے مصنف جدو ناتھ سرکار مغلیہ دور کے بڑے مستند اور بلند پایہ مورخ سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے اورنگ زیب کی ضخیم تاریخ جس نقطۂ نظر سے لکھی ہے اس کو مسلمانوں نے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا ہے، اس لئے وہ مسلمانوں کی تاریخ اور تمدن کے دوست اور ان کے حامی نہیں سمجھے جاتے لیکن انھوں نے اپنے ایک مضمون میں غالباً بادل ناخواستہ کچھ ایسے حقایق لکھے ہیں، جن کا مطالعہ آج کل بعض حقیقتوں سے بہت مفید اور دلچسپ ہوگا، ان کا ایک انگریزی مقالہ اپریل ۱۹۲۹ء کے ہندوستان ریویو میں "اسلام ان انڈیا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، گو یہ مضمون بھی بہت سے غلط واقعات و مفروضات پر مشتمل ہے، تاہم اس میں بہت سی حقیقتوں کا بھی اعتراف کیا گیا ہے، اس لئے اس کے خاص خاص حصے ناظرین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے سنوارنے میں مسلمانوں کا کیا حصہ رہا ہے، اس مضمون میں بہت سے ایسے خیالات بھی ہیں جو صحیح نہیں، اس لئے مضمون نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے"

مسلمانوں نے جب ہندوستان کو فتح کیا، تو ان کی فتح گذشتہ تمام فتوحات سے مختلف تھی، وہ ہندوستان آئے، تو اُن کو یہاں کے پرانے باشندے اپنے میں ضم نہ کرسکے، ورنہ اُن سے پہلے یونانی تورانی، تاتاری اور پارتھین حملہ آور جب یہاں آباد ہوئے، تو چند نسلوں کے بعد ہی وہ اپنے نام، لباس، رسم ورواج اور مذہب میں بالکل ہندو بن گئے، دوسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی ہیلیوڈورس نامی نے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاحت کی تھی، تو اس نے وشنو کی پوجا کی، اور اس دیوتا کی یاد میں ایک ستون بھی بنوایا......

لیکن اسلام میں توحید کا تخیل اس قدر خالص اور شدید ہو کہ اس میں اور شرک اور تعدد الٰہ کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے، اسلام کا خدا ہمیشہ زندہ اور غیور رہتا ہے، وہ کسی کو اپنا شریک نہیں بنا سکتا، اور نہ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے دلوں میں کسی اور خدا کے وجود کو گوارا کرسکتا ہے، اسی لئے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندومت کے ساتھ ضم ہونا ناممکن ہوگیا وہ اپنے اللہ کو نہ وشنو کے کثیر التعداد اوتاروں میں سے ایک اوتار مان سکتے تھے، اور نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک صاحب الہام سادھو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوسکتے تھے، اسی لئے ہندو اور مسلمانوں کے ایک ہی سرزمین میں رہتے ہوے بھی دونوں میں آمیزش نہ ہوسکی، اور ان میں جو خلیج پیدا ہوگئی، اس کو کوئی چیز پاٹ نہ سکی، ہندوستان کے مسلمانوں کا رجحان ہندوستان کے بجائے باہر کی سمت رہا۔ آج بھی جب وہ نمازوں میں کھڑے ہوتے ہیں، تو اُن کا منھ مکہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر زمانہ میں جب بھی اپنے ذہنی نشو ونما، قوانین کی تدوین، ملک کے انتظامی معاملات اور نوشت وخواند کے معیار کے سلسلہ میں کوئی نمونہ تلاش کرتے تو وہ ہندوستان سے باہر، عرب، شام، ایران اور مصر کا ہوتا، مسلمانوں کی بہت سی چیزیں مثلاً ان کی مقدس زبان، اُن کا لٹریچر، ان کے اساتذہ، اُن کے اولیاء اللہ اور ان

کی درگاہیں مشترکہ ہیں جو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں، اور ہندوؤں کی طرح صرف ہندوستان ہی میں محدود نہیں ہیں،

ہندوؤں نے مسلمانوں کو اپنے میں ضم کرنے کی کوشش کی، اسی لئے انھوں نے Allo-panishad لکھی، اور شہنشاہ اکبر کو اوتار تسلیم کر لینے کا خطرہ بھی مول لیا، لیکن مسلمان اپنے مذہب کی بنیادی باتوں کو ترک کرنے، اور ان الٹی رسموں کو اختیار کرنے کے لئے بھی آمادہ نہیں ہوئے، جو ہندو سوسائٹی میں داخل ہونے کے لیے ضروری تھیں، انھوں نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ مشرک نجس ہیں، اور کوئی نجس چیز کعبہ میں داخل نہیں ہو سکتی،

ہندوستان آنے والے مسلمانوں اور اُن سے پہلے کے حملہ آوروں میں یہی بنیادی فرق رہا، اس کے علاوہ ایک اور خاص فرق یہ تھا کہ ۱۲۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک مسلمانوں کی ریاست اور سوسائٹی سپاہیانہ اور خانہ بدوشانہ طرز کی تھی، حکمران طبقہ اس ملک میں اس طرح رہا، جس طرح کوئی فوجی کیمپ میں رہتا ہو، سولھویں صدی کے اخیر میں اکبر نے اس ملک کے لوگوں میں یہاں کی حکومت سے دلچسپی پیدا کرانے کی کوشش کی، اور خود حکومت بھی حاکمانہ فرایض کے علاوہ کچھ معاشرتی اور عمرانی فرایض انجام دینے کی طرف مائل ہوئی، لیکن مسلمان باشندے اس ملک میں رہنے کے باوجود اکبر کے عہد تک اس کا جزء بن کر نہیں رہے،

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے عہد میں ہندوستان کو کیا کیا چیزیں دیں؟ ہمارے نزدیک یہ دس چیزیں ہیں،

(۱) مسلمانوں نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہازوں اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا، ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ

کے بعد یہ دونون چیزین بالکل ختم ہو گئی تھین،

۲۔ ہندوستان کے بیشتر علاقون خصوصاً ذندھیا کے شمال مین اندرونی طور پر امن وسکون قائم ہوا،

۳۔ ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک مین یکسانیت پیدا ہوئی،

۴۔ مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگون کے عادات واطوار اور لباس وغیرہ معاشرتی امور مین یکرنگی پیدا ہوئی،

۵۔ ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا، جس مین ہندوؤن اور چینیون کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، اس لئے تعمیرات مین ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتون کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین، اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگارین ہین،

۶۔ ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی مین ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندو منشیون نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اور اس اسٹائل کو مرہٹون نے بھی اپنی زبان مین رائج کیا،

۷۔ دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی،

۸۔ مذہب مین توحید کے تصور کی تجدید ہوئی، اور تصوف پھیلا،

۹۔ تاریخی لٹریچر پیدا ہوا،

۱۰۔ فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبون کو فروغ ہوا،

بیرونی تعلقات | بودھون کے زمانہ مین تو ہندوستان کے تعلقات ایشیا کے اور ملکون سے پیدا ہوئے لیکن جب آٹھوین صدی عیسوی مین از سرِ نو ہندو سوسائٹی کی تشکیل ہوئی، تو ہندوستان دنیا سے بے تعلق ہو کر خود اپنی سرحد کے اندر محدود ہو گیا، لیکن بارھوین صدی عیسوی مین جب مسلمانون

نے ہندوستان کو فتح کیا، تو ایشیا اور افریقہ کے بعض علاقون سے ہندوستان کے تعلقات پھر سے قائم ہوئے، لیکن اس کے بعد بھی ہندو خود باہر نہین نکلے، بلکہ باہر سے ہزارون غیر ملکی ہندوستان آتے رہتے، اور کچھ مسلمان بھی ہر سال باہر جاتے رہتے، افغانی سرحد کے درّون کی راہ سے بخارا، سمرقند، بلخ، خراسان، خوارزم اور ایران سے عام لوگون کے علاوہ تاجرون کی آمد و رفت برابر جاری رہی اور یہ سلسلہ مغلون کی حکومت کے خاتمہ یعنی ۱۷۳۹ء تک قائم رہا، بولن کے درہ سے قندھار اور ایران تک راستہ جاتا تھا، اس راستہ سے جہانگیر کے زمانہ یعنی سترہوین صدی کے آغاز مین ہر سال چودہ ہزار بار شتر تجارتی سامان باہر سے آتا تھا، مغربی ساحل پر بہت سی بندرگاہین ایسی تھین، جن کے ذریعہ بیرونی دنیا مین رسائی ہوتی رہتی تھی، مشرق مین مسولی پٹم کی بندرگاہ پر گولکنڈہ کے سلاطین کا قبضہ ۱۶۸۷ء تک رہا، جس کے بعد مغلون کا قبضہ ہوا، یہان سے لنکا، سماترا، جاوا، سیام اور چین تک جہاز جاتے رہتے تھے،

یکسانیت مغلون کے دوسو سالہ عہدِ حکومت مین پورے شمالی ہند اور دکن کے بیشتر حصہ مین سرکاری زبان، نظامِ حکومت اور سکون مین یکسانیت پیدا ہوئی، ایک مشترکہ زبان بھی پیدا ہوئی، جس کو برہمنون اور دیہاتیون کے علاوہ ہر طبقہ کے لوگ بولتے، مغلون کے ملکی نظام، سرکاری خطابات، درباری آداب اور سکون کے ضوابط کو ان ہندو راجاؤن نے بھی اختیار کیا جو مغلون کے زیر اثر نہ تھے،

مغلون کے زمانہ مین بیس صوبے تھے، ہر صوبہ مین ایک ہی قسم کا نظم و نسق تھا، ایک ہی قسم کے خطابات بھی تھے، سرکاری کاغذات مین ایک ہی زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی، سرکاری عہدہ دارون اور فوجیون کا تبادلہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ مین برابر ہوتا رہتا تھا، اس لئے ایک صوبہ کا آدمی دوسرے صوبہ مین اپنے کو اجنبی محسوس نہین کرتا تھا، تاجر اور مسافر آسانی سے

ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں آیا جایا کرتے تھے، اور اس آمد و رفت سے اُن کو اس وسیع ملک کی سیاسی وحدت کا احساس ہوتا تھا،

فنون لطیفہ | فنون لطیفہ میں مسلمانوں کے بڑے احسانات حسب ذیل ہیں،

۱- انھوں نے تعمیرات میں ایک نیا طرز ایجاد کیا، محلوں اور مقبروں کی تعمیر اُن کی خاص چیز ہے،

۲- ان کی وجہ سے مصوری میں ایک خاص اسکول قائم ہوا،

۳- ہندوستان میں فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا،

شروع میں مسلمانوں کی مصوری کے جو نمونے خراسان اور بخارا سے ہندوستان پہنچے، ان میں خصوصاً چہروں، چٹانوں، اژدہوں، آگ اور پانی کی چادر کی مصوری میں چینی اثرات کا غلبہ نظر آتا تھا، لیکن ہندوستان کے اصلی قومی بادشاہ اکبر کے دربار میں مسلم آرٹ میں چینی اور غیر ہندوستانی اثرات کے ساتھ ہندو آرٹ کی بھی آمیزش ہونے لگی، جس کی روایات میں اجنتا، بجا رہوت اور ایلورا کی مصوری کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی،

اکبر کے زمانہ میں مسلم آرٹ میں پہلی دفعہ تغیر پیدا ہوا، اور چینی آرٹ میں جو سختی پائی جاتی تھی اس میں نرمی پیدا کی گئی، اور اس آرٹ کی رسمی باتوں سے پرہیز کیا جانے لگا، چٹان، پانی، اور آگ کی مصوری میں ایک نیا طرز اختیار کیا گیا، جس میں چینی اسکول کے اثرات تو باقی تھے، لیکن وہ فطرت سے قریب تر ہوتے تھے، پھر رفتہ رفتہ چینی اثرات زائل ہونے لگے، اور مصوری کی خصوصیات اور مناظر پورے طور پر ہندوستانی ہو گئے، اور یہ ترقی اکبر کے بعد بھی جاری رہی، یہاں تک کہ شاہجہان کے عہد میں چینی اثرات پر ہندوستانی اسٹائل غالب آگیا، پھر اس آرٹ نے نزاکت، رنگ آمیزی، باریکی، مرصع کاری، اور فطرت نگاری میں بڑا کمال پیدا کیا، اس انڈو مسلم آرٹ کو فروغ مغلوں کے دربار ہی میں ہوا، اور اس زمانہ میں ہندوستان کے مصوروں نے اپنے کمالات کے جو ہر دکھائے یہ ایک

ہندوستانی آرٹ یا مغل مصوری کے نام سے اب تک باقی ہے،

زبانوں کی ترقی ۱۲۰۰ء کے بعد سے سنسکرت ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی نہین رہ گئی تھی، اور گو اس زبان مین کتابین لکھی جاتی رہین، اور اب بھی لکھی جاتی ہین، لیکن یہ تمام کتابین بناوٹی ہین یعنی یا تو وہ شرحین ہین، یا شرحون کی شرحین ہین، یا رسمی باتون پر کچھ رسالے ہین، ان مین کوئی ایسی اوریجنل تصنیف نہین ہے، جس کو واقعی لٹریچر کہا جا سکتا ہے، اس کی کوئی کتاب نہ دل کو متاثر کرتی ہے، نہ معلومات مین اضافہ کرتی ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ۱۲۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک کا زمانہ جس کو عام طور سے پٹھانون کا عہد کہا جاتا ہے، شمالی ہندوستان کا ایک تاریک دور تھا[۵]، اس ساڑھے تین سو برس کی مدت مین ہندوؤن کا دماغ بالکل کورا اور بنجر رہا۔ لیکن جب اکبر نے اپنے دشمنون پر غلبہ پا کر شمالی ہند مین ایک وسیع سلطنت قائم کی تو امن و امان اور اچھے نظام سلطنت کے خوشگوار نتائج پیدا ہونے لگے، امن کی وجہ سے دولت بڑھی، اور دولت کے ساتھ ذہنی تعیشات کی جلوہ آرائی شروع ہوئی، تمام صوبون کی زبانون مین یکایک ترقی ہونے لگی، بنگال مین چیتنیا کے مقلدون نے بنگالی زبان مین ایک نئی روح پھونک دی، اس زبان مین گیتون کے علاوہ بعض اہم کتابین خصوصًا سوانحعمریان لکھی گئین،

ہندی زبان مین تلسی داس نے اپنی غیر فانی کتاب رام چرت مانس ۱۵۷۲ء عیسوی مین لکھنی شروع کی، اس سے پہلے محمد جائسی نے پدماوت ۱۵۴۰ء مین ختم کی تھی، اس نے ۱۵۰۲ء مین ماری گاوت بھی لکھی، اس زمانہ مین ہندی نظمین بکثرت لکھی گئین، انہی مین سے اکھراوت، سپناوت، کندراوت، مادھو ملاتی، عثمان چتراوتی ہین، کبیر دادو، اور نانک نے بہت سی مذہبی نظمین لکھین، لیکن ان کی حیثیت

---

۵ معارف :- فاضل مقالہ نگار مغلیہ عہد کے مورخ ہین، اس سے پہلے کے عہد پر ان کا تاریخی مطالعہ وسیع نہین، اس لئے اُن کی یہ رائے قابلِ قبول نہین،

مستقل لٹریچر کی نہین، وہ محض پند و نصائح ہین، جو زبانی یاد کرلئے جاتے تھے،

اردو سولھوین صدی مین پیدا ہوئی، شروع مین یہ بازاری زبان تھی، اور مصنفون اور اعلیٰ سوسائٹی کی نظرون مین حقیر سمجھی جاتی تھی، لیکن شمالی ہند مین اٹھارہوین صدی کے آخر مین یہ زبان علمی بن گئی، دکن مین ایک صدی پہلے ہی اردو جس کو ریختہ بھی کہتے تھے، شاعری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے گئے۔ تموئی اورنگ آبادی اردو کے سب سے پہلے ممتاز شاعر سمجھے جاتے ہین،

اکبر اور اس کے باجگذار حکمرانون نے علوم و فنون کی بڑی سرپرستی کی جس کی وجہ سے سولھوین صدی کے آخر اور سترہوین صدی کے نصف تک ہندوستان کے ذہن و دماغ کا حیرت انگیز نشو و نما ہوا، اسی زمانہ مین بنگال کی تاریخ سنسکرت مین "فتح سبھو دیا" لکھی گئی، جس مین ایک عجیب و غریب مخلوط زبان استعمال کی گئی ہے، اسی عہد مین شاہجہان کے درباری چندر بھان برہمن کی فارسی تحریرون کی شہرت ہوئی، اسی دور مین ہندی کی تصنیف متراہندھو و نود مشہور ہوئی،

مذہب کے اثرات | مشہور مورخ کنگھم رقمطراز ہے کہ

"مسلمان ہندوستان مین ایک نئی قوم کی حیثیت سے آئے، وہ اپنی شجاعت مین چھتریون کے برابر یا اُن سے بڑھکر تھے، وہ برہمنون کے تقدس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، انھون نے توحید کو بابانگ دہل پیش کیا، اور یہ بتایا کہ خدا بتون سے نفرت کرتا ہے، ان تمام باتون نے ہندوستان کے لوگون کے ذہن کو متاثر کیا،......" ہندو مذہب اور اسلام کے اختلاط کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ چودھوین صدی کے آخر مین بنارس کے رامانند نے ایک مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈالی، جس کا ہر فرد خدا کی نظرون مین یکسان سمجھا جاتا تھا، اور اس مین کسی امتیاز کے بغیر ہر قوم کے لوگ رامانند کے چیلے بن کر شریک ہو سکتے تھے"

نظر.... دوسرے یوروپین مصنفون کا یہ کہنا صحیح نہین ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوؤن

مین توحید کا تخیل اور ذات پات کے خلاف جذبات اسلام کے اثر سے پیدا ہوئے، ہندوؤن مین شروع سے جتنے بڑے بڑے مفکر اور مذہبی مصلح پیدا ہوئے، انھون نے یہی تعلیم دی کہ بے شمار دیوتاؤن کے پیچھے ایک ہی خدا ہے، اور ہر پجاری خدا کے نزدیک برابر ہے، ان مصلحین نے یہ بھی تعلیم دی کہ مذہبی رسم ورواج توہمات ہین، لیکن ان تمام چیزون سے بالاتر صرف ایک سیدھا سادہ عقیدہ ہے، انھون نے مذہب کی باتون کو آسان بنا کر ادنی طبقہ تک پہونچانے کی بھی کوشش کی، لیکن اس مین شک نہین کہ ان تمام اصلاحی تحریکون مین مسلمانون کے آنے کی وجہ سے بڑی ترقی ہونے لگی، ہندوؤن کے دماغ پر جو تعصب چھایا ہوا تھا، وہ مسلمانون کی سوسائٹی کے اثر سے دور ہونے لگا،

مسلمان صوفیون نے ہندوؤن اور مسلمانون کے اعلیٰ دماغون کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم تیار کیا، اور صوفیون کے فلسفہ کے اثرات سے حکمران طبقہ محکومون سے قریب تر ہوا،

تاریخی لٹریچر تاریخ نویسی مین ہندوؤن کا دماغ بالکل محدود تھا، مسلمانون کی فتح سے پہلے ہندوؤن نے کوئی ایسی کتاب نہین لکھی تھی، جو صحیح معنون مین تاریخ کہی جا سکتی ہے، اس کے برخلاف عربون کا دماغ خشک، مرتب اور حقیقت پسند ہوتا ہے، وہ تمام واقعات کو تاریخ وار لکھنے کے عادی ہین، مسلمانون کا تاریخی لٹریچر بہت ہی وسیع اور متنوع ہے، اور اس مین سنہ و سال کی باضابطہ ترتیب رہتی ہے، ہندوستان کے ہر مسلمان خاندان کے زمانہ مین تاریخین لکھی گئین مغلون کے ہر بادشاہ نے اپنے عہد کی تاریخ لکھوائی، ان تاریخون کا نہ صرف مطالعہ کیا گیا، بلکہ ہندو مصنفون اور راجاؤن نے ان کے طرز کو نقل کرنے مین تساہل سے کام نہین لیا، اس طرح ہندوستانی لٹریچر مین ایک نئے اور بہت ہی مفید فن کا اضافہ ہو گیا، چنانچہ سترہوین اور اٹھارہوین صدی مین تاریخون سوانحعمریون اور خطون کا ایک عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہو گیا،

کلچرل اثرات مسلمانون نے ہندوستان مین صدیون حکومت کی، اس لئے یہان اُن کے تمدنی

اثرات گوناگون ہین،

شکار خصوصاً باز اور شکرے سے شکار کھیلنے کے طریقون مین مسلمانون کا اثر غالب ہوا، اس کے لئے ان ہی کی اصطلاحات استعمال ہوئین، تمدن کے دوسرے شعبون مین بھی فارسی عربی اور ترکی الفاظ ہندی بنگالی بلکہ مرہٹی زبان تک مین استعمال کئے جانے لگے،

مسلمانون نے فنونِ جنگ مین بڑی ترقی کی تھی، انھون نے یہ فن ترکی سے سیکھا تھا، جو یورپ کے فنون جنگ سے متاثر تھا، اور کچھ ایرانیون سے بھی سیکھا تھا، مغلون کی فوج کے نظم ونسق کو ہندو راجاؤن نے بڑی رغبت سے اختیار کیا، تمدن جیسے جیسے بڑھتا گیا، اور جنگ مین توپون کے استعمال کی کثرت ہوئی، تو مسلمانون نے حصار بندی کو بڑی ترقی دی، مسلمانون ہی نے یہان بارود رائج کی، ہندوؤن کو جنگ مین ہاتھیون پر بڑا بھروسہ رہا کرتا تھا، لیکن مسلمانون نے سوارون کے دستے کے طریقۂ جنگ کو اتنی ترقی دی کہ ہاتھی جنگی مصرف کے لئے بیکار ہو گئے اور وہ لڑائی مین صرف باربرداری کے کام مین آنے لگے،

ملکی نظام، دربار کے آداب، لباس پوشاک، اعلیٰ طبقہ کے طرزِ زندگی، سامان تعیشات، فنونِ لطیفہ، تعمیرات اور فن باغبانی مین مسلمانون کے اثرات بہت نمایان طور پر ظاہر ہوئے، مغلون نے دربار کے مراسم، خطابات اور سرکاری عہدیدارون کے آداب مین جن جن باتون کو رائج کیا، ان کو اکثر ہندوؤن نے فخریہ نقل کیا، راجپوت اور مالوہ کی بعض ریاستون مین سرکاری زبان آج تک اردو ہے، اور اس کا رسم الخط دیوناگری کے بجائے فارسی ہے،

محکمۂ مالیات کا نظام تو وہی رہا جو بہت ہی قدیم زمانہ سے ہندوستان مین رائج تھا، لیکن اس نظام کی سرکاری ترتیب اور اس کے حساب کتاب کے طریقون، اور اس محکمہ کے القاب کو مسلمانون نے رائج کیا اور اُن سے ہندو ریاستون نے لیا،

مسلمانوں کی روزانہ کی زندگی میں ہندوؤں کے مقابلہ میں تعیش زیادہ تھا، وہ زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے، اس لئے اُن کی وجہ سے صنعتوں اور فنون لطیفہ کو زیادہ فروغ ہوا، اُن کا ذوق ہندوؤں سے زیادہ بلند اور پاکیزہ تھا، متمول ہند وخصوصًا سرکاری طبقہ ان ہی کے ذوق کو اپنی زندگی کا معیار بناتا تھا حتی کہ معصیتوں میں بھی ان ہی کی ریس کرتا تھا،

مسلمانوں نے کھانے پینے کی بہت سی نئی چیزیں رائج کیں، جمالیات، عطریات اور رقص وسرود میں مسلمان شاہی خاندان کا ذوق پوری سوسائٹی کی رہبری کرتا تھا، گو رقص وسرود میں اُن کا ذوق کچھ بہت ترقی یافتہ نہ تھا،

کاغذ مسلمانوں ہی نے یہاں رائج کیا، جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے: کاغذ کے رائج ہونے کے بعد پتیوں پر کتابوں کے لکھنے کا رواج بند ہوگیا اور کتابیں ظاہری حسن کے ساتھ زیادہ تعداد میں ہاتھوں میں آنے لگیں، مخطوطات کی طلاکاری ایک خاص آرٹ ہے، جو مغلوں کے زمانہ میں شروع ہوا، اکبر اور اس کے بعد کے عہد میں ہندو راجاؤں کے لئے ہندی اور سنسکرت کتابیں نقل کی جانے لگیں، اور اُن کو مصوّر بھی کیا گیا، یہاں کی فارسی کتابوں کی طلاکاری اور خطاطی کی شہرت یورپ تک پھیلی، جس کی وہ مستحق تھی، مسلمانوں ہی کے اثر سے کتابیں عام طور سے نقل کی جاتیں، اور علوم وفنون کو پھیلایا جاتا، ورنہ اس سے پہلے ہندو اپنی کتابوں اور علوم وفنون کو راز ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے،

یونانی اطبا اپنے زمانہ کے بہترین طبی مشیر سمجھے جاتے تھے، اس کی وجہ کچھ تو یہ ضرور تھی کہ سلاطین اور امراء اُن کی سرپرستی کرتے تھے، لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوؤں کے فنِ طب کی ترقی بالکل مسدود ہوگئی تھی، اور مسلمانوں کا یہ فن روزافزوں ترقی کر رہا

تھا، کیونکہ وہ مغربی ممالک کی ترقیوں سے باخبر رہتے تھے،

مسلمان بیرونی ملکوں کا سفر کرکے تجارت کیا کرتے تھے، اس سے اُن کے ذہن و دماغ مین وسعت پیدا ہوتی رہتی تھی، ان کے مقابلہ مین ہندو گھر ہی مین بند رہنا پسند کرتے تھے، فارسی زبان مین "مردجہاندیدہ" ایک اصطلاح ہے، جوایسے شخص کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جس نے بہت زیادہ سیر و سیاحت کی ہو، ایسا شخص عقل و دانش اور کلچر کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، جو بالکل صحیح ہے،

"ص ع"

خطباتِ مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۵ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے اُن کو بیحد پسند کیا،

ضخامت :- ۱۹۲ صفحے، چوتھا اڈیشن، قیمت :- ۸؍

دروس الادب

عربی کی پہلی اور دوسری ریڈرین جن کو مصنف نے عربی کے ابتدائی طالب علمون کے لئے اس طرح لکھا ہے کہ طالب علم کو ادب، اور نحو کے ساتھ ساتھ تعلیم اور مشق ہوسکے، اکثر مدارس مین یہ داخل نصاب ہے،

قیمت :- جلد اول ۳؍، جلد دوم ۶؍

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام کامل از جناب مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت
(حصہ اول) ۳۴۲ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت معمولی قیمت للعہ ر، پتہ ۱-
محمد زبیر کتب خانہ امجدیہ سترکھ ضلع بارہ بنکی،

مصنف روشناس صاحب قلم اور متعدد کتابون کے مصنف ہین، انھون نے اسلام کی ایک کامل "تاریخ لکھی ہے، جس مین اُن کے بیان کے مطابق ابتداے آفرینش سے قیامت تک کے حالات ہونگے" چنانچہ اس حصہ مین تخلیق عالم سے لیکر بنی امیہ کے خاتمہ تک کی تاریخ ہے، اس کی تالیف مین عربی ماخذون کے علاوہ اردو مین بھی مصنف کو تاریخ اسلام پر جو مستند مواد مل سکا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا ہے، خصوصًا دار المصنفین کی کتب سیرت اور تاریخ اسلام سے بکثرت استفادہ کیا ہے لیکن حوالے اُن کے بجاے بیشتر اصل ماخذون کے دیئے ہین تاہم اس حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر ہے کہ اس مین اسلام کی ابتدائی سو اصدی کے متعلق سیاسی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور علمی وغیرہ ہر قسم کے ضروری اور مفید معلومات سلیقہ سے جمع کر دیئے ہین، جس سے پڑھنے والون کے سامنے اسلام کی ہمہ گیر برکتون کا اجمالی نقشہ آجاتا ہے، اگر مصنف اس کتاب کا دامن ازل سے لیکر ابد تک وسیع نہ کر دیتے تو بھی اس کی حیثیت مین کوئی فرق نہ آتا اتنی جامعیت اسلامی تاریخ کے لئے ضروری بھی نہین تھی، دوسرے اس کا نباہنا بھی آسان نہین تھا، چنانچہ اس کتاب مین تخلیق عالم سے لیکر ظہور نبوی تک کی تاریخ کا کل سرمایہ حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے چند ناتمام واقعات ہین اور وہ بھی دو چار صفحات سے زیادہ نہین جن کو اس دور کی تاریخ سے کوئی

نسبت نہیں، قیامت تک کے حالات کے علم کا ذریعہ تو غیب کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا، اور اگر اس سے مراد قیامت کی پیشینگوئیاں ہیں، تو ان کی حیثیت تاریخ کی نہیں ہے، ایک علمی و ادبی کتاب کی توثیق کے لئے وزراے حکومت کی تحریریں بھی بالکل غیر ضروری ہیں، اُن کے شکرانے کے دوسرے طریقے بھی ہوسکتے تھے، تاہم ان پہلوؤں سے قطع نظر یہ کتاب تاریخ اسلام سے متعلق متفرق معلومات کے لئے مفید اور عام لوگوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

رہنماے انسانیت یعنی دینِ فطرت — از جناب مولوی صفوۃ الرحمٰن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۹ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت :- عہ پتہ :- ڈیوڑھی شہر یار جنگ محلہ سلطان شاہی ڈاکخانہ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن،

آج کل مسلمانوں میں عقیدہ و عمل دونوں قسم کی گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں، ایک طبقہ جو نئے اثرات سے متاثر ہے، اسلام سے بالکل بیگانہ اور بے عمل ہے، اس کی نگاہ میں اسلامی تعلیمات کی کوئی قدر و قیمت نہیں، ایک دوسرا طبقہ جو اس کا منکر نہیں، بلکہ اس پر عامل بھی ہے لیکن بیشتر مروجہ عقائد و اعمال کو خود اسلام سے بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان پر اوہام اور بدعات کے اتنے حجابات پڑگئے ہیں کہ ان میں اصلی اسلامی تعلیمات بالکل گم ہوگئی ہیں، اور ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں، اس لئے مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ خود بگڑی ہوئی اسلامی تعلیمات میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے، یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے اس میں رائج الوقت غیر اسلامی عقائد و تصورات کی پوری تردید کی گئی ہے، اور قرآن مجید و احادیث نبوی کی روشنی میں صحیح اسلامی عقائد و اعمال پیش کئے گئے ہیں کتاب اپنے مقصد پر حاوی ہے، مصنف نے ان تمام غیر اسلامی عقائد و اعمال کی تصحیح کی ہے جن میں نہ صرف عوام بلکہ بہتیرے تعلیم یافتہ تک مبتلا ہیں، اس لئے مصنف کی یہ دینی خدمت لائق تحسین ہے، لیکن جا بجا ان کا طرز اصلاحی کے بجائے مناظرانہ اور مجادلانہ ہوگیا ہے اور طریقۂ تعبیر میں شدت پیدا ہوگئی ہے، جو اصلاح و تبلیغ کے لئے مفید نہیں ہے، خصوصاً ان مختلف فیہ

مسائل مین جن مین تاویل کی گنجایش نکل سکتی ہے، تشدد مناسب نہین ہے، اور مصنف کے حسن نیت اوران کے خیالات کی صحت کے باوجود اس سے بعض طبقون کو شکایت پیدا ہوسکتی ہے، تبلیغ واصلاح مین شدت کے بجائے نرمی کے ساتھ افہام وتفہیم زیادہ مفید اور کارگر ہوتی ہے، خصوصاً جن مسائل کی مختلف تعبیرین ہوسکتی ہین ان مین زیادہ سختی مناسب نہین ہوتی، اس پہلو سے قطع نظر یہ کتاب اپنے مقصد اور خیالات کے اعتبار سے قابل قدر اور تعلیم یافتہ مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

۵۷ء کے ہیرو، از سیدہ انیس فاطمہ صاحبہ بریلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحے قیمت مجلد عہ، پتہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ

۵۷ء کے انقلاب مین جن بلند ہمت اور حوصلہ مند شخصیتون نے ہندوستان کو انگریزون کی غلامی سے چھڑانے کی کوشش کی تھی، اس کتاب مین ان مین سے تین واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل، جنرل بخت خان اور ضیاء الملک محمود خان روہیلہ کے مختصر حالات اور کارنامے لکھے گئے ہین، واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد اُن کی بیگم حضرت محل نے اپنے کمسن لڑکے برجیس قدر کو تخت نشین کرکے بڑی بہادری سے انگریزون کا مقابلہ کیا تھا، جنرل بخت خان بریلی مین حافظ الملک رحمت خان کے پوتے محمود خان کو گدی پر بٹھا کر مقابلہ میں آئے، اور ضیاء الملک محمود خان نے بجنور مین بہادر شاہ کی حمایت اور سرپرستی مین مخالفت کا علم بلند کیا تھا لیکن انگریزون کے تدبر اور ہندوستانیون کی نااتفاقی سے تینون کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، اس کتاب مین ان تینون حوصلہ مندون کی جنگ آزادی اور اس کی ناکامی کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ مین حکومت اودھ کی مختصر تاریخ اور اس زمانہ کے متعدد مجاہدین کے حالات بھی آگئے ہین، مصنفہ کا انداز تحریر ادیبانہ اور موثر ہے، ایک خاتون کے قلم سے ایسی مفید اور سنجیدہ کتاب تحسین وآفرین کی مستحق ہی، کتاب کے شروع مین پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے قلم سے ایک مفید اصلاحی مقدمہ ہے،

مرزا شوق لکھنوی از جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ محمد اسلم نمبر ۵، عماد الملک روڈ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ وار دو بک ڈپو چھراون ضلع مراد آباد،

اردو کی مثنویون مین نواب مرزا شوق کی مثنویون بہار عشق و زہر عشق خصوصاً زہر عشق کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ کسی دوسری مثنوی کے حصہ مین نہین آیا، اس کی وجہ یہ ہو کہ حسن بیان ولطف زبان محاورون اور روزمرہ کے استعمال، فصاحت و سلاست، سادگی و بے ساختگی جذبات و کیفیات کی مصوری اور جذب وکشش مین کوئی مثنوی زہر عشق اور بہار عشق کا مقابلہ نہین کرسکتی اور اُن کے جیسے بہتر نمونے ان دونون مین ملتے ہین، ان سے اردو کی دوسری مثنویان خالی ہین، اور اس وصف مین گلزار نسیم اور سحر البیان بھی اپنی تمام خصوصیات کے باوجود ان کا مقابلہ نہین کرسکتین، زہر عشق پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن بہار عشق کا پورا حق ادا نہین کیا گیا تھا، مصنف نے اس کتاب مین اس کو ادا کیا ہے، وہ صاحب ذوق ادیب و نقاد ہین، اس لئے بڑی خوبی سے زہر عشق اور بہار عشق کا تجزیہ کرکے ان کی خصوصیات اور ان کے محاسن و معائب دکھائے ہین، انداز بیان دلکش اور ادیبانہ ہو،

ہماری کتاب قاعدہ پہلا دوسرا اور تیسرا حصہ } مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم اے بی ٹی ناظم درسگاہ جماعت اسلامی، تقطیع بڑی کاغذ کتابت بہتر قیمت فی حصہ مجری عہ پتہ مکتبہ جماعت اسلامی رامپور

مسلمان بچون کی ابتدائی تعلیم کی کتابون کی کمی نہین ہو، لیکن ایسی کتابین بہت کم ہین جن مین ان کی تمام تعلیمی ضرورتون کا لحاظ رکھا گیا ہو، یہ نصاب اسی ضرورت کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے، اس مین اصول تعلیم کے مطابق اردو کی تعلیم کے ساتھ مذہبی واخلاقی تعلیم و تربیت، مفید مذہبی معلومات، تاریخ اسلام کے متفرق مؤثر واقعات، بچون کے ذوق کی دلچسپ حکایات و منظومات وغیرہ وہ تمام باتین موجود ہین جو ایک مسلمان بچے کے لئے ضروری ہین، اسلئے یہ نصاب تعلیمی اور مذہبی دونون حیثیتون سے ان کے پڑھانے کے لائق ہو،

"م"

جلد ۶۶ ماہ شوال المکرم سنہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۵۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۸۲-۸۴

مقالات

الجزیہ	جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین،	۸۵-۱۱۰
ہاروت و ماروت	مولانا ابو الجلال ندوی	۱۱۱-
الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ	مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو،	۱۳۲
شہاب الدین محمود آلوسی	جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی	۱۳۳-۱۴۴

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک	پروفیسر رام پرشاد کھوسلا بی اے آکسن،	۱۴۵، ۱۵۱
کثیر التصانیف مصنفین	"ض ع"	۱۵۱-۱۵۳

ادبیات

رنگ تغزل	جناب عارف عباسی بلیاوی	۱۵۴-۱۵۵
حشر جذبات	جناب ثاقب کانپوری	۱۵۵-
مطبوعات جدیدہ	"م"	۱۵۶-۱۶۰

شذرات

اس صوبہ مین اردو زبان کی تعلیم کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہین نکلا، تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کسی حد تک اردو کا بھی حق مان لیا گیا، اور اسکو بھی تعلیم گاہون مین بار مل گیا لیکن اسکی جو شکل اختیار کی گئی ہے، وہ عملاً بے نتیجہ ہے، اور شعبۂ تعلیم کے حکام اور عہدہ دارون کی اردو دشمنی کی بنا پر اس اجازت سے بھی پورا فائدہ نہین اٹھایا جا سکتا،

(۲)

اس کی تفصیل یہ ہی کہ نئے نظام تعلیم مین بنیادی طور پر یہ مان لیا گیا ہی کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان مین دیجائے گی، اور مادری زبان وہ مانی جائے گی، جو بچون کے والدین بتائین گے، اس اصول کے مطابق پرائمری تعلیم مین اردو کو بھی ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے، اور اس کی کتابین بھی ملتی ہین لیکن اس کے متعلق احکام اتنے مجمل ہین کہ اُن سے فائدہ اٹھا کر پرائمری اسکولون سے عملاً اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے، اور صاف جواب ملتا ہے کہ اردو کی تعلیم کا انتظام نہین ہو سکتا، اگر کسی اسکول مین کسی مجبوری کی بنا پر اس کا انتظام ہی بھی تو اردو کے ساتھ ہندی کی تعلیم بھی ضروری ہے، حتی کہ اسلامی مکاتب بھی اس پر مجبور ہین، اس سے بچون پر دہرا بار پڑتا ہے، اور جب اعتراض یا گرفت کا خطرہ ہوتا ہی تو یہ جواب دیا جاتا ہی کہ اردو مین پڑھنے والے لڑکے ہی نہین ملتے، یہ جواب ان مقامون کے لئے جہان مسلمانون کی آبادی بہت کم اور محض ادنی طبقون پر مشتمل ہو کسی حد تک قابلِ قبول ہو سکتا ہی لیکن ان بڑی آبادیون کے لئے جہان ہر طبقہ کے مسلمان ہون، یہ عذر لنگ کسی حیثیت سے بھی قابلِ سماعت نہین، ضلع اعظم گڈھ مین مسلمانون کی بڑی بڑی بستیان ہین لیکن کسی پرائمری اسکول مین اردو مین تعلیم کا انتظام نہین یہی حال دوسرے اضلاع کا بھی ہوگا،

جونیر ہائی اسکول یعنی چھٹے ساتویں آٹھویں میں ہندی لازمی ہو اور اردو کی حیثیت جنرل سائنس اور انگریزی کے ساتھ اختیاری مضمون کی ہو، چنانچہ جن اسکولوں میں جنرل سائنس کی تعلیم کا انتظام ہے، وہاں اُس کے ساتھ صرف ایک اختیاری مضمون لیا جا سکتا ہے، جو ظاہر ہے کہ اپنی اہمیت کی بنا پر انگریزی زبان ہوگی، اس طرح ان اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا کوئی موقع ہی نہیں رہ جاتا، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی طالب علم اردو لینا چاہے تو بھی اس کو مختلف قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً ہندو اسکولوں میں جن کی بڑی تعداد ہے، اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے گورنمنٹ اسکولوں میں ممکن ہو یہ صورت نہ ہو لیکن موجودہ ذہنیت میں وہاں بھی اردو کی تعلیم دشواریوں سے خالی نہ ہوگی، اس لئے دیگر مسلمانوں کے اسکولوں میں جن کی تعداد بہت کم بلکہ برائے نام ہے، اردو باقی رہ گئی ہے، اُن کے لئے یہ مشکل ہے کہ اردو کی کتابیں نہیں ملتیں، اردو سے بے اعتنائی کا یہ حال ہو کہ اس سال کے نصاب میں دوسری تمام اختیاری بانوں حتی کہ بنگالی تک کی کتابیں مقرر کر دی گئی ہیں لیکن اردو کتابوں کا کہیں نام نہیں ایسی حالت میں جن اسکولوں میں اردو ہے بھی وہ کونسی کتابیں پڑھائیں، سکنڈری ہائر اسکولوں میں بھی کم و بیش اسی قسم کی مشکلات ہیں، اس پر مستزاد یہ ہو کہ ان میں ذریعۂ تعلیم ہندی کر دی گئی ہو اور ۵۲ء سے امتحانات کے جواب بھی ہندی میں دینا ہونگے، ایسی حالت میں اردو کی حیثیت اور اہمیت کیا رہ جاتی ہے، اس سلسلہ میں اردو کی جانب سے یہ بنیادی غفلت بھی قابل ذکر ہے، کہ اس سال سے ٹریننگ اسکولوں سے اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند دنوں میں اردو پڑھانے والے اساتذہ نہ ملیں گے،

(۰)

اگر اردو کے بارہ میں گورنمنٹ کی پالیسی اعتراض سے بچنے کے لئے اس کی تعلیم کی محض قانونی اجازت نہیں بلکہ وہ درحقیقت اسکی تعلیم بھی چاہتی ہو تو ان ساری مشکلات کا حل یہ ہو کہ ابتدائی تعلیم کے بارہ میں اسکی پوری چھوٹ ہونی چاہئے کہ جن طالب علموں کی مادری زبان اردو ہوگی، ان کو صرف اردو میں تعلیم دیجائیگی، اسکے ساتھ ہندی پڑھائی جائیگی اور اردو کی تعلیم کے انتظام کے لئے طلبہ کی تعداد بھی متعین کر دینی چاہئے تاکہ اجمال کی وجہ سے

اردو کو ختم کردینے کی گنجایش باقی نہ رہے جونیر ہائی اسکول مین ایک کے بجائے دو اختیاری مضمون کردیئے جائین تاکہ دوسرا اہم مضامین کے ساتھ اردو لینے کی گنجایش بھی باقی رہے، کم از کم گورنمنٹ اسکولون مین جو اس کے اختیار مین ہین اردو کی تعلیم کے احکام پر سختی کیساتھ عمل کرایا جائے سکنڈری ہائر اسکولون مین جو اردو مین تعلیم دینا چاہین انکو اس کی اجازت دیجائے اور اُس کے نصاب کی کتابین مہیا کیجائین، امتحان کے سوالات کے جوابات اردو مین بھی دینے کا اختیار دیا جائے، ٹریننگ اسکولون مین اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جن مقامون پر مسلمانون کی کافی آبادی ہو وہان اُردو کے مستقل پرائمری اور جونیر ہائی اسکول قائم کئے جائین جن مین صرف اردو ذریعہ تعلیم ہو، اس مین کوئی دشواری نہین ہو کیا صوبہ متحدہ مین اردو کی وہ حیثیت بھی نہین ہے، جو بمبئی مین ہے، وہان گجراتی اور مرہٹی کے ساتھ اردو کے بھی مستقل اسکول قائم کئے گئے ہین، اردو سے اس بے اعتنائی کے باوجود اس صوبہ سے اس کا اتنا تعلق تو ماننا ہی پڑے گا کہ

گو یان نہین پہ یان سے نکالی ہوئی تو ہے   اس کو بھی اس دیار سے نسبت ہے دور کی

ورنہ موجودہ صورت مین تو اردو کی تعلیم اور اس کا باقی رہنا ممکن نہین ہے۔

انجمن ترقی اردو نے اردو کے متعلق شعبۂ تعلیم کی جملہ شکایتون اور بے عنوانیون کی تحقیقات اور اس کے تدارک کے لئے لکھنؤ مین جو کمیٹی مقرر کی ہو ضرورت ہے کہ تمام اضلاع بلکہ ضلع کی بڑی بڑی آبادیون مین اسکی سب کمیٹیان قائم کیجائین، جو اپنے یہان کی تعلیمی شکایات کو لکھنؤ کی مرکزی کمیٹی تک پہنچائین، اب اردو کا تحفظ اور اس کی بقا صرف اس کے حامیون کی کوشش پر منحصر ہے، اس لئے گورنمنٹ نے جس حد تک بھی اسکی تعلیم کی اجازت دی ہو اس سے فائدہ اٹھانے کی تمام شکلین اختیار کرنی چاہئین، اور باقی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد جاری رکھنی چاہئے، اس کے لئے عمل اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، اگر اردو کے حامی ہمت جرأت اور استقلال سے کام لین تو گورنمنٹ اردو کے واجبی حقوق ماننے پر مجبور ہو گی،

مقالات

الجزیہ

از

مولانا سعید انصاری سابق رفیق دار المصنفین

(۲)

جزیہ اور قرآن جزیہ کے متعلق یہ غلط فہمی رفع کرنے کے بعد کہ وہ ذلت کا مرادف تھا، آیت جزیہ پر بحث اور مفسرین کے اقوال سے صغار کی تشریح کی جاتی ہے، سر جدو ناتھ سرکار کی طرح بہت سے معترضین اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، اور اس سے جزیہ کی ذلت کا مفہوم نکالتے ہیں، بلا شبہہ بعض مفسرین اور فقہاء نے جزیہ کو ایسا ہی سمجھا ہے لیکن اسلامی حکومتوں کے عمل سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی، اس لئے اس کی حیثیت ان فقہاء اور مفسرین کے ذاتی اقوال سے زیادہ نہیں ہے،

قرآنی تعلیمات پر عمل کا سب سے مکمل نمونہ عہد رسالتؐ اور عصر خلفائے راشدینؓ ہے، اور ان مبارک زمانوں میں صغار (ذلت) کا مطلق پتہ نہیں چلتا، چنانچہ مفسرین کی جماعت میں سے ایک بڑے عالم علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب جنہوں نے تفسیر سراج المنیر ۹۶۶ھ میں تالیف کی تھی، اپنی اسی کتاب (ص ۶۰۲ جلد ۱) میں لکھتے ہیں،

تفسیرہ ان یجلس الآخذ ..... اوس کی یہ تفسیر کہ یوں غیر مسلم کو ذلیل

مردود، بان ھذہ الھیئۃ باطلۃ ودعوی سنیتھا او وجوبھا اشد بطلانا، ولم ینقل ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولا احدا من الخلفاء الراشدین فعل شیئا من ذالک وعلی تفسیرھا بما ذکر یمتنع التوکیل اذا قیل بوجوبہ

کیا جائے) مردود ہے کیونکہ یہ (ذلیل کرنے کی) شکل غلط ہے اور اس کے سنت یا واجب ہونے کا دعوی کرنا اور بھی غلط ہے اور یہ منقول نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین میں سے کسی نے اس میں سے کچھ بھی کیا ہو (یعنی ذات کا کوئی طریقہ بھی اختیار کیا ہو) اور اس تفسیر کے بموجب جب یہ ہیئت تذلیل بھی ضروری ہو تو

(ابوحیان غرناطی اور ابن قیم وغیرہ کی تشریحات آگے آتی ہیں)

قرآن کے ایک شارح اور عالم اسلامی کے ایک مشہور مفسر کے اس دعوی کے بعد ہم کو حق پہنچتا ہے کہ پروفیسر حبیب اللہ سرکار کی تاریخ والی سے ان واقعات کا استفادہ کریں جو غیر مسلموں سے وصول جزیہ کے وقت اسلامی دفاتر میں بطور اہانت و تذلیل پیش آئے ہوں، اس سرکار نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے شبہہ بعض کتابوں میں موجود ہے لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کم از کم ہندوستان میں اس پر عمل بھی ہوتا تھا،

صغار کی بحث | بہرحال قرآن مجید میں جزیہ کے متعلق جو آیت ہے وہ یہ ہے۔

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ و لا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم

تم لڑو ان لوگوں سے جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں، نہ آخر دن پر، اور نہ حرام سمجھتے ہیں ان چیزوں کو جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچا مذہب اختیار کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک

صَاغِرُوْنَ، (توبہ) کہ وہ جزیہ دین، ہاتھ سے اور وہ پست ہون

اس آیت مین چند امور غور طلب ہین،

۱- یہ تمام غیر مسلمون کے متعلق نہین ہے، بلکہ اس کا تعلق خاص اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے ہے،

۲- تمام اہل کتاب کے متعلق بھی نہین ہے، بلکہ ایک خاص گروہ کے متعلق ہے، جو اسلام کا دشمن تھا،

۳- سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ برأت مین جن مشرکون یا یہود و نصاریٰ سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، اُن مین یہ معائب موجود تھے، معاہدہ پورا نہ کرنا، مسلمانون کے خلاف دشمن کو مدد دینا، مسلمانون کے عہد اور قرابت کا لحاظ نہ کرنا، زبان سے محبت ظاہر کرنا، اور دل مین عداوت رکھنا، جنگ پر لالچ، اسلام سے نومسلمون کو برگشتہ کرنا، ظلم، اسلام پر حملہ کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے جلا وطن کرنا، زیادتی مین پہل کرنا، معمولی مذہبی خدمتون پر فخر کرنا، خاص یہود و نصاریٰ مین یہ عیوب تھے، کفر، یہود حضرت عزیرؑ کو اور عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، شرک حضرت مسیحؑ احبار اور رہبان کو خدائی کا درجہ دیتے تھے، اسلام کو فنا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس سے لوگون کو برگشتہ کرتے تھے، غلط طریقون سے مال کھا جاتے تھے، کار خیر مین سونا چاندی خرچ نہین کرتے تھے،

۴- ظاہر ہے کہ جو فرقہ مذہبی اور اقتصادی خرابیون کے ساتھ ساتھ سیاسی حیثیت سے مسلمانون کا مد مقابل ہو، جو اسلام کو فنا کرنے پر تیار رہو، جو نومسلمون کو ورغلاتا ہو، اس کی سزا اس سے زیادہ نرم اور مناسب کیا ہو سکتی ہے کہ اوس کو لڑ کر زیر کیا جائے، اور اپنا ماتحت بنایا جائے،

۵- ایسے لوگون کا ماتحت ہونا اور محصول (جزیہ) ادا کرنا، نہ صرف ان کے نقطۂ نظر بلکہ تمام دنیا کے نقطۂ خیال سے ذلت اور پستی کا مرادف ہے، خواہ حاکم ان کو ذلیل سمجھے یا نہ سمجھے،

۶- چونکہ یہ لوگ علانیہ اسلام کے دشمن تھے، اس لئے تہدیداً خدا نے فرمایا کہ مسلمانون کو ان سے برابر لڑتے رہنا چاہیئے تا وقتیکہ یہ پست ہو کر محصول نہ ادا کرین،

۷۔ آیت میں دو لفظ ہیں جن سے صغار کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے، عن ید اور صاغرون

۸۔ عَن یدٍ کا مطلب بعض لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اصالۃً جزیہ کی رقم ادا کرنی چاہئے، وکالۃً داخل نہیں ہوسکتی لیکن یہ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے، فقہ کی متعدد کتابوں میں اس کی تصریح آئی ہے کہ اصالۃً حاضر ہونا ضروری نہیں، گو بہتر ہے [۱]، اور آج بھی عدالتوں، بنکوں، اور ڈاکخانوں میں روپیے کے کاروبار کے وقت اصالۃً موجود رہنا بہتر سمجھا جاتا ہے، خود اورنگ زیب کے زمانہ میں بھی اصالۃً حاضری ضروری نہ تھی، چنانچہ ۱۰۹۵ھ مطابق ۲۸ سنہ جلوسی میں جتوڑ کے رانا نے جب اس شرط پر صلح کی کہ

"قبول جزیہ بجد افزودن، دو سہ پرگنہ عوض زر جزیہ از ملک خود" [۲]

تو اس شرط کو قبول کیا گیا، حالانکہ اگر اصالۃً زر جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہوتا، تو نہ پرگنے اس کا عوض ہوسکتے تھے، اور نہ اپنی ریاست کے پایہ تخت میں موجود رہنا کافی ہوسکتا تھا،

۹۔ عَن یدٍ کے اور بھی معنی ہیں، امام ابن العربی (م ۵۴۳ھ) نے احکام القرآن میں پندرہ قول نقل کئے ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ ید کے حقیقی معنی مراد لئے جائیں یا مجازی، اگر حقیقی معنی مراد ہوں تو اصالۃً زر جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہے، اور اگر مجازی معنی لئے جائیں، تو بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، چنانچہ اس دوسری صورت میں ید کے حسب ذیل معنی بھی ہوسکتے ہیں، ہاتھوں ہاتھ (یعنی دینے والا اپنے ہاتھ سے حاکم جزیہ کے ہاتھ میں دے، خواہ اصالۃً خواہ وکالۃً) نقد ادا کرے، زر جزیہ کو باقی نہیں رکھنا چاہئے، یا بلا تامل بغیر مطلب (ادا کرے) وغیرہ (ص ۲۰۰ ج ۱ مصر) غرض ان میں سے جو صورت بھی لی جائے صغار (ذلت) کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوتا،

۱۰۔ صاغرون کا لفظ البتہ صغار کو صاف صاف بتاتا ہے، لیکن صغار کی کیا صورت ہو؟ اس میں فقہا مختلف الرائے ہیں، بعض نے اس کی یہ شکل تجویز کی ہے کہ ذمی کو جزیہ کھڑے ہو کر دینا چاہئے، اور

---

[۱] ہدایہ ص ۱۳۰ جلد ۲ [۲] منتخب اللباب ج ۲ صفحہ ۲۶۲ [illegible]

کھڑے ہوکر اپنی رقم داخل کرے لیکن کھڑا رہنا ذلت کی بات نہیں آج عدالتوں بنکوں اور ڈاکخانوں میں عموماً کاروباری آدمی کھڑے ہی رہتے ہیں، کیونکہ بیٹھنے کا انتظام نہ ہوتا ہے اور نہ ہوسکتا ہے، مسلمانوں کی سلطنت میں اگر دفاتر جزیہ میں کھڑے ہوکر رقم داخل کرنا غیر مسلموں کے لئے ضروری تھا، تو معترضین کو اس کے بالمقابل یہ بھی دکھانا چاہئے کہ مسلمانوں کی نشست کا انتظام زکوٰۃ کے دفاتر میں ہوتا تھا، بعض کا قول ہے کہ حاکم جزیہ ذمی سے کہے "اد ذمی! جزیہ دے" اس قول کو سرجدوناتھ نے اپنی تاریخ (ص ۲۶۹ ج ۳) میں بڑے آب وتاب سے نقل کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اسلامی فقہ کے رو سے وصول جزیہ کا بھی ذلیل طریقہ تھا لیکن یہ کہیں نہیں دکھایا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں اسی طرح جزیہ وصول بھی کیا جاتا تھا، فقہ کی کتابوں میں لکھا ہونا اور بات ہے، اور اس پر عمل ہونا اور بات، اس موقع پر علامہ ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) کی عبارت غور سے پڑھنے کے قابل ہے، وہ البحر المحیط (۲۹ جلد ۵) میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے ذلت کی جو صورتیں لکھی ہیں، ان میں آیۂ قرآنی میں ایک کا بھی تذکرہ نہیں اسی طرح امام ابن قیم (۷۵۱ھ) کی یہ رائے قابل توجہ ہے،

وھذا کلہ مما لا دلیل علیہ	یہ تمام باتیں بے دلیل ہیں، اور آیت
ولا ھو مقتضی الآیۃ ولا نقل	ان کو نہیں چاہتی، اور نہ رسول اللہ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا	صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے یہ باتیں
الصحابۃ (فتح البیان ص ۹۲ جلد ۴)	منقول ہیں،

علامہ شربینی کا وہ قول بھی دیکھنا چاہئے جس میں انھوں نے تصریح کی ہے کہ اہانت کی یہ صورت علماء ہی اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، نواب صدیق حسن خان بھی لکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی کوئی دلیل نہیں ہے (فتح البیان ص ۹۲ ج ۴)

بعض نے صغار کے زیادہ مناسب معنی بیان کئے ہیں یعنی جزیہ دینا خود ذلت ہے اس بنا پر

غیر مسلمون کے لئے ذلت کی شکلین پیدا کرنے کی ضرورت نہین ہے) یہ امر کہ محکومی اور غیر قوم کی اطاعت ذلت ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ، آسٹریلیا، آئرلینڈ اور اُن کے سیاسی رہنماؤن سے دریافت کرنا چاہیئے

بہرحال طبری (۳۱۰ھ) محی السنۃ بغوی (۵۱۶ھ) اور امام فخرالدین رازی (۶۰۶ھ) نے اپنی تفسیرون مین یہ خیال بھی نقل کیا ہے،

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ صغار یہ ہے کہ اسلامی قانون (معاملات کے متعلق) اُن پر عائد ہوتا ہے، یعنی وہ مذہبی مسائل کے علاوہ دنیاوی باتون مین قانون اسلامی کی پابندی کرتے ہین، یہ خیال جو دنیائے اسلام کے ایک بڑے امام کا ہے، تمام خیالون سے زیادہ صحیح ہے، اور محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل (ص ۶۷، ج ۲) مین امام ابن مکرم (۷۱۱ھ) نے لسان العرب (ص ۲۹، ج ۶) مین اور شربینی نے (۹۷۷ھ) نے سراج المنیر مین اس کو نقل کیا ہے، تیسرے اور چوتھے نظریون کے مطابق صغار کا مفہوم محض ذہنی اور خیالی رہ جاتا ہے، اور اس کا تعلق مسلمان حکام سے باقی نہین رہتا، اب ان تمام مباحث کا حاصل یہ ہوا کہ

(۱) قرآن مجید کے رو سے صغار کے مستحق تمام غیر مسلم نہین ہین، بلکہ وہ مخصوص اہل کتاب ہین جو اسلام اور مسلمانون کے دشمن تھے، اور جن سے لڑائی کا حکم دیا گیا تھا،

(۲) اور غیر مسلم اس لئے جزیہ دیتے تھے کہ ان کے محصول کا یہی نام تھا، اور کوئی نیا نام رکھا نہین گیا تھا،

(۳) صغار کا لفظ قرآن مجید مین دشمنانِ اسلام کے لئے تہدیداً استعمال کیا گیا ہے اور اس پر خود عہد رسالت مین بھی عمل نہین ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زجر و توبیخ ویسی ہی تھی جیسی کہ ماں باپ اپنی اولاد کو کرتے ہین، اس کا مقصد مسلمانون کے دلون مین غیر مسلمون کی طرف سے منتقمانہ جذبات کی پرورش نہ تھی،

(۴) جو غیر مسلم دشمنِ اسلام نہین ہین، اُن کے لئے صغار بھی نہین ہے،

(۵) صغار کا مطلب ذلیل برتاؤ نہین، بلکہ ماتحتی اور سیاسی معاملات مین اسلامی قانون کی پابندی ہے، معزز ماتحت بھی بہرحال ماتحت ہے، یعقوب بن لیث الصفار کا قول ہو کہ کمتر جون تو باید زیستن[۵۱]

اب ضرورت ہو کہ ہم ہندوستانی سرکار اور ہمارے معترض ارسطو[۵۲] اس پر غور کرین کہ اسلامی عہدِ حکومت مین غیر مسلمون کے ساتھ کیا ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا:

جزیہ کی شرح ہندوستان کے جزیہ کی (جس کا تذکرہ منوسمرتی مین ہے) کوئی شرح منوجی نے مقرر نہین کی، بلکہ ہر شخص پر برابر محصول لگایا (باب ۷، دفعہ ۱۲۸) جو ظاہر ہے کہ بالکل خلاف انصاف تھا، نوشیروان کے فرمان مین رعایا کی مالی حالت کے اختلاف سے جزیہ بھی مختلف مقرر کیا گیا، یعنی ۱۲، ۸، ۶، ۴، درہم (طبری ص ۹۶۲ جلد ۲) لیکن اس مین سلطنت کے مختلف صوبہ جات کی اقتصادی حالت کو سامنے نہین رکھا گیا تھا، بلکہ امرا، متوسطین اور غربا، کی یکسان حالت تمام صوبون مین فرض کر لی گئی تھی اور یکسان جزیہ لگا دیا گیا تھا، اُس کے ساتھ ہی خواص و عوام کی نہایت ناگوار تفریق پیدا کی گئی تھی

لیکن اسلام مین معاشیات کا سوال ابتدا سے سامنے تھا، اس لئے مختلف ممالک کی اقتصادی حالت کے مطابق وہان کی رعایا پر جزیہ مقرر ہوا، اور اس کی مختلف شرحین قرار دی گئین، اہلِ یمن سے بحساب ایک دینار سالانہ، اہلِ شام سے ۴ دینار[۵۳]، مکہ کے ایک نصرانی سے ایک دینار[۵۴]، عراق کی رعایا

---

[۵۱] زین الاخبار ص ۱۳ تالیف ابو سعید عبد الحیٔ گردیزی درحدود ۴۴۴ھ [۵۲] اس مضمون مین ان تمام اعتراضات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جو جزیہ پر کئے جاتے ہین، عرصہ ہوا آریہ گزٹ لاہور مین آرسطو کے فرضی نام سے جزیہ کے خلاف ایک مضمون نکلا تھا، اس مضمون مین ارسطو کے اعتراضات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے [۵۳] احکام القرآن ابن عربی ص ۳۷۷، جلد ا،

[۵۴] کتاب الخراج یحیٰی بن آدم ص ۷۳،

سے (بعض روایات کے مطابق) ۴۸ درہم سالانہ[۱] اور عام ممالک و صوبہ جات سے ۱۲، ۲۴، ۴۸، درہم سالانہ فی کس جزیہ وصول کیا جاتا تھا، یہ آخری شرح جیسا کہ بالتصریح معلوم ہے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے زمانہ مین برابر قائم رہی[۲] اور امام ابو حنیفہؒ، امام محمد بن حسنؒ اور (بروایت مصنف فتح البیان) امام احمد بن حنبلؒ نے اسی کو اختیار کیا[۳] جزیہ کا عالمگیری فرمان اگرچہ مرآت احمدی (ص ۳۱۳ ج ۱) مین بلفظ منقول نہین ہے لیکن سرجادو ناتھ سرکار نے اس کا خلاصہ نقل کیا ہے، اس کی دفعہ ۲ مین یہی شرح موجود ہے، جو ان کے نزدیک ایک ناقابلِ برداشت بوجھ ہے، جو غریبون کے کاندھون پر ڈالا گیا (اس کا جواب آگے آتا ہے)،

معاشی حیثیت سے ایک اور اصول زرِ جزیہ کے متعلق اختیار کیا گیا ہے، قدیم ہندوستان مین محصول نقد کی شکل مین لیتے تھے؛ مثلاً روپیہ، دہرن، ستمان، آتشک، اپن وغیرہ (منوسمرتی باب ۸، دفعات ۱۳۵ تا ۱۳۸) ایران مین غالباً طبری درہم تھے، چین کا کچھ پتہ نہین لیکن اسلام مین ہر پیشہ والے کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ جزیہ کی نقد قیمت کے بجائے اپنے اپنے پیشہ کی چیز کو دیسکتا ہے؛ البتہ مردہ سور اور شراب جزیہ کی رقم مین قبول نہین کئے جائین گے[۴] اس طرح جو سہولت غیر مسلم رعایا کو اسلامی سلطنت کے اندر میسر تھی، وہ دوسرے ممالک مین نہ تھی، اور نہ آج تک کسی ملک مین میسر ہے،

جزیہ کون لوگ دیتے تھے قدیم ہندوستان مین ہر شخص سے جزیہ لیا جاتا تھا، (منوسمرتی دفعہ ۱۳۷، باب ۷) جن مین عورتین اور بچے بھی شامل تھے، ان کو مستثنیٰ نہین کیا گیا ہے، غیر مستطیع بھی کچھ نہ کچھ دیتے تھے (دفعہ ۴۰۵، باب ۸) جو لوگ محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، وہ ہر مہینہ مین ایک دن بیگار مین پکڑے جاتے تھے (دفعہ ۱۳۸، باب ۷) ایران مین اس سے کم سختی تھی، وہان ۲۰ اور پچاس سال کے درمیان عمر والے مرد جزیہ دیتے تھے، اور عورتین مستثنیٰ تھین، چین مین اس سے بھی زیادہ سہولت تھی، وہان صرف مردون

[۱] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۲۲ [۲] عینی شرح کنز ص ۳۲۰ ج ۱ [۳] فتح البیان ص ۵۰ جلد ۴ [۴] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۷۰)

سے جزیہ لیا جاتا تھا جن کے لئے ۱۸ سے ۶۰ سال تک عمر کی شرط تھی،

اسلام مین ان تمام ممالک سے زیادہ جزیہ مین رعایت کی گئی، صرف عاقل بالغ اور کام کرنے کے قابل مردون پر محصول لگایا گیا اور کام کی حیثیت سے اُن کے ۳ طبقے قرار دیئے گئے،

۱- غنی جو دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ کا مالک ہو،

۲- متوسط جو ۲۰۰ درہم سے دس ہزار تک کا مالک ہو،

۳- فقیر جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا اس کی آمدنی ضروریات زندگی سے زائد نہ ہو،

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۷۰) مین اس کی پوری تفصیل بیان کی ہو کہ صراف، بزاز، مالک جائداد، تاجر، مطب کرنے والے طبیب مین جو غنی اور متوسط ہون، وہ اپنی آمدنی کے مطابق جزیہ ادا کرین، ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگر، مثلاً خیاط، رنگریز، موچی وغیرہ تیسرے درجہ مین ہین، وہ اس کی شرح کے مطابق محصول دین، اس موقع پر سرجدو ناتھ نے بعض فقہار کی رائے کے مطابق صرافون وغیرہ کو پہلے درجہ مین اور خیاطون وغیرہ کو تیسرے درجہ مین رکھکر درمیانی طبقہ کو غائب کر دیا ہے، (تاریخ عالمگیر ص ۲۶۹ ج ۳) حالانکہ امام ابو یوسف کی طرح اور فقہار نے بھی صرافون وغیرہ کے دو درجے قرار دیئے ہین، غنی اور متوسط،

ایسے اپاہج، اندھے اور لنگڑے لولے جو متمول ہون اور جن کا کاروبار اچھا چلتا ہو اُن پر جزیہ ہے، اسی طرح دولت مند مقدس راہب اور پجاری بھی اس سے مستثنیٰ نہین ہین، (اورنگزیب کے عہد کے مالدار برہمن بھی اسی حکم مین آتے ہین)،

کون لوگ جزیہ نہین دیتے تھے قدیم ہندوستان مین صرف تین قسم کے لوگ جزیہ سے مستثنیٰ تھے، معذور، ستر برس کے بوڑھے اور برہمن، (منو سمرتی دفعہ ۳۹۴ باب ۸) ایران مین ۲۰ سال سے کم اور پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگ محصول ادا نہین کرتے تھے، اُن کے علاوہ خاندانِ شاہی معززین

فوج، مذہبی پیشوا دفاتر کے منشی، اور ملازمین سلطنت جزیہ کے مطالبہ سے آزاد تھے، چین میں عورتیں جزیہ نہیں دیتی تھیں، اور ۱۰ سال سے کم اور ۵۰ سال سے اوپر عمر والے مرد بھی مستثنیٰ قرار دئیے دیئے گئے تھے،

اسلام نے عورتوں، بچوں، پاگلوں، غلاموں، محتاج اور ازکار رفتہ بڈھوں، نادار راہبوں، اور بچاریوں (نادار برہمن) اورنگ زیب کے زمانہ میں اسی حکم میں شامل تھے، مفلس، اندھوں اپاہجوں، اور لنگڑے لولوں کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اورنگ زیب نے عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ایک حکم بھیج کر غیر مسلم ملازمین سلطنت کو بھی جزیہ سے بری کیا تھا، مرات احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) میں یہ الفاظ ہیں،

"بندگان حضرت قدر قدرت عنایت اللہ خان را بتمشیت این کار تفویض فرمودند حکم اشرف اعلیٰ شرف صدور یافت کہ از ملازمان سرکار بدولت مدار مواخذہ نکنند، وسوائے این از جمیع ذمیان مطابق شرع شریف بگیرد"

تعجب ہے کہ ہمارے "ارسطو" صاحب کی نظر اس نکتہ اور اس عبارت پر نہیں پڑی، ورنہ وہ یہ تکلیف نہ فرماتے، کہ "۱۶۷۹ء میں اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جزیہ سب سے وصول کیا جائے خواہ اسلامی ہندوستان ہو یا رجپوتانہ کوئی سرکاری ملازم ہو یا نہ" (آریہ گزٹ)

جزیہ کے مصارف معارف عامہ کا بنیادی اصول بہبود عامہ ہے، اور اسلام میں جزیہ کے مصارف کو مختلف مدون میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے، کہ عوام کو ہر مد کے مصارف سے بیشتر میں فائدہ حاصل ہوتا تھا،

۱- مصارف عامہ کی سب سے پہلی اور ضروری مد فوجی انتظام ہے، اور یہ اسی جزیہ کی رقم سے ہوتا تھا امام ابو یوسفؒ نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے،[1]

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۴

واضع علیهم فیها الخراج وفی	اور مین ان (زمینون) پر زمین مین خراج
رقابهم الجزیة یؤدونها	اور اُن کی گردنون مین جزیہ مقرر کرتا ہون
فتکون فیئًا للمسلمین المقاتلة	جس کو وہ ادا کرین گے اور جو مسلمان فوج
والذریة ولمن یاتی من	اور اس کی اولاد اور آئندہ آنے والون
بعدهم،	کے لئے فئے (غنیمت) ہوگا،

یہ فوج سرحدون کے علاوہ بڑی بڑی چھاؤنیون (مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر) مین بھی رہتی تھی، جس کا اسی تقریر مین ذکر ہے، اور یہ سب فوجی وظیفہ دار تھے، خلیفہ کا فقرہ ہے وادر دار العطاء علیهم، اور مبسوط ص ۸، ج ۱۰) مین بھی ہے،

فیوخذ منهم المال لیصرف	یعنی ذمیون سے جو وصول ہوگا، وہ اُن
الی الغزاة الذین یقومون	غازیون کو ملے گا، جو دار الاسلام کی حفاظت
بنصرة الدار	کرتے ہین،

(۲) ایک مد تحصیل کے اخراجات کی تھی، اس سے عمال کو تنخواہ ملتی تھی، مصنف کنز الدقائق (سنہ ۷۱۰ھ) اور صاحب درمختار نے اس کی تصریح کی ہے،

(۳) سول یا دیوانی محکمون کی تنخواہون اور اخراجات کی مدین بہت سی مدین شامل تھین، مثلاً

امور نافعہ (پبلک ورکس) مین پتھر کے پلون (قناطر) اور لکڑی اور مٹی کے پلون (جسور) کی کی تعمیر کا کام اسی مد سے ہوتا تھا، (کنز و درمختار)

محکمۂ عدالت مین قاضیون اور مفتیون کی تنخواہین، (کنز و درمختار) دفاتر قضا کے محررون اور تقسیم کے گواہون کے معاوضہ (کنز و درمختار) اسی سے ادا کئے جاتے تھے،

نیا در کی نگرانی کرنے والے اسی رقم سے تنخواہ پاتے تھے، (کنز و درمختار)

تعلیمات مین علما اور طلبہ کے وظائف اسی سے نکالے جاتے تھے، (درمختار ورد المختار ص ۳۰۲ جلد ۳)

۴۔ مسلمانون کے علاوہ خود ذمیون کے ایسے افراد کو جو قابل امداد ہو جاتے تھے، اسی سے مدد دیجاتی تھی، حضرت خالد بن الولیدؓ نے حیرہ والون کو جو فرمان عطا کیا، اس مین یہ الفاظ درج تھے[۱]

ایما شیخ ضعف عن العمل او	اور جو بوڑھا کام کرنے مین کمزور ہو یا اُس کو
اصابتہ آفۃ من الآفات او	کوئی آفت آگئی ہو، یا مالدار ہونے کے بعد
کان غنیا فافتقر وصار اھل	محتاج ہو گیا ہو، اور اُس کے مذہب والے
دینہ یتصدقون علیہ طرحت	اُس کو خیرات دینے لگے ہون، تو اس کا
جزیتہ، وعیل من بیت المال	جزیہ معاف کیا جائے، اور مسلمانون کے
المسلمین وعیالہ ما اقام	بیت المال سے اس کو اور اس کے بچون
بدار الھجرۃ ودار الاسلام	کو امداد دیجائے جب تک وہ دار الہجرۃ اور د[illegible]

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت مین اور مقامات کے معذور بوڑھون کے لئے بھی یہ عام قاعدہ بنا دیا گیا تھا، اونھون نے ایک دفعہ ایک بوڑھے نابینا یہودی کو ایک دروازہ پر بھیک مانگتے دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جزیہ کی رقم اور دوسری ضروریات کے لئے بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اُس کا اور اُس کے جیسے تمام بوڑھون کا جزیہ معاف کر دیا جائے،[۲]

اسلامی اور غیر اسلامی جزیون کا فرق (۱) اسلامی اور غیر اسلامی محصولون مین نمایان فرق یہ ہے کہ اسلام نے ربانی ذمہ داری کی بنا پر دنیا کا نظم و نسق اپنے ہاتھ مین لیا تھا، اس لئے وہان محصول کا اصل مقصد روپیہ نہ تھا، شمس الائمہ سرخسی (۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۷۷، ۸۲، ج ۱۰) مین جابجا اس کا تذکرہ کیا ہے اور ذمیون کی بقایا رقم (موانید) کے معاف کر دینے کی وجہ بھی یہ بتلائی ہے کہ جزیہ کے ذریعہ مال جمع کرنا

---

[۱] کتاب الخراج ص ۸۵، [۲] ایضاً ص ۷۲

مقصود نہیں ہی، بخلاف اس کے دوسرے ممالک اور اقوام میں محصول کے متعلق ہر زمانہ میں تجھو کی شہنشاہیت کی گرج سنائی دی ہی، جس نے غربا کی جیبین خالی کرا کر امراء کے عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا ہے، اور اس طرح اس بے زبان طبقہ کی سادہ مزاجی اور بھولے پن سے فائدہ اٹھاتی رہی ہے، منوسمرتی باب ۷، دفعہ ۱۳۹ و ۱۴۵ اور باب ۸ دفعہ ۵ بہ خاص طور سے اس سلسلہ میں قابلِ ملاحظہ ہیں۔

(۲) دوسرا عظیم الشان فرق اس سیاسی تخیل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، جو مسلمان اور غیر مسلموں کے اندر "سلطنت" کے متعلق تھا، مسلمانوں نے نظریہ "تولیت" (TrusTee Ship) کا صحیح مفہوم سمجھ کر اپنے کو اس کا پورا عامل بنایا تھا، وہ اپنے کو ملک کا مالک نہیں، بلکہ متوَلی سمجھتے تھے[1] اس لئے انھوں نے محصول رعایا کی مالی حالت کے مطابق لگایا، جس سے اس کی خوشحالی میں فرق نہ آئے، اور ملک کی سرسبزی قائم رہے، بخلاف اس کے دوسری قوموں نے اپنے کو ملک کا متولی نہیں بلکہ مالک سمجھا تھا، اس لئے انھوں نے رعایا کی مالی حالت کے بجائے دوسرے اصول پر محصول متعین کئے، چنانچہ قدیم ہندوستان کے قانون منوسمرتی (باب ۸ دفعہ ۳۹) میں راجہ کو بالتصریح مالک کہا گیا ہے، اور اسی بنا پر یہاں محصول بمعیار خدمات کی ایک شق "مساوات" کا اصول پیش نظر رکھا گیا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ محصول سرکاری خدمات کا معاوضہ ہے، لیکن چونکہ سرکاری خدمات کا تخمینہ انفرادی طور پر ناممکن ہے، اور ان خدمات سے تمام ملک مستفید ہوتا ہے، اس لئے محصول بلا امتیاز بمقدار مساوی قائم ہونا چاہئے، منوسمرتی (باب ۷ دفعہ ۱۲۸) کا حکم اس بارہ میں نہایت صریح اور صاف ہے، لیکن اس اصول میں معاشی حیثیت سے چند نقائص ہیں، یہ مانا کہ خدماتِ منفردہ کا تخمینہ ممکن نہ سہی، تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا، کہ سب

---

[1] صحیح بخاری (کتاب الاعتصام باب یکرہ من التعمق) میں حضرت ابو بکرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، انا ولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر حضرت عمرؓ کا یہ قول لکھا ہے، انا ولی رسول اللہ صلعم وابی بکر، اور مبسوط (ص ۱۸، ج ۱۰) میں ہی، و قولنا دار الاسلام نسبة للولایة،

لوگ سرکاری خدمات سے یکسان مستفید نہین ہوسکتے، اور بالعموم دولتمندون کو غربا کے مقابلہ مین بہت زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے، پھر جب غربا کو اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنا بھی دشوار ہورہا ہو، اور بسر اوقات کے لئے دوسرون کی فیاضی کے دست نگر ہون تو اُن سے ٹیکس طلب کرنا کہان تک قرین انصاف اور وصول کرنا کہان تک ممکن ہے،؟ اس لئے مساوی ٹیکس کا یقینی نتیجہ خود ملک کی تباہی و بربادی ہے[۵۱]

ایران مین مساوات کے بجائے سرکاری خدمات کی انفرادی حیثیت پر نظر رکھی گئی، جس طرح مزدور کو محنت کی اُجرت دیجاتی ہے ٹیکس بھی سرکار کی خدمت کا معاوضہ ہے، اس لئے جو سرکار سے جتنی خدمت لے اسی کے مطابق معاوضہ بشکل ٹیکس ادا کرے، اسی بنا پر ایران مین ۱۲-۸-۶-۴ درہم کی شرح سے مختلف حیثیتون کے لوگون پر جزیہ مقرر ہوا، اور وہ لوگ جو سرکار کے مفہوم کی "وسعت" مین آتے تھے مثلاً اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم، جزیہ سے مستثنیٰ کر دیے گئے لیکن عورتین جو سرکار کے مفہوم مین شامل نہ تھین، قدیم ہندوستان کی طرح ایران مین بھی جزیہ ادا کرتی تھین، معاشی حیثیت سے اس اصول مین بھی متعدد خامیان ہین، سب سے ناگوار چیز تو وہ تفریق ہے، جو اونچے گھرانون اور عوام مین رکھی گئی ہے، حالانکہ محصول کو "فرقہ داری" سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے اسلام مین زکوٰۃ خود خلیفہ کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے، دوسرے سرکاری خدمات اس قدر بے شمار اور اُن کے نتائج اس قدر گوناگون ہین، کہ ان مین کسی شخص کے حصہ کا تخمینہ کرنا بالکل محال ہے، پیرون، فوجون حکام کی تنخواہون، شہر کی صفائی، سڑکون کی درستی، واٹر ورکس، غرض لوکل یا امپیریل محصولون سے ہر شخص کو جو فائدہ پہونچتا ہے، اس کا جداگانہ تخمینہ کیونکر ممکن ہے؟ اور پھر جو ٹیکس ان مصارف کے طلب کیا جائے، وہ سرکاری خدمات منفردہ کے مساوی کیونکر مقرر ہوسکتا ہے،؟،

۵۱؎ اصول معاشیات برنی ص ۲۹۰، ۲۹۹،

کیا شرح جزیہ مین ایران کی تقلید کی گئی ہے

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۱۷۰ ج ۲) نیز اپنے مضامین الجزیہ اور غیر قومون کی مشابہت (مقالات شبلی ج ۱ ص ۲۳۰، ۱۷۶) مین صاف صاف لکھا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے نوشیروانی قواعد جاری کئے تھے، اس سلسلہ مین انھون نے ابو حنیفہ دینوری اور شاہ ولی اللہ صاحب کا نام بھی لیا ہے، اور اصلی ماخذ طبری کو قرار دیا ہے، جس نے یہ الفاظ لکھے ہین،

وھی الوضائع التی اقتدی بھا	اور یہ وہی شرحین ہین، جن کی عمرؓ بن
عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد	الخطاب نے پیروی کی، جب انھون نے
الفرس وامر باجتباء اھل الذمۃ	فارس کے شہر فتح کئے، اور انھون نے اہل
علیھا	ذمہ سے انہی (شرحون) کے مطابق وصول
(طبری ص ۹۹۲ ج ۲)	کرنے کا حکم دیا،

شاہ ولی اللہ صاحب طبری سے متاخر ہین، اس لئے اُن کی رائے عین طبری کی راے ہو سکتی ہے تاہم وہ بھی حضرت عمرؓ کا نام لینے مین تامل کرتے ہین، ابو حنیفہ دینوری (۲۸۲ھ) البتہ طبری سے مقدم ہین، لیکن انھون نے اس کا ذکر ہی نہین کیا ہے، اب رہے، امام طبری (۳۱۰ھ) تو ان کے متعلق حسب ذیل امور قابلِ لحاظ ہین،

(۱) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے جہان جزیہ کی شرح بیان کی ہے، حضرت عمرؓ کی تقلید کا ذکر نہین کیا ہے،

(۲) امام موصوف نے کتاب الخراج (ص ۴۹) مین یہ بھی لکھا ہے کہ عراق فتح ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے وہان کے بعض زمینداروں کو بلایا، اور پوچھا کہ زمین کا محصول تم عجمیون کو کیا ادا کرتے تھے، ؟ انھون نے کہا، ۲۷، فرمایا مین اس پر راضی نہ ہون گا،

۳۔ امام یحییٰ بن آدم (سنہ ۲۰۳ھ) بھی تقلید کے ذکر سے ساکت ہیں،

۴۔ امام طبری (سنہ ۳۱۰ھ) نے آگے چل کر جو عبارت لکھی ہے وہ تمام کتب فقہ اور تاریخ کے خلاف ہے، وہ لکھتے ہیں،

ولم یخالف عمرؓ بالعراق خاصة	اور عمرؓ نے خاص کر عراق میں کسریٰ کی ان
وضائع کسریٰ علی جربان الارض	شرحوں کی مخالفت نہیں کی جو اس نے زمین
وعلی النخل والزیتون والجماجم	کی جریبوں اور کھجور، اور زیتون اور سروں
(ص ۹۶۳)	پر مقرر کی تھیں،

(الف) اس عبارت کی رو سے ذمیوں کے طبقات چار ہونے چاہئیں کیونکہ چار شرحیں طبری نے مقرر کی تھیں (طبری جلد ۲ ص ۹۶۳)

(ب) شرح ۱۲- ۸- ۶- ۴، درہم ہونی چاہیئے،

حالانکہ اسلام نے ۳ طبقے قرار دیئے ہیں، اسی طرح ۴۸، ۲۴، ۱۲ درہم شرح رکھی ہے، اور اس کے حوالے اوپر آچکے ہیں،

(۵) طبری نے اقساط کا جو طریقہ لکھا ہے، مسلمانوں کا طرز عمل اس کے خلاف شہادت دیتا ہے کیونکہ وہ عموماً سالانہ جزیہ وصول کرتے تھے،

(۶) طبری کی روایت کے مطابق کسریٰ نے خاندان شاہی، معززین، فوج، مذہبی پیشوا اور ملازمین سلطنت کو جزیہ سے مستثنیٰ کیا تھا، حالانکہ حضرت عمرؓ نے ایسا نہیں کیا،

(۷) شمس الائمہ سرخسی (سنہ ۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۷۰، ج ۱۰) میں لکھا ہے کہ جزیہ کی مقدار کا علم حضرت عمرؓ کی حدیث سے ہوا ہے، اور یہی اصل ہے، انھوں نے مردوں پر ٹیکس ۱۲ درہم اور ۲۴ درہم اور ۴۸ درہم مقرر کئے، اور مقدار قیاس سے مقرر نہیں ہوتی، اس سے ہم نے سمجھا کہ انھوں (حضرت عمرؓ) نے رسول اللہ صلعم سے سماعت پر اعتبار کیا ہوگا، (یعنی انھوں نے خود یا کسی اور صحابی نے رسول اللہ صلعم سے

سُنا ہوگا،) تو ہم نے اُس کو لے لیا،

(۸) عموماً مفسرین اور فقہاء تقلید کے ذکر سے خاموش ہین،

اب ایک طرف یہ تمام قدماء اسلام ہین جن کی کتابون مین نوشیروان کی پیروی کا ذکر تک نہین ہے اور دوسری طرف مولانا شبلی ہین جن کو طبری کی روایت پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ جزیہ کے اختلاف شرح کو بھی نوشیروانی پیروی کی طرف منسوب کر دینا چاہتے ہین، حالانکہ محصول اور اس کی مختلف شرحین مقرر کرنا نوشیروان کا کوئی تمغاے امتیاز نہ تھا، یہ تو معمولی سی بات ہے، اور ہر مدبر اس کو سوچ سکتا ہے۔

جزیہ اور سیاسیات

اب تک جزیہ کے متعلق جو گفتگو کی گئی، وہ قانونی (فقہی) اور کسی حد تک تاریخی پہلو لئے ہوے ہوئی تھی، لیکن اب یہ دکھایا جائے گا، کہ پالیٹکس مین اس کی کیا حیثیت ہے ؟

(۱) اوپر جزیہ کے متعلق فقہاء کے جو سات نظریات بیان کئے گئے ہین، اُن سب کا قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ وہ ایک محصول ہے اور محصول کی تعریف بسٹیبل (Bastable) نے اپنی کتاب "سرکاری مالیات" (Public Finance) مین اس طرح کی ہے،[۱]

"محصول (Tax) کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بلا لحاظ اس کی رضامندی یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لئے حاصل کیا جاتا ہے"،

پروفیسر محمد الیاس برنی ایم اے، ال ال بی نے اصول معاشیات (ص ۲۹۲) مین اس تعریف کو یون واضح کیا ہے،

"ٹکس سے مراد دولت کا وہ حصہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارف حکومت کے واسطے ادا کرین"،

پھر اسی کتاب اور اپنی دوسری تصنیف علم المعیشت مین اس تعریف کے بعض الفاظ کو غور طلب قرار

---

[۱] معاشیات ص ۳۵۲ مصنفہ مولوی حبیب الرحمن ایم اے ایل ایل بی جامعۂ عثمانیہ،

دیا ہے، جن میں ایک لفظ دولت بھی ہے وہ اس لفظ کے متعلق لکھتے ہیں،

اصطلاحِ "دولت" اپنے وسیع معنون میں استعمال کی گئی ہے اگویا مال و جائداد کے علاوہ "خدمات"

بھی اس میں شامل ہیں چنانچہ بیگار بھی ایک ناپسندیدہ قسم کا ٹکس ہے؛

لفظ "دولت" کی اس وسعت کو سمجھنے کے بعد جزیہ کے متعلق ایک بڑا مغالطہ دور ہو جاتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۲۷۰ جلد ۲) میں جہان جزیہ کی بحث لکھی ہے، اس کو حفاظت کا معاوضہ قرار دے کر تاریخ سے چند تائیدی دلائل بھی تحریر فرمائے ہیں، اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"اس سے بھی زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ جن لوگوں سے کبھی کسی قسم کی فوجی خدمت لی گئی، اُن کو باوجود اُن کے مذہب پر قائم رہنے کے جزیہ معاف کر دیا"

پھر شواہد میں ۱۷ھ اور ۲۲ھ میں عراق، آذربائجان، آرمینیہ، اور جرجان کے غیر مسلموں سے جو معاہدے ہوئے تھے، اُن کو نقل کیا ہے،

لیکن "معاشیات" میں دولت کا لفظ جن عام معنی میں استعمال ہوتا ہے، اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے، کہ ذمیون کی جنگی خدمت بھی "دولت" کے وسیع مفہوم کے اندر داخل تھی، اس لئے اپنی جان کو لڑائی کے لئے پیش کرنا، گویا زرِ جزیہ کو نقدی صورت میں ادا کرنا تھا، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جزیہ معاف نہیں کیا گیا، بلکہ دوسری شکل میں وصول یا قبول کیا گیا،

حقیقت یہ ہے کہ جو سلطنت کسی ملک پر سیاسی حیثیت سے تسلط حاصل کرتی ہے وہ قانوناً اس کی مجاز ہے کہ بروقتِ ضرورت رعایا سے جانی اور مالی خدمات کا مطالبہ کرے، مسلمانون کی ابتدائی سلطنت (خلافتِ راشدہ) جو آج کل کے اعلیٰ ترین جمہوری طرزِ حکومت "منتقیہ" سے بدرجہا بہتر تھی، اس نے بھی اپنی رعایا سے دونون قسم کی خدمتین لین،

۱۔ ابتداءً جیسا کہ ہر قوم میں ہوتا ہے، صرف مسلمان فوج میں شامل تھے، ۱۷ھ میں جب غیر مسلمون

کا اس کو اعتماد حاصل ہوگیا، تو اُن کو بھی فوج مین شرکت کی اجازت مل گئی، جو حفاظت سلطنت کے لئے جانی امداد تھی ؟

۲- مالی امداد مصارفِ حکومت کے لئے تھی جس کو مسلمان بشکل زکوٰۃ اور غیر مسلم بصورتِ جزیہ دیتے تھے، اس کو فوجی خدمت سے کچھ واسطہ نہ تھا، جس طرح صاحب نصاب مسلمان فوجی خدمت کی وجہ سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہوتے تھے، مستطیع غیر مسلمون کا جزیہ بھی معاف نہین کیا جاتا تھا؟ خلافتِ راشدہ کے بعد شخصی سلطنتون مین بھی یہ نکتہ ہمیشہ ملحوظ خاطر رہا ہے، چنانچہ سلطنتِ مغلیہ مین برابر راجپوتون کی فوج رہتی تھی، اور خود شہنشاہ (اورنگ زیب) جس پر ارسطو نے اعتراضات کئے ہین، راجپوتون کو فوج مین بھرتی کرتا تھا، اور اُن سے فوجی خدمت لینے کے باوجود جزیہ بھی لیتا تھا، چنانچہ ہمارا معترض حیرت سے لکھتا ہے،

"مگر چلو ہم ایک لمحہ کے لئے یہ فرض کرلیتے ہین کہ یہ فوجی خدمت کا معاوضہ تھا، جو غیر مسلمون سے لیا جاتا تھا، تو اُن ہندوؤن سے جزیہ کا وصول کرنا کسی طرح بھی جائز نہ تھا، جو فوج مین ملازم تھے، پھر اورنگ زیب کا وسطِ ہند اور راجپوتانہ کے راجپوت راجاؤن سے جزیہ وصول کرلینا کیسے درست ہوسکتا ہے؛...... پھر فوج کے ساتھ امیر جزیہ مقرر کئے گئے تھے، جو جزیہ وصول کرتے تھے، ۱۲ر جولائی ۱۶۸۱ء (۱۱۰۰ھ) کا اعلان اُن فوجی امیرون کا ذکر کرتا ہے، اس کا صاف مطلب ہے کہ فوج مین ہندوؤن سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ فوج مین اُن کی موجودگی کی اور کیا تاویل ہوسکتی ہے، پھر دوسری طرف کوئی ایسا حکم نہین جس مین فوجی ملازم ہندوؤن کو جزیہ کی ادائگی سے مستثنیٰ کیا گیا ہو، یہ صرف معمولی فوجی ملازمون سے ہی وصول نہین ہوتا تھا، بلکہ ہندو افسر تک اس حکم سے باہر نہ تھے"؛ (آریہ گزٹ)

لیکن معترض کی حیرت کا اصلی سبب علامہ شبلی مرحوم کا یہ خیال ہے کہ جزیہ صرف جنگی خدمت کا معاوضہ تھا، اور گو تاریخی واقعات سے انھون نے اس کی تائید بھی کردی ہے لیکن جزیہ کی سیاسی

حیثیت پر اس کی نظر نہیں گئی تھی، اسی لئے جزیہ کو فوجی خدمت کا معاوضہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اس لحاظ سے کل مسلمان فوجی خدمت رکھتے تھے، اور ضرور تھا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہیں جس طرح نوشیروان عادل نے عموماً اہل فوج کو اس (جزیہ) سے بری رکھا تھا لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے، اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، نہ وہ لوگ ایسی پر خطر خدمت کے لئے راضی ہو سکتے تھے، اس لئے ضرور تھا کہ وہ اپنی محافظت کیلئے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا (ص ۲۳۱، ۲۳۲)

لیکن اوپر سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے جس اصول اور عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوجی خدمت اور مالی امداد بالکل دو جداگانہ چیزیں تھیں، مولانا نے یہ تو لکھا ہے کہ مسلمانوں کو جزیہ مستثنیٰ ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ نہیں بتلایا ہے کہ اُن سے زکوۃ کا مطالبہ ہوتا تھا، مسلمانوں کا محصول جزیہ نہ تھا، بلکہ زکوۃ تھی، اور جب وہ فوجی خدمت کے صلہ میں زکوۃ سے مستثنیٰ نہیں کئے گئے، تو غیر مسلم فوج میں رہ کر جزیہ سے کیوں کر مستثنیٰ ہو سکتے تھے؟ پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ غیر مسلموں سے فوجی خدمت لینے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، ہر سلطنت کو اپنی رعایا سے فوجی خدمت لینے کا حق حاصل ہے، اور اسلامی سلطنت کو تو بدرجۂ اولیٰ یہ حق حاصل تھا، کیونکہ اولاً تو وہ مسلم اور غیر مسلم کی ناروا تفریق پسند نہیں کرتی تھی، دوسرے زمین کا مالک اُس نے عام طور پر غیر مسلموں ہی کو بنا رکھا تھا،

رہا یہ امر کہ ابتدا میں غیر مسلم فوج میں کیوں شریک نہیں کئے گئے؟ اس کا سبب یہ تھا کہ غیر مسلم مفتوح تھے، جو مسلمانوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنی قومی سلطنت کو دوبارہ واپس لانے کا خیال ان کے دماغوں میں موجزن رہتا تھا، اس بنا پر آغازِ فتح میں سیاسی حیثیت سے ان کو فوج میں بھرتی کرنا قرینِ مصلحت نہ تھا، البتہ جب عہدِ نبوت سے لے کر خلافتِ فاروقی تک اُن کو مسلمانوں سے

سابقہ پڑا، جس مین اسلام کی عادلانہ حکومت کا سکہ اُن کے دلون پر بیٹھ گیا، اور انھون نے خود دشمنانِ اسلام سے نبرد آزما ہونے کی خواہش ظاہر کی، تو سنہ ھ مین اُن کو اجازت دے دی گئی، اور معاشی نقطۂ نظر سے اُن کی اس فوجی خدمت کو جزیہ کا قائم مقام سمجھ لیا گیا، جو اُن کے ساتھ مزید رعایت تھی،

۲- تعین محصول کے سلسلہ مین "مساواتِ محصول" (Parity of Tax) کا اصول اختیار نہین کیا گیا، جس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ سب کو سرکار سے یکسان آرام اور فائدہ پہنچتا ہے اس لئے سب لوگ برابر محصول دین، بلکہ جزیہ اشخاص کی مختلف قابلیتون اور حیثیتون کے مطابق مختلف نرخ سے مقرر ہوا، کیونکہ اصولِ مساوات سے غربا پر جس قدر ظلم ہو سکتا ہے محتاج بیان نہین، مزید برآن سیاسی لحاظ سے بھی یہ اصول ناقابلِ عمل ہے[۱]"

۳- درودِ محصول (Incidence of Taxation) کی بنا پر محصول کی دو قسمین قرار دی گئی ہین (۱) یہ کہ ٹیکس کا ادا کنندہ (Payer of Tax) اور مورد (Subject of Tax) ایک ہی شخص ہو یعنی جو دوسرون پر منتقل نہ ہو سکے، (۲) یہ کہ جس کے ادا کنندے اور مورد مختلف اور متعدد لوگ ہون یعنی جو ادا کنندہ سے گذر کر بہت سے لوگون پر منقسم ہو جائے، اصطلاحاً اول کو ٹیکس بلا واسطہ (Direct Tax) اور دوم کو ٹیکس بالواسطہ (Indirect Tax) کہتے ہین[۲]"

جزیہ بلا واسطہ ٹیکس (Direct Tax) ہے جس سے عام "سیاسی بیداری" پیدا ہوتی ہے کیونکہ ٹیکس بلا واسطہ، لگان، سود، اجرت، یا ملک و جائداد مین سے براہ راست و صریحاً اپنا حصہ نکالتا ہے، یہ ٹیکس "سیاسی تربیت" کا نہایت کارگر آلہ ہے، انسانی خاصہ ہے کہ جس کام مین کسی کا روپیہ لگتا ہے اس سے

---

[۱] معاشیاتِ ہند ص ۲۶۲، مصنفہ پرمتھ ناتھ بنرجی، مترجمہ مولوی الیاس برنی [۲] اصولِ معاشیات ص ۳۰۸ مصنفہ مولوی الیاس برنی،

خواہ مخواہ تعلق اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ بعض انجمنوں مین تو علاوہ مالی امداد کے دلچسپی بڑھانے کی غرض سے بھی ممبرون سے چندہ طلب کیا جاتا ہے، جب لوگ جان بوجھ کر مصارفِ حکومت ادا کرتے ہین، تو ان کو سیاسی معاملات سے خود بخود تعلق زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے، اور اس کا نتیجہ عام سیاسی بیداری ہوتا ہے،

(اصولِ معاشیات ص ۳۰۹)

اور واقعات شاہد ہین کہ جزیہ کے سبب سے ہمیشہ غیر مسلمون مین سیاسی بیداری قائم رہی ہے، گو کبھی کبھی اس کا ظہور مظاہرہ کی نامناسب شکل مین بھی ہوا ہے، جیسا کہ سرکار نے "تاریخ اورنگ زیب" (ص ۱۰۲ ج ۳) مین اور علامہ شبلی مرحوم نے مقالات عالمگیر (ص ۴۰) مین دکھایا ہے،

جزیہ اور معاشیات | جزیہ کو معاشیات (Economics) سے بڑا گہرا تعلق ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ص ۲۰۴ جلد ۲۶ طبع ۱۱) مین آدم اسمتھ (Adam Smith) کی کتاب "دولتِ اقوام" کے حوالہ سے ٹیکس کے حسب ذیل قوانین بیان کئے گئے ہین،

(۱) قانونِ مساوات: ہر مملکت کی رعایا کو چاہئے کہ جہانتک ممکن ہو سکے اپنی اپنی قابلیت کے تناسب سے یعنی اُس آمدنی کے تناسب سے جو انھین مملکت کے زیرِ حفاظت اپنے اپنے طور پر حاصل ہوتی ہے، حکومت کے اخراجات مین شریک ہون،

(۲) قانونِ تیقن: جس ٹیکس کا ادا کرنا ہر فرد پر لازمی ہو وہ بالکل باقاعدہ اور یقینی ہونا چاہئے، وقتِ ادائگی، طریقۂ ادائگی، مقدارِ ٹیکس، یہ تمام امور نہ صرف ادا کرنے والے پر بلکہ دوسرے تمام اشخاص پر بھی واضح ہونے چاہئین،

(۳) قانونِ سہولت: ٹیکس ایسے وقت پر اور اس طریقہ سے عائد کیا جائے جو ادا کرنے والے کے حق مین زیادہ سے زیادہ سہولت کا باعث ہو،

(۴) قانونِ کفایت: ہر ٹیکس اس طور پر تجویز کیا جائے کہ اس کی بدولت جس قدر رقم سرکاری

خزانہ مین داخل ہوتی ہے اس کے علاوہ حتی الوسع کم سے کم مزید رقم رعایا کی جیبون سے خارج ہو۔....

ان چار کے علاوہ بعض مصنفین نے دو قانون اور بھی لکھے ہین،

(۵) قانون پیدا آوری: ٹکس بدرجۂ اولیٰ پیدا آور (Productive) ہونا چاہئے یعنی ماحصل ٹکس کی مقدار بہت معقول ہونی چاہئے، کیونکہ ٹکس قائم کرنے کا منشا مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنا ہے، اور جب ایسی آمدنی کی مقدار قلیل ہو، تو ظاہر ہے کہ ٹکس ناقص ہوگا، اور اس سے حصول آمدنی کی غرض بدرجۂ ادنیٰ پوری ہوگی،

(۶) قانون تغیر پذیری: ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل مین اضافہ و تخفیف ہو سکے،

یہ ۶ قانون ہوئے جن کا ٹکس قائم کرنے مین لحاظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ان کی خلاف ورزی سے عام مرفہ الحالی اور معاشی ترقیون کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے،

جزیہ قائم کرتے وقت ان قوانین کو پیش نظر رکھا گیا تھا، یا نہین؟ اس کا جواب ذیل مین دیا جاتا ہے،

پہلا قانون معدلت یا عدل ہے اس کی تعریف مین یہ الفاظ "اپنی اپنی قابلیت کے تناسب" ہمیشہ سے معاشی علماء کے اختلاف کا آماجگاہ رہے ہین، یہ امر کہ محصول انصاف سے قائم کرنا چاہئے بالکل مسلم ہے لیکن یہ عمل کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور محصول کے تقرر مین کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئین؟ اس کے متعلق علماء نے چند راستے اختیار کئے ہین، جو محصول تمعیار خدمات، محصول مساوی، محصول متناسب (Proportional tax) وغیرہ کی شکل مین موجود ہین،

لیکن ان سب سے بہتر طریقہ محصول متزاید یا تدریجی (Progressive tax) کا ہے جو آج کل ہر جگہ اختیار کیا جا رہا ہے، اس طریقہ کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ٹکس لگانے مین تدریج سے کام لیا جائے یعنی

(الف) ٹکس مالی حالت کے فرق کے بموجب بشرح مختلف قائم ہو، امراء پر بشرح اعلیٰ، متوسطین پر بشرح متوسط، اور غرباء پر بشرح ادنیٰ، تاکہ تمام ٹکس ادا کرنے والے مساوی بار یا ایثار محسوس کریں، تشخیص جزیہ میں امراء، متوسطین، اور غرباء کے ۳ طبقے مالی حالت کے اختلاف کی بنا پر قرار دیئے گئے ہیں، اور ان پر بشرح مختلف ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ہر ۲۰ ۴ درہم ۴ ماہوار محصول لگایا گیا ہے۔

(ب) شرح محصول مختلف ہونے کے باوجود ایک حد تک محدود ہو، یعنی اس پر متواتر اضافہ نہ ہو سکے، تاکہ اضافہ آمدنی کسی حالت میں لوگوں کے لئے ضرررساں نہ ہو، اور اجتماع دولت، بلند حوصلگی، اور کفایت شعاری کے راستے میں نامناسب مزاحمتیں پیدا نہ ہو پائیں، یہ بالکل بدیہی ہے کہ "طلائی انڈے دینے والی مرغی کو ذبح کر ڈالنا کوئی عقلمندی کا کام نہیں"، تاہم موجودہ معاشیین محصول متزائد کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس چیز کو بہت کم پیش نظر رکھتے ہیں، اور اس لئے آمدنی کی مقدار بڑھنے کی حالت میں وہ برابر شرح محصول میں اضافہ کرتے جاتے ہیں، بخلاف اس کے اسلام نے دولت و افلاس کے لحاظ سے انسانی طبقوں کے لئے جزیہ کی جو شرح مقرر کی، وہ اگرچہ بذاتِ خود مختلف ہے، تاہم ہر شرح محدود ہے، یعنی بالفاظ دیگر ہر طبقہ کی آمدنی کے متعدد مدارج قرار دے کر ان کے لئے علحدہ علحدہ شرحیں قائم نہیں کی ہیں، بلکہ تمام غرباء کے لئے ایک شرح ہے، تمام متوسطین کے لئے ایک اور تمام امراء کے لئے ایک، اس سے ہر طبقہ پر جزیہ کا یکساں الگ الگ بار پڑتا ہے اور کسی خاص طبقہ کو زیادہ استطاعت کی وجہ سے جزیہ بارگراں نہیں معلوم ہوتا،

(ج) آمدنی جب تک ایک خاص مقدار تک نہ پہنچے، محصول کا مطالبہ نہ کیا جائے، چنانچہ جزیہ اس شخص سے نہیں لیا جاتا، جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا جس کی آمدنی خاندان کی پرورش کے لئے ناکافی ہو، کیونکہ ایسا شخص محصول ادا کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا، چنانچہ زکوٰۃ کے لئے بھی کم سے کم دوسو درہم کا مالک ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے،

دوسرا قانون تیقن ہو جس کو تعیین بھی کہتے ہیں، اُس کے رو سے جزیہ کی شرح ہمیشہ معین رہی ہے، جزیہ ادا کرنے والے کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق واجب الادا رقم کی صحیح مقدار کا علم ہوتا ہے، جس کی بنا پر جبر یا دھوکے سے کوئی شخص سرکاری مطالبہ سے زیادہ وصول نہیں کرسکتا، جزیہ کی شرح مین تغیر و تبدل نہین ہے، اس کی ادائگی کا وقت مقرر ہے، یعنی سال تمام پر وصول کیا جائے[۱]، اور ادائگی کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہو یعنی جانور، سامان، اور پیشہ کی ہر چیز رقم جزیہ کے عوض پیش کی جاسکتی ہے، صرف مردار، سور، اور شراب پیش نہ کرنا چاہئے، اور اگر یہ چیزین آئین تو اہل پیشہ کے ذریعہ سے ان کو فروخت کرا کر اُن کی قیمت دفتر مین جمع کرنی چاہئے، کیونکہ اس مین اہل جزیہ کو سہولت ہوتی ہے[۲]،

تیسرا قانون سہولت ہو، جزیہ کے ذرائع اور اس کی وصولی کے اوقات جن کا دوسرے قانون مین ذکر ہوا، درحقیقت ایسے تھے کہ جزیہ دینے والون کا کوئی نقصان اور ہرج نہ ہوتا تھا، نہ ان کو کوئی دقت اور دشواری محسوس ہوتی تھی،

چوتھا قانون کفایت ہو، اس کے ۳ مفہوم ہین، پہلے مفہوم کے رو سے جو کچھ فراہمی جزیہ مین صرف ہوتا ہے، اس کی مقدار بمقابلۂ ماحصل جزیہ ادنیٰ سے ادنیٰ ہوتی ہے یعنی اس کے فراہم کرنے کے مصارف اصلی مطالبات سے کم اور بہت کم ہوتے ہین، دوسرے مفہوم کے رو سے جزیہ ادا کرنے والون کو مقدار جزیہ سے زیادہ دینا نہین پڑتا، کیونکہ وہ کاروبار مین بہت کم حارج ہوتا ہے، تیسرے مفہوم کے رو سے جزیہ افزونی دولت، اور اضافۂ مرفہ الحالی مین مانع اور مزاحم نہین ہے،

پانچوان قانون پیداآوری جزیہ کی رقم کی آمدنی نہایت معقول ہوتی ہے، اور اس سے مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنے کا منشا حاصل ہوتا ہے، اور سلطنتون کو چھوڑ کر خود اورنگ زیب کے زمانہ مین صرف گجرات سے جزیہ کی رقم جس قدر وصول ہوتی تھی، وہ سرجدوناتھ سرکار اور ہمارے معترض "ارسطو" دونون

---

[۱] جسو طاص ۸۲ ج ۱۰ [۲] کتاب الخراج امام ابویوسف ؒ ص ۶۹،

کو کھٹکتی ہے،

چھٹا قانون تغیر پذیری ہے، ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل مین اضافہ و تخفیف ہو سکے، یہ نہین کہ مصارف حکومت کے واسطے خواہ رقم زیادہ درکار ہو، یا کم ہر حالت مین ماحصل ٹکس کی مقدار وہی ایک رہے، جو کبھی خرچ کے واسطے بھی ناکافی ہو، اور کبھی زائد بچ رہے، بہ الفاظ مختصر، ماحصل ٹکس جس حد تک کمی وبیشی تصارف کی متابعت کرے بہتر ہے، جزیہ مین، اس شکل کے علاوہ جب کسی شہر یا علاقے سے کوئی خاص رقم طے ہو جائے ہمیشہ اس قانون کا لحاظ رکھا جاتا ہے، وہ مختلف پیشون پر مختلف شرحون سے حسب حیثیت وصول کیا جاتا ہے، اس مین کمی وبیشی کا بھی اختیار ہے، چنانچہ تخفیف جزیہ کے بعض واقعات امام ابو یوسف اور یحییٰ بن آدم کی ہمنام تصنیفات (کتاب الخراج) سے اوپر نقل کئے گئے ہین، اور معافی جزیہ کی نسبت موانید کا مسئلہ بھی درج کیا گیا ہے، بیانات بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ چونکہ جزیہ ان تمام قوانین و اصول کا پابند ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے وہ نہایت عمدہ محصول ہے، کیونکہ وہ تمام محصول جو ان اصول کے پابند نہ ہون، یا کم پابند ہون معاشیین کے نزدیک ناقص ہوتے ہین، (باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وی پی اور منی آڈر آجا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آجا سکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور، دار المصنفین کے نمایندے ہین، ان کے یہان ہماری تمام مطبوعات ملجائین گی جن لوگون کو ضرورت ہو ان سے منگالین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی ہے، مہربانی کر کے اسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین،

"منیجر"

ہاروت اور ماروت

بسلسلۂ سابق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

ہاروت اور ماروت فرشتے نہین لیکن چونکہ اُن کی بابت خود قرآن مین ملکین کا لفظ وارد ہے اسلئے فرشتون ہی کے ساتھ اُن کا تذکرہ بھی ضروری ہے،

لفظ بابل کے ماتحت ہم نے وہ آیت نقل کی ہے جس مین ہاروت اور ماروت کا ذکر ہے، قرآن کے بیان کے مطابق یہ دونون بابل کے دو معلم تھے، جن سے بنو اسرائیل نے میان بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے کا ہنر سیکھا تھا، جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے اُن بنی اسرائیل کے کافر ہونے کی دلیل قرار دیا ہے،

بعض وقت خود بولنے والے کسی لفظ کو اپنے عقیدہ اور تصور کے برخلاف مخاطب اور فریق بحث کے عقیدہ اور تصور کے مطابق بولتے ہین، لغات مین اس کی نظیرین بہت ہین، یہود حضرت عیسیٰؑ کو نہ مسیح مانتے تھے اور نہ رسول اللہ، مگر نزول قرآن کے ایام مین انھون نے یہ کہکر ناز کیا تھا کہ انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول اللہ بعینہٖ اسی طرح چونکہ یہود ہاروت اور ماروت کو الملکین کہتے تھے، اس لئے قرآن مین بھی بطریق طنز ان کو الملکین کہا گیا ہے،

ہاروت | بابل کے ذکر مین بتایا گیا ہے کہ یہان دو قومون کے آثار پائے جاتے ہین، ایک قوم کو بنو سام اور دوسری کو سمیری قوم کہا جاتا ہے، اس دوسری قوم کا اہم ترین مرکزی شہر اُور تھا، بعد مین یہ لفظ شہر کا

مرادف بن گیا، اصل مین اس لفظ کا ترجمہ ہے روشنی، یہ قوم روشن اجرام کی پجاری تھی اور یہ شہر ایک روشن جرم فلک کا معبد ہونے کی وجہ سے اُور کہلایا، اس لفظ کو سمیریون کے یہان اس قدر اہمیت حاصل تھی، کہ ان کے اکثر بادشاہون کے نامون مین یہ لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً

۱- اُورکاجنا ۴۵۰۰؁ (۲) اُورلاما ۴۲۰۰؁ (۳) اُورنینا ۴۲۹۰؁ (۴) اُورمن حرسو ۲۷۰۰؁ (۵) اورنماکدو ۳۸۵۰؁، یہ پانچون سمیری بادشاہ تھے،

سمیریون کے بے نام ونشان ہوجانے کے بعد بھی بعض غیر سمیریون کے نامون مین اُور کا لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً کنعان کے ایک اشوری فرمانروا کا نام جو ۳۰۰۰؁ ق م مین گذرا ہے اورو ملک تھا، مصری بولی مین تا کے معنی ہین زمین، چنانچہ پونت کو تا نتر کہتے تھے، اور جو بادشاہ بالائی اور زیرین دونون مصرون کا بادشاہ ہوتا تھا، اس کو نب تا وی کہتے، اور تا کے معنی ہوئے ارض نور، قدیم بابلی مین تا اور تو کے معنی تھے نسل اور قوم، اس لئے اورتا کے معنی اُور کی قوم ہین، اسی لفظ کا دوسرا تلفظ آرتو ہے، جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی، اس کا تورانی نام ارارا ط ہے، یہ اورارتو کی بدلی ہوئی شکل ہے، یہ آرمینیہ کا کلدانی اور اشوری نام ہے، اور ارتو کے معنی ہین آرتو کی بستی، بابل کے سمیری اصل مین جہان سے بھی اس دیار مین آئے ہون، مگر آرمینیہ ہوتے ہوئے آئے تھے، اسی اورتا اور آرتو کا نام عربی لب ولہجہ مین ہاروت بنا، قرآن مین جس ہاروت کا ذکر ہے، اگر وہ نسلی حیثیت سے نہین تو مذہبی اور ثقافتی حیثیت سے اسی قوم کا ایک فرد تھا،

ماروت اشوری بادشاہ اشوربنی پال (۶۶۸-۶۲۶؁ ق م) کے زمانہ مین عیلام مین ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، جس کا نام تھا اُورتاکی (حاکم ہاروت) یہ پہلے اشوربنی پال کا حلیف تھا، بعد مین کسی وجہ سے اس کا مخالف ہو گیا، اور اُس نے بابل پر جو ان دونون شاہان اشور کے ممالک مقبوضہ مین داخل تھا، حملہ کر دیا، لیکن اشوریون نے شکست کھائی، اُورتاکی کے مرنے کے بعد عیلام کا بادشاہ تی اُمّان ہوا جس کی

بابت اشوری تحریر بتاتی ہے، کہ وہ اپنے پیش رو دو بادشاہون کی طرح "مثیل شیطان" تھا، تی امان کے بعد عیلام کا حاکم اُورتاکی کا فرزند تم مارتو ہوا، یہ اشوریون کا وفادار حلیف تھا، اس بادشاہ کا نام دو لفظون کا مجموعہ ہے، پہلا لفظ تم ہے، جسے عربی لب ولہجہ مین تام پڑھ سکتے ہین بابل کے عبرانی نسخون مین یہ لفظ عموماً مرد کامل کے معنی مین آیا ہے، اور ہمیشہ نیکی اور راستی مین باکمال کو تم کہتے تھے، "نوح اپنے قرن مین صدیق (راستباز) اور تم (کامل) تھا، (تکوین ۶: ۹) اس کے نام کا دوسرا جز ماتو، عربی لب ولہجہ مین ماروت بنا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن مین اسی ماروت کا ذکر ہے، جو اپنے خیال مین تم یعنی مرد کامل تھا، اور جس کا باپ اُورتاکی (حاکم ہاروت) اشوریون کی نظر مین مثیل شیطان تھا بلکہ مارتو کے لغوی معنی ہین "انسان کی نسل" سفر تکوین مین وارد ہے، کہ "نفلیم جن کو گبورتم بھی کہا جاتا ہے بنی الوہیم اور بنات آدم کی اولاد تھے، (تکوین ۶: ۱ تا ۴) اس سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ مین دو قومین ایک ساتھ رہتی تھین ایک کو خداؤن کی اولاد ہونے کا ادعا تھا، اور دوسری قوم کو یہ ادعا نہین تھا، بلکہ وہ خود کو معمولی آدم زاد کہتی تھی، اسی قوم کا نام مارتو تھا، اطراف بابل مین جو نبو سام تھے، وہ خود کو امورد کہتے تھے، یہ نام عربی لفظ امرؤ (انسان) کی قدیم شکل ہے، اسی قوم کا ذکر توراۃ مین اموری قوم کے نام سے آیا ہے بابل کے سامری بولنے والے اس قوم کو مارتو کہتے تھے، یہی نام عبرانی لب ولہجہ مین مروت اور عربی لب ولہجہ مین ماروت ہو گیا، فلسطین مین بھی چونکہ ایک وقت مارتو، ماروت، مروت اور امورو کہلانے والی قوم بستی تھی، اس لئے ایک زمانہ مین اطراف بیت المقدس کو بھی مروت کہتے تھے، چنانچہ صحیفۂ میکاہ مین ہے،

"مروت کی رہنے والی اپنے اموال کے لئے کڑھتی ہے، کیونکہ خداوند کی طرف سے بلا نازل ہوئی جو یروشلم کے پھاٹک تک پہنچی، (میکہ ۱: ۱۲)

قرآن کریم مین جس شخص کا ماروت کے نام سے ذکر ہے، وہ اسی مارتو کہلانے والی قوم کا ایک فرد تھا،

افسانۂ ہاروت و ماروت | قرآن مین ہاروت اور ماروت کو طنزاً فرشتے کہا گیا ہے لیکن مفسرین نے بہت سی ایسی روایتین نقل کی ہین جن کا ماحصل یہ ہو کہ یہ دونون واقعی فرشتے تھے، فرشتون نے بنی آدم کی خطائین دیکھ کر خدا سے کہا کہ ہم ہوتے تو ہم سے یہ گناہ نہ ہوتے، خدا نے کہا اچھا اپنے درمیان سے دو کو امتحان کے لئے چنو، چنانچہ ہاروت اور ماروت چنے گئے، اور انسان بنکر زمین مین اترے اور ایک خوبصورت عورت پر ریجھ گئے، اس عورت کو انھون نے اسم اعظم سکھانے کے بعد اس کے کہنے سے شراب پی، بت پوجا، اور بہت سے گناہ کئے، پھر اس نے ان کو تمتع کی اجازت دی، وہ عورت اس کے بعد اسم اعظم کے زور سے آسمان پر اڑ گئی، خدا نے اسے ستارہ زہرہ کی صورت مین مسخ کر دیا، اور ان فرشتون سے کہا گیا، کہ عذاب دنیا اور عذاب آخرت مین سے ایک کو پسند کرین دونون نے عذاب دنیا کو پسند کیا، چنانچہ وہ دونون ایک تاریک کنوئین مین قیامت تک کے لئے لٹکا دیئے گئے، یہ ہے متعدد روایتون کا مجموعی مفہوم یہ تمام روایتین سیوطی نے دُرِ منثور مین نقل کی ہین، ہم نے سب کا ملخص لے لیا ہے، دو باتون مین ان روایتون مین اختلاف ہے، ایک روایت مین اس واقعہ کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام کا عہد بتایا گیا ہے، حضرت ادریس طوفان نوح کے بعد پیغمبر مبعوث ہوئے اور وہ کشتی نوح کے سوارون مین سے ایک تھے، لیکن متقدمین نے ان کو حضرت نوحؑ کے مورث حنوک سے تطبیق دی ہے، دوسری روایت مین ہے کہ ان فرشتون کے پاس خدا کا یہ پیغام کہ دُنیا یا آخرت کے عذابون مین سے ایک کو پسند کر لو حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السّلام نے بھجوایا تھا،

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ جو عورت زہرہ بن گئی تھی، وہ ایک روایت مین ایرانی عورت تھی، اور ایک مین اسرائیلی،

قرآن کریم مین ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہین ہے، اور نہ اسے بطور تفسیر ذکر کرنے کی آیت کا کوئی نقرہ اجازت دیتا ہے، البتہ چونکہ ہاروت اور ماروت کو طنزاً خدا نے دو فرشتے کہا ہے، اسلئے

طرز کو نہ سمجھنے والے روایت کے اس حصہ کو قرآن کی تفسیر میں اس طرح شامل کر دیتے ہیں کہ تھے تو وہ دونوں فرشتے ہی، مگر بعد میں کافر ہوگئے کیونکہ انھوں نے نازکیا تھا، کہ اگر بنی آدم کی جگہ ہم ہوتے، تو ہم سے یہ خطائیں نہ ہوتیں، اس لئے امتحان کی غرض سے خدا نے اُن کو انسان بناکر زمین میں اُتارا، اور وہ امتحان میں ناکام رہے، باقی قصہ کا قرآن کے کسی فقرہ سے ذرہ برابر واسطہ نہیں ہے،

روایات کی نوعیت | اس افسانہ کی بدولت قرآن پاک پر اعتراضات کئے جاتے ہیں، اس لئے اس کی پوری حقیقت کھولنا ہمارا فرض ہے، لیکن قصہ کے سرچشموں پر بحث سے پہلے روایات کی نوعیت دکھا دینا ضروری ہے،

صحاح ستہ میں ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہیں ہے، مستدرک میں حاکم نے اس قصہ کی حضرت علیؓ سے تخریج کی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ سے صرف اتنے مضمون کی تخریج کی ہے، "کہ زہرہ پہلے ایک عورت تھی، جس کو اس کی قوم والے بیدخت کہتے تھے" گو حاکم نے ان دونوں روایتوں کی اسناد کو شیخین کی شرط پر صحیح بتایا ہے، لیکن شیخین کا اس کو روایت نہ کرنا ہی یہ بتاتا ہے کہ اس کی سند میں ضرور کچھ نہ کچھ نقص ہے،

جہاں تک حضرت علیؓ کی روایت کا تعلق ہے، حاکم کی تصحیح قابلِ رد ہے، عمیر بن سعید نخعی کی بابت جن سے حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے، ابن حزم نے کتاب الملل والنحل میں لکھا ہے، کہ

"وہ مجہول ہے حضرت علیؓ سے اُس نے دو روایتیں نقل کی ہیں، ان دو کے علاوہ اس کی کسی اور روایت کا ہم کو علم نہیں ہے، ایک تو شارب خمر کی حد سے متعلق ہے، یعنی وہ جس کی امام بخاری نے تخریج کی ہے، اور ایک ہاروت و ماروت کے قصہ میں اور یہ دونوں جھوٹی روایتیں ہیں"

تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کرکے لکھا ہے کہ افرط ابو محمد بن حزم یعنی محمد بن حزم نے افراط و مبالغہ سے کام لیا ہے، مطلب یہ ہے کہ انکی دونوں روایتوں کو جھوٹی قرار دینا حد سے تجاوز ہے، امام بخاری والی روایت قطعاً جھوٹی نہیں ہو سکتی، رہی قصہ ہاروت و ماروت والی روایت تو اس کی بابت اتنا کہہ دینا کافی ہے، الله عنده هو حديث واحدٌ عن علي في حدّ شارب الخمر"

یعنی ائمۂ حدیث کی رائے مین حضرت علی رضی سے انھون نے صرف ایک ہی حدیث شارب خمر کے بارے مین روایت کی ہے،

حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کی "زہرہ پہلے ایک عورت تھی" کی روایت وہم سے خالی نہین ہے ممکن ہے کہ انھون نے عربون کے قدیم تصور کی روایت کی ہو لیکن اسے ان کا قول سمجھ لیا گیا ہو، حضرت ابن عباسؓ کے راوی ابوعثمان النہدی آنحضرت صلعم کے زمانہ حیات مین مسلمان ہوئے، مگر زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے، اُن کے راوی سلیمان بن بلال التیمی کی ثقاہت پر شبہہ کرنا روا نہین ہے، مگر ان کی اس قسم کی بعض کمزوریون کی بنا پر اُن کی روایات کے بارہ مین عثمان بن سبیہ کا خیال تھا کہ اُن سے روایت کرنے مین ہرج نہین ہے، مگر اس پر اعتماد نہین کیا جا سکتا،

سیوطی نے دُرِ منثور مین کئی کتابون کے حوالہ سے کئی بزرگون سے اس افسانہ کو نقل کیا ہے اور اکثر روائتین صحابی اور تابعی کے قول پر منتہی ہوتی ہین، ایام جاہلیت مین یہ قصہ مشہور تھا صحابۂ کرام کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مشہور ماجرا سنانے کے بعد اس کے متعلق قرآن مجید کی آئتین پڑھ دیتے تھے، اس طرح قرآن کی آیت مشہور عوام قصہ کی اصلاح کر دیتی تھی، ورسننے والے قصہ کو قرآن کی تفسیر نہین، بلکہ قرآن کی آیت کو قصہ کے باطل حصہ کی تردید اور سچے حصہ کی تصدیق سمجھتے تھے، اس لئے اگر صحیح سند سے کسی صحابی تک کسی ایسے قصہ کی سند پہنچتی ہے جس کا قرآن سے رابطہ ہونے کے باوجود اس مین قرآن سے زائد ناقابل یقین باتین ہین تو ہم کو چاہئے کہ روایت کو مسترد کرنے کے بجائے مضمون قرآن کو قصہ کی اصلاح قرار دین، لیکن دشواری یہ ہے کہ بعض روایات مین ایسے الفاظ بھی ہین جو اس کریہہ کہانی کے بعض اجزار کو آنحضرت صلعم کی زبان مبارک پر بھی رکھ دیتے ہین، ایسی روائتین یقینی طور پر قابل تسلیم نہین ہین، حضرت علیؓ کی طرف منسوب روایت کو جسے حاکم نے صحیح بتایا ہے، ابن حزم نے جھوٹی کہا ہے، اور محدثین اُسے حضرت علیؓ کا قول ہی نہین مانتے، وہ اگر درست بھی مان لیجائے

تو چونکہ حضرت علی پر منتہی ہوتی ہے، اور عام عربی تصور کے مطابق ہے، اس لئے کوئی ہرج نہیں، مگر در منثور مین خطیب وغیرہ کے حوالہ سے سیوطی نے نافع کا قول نقل کیا ہے، کہ ایک سفر مین انکا اور حضرت عبد اللہ بن عمر کا ساتھ ہوا اتنے مین سرخ تارا طلوع ہوا اسے دیکھ کر ابن عباس نے کہا لا مرحبا بها ولا اهلاً مین نے کہا سبحان اللہ نجم سحر سامع مطیع ہے، حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا ما قلت لك الا ما سمعتُ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

یہ فرمانے کے بعد ہاروت اور ماروت کا قصہ نقل کیا ہے لیکن ابن جریر نے عبد اللہ بن عمر عن کعب الاحبار سے اس قصہ کی تخریج کی ہے، اور یہی واقعہ ہے اس قصہ کی روایت منتہی کسی شخص تک بھی منتہی کرین لیکن ان تمام روایتون کا سرچشمہ یقیناً کعب احبار یا کسی دوسرے عالم اہل کتاب کا قول ہوگا، قرآن مجید کی آیت کو ہاروت وماروت اور زہرہ کی کہانی سے کوئی واسطہ نہین ہے البتہ قرآن مین اُن کی بابت طرزاً دو فرشتون کا لفظ ہے، مگر وہ واقعی فرشتے نہ تھے، بلکہ ایک ایسے ہنر کے معلم تھے جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے مکفرین سلیمان علیہ السلام کے کفر کی دلیل قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ خود اُن کو بھی اپنی بابت فتنہ اور اپنے ہنر کی بابت کفر ہونے کا یقین تھا، چنانچہ فرمایا کہ یہ مکفرین سلیمان،

یعلّمون الناس السحر وما انزل	آدمیون کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے
علی الملکین ببابل ھاروت وماروت	اور اس کی بھی جو کہ ان دونون فرشتون
وما یعلّمان من احد حتی یقولا	نازل کیا گیا تھا، بابل مین جن کا نام ہاروت
انّما نحن فتنة فلا تکفر فیتعلّمون	وماروت تھا، اور وہ دونون کسی کو
منهما ما یفرّقون به بین المرء و	نہ بتلاتے، جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہمارا
زوجه وما ھُم بضارّین من	وجود بھی ایک امتحان ہے اسو تو کہین

أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا
لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ
مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا
بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

کافر مت بنائیو، سو لوگ ان دونوں
سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے
ذریعہ سے کسی مرد اور اس کی بیوی میں
تفریق پیدا کر دیتے تھے، اور یہ لوگ اس
کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے
مگر خدا ہی کے حکم سے اور ایسی چیزیں سیکھ
لیتے ہیں، جو ان کو ضرر رساں ہیں اور
ان کو نافع نہیں ہیں، اور ضرور یہ بھی
اتنا جانتے ہیں، کہ جو شخص اس کو اختیار
کرے، ایسے شخص کا آخرت میں کوئی
حصہ نہیں، اور بے شک بری ہے وہ چیز
جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں

مع ترجمہ بیان القرآن کی بعض بدلی

قصہ کے سرچشمے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی طرف منسوب ایک روایت سے ظاہر ہے کہ ہاروت اور ماروت کا افسانہ مسلمانوں میں کعب احبار کے ذریعہ آیا، حضرت کعب احبار یمنی اور مذہباً یہودی تھے، ان کی طرف منسوب اقوال سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ نصرانی لٹریچر سے بھی واقف اور کسی حد تک متاثر تھے، موجودہ دور کے نصرانی علماء اب تو ہاروت اور ماروت کے قرآن میں مذکور ہونے پر معترض ہیں، لیکن اس کے ناپسندیدہ عناصر جن کو تفسیر قرآن سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، خود نصرانی اور یہودی لٹریچر سے آئے ؛

مسلمانوں کا فرشتوں کی بابت یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی نافرمانی نہیں کر سکتے، اور

وہ وہی کرتے ہین جو اُن کو خداوند عالم کی طرف سے فرمایا جاتا ہے" اس عقیدہ کو اہلِ علم کے مباحث نے ایجاد نہین کیا، بلکہ قرآن مجید مین فرشتون کی بابت صریحًا یہ ارشاد ہے، قدیم نصرانیون کے خیال مین ایسے فرشتے بھی ہین جنھون نے گناہ کیا، اپنی اصلی حالت پر نہین رہے، بلکہ اپنے مقام کو چھوڑ دیا (یہودا کا خط درس ۶ پطرس کا دوسرا خط ۲:۴) چونکہ قرآن مین ایسی چیز کے دو معلمون کو خدا نے طنزًا دو فرشتے کہا ہے جس کا سیکھنا سکھانا کفر تھا، اسی لئے حضرت کعب احبارؓ نے ہاروت اور ماروت کو انھی فرشتے مین سے خیال کر لیا جن کا ذکر یہوداہ اور پطرس کے مقدس خطون مین ہے،

نصرانیون کا یہ تصور ان کی اپنی ایجاد نہ تھا، بلکہ یہودیون کے تصور مین فرشتے دو قسم کے تھے، نیک اور بد، علاوہ برین ہر ملک کا حامی اور نگران ایک ایک فرشتہ کو مانا جاتا تھا، سفر دانیال مین ہے کہ حضرت جبرئیل نے ان کو خبر دی کہ

> "فارس کی مملکت کا سردار ۲۱ دن تک میرے مقابلہ مین ڈٹا رہا، اور دیکھ میکائیل جو سردارون مین بڑا ہے میری مدد کو پہنچا، (۱۰:۳) اور اب دیکھ مین فارس کے سردار سے لڑنے کو پھر جاؤنگا" تب یونان کا سردار آئے گا، (دانیال ۱۰:۳)

ان آیتون سے سمجھا گیا کہ جس طرح فارس اور ایران کے جدا جدا غیبی سردار تھے، جو میکائیل اور جبرئیل کے حریف تھے، اسی طرح ہر ملک کا حامی اور مددگار خدا کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر ہے، مصر کے حامی اور مددگار فرشتہ کا نام عزیٰ تھا، چنانچہ ایک مدراش کی روایت ہو کہ جب بنو اسرائیل مصر سے نکلنے لگے،

> "مصر کے موکل عزیٰ نے تخت ازل کے سامنے عرض کیا جس قوم کو تو مصر سے نکال رہا ہے اس پر میرا حق ہے،

مگر اسرائیل کے موکل میکائیل نے سامنے آکر عزیٰ کے تمام دلائل خاک مین ملا دیئے[۱] عزیٰ نے

---

[۱] My The onlegund of Ancient Israel جلد اص ۴۱ Midrach Ab-Kie gonted by yalkal 241

یہ بھی کہا تھا کہ" تو نے حضرت ابراہیم سے فرمایا تھا، کہ تیری نسل ۴۰۰ برس مصر کی غلامی کرے گی، ان لوگون نے میری قوم کی صرف ۸۶ برس غلامی کی ہے، اس لئے ابھی ۳۱۴ برس اور میرے لوگون کو ان سے خدمت لینے کا حق ہے، لیکن میکائیل نے بحث کرکے قائل کر دیا، کہ یہ مدت صرف مصر مین قیام کے لئے مقرر تھی،[۵۱]

عزی یعنی حمایت مصر پر مامور فرشتہ کے متعلق یہود کے تصورات ایسے تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی بولی مین یہ اہل مصر کے دیوتا آمن رع کا نام تھا، اکثر وہ فراعنہ جن کا تاریخ بنی اسرائیل سے رابطہ ہے خود کو آمن رع کی نسل باور کرتے تھے،

عزی کے ایک ساتھی فرشتے کا نام عزازیل تھا، جو کہ مسلمانون کے لٹریچر مین ابلیس کا ایک نام ہے!

تکبر عزازیل را خوار کرد   بزندان لعنت گرفتار کرد

سفر احبار کے مطابق نعوذ باللہ خود خدا نے اس کے لئے بکرے چھوڑنے کا حکم دیا تھا، یہودی افسانون کے مطابق یہ دونون فرشتے تھے جو آسمان سے زمین پر اتارے گئے تھے، ان دونون نے بنی آدم کو ایسے جادو کی تعلیم دی کہ اس کے زور سے انھون نے ایام الوش مین سورج اور چاند تک کو گرا لیا تھا،[۵۲] ہاروت و ماروت کو عربی روایتین سحر اور جادو کا معلم بتاتی ہین، قرآن مجید کی آیت:

"يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ"

سے ظاہر ہے کہ سحر اور چیز ہے، اور جس چیز کی ہاروت اور ماروت تعلیم دیتے تھے، وہ اور چیز ہے، کیونکہ عربی قاعدہ سے معطوف کو معطوف علیہ کا غیر سمجھا جاتا ہے، جن عربی روایات مین ہاروت اور ماروت کو معلمین سحر بتایا گیا ہے، وہ عزی اور عزازیل کو قرآن کے ہاروت اور ماروت سے تطبیق دینے کا نتیجہ ہین،

یہودی تصور مین گھڑے ہوئے فرشتے صرف دو ہی عزی اور اسرائیل نہین تھے، بلکہ اور بھی کئی ایک تھے، سفر تکوین مین نفلم کی بابت جو حضرت نوح کے زمانہ مین دنیا کے اندر آباد تھے، یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بنات آدم اور بنو الوہیم کی اولاد تھے، بنو الوہیم (ہر یکین بہ ما خدا) کے جنے ہوئے، جیسے کسی قدیم نام کا ترجمہ ہے،

---

[۵۱] حوالہ تذکرہ جلد ۲ ص ۲۸۶، [۵۲] دی لیجنڈ آف جیوز مولفہ لوئی گنزبرگ جلد ۱ ص ۱۲۵ بحوالہ متعدد کتب یہود،

خود کو "ابناء اللہ" کہنے والی کسی قوم کا اس نام سے ذکر ہے، یہودی روایات نے ان بنی الوہیم کو ان فرشتوں میں شمار کیا ہی جنھوں نے گناہ کرکے اپنے مقام کو چھوڑ دیا، اور اپنی قدیم حالت میں نہ رہے، ان میں چند کے نام یہ ہیں:

"برق ایل، کوکب ایل، ارض ایل، شمس ایل، شہر آیل"

اُن کے رئیس اعظم کا نام شم حزی تھا، یہودی کہانی بولتی ہے کہ یارد کے زمانہ میں برق ایل وغیرہ فرشتوں نے جو زمین پر اُتارے گئے تھے، بنات آدم کو خوبصورت دیکھ کر کہا،

"ہم اپنے لئے صرف بنات آدم سے بیبیاں چنیں گے، اور ان سے اولاد پیدا کریں گے"

چنانچہ باہمی مشورہ سے انھوں نے اپنے اس فیصلہ پر عمل کیا۔[1]

اس افسانہ کے اندر ہاروت اور ماروت کے ایک عورت سے ملوث ہونے کا ذکر ہے، اس کی حقیقت یہی ہے، کہ قرآنی طرز کو نہ سمجھ کر بنات آدم سے ناجائز تعلقات پیدا کرنیوالے خطاکار عزی اور عزازیل کو ہاروت و ماروت سے تطبیق دی گئی،

ہاروت اور ماروت کا زمانہ ہماری روایتوں نے حضرت ادریس کا زمانہ بتایا ہے، عام طور پر حضرت ادریس کو جناب حنوک سے تطبیق دی جاتی ہے، جو حضرت نوح کے مورثوں میں سے تھے، یہودی افسانہ بتاتا ہے کہ جب ان گرے ہوئے فرشتوں کی شرارتیں حد سے گذر گئیں، تو خدا نے حضرت حنوک کو ان کی تنبیہ پر مامور کیا، انھوں نے عزازیل وغیرہ تمام گرے ہوئے فرشتوں کو خدا کا حکم سنا دیا، جسے سُن کر وہ سہم گئے، اور حضرت حنوک کی معرفت خدا کے پاس درخواست رحم بھیجی لیکن خدا نے جواب میں کہلوایا، کہ بنی آدم کی شفاعت تم کو کرنی چاہیئے تھی، نہ کہ خود تم نے ایک ابن آدم کو اپنا شفیع بنایا، اور اُن کی درخواست مسترد کر دی اور ان کے جرائم گنوا کر یہ فیصلہ کہلا بھیجا، کہ تمھارے لئے اب آرام اور چین نہیں ہے"[2]

انہی کوکب ایل، اور شہر ایل جیسے فرشتوں کی بابت پطرس کا بیان ہے کہ خدا نے ان کو "نہیں چھوڑا"

---

[1] دی لیجنڈ آف دی جیوز ج اول ص ۱۲۶ [2] ایضاً،

بلکہ تاریکی کی زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کے حوالہ کیا، تاکہ عدالت کے دن تک اُن کی نگہبانی ہو، (۲ پطرس ۲: ۴) جناب یہودا فرماتے ہیں، کہ اُن کو خدا نے ابدی زنجیروں سے جکڑ کر تاریکی میں روزِ عظیم کی عدالت تک رکھا ہے۔" (یہوداہ ۱: ۶) یہ ہیں بھٹکنے والے ستارے، جن کے لئے تاریکی کی سیاہی ہمیشہ کے لئے دھری ہے۔ (یہوداہ ۱: ۱۳) عربی روایت نے ہاروت اور ماروت کو چاہِ بابل کی تاریکی میں قید کیا ہے، یہ کہانی کا ایک دوسرا رنگ تھا، یا قرآن کے ہاروت و ماروت کو جن سے ۵۸۶ ق م کے دوران بنی اسرائیل بابلی فنون و علوم سیکھے تھے، ان فرشتوں سے تطبیق دینے کی بدولت اُن کے مجسموں کو جہنم کے بجائے ارضِ بابل میں اُتار دیا گیا،

وہ عورت جس سے ہاروت اور ماروت ملوث ہوئے تھے، اس کو ستارہ زہرہ کی صورت میں مسخ ہو جانے کے واقعہ کا اصل ماجرا یہ ہے کہ اہلِ بابل کے ایک دیوتا کا نام دوموزی تھا جس کا ذکر بائبل میں تموز کے نام سے آیا ہے جس کے لئے عورتیں نوحہ کیا کرتی تھیں، اس کو دیوی عشتر کا جسے یمن میں عشتر اور فلسطین میں عشتار کہا جاتا تھا، اہلِ بابل کی دیو مالا میں شوہر بتایا گیا تھا، بابلی اور آشوری روایت یہ تھی، کہ دوموزی مر گیا، اور اس کی روح دیوی اللات کے ملک ارالو (بے نور) میں قید کر دی گئی، اس کے بعد عشتار نے ازدوبار (گلگامش) کو اپنا شوہر بنانا چاہا۔ مگر اس نے اس کی درخواست قبول نہ کی، اس لئے وہ اللات کے بے نور ملک میں جا کر دوموزی کو دوبارہ زندہ کر لائی، یہ ہے افسانہ ازدوبار کا ملخص،

تموز اور عشتار دونوں دراصل آسمانی اجرام کے نام ہیں، جن کو پوجا جاتا تھا، لیکن انسانوں کے بھی یہ نام ہوتے تھے، ان ناموں کے ایک انسانی جوڑے کو ان ناموں کے دیوتاؤں کا اوتار بھی مانا جاتا تھا، یہی خیال بعد میں اس شکل میں بدل گیا، کہ عشتار نام ایک عورت جس کا عربی نام زہرہ ہے، اپنے شوہر تموز سے سیکھے ہوئے جادو یا عربی روایت کے مطابق اسم اعظم کے زور سے زہرہ بن گئی۔

قرآنی آیت کی تفسیر مین ان تفصیلات کے تذکرہ کی ضرورت نہین تھی، لیکن چونکہ کتب تفسیر مین یہ افسانہ مذکور ہے، اور اس کی بدولت قرآن پر اعتراضات کئے جاتے ہین، اس لئے ہم کو اس قدر تفصیل سے کام لینا پڑا،

قرآن مین یقیناً ہاروت اور ماروت کو طنزاً دو فرشتے کہا گیا ہے، لیکن یہ دونون یہودی لٹریچر کے گھڑے ہوئے فرشتون مین سے نہ تھے، کیونکہ اُن کے اسماء مین اُن کے نام نہین ملتے، یہ دونون درحقیقت تاریخی اشخاص اور بابلی استادون مین سے دو استاد تھے جن کو ان کے ماننے والے حسن اعتقاد کی بنا پر فرشتہ کہتے تھے، قرآن نے طنزاً اُن کو فرشتے کہا، اُن کے معتقدین بھی اُن کو حقیقی معنون مین فرشتے نہین کہتے تھے بلکہ اپنے گمان کے مطابق اُن کے حسن سیرت اور تقدس کے سبب سے ان کو تشبیہاً اسی طرح فرشتے کہتے تھے، جس طرح زنانِ مصر نے حضرت یوسف کی بابت کہا تھا اِنَّ ھٰذا الا ملکٌ کریم،

ارض القرآن حصہ اوّل

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے، ضخامت ۴۲۴ صفحے قیمت ؎ ۳ ر

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قومون کا ذکر ہے ان مین سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسماعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث، قیمت ؎ ۲ ر ضخامت ۴۴۰ صفحے،

"منیجر"

الدرایۃ فی تخریج احادیث الہدایۃ

کا

ایک نادر نسخہ

از

مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو

گذشتہ مہینہ مین، مدرسہ مفتاح العلوم (جامع مسجد شاہی، مئو، ضلع اعظم گڈھ) کے کتب خانہ مین حافظ ابن حجر عسقلانی کی تلخیص نصب الرایہ یعنی الدرایہ کا ایک نادر اور اہم نسخہ داخل ہوا ہے، یہ اس کتاب کا نصف ثانی ہے، جو کتاب النکاح سے لے کر آخر تک کے تمام ابواب پر مشتمل ہے، ہمارے علم مین یہ نسخہ اپنی گوناگون خصوصیات کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتا ہے، سطور ذیل مین اس نسخہ کا تعارف کرایا جاتا ہے، اس سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ممکن ہو کوئی صاحب علم اس کے نصف اول کا سراغ لگا سکین، اور اصحاب علم کے شکر کے مستحق ہون،

نسخہ زیر نظر تقریبًا ۲۰×۳۰ کے ۱۶۲ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ مین اکیس۲۱ سطرین ہین، خط نہایت پاکیزہ ہے، کاغذ بہت دبیز اور اتنا پائدار و بہتر ہے، کہ تقریبًا ساڑھے پانچسو برس گذرنے پر بھی بوسیدگی وکہنگی کا کوئی اثر اس مین نہین ہے، ابواب کے عنوانات، ہر حدیث کی ابتدا مین لفظ حدیث یا قولہ اور ایک حدیث کے دوسرے حوالہ یا اس کے دوسرے طرق کے بیان کے لئے لفظ خرجہ یا ورواہ اور لہ طریق آخر وغیرہ شرح روشنائی سے لکھے ہوئے ہین،

اس نسخہ کا سنہ کتابت ۸۵۳ھ ہے، اس اعتبار سے خود مصنف کی زندگی مین اور تصنیف کے صرف تین سال بعد لکھا گیا ہے، اس لئے کہ حافظ ابن حجر کی وفات ۸۵۲ھ مین ہوئی ہے، اور درایہ کا سال تصنیف ۸۲۷ھ ہے،

اس نسخہ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہو کہ وہ ابو الفتح محمد بن احمد خطیب طوخی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہ بزرگ نوین صدی ہجری کے مشہور عالم و کاتب ہین، حافظ ابن حجر کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع مین ان کا ذکر کیا ہے، وہ زرکشی، ابن الملقن اور دمیری وغیرہ کے شاگرد اور سبعہ کے قاری تھے، اور زین بن الصائغ سے کتابت کی مشق کی تھی، حافظ سخاوی فرماتے ہین کہ

"انھون نے ہمارے شیخ (ابن حجر) کی بہت سی تالیفات کی کتابت کی تھی"

حافظ ابن حجر کی مجلس املا مین ان کے امالی بھی لکھتے تھے، اور بہت تیز لکھتے تھے، اُن کی وفات ۸۳۵ھ مین ہوئی، (ضوء اللامع جلد ۷ ص ۸۸)

سخاوی کے اس بیان کی بنا پر زیر نظر نسخہ خود حافظ ابن حجر کے معتمد علیہ اور ان کی تالیفات کے ناقل و کاتب خاص کے قلم کا ہے، اور اس لحاظ سے یہ نسخہ نوادر روزگار مین سے ہے،

تیسری خصوصیت یہ ہو کہ یہ نسخہ ایک زمانہ مین ہندوستان کے مشہور و نامور بزرگ و عالم و مصنف حضرت مولانا غلام یحییٰ بہاری قدس سرہ کی ملک رہ چکا ہے، اور اس پر اُن کی مہر ثبت ہے جس مین اُن کے نام کا سجع بیشرت بغلام اسمہ یحیٰی کندہ ہے، اور مہر کے اوپر مولانا کے دست خاص کی یہ تحریر ہے، "ثمّ دخل فی ملك غلام یحییٰ البهاری فی دار الخلافة بالشراء"

یہ تو اس نسخہ کے ظاہری خصوصیات ہین، اسی کے ساتھ اس کی سب سے بڑی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کتاب مین بہت سی حدیثون کی نسبت یہ تحریر فرمایا ہے کہ

لم اجده مین نے اس کو نہین پایا،

اس نسخہ مین ہر جگہ تو نہین لیکن پھر بھی بہت سے مقامات پر کسی قدیم حنفی محدث کے مختصر تعلیقات ہین، ان تعلیقات کا خط اصل کتاب کے خط سے بہت مختلف ہے، پھر بھی بہت قدیم ہے، اور اغلب یہ ہو کہ اسی عہد کے کسی بزرگ کے تعلیقات ہین، ان تعلیقات مین ان بزرگ نے یہ بتایا ہے کہ حافظ ابن حجر کو فلان حدیث نہین ملی، مگر وہ فلان فلان کتاب مین موجود ہے،

اس قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر حاشیہ مین ایک مٹی مٹی سی عبارت ہو، جس کے بعض الفاظ کیڑون نے چاٹ لئے ہین، اور کچھ جلد بند کی بے احتیاطی سے کٹ گئے ہین، اس لئے اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے، تاہم بڑی کوشش سے اس کے بعض فقرے پڑھنے مین کامیابی ہوسکی، وہ فقرے یہ ہین،

"الحمد للہ طالعت هذه النسخة وعلقت فی هوامشها مالم یجد مولفها....... وکتب قاسم الحنفی"

ان فقرون کو پڑھکر مین خوشی سے اچھل پڑا، اس لئے کہ ان فقرن نے ساری گرہ کھول دی، اور ان سے کاتب تعلیقات کا سراغ مل گیا، جس سے ان تعلیقات کی قیمت میری نگاہ مین بہت بڑھ گئی، یہ قاسم حنفی شیخ ابن الہمام اور حافظ ابن حجر کے بلند پایہ شاگرد، جلیل القدر مصنف اور نوین صدی ہجری کے مشہور حافظ حدیث، و فقیہ حنفی، علامہ قاسم بن قطلوبغا ہین، جن کا ذکر زائر الہ آبادی نے یون کیا ہو،

آن کہ از جمع علمائے اعلام

ابن قطلوبغاست قاسم نام

اور جنھون نے متعدد کتابون (مثلاً عوارف المعارف، الاختیار شرح المختار، اصول بزدوی، تفسیر ابی اللیث، منہاج الاربعین، الاربعین فی اصول الدین، جواہر القرآن، بدایۃ الہدایۃ، اور شرح العقائد) کی تخریج احادیث لکھی ہو، اور امام عراقی و امام زیلعی جن احادیث کی تخریج مین ناکام رہے ہین، ان کی تخریج کرکے ان کی کتابون کا تکملہ لکھا ہے، ایک کا نام اتحاف الاحیاء بما فات العراقی من تخریج احادیث الاحیاء اور دوسری

کا نیتہ الالمعی بافات الزیلعی ہی، اُن کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع مین اُن کا مطول ترجمہ درج کیا ہے، اور لکھا ہے، کہ یعرف بقاسم الحنفی یعنی قاسم حنفی کے نام سے معروف ہین، سخاوی نے یہ بھی لکھا ہو کہ حافظ ابن حجر نے اُن کو الامام العلامۃ المحدث الفقیہ الحافظ کے القاب سے یاد کیا ہے، اور اعتراف کیا ہو کہ علامہ قاسم نے میری کتاب ایثار کے پڑھنے کے دوران مین خود مجھکو فائدہ پہنچایا، اور نئی باتین بتائین، اور بہت سی جگہ مجھکو متنبہ کیا، تو مین نے اصل کتاب مین اُن کی تنبیہات و فوائد کا اضافہ کرلیا، جس سے میری کتاب کی نورانیت بڑھ گئی، (ضوء اللامع ص ۱۸۵ جلد ۶)

اس عبارت کے حل ہوجانے سے اس نسخہ کی یہ عظیم الشان خصوصیت ظاہر ہوئی کہ وہ علامہ قاسم کے مطالعہ مین رہ چکا ہے، اور اس پر خود ان کے دستِ مبارک کی تعلیقات ہین،

درایہ اب سے بہت پہلے ہمارے ہم وطن عالم مولانا محمد علی ابو المکارم صاحب مرحوم کی سعی و اہتمام سے ۱۲۹۹ھ مین طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے، ہم چاہتے ہین کہ اس مضمون مین زیر نظر نسخہ سے علامہ قاسم کے تعلیقات بھی نقل کردین، تاکہ مطبوعہ نسخہ کا مطالعہ کرنے والے حضرات ان تعلیقات کو بھی پیش نظر رکھین، اور حافظ ابن حجر کی وسعتِ نظر کے اعتراف کے ساتھ ساتھ فوق کل ذی علم علیم کے یقین و اذعان سے بھی ذہول نہ ہو،

تعلیقات علامہ قاسم علی الدرایۃ

۱۔ حدیث لا نکاح الا بشھود کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے لم ارہ بھذا اللفظ (مین نے ان لفظون کے ساتھ اس کو نہین دیکھا ہی)، اس پر علامہ قاسم فرماتے ہین، قلت اخرجہ محمد بن الحسن فی الاصل بلاغاً و وصلہ الخطیب من حدیث علی (مین کہتا ہون اس کو امام محمد نے اصل مین بلاغاً ذکر کیا، اور خطیب نے موصلاً حضرت علیؓ کی حدیث سے)

۲۔ حدیث الثیب تشاور کی نسبت حافظؒ کا ارشاد ہے لم ارہ بھذا اللفظ، اس پر علامہ قاسم

فرماتے ہیں، قلت روی الحارثی فی المسند من حدیث ابی ھریرۃ لا تنکح الثیب حتی تشاور،

۳- ظہار کرنے والے کے حق میں ارشاد نبوی ہے، استغفر اللہ ولا تعد حتی تکفر، حافظ فرماتے ہیں کہ اس کے کسی طریق میں میں نے استغفار کا ذکر نہیں پایا، علامہ قاسم فرماتے ہیں:-

قلت رواہ محمد بن الحسن بذکر الاستغفار من مرسل طاؤس ووصلہ الحاکم بذکر ابن عباس،

۴- حدیث الحناء طیب کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا ہے لم اجدہ، علامہ قاسم فرماتے ہیں:-

قلت رواہ الطبرانی فی الکبیر عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطیبی وانت محرمۃ ولا تمسی الحناء فانہ طیب،

۵- ہدایہ میں ہے، لم یاذن علیہ السلام للمعتدۃ فی الاکتحال والدھن، اس پر حافظ فرماتے ہیں، اما الاکتحال فھو فی حدیث ام سلمۃ واما الدھن فلم اجدہ، اس مقام پر علامہ قاسم نے لکھا ہے، قلت قولہ فی الھدایہ والدھن کلام مبتدأ من قبل نفسہ فانہ قال تنھی المعتدۃ عن الاکتحال والدھن لا یعری عن الطیب،

۶- ہدایہ میں ہے کہ حدیث فاطمہ بنت قیس کو حضرت زیدؓ و اسامہؓ نے بھی رد کردیا تھا، حافظ فرماتے ہیں، اما حدیث زید بن ثابت واسامہ بن زید فلم اجدھما، علامہ قاسم فرماتے ہیں قلت ما عن اسامۃ بن زید رواہ الطحاوی،

۷- ہدایہ میں ہے نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تعذیب الحیوان، حافظ فرماتے ہیں، لم اجدہ، علامہ قاسم نے لکھا، قلت الفقیہ یذکر الحدیث بالمعنی وقد روی البخاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن تصبر البھائم،

۸- ہدایہ میں ہے روی سعید بن المسیب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بعتق امہات الاولاد وان لا یبعن فی دین ولا یجعلن من الثلث، حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجدہ علامہ قاسم فرماتے ہیں:- رواہ محمد بن الحسن فی الاصل،

۹- بیع امہات الاولاد میں ہدایہ کی ایک حدیث کے لئے حافظ نے بیہقی کا حوالہ دیا ہے، اس پر علامہ قاسم تحریر فرماتے ہیں، قلت ما رواہ البیہقی خلاف ما ذکرہ صاحب الہدایۃ والذی ذکرہ صاحب الہدایہ عند محمد فی الاصل،

۱۰- حدیث ادرؤا الحدود بالشبہات کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم فرماتے ہیں، قلت رواہ الحارثی فی المسند من حدیث ابن عباس،

۱۱- ہدایہ میں ہے ومن زفت الیہ غیر امرأتہ وقال النسوۃ انہا زوجتک فوطئہا فلاحد علیہا وعلیہ المہر قضی بذلک علی، حافظ نے یہاں لکھا لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ عبد الرزاق،

۱۲- حدیث لا قطع فی الطعام کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ بہذا اللفظ علامہ قاسم فرماتے ہیں:- قلت رواہ بہذا اللفظ محمد بن الحسن فی الاصل،

۱۳- ہدایہ میں ہے وقد صح انہ علیہ السلام نہی قتل النساء والذراری اس پر حافظ نے فرمایا لم اجدہ ہکذا علامہ نے فرمایا قلت روی الحاکم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لرجل الحق خالدا ولا تقتلن ذریۃ ولا عسیفا،

۱۴- حدیث ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعطی الفارس سہمین والراجل سہما کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم حنفی نے اس پر لکھا ہے، قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل وابو یوسف فی کتاب الخراج وابو یعلی الموصلی فی مسندہ،

۱۵- حدیث اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَاکُلُ مِنْ صَدَقَتِہٖ (وَالمراد وقفہ) کی نسبت حافظ نے لکھا لَمْ اجدہٗ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الخصاف فی کتاب الاوقاف،

۱۶- حدیث من اشتری ارضًا فیھا نخل فالثمرۃ للبائع الا ان یشترط المبتاع کے باب میں حافظ نے فرمایا لم اجدہٗ علامہ قاسم لکھتے ہیں قلت فی الطبرانی من حدیث ابن عمر ان رجلاً باع ارضًا فیھا ثمرتھا فقال النبی صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم الثمرۃ للذی ابرھا الا ان یشترط المبتاع،

۱۷- حدیث: لا تاخذ الا سلمک اور اس مالک کے حق میں حافظ نے لکھا لم اجدہٗ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الدارقطنی بلفظ مَنْ اسلف فی شیئٍ فلا یاخذ الا ما اسلف فیہ او راس مالہ،

۱۸- حدیث: لا تقبل شہادۃ الولد لوالدہ ولا الوالد لولدہ ولا المرأۃ لزوجھا ولا الزوج لامرأتہ ولا العبد لسیدہ ولا المولیٰ لعبدہ ولا الاجیر لمن استاجرہ کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہٗ علامہ نے اس پر کہا، قلت رواہ الخصاف فی کتاب ادب القضاء من حدیث عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا،

۱۹- ہدایہ میں ہے، عن علی لا یجوز شہادۃ علی شہادۃ رجلٍ الا شہادۃ رجلین حافظ نے فرمایا لم اجدہٗ علامہ قاسم نے اس کا یوں پتہ بتایا، قلت اخرجہ محمد فی الاصل بلاغًا عنہ،

۲۰- حدیث عمر اذا اقر المریض بدین جاز ذالک علیہ فی جمیع ترکتہ کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجدہٗ اس پر علامہ قاسم نے لکھا قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل عن

ابن عمرؓ واللہ اعلم،

۲۱- حدیث انّ النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اجاز العمری و رد الرقبی کو حافظ نے لکھا لم اجدہٗ علامہ نے لکھا: قلت رواہ الامام محمد بن الحسن فی الاصل بھٰذا اللفظ،

۲۲- ضمان اجیر کے باب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اثر کو حافظ نے لکھا کہ لم اجدہ، علامہ قاسم نے تحریر فرمایا، کہ قلت رواہ ابن ابی شیبۃ فی مُصنفہ ومحمد بن الحسن فی الاصل،

۲۳- حدیث لیس للنساء من الولاء الا ما اعتقن او اعتق من اعتقن او کاتبن او کاتب من کاتبن او دبرن او دبر من دبرن او جرّ ولاء معتقھن کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ ھٰکذا اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قلت فی مسند رزین عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال میراث الولاء للاکبر من الذکور ولا یرث النساء من الولاء الا ولاء من اعتقن او اعتق من اعتقن،

۲۴- حدیث کان عمر اذا رأی جاریۃ متقنعۃ علاھا بالدرۃ وقال القی عنک الخمار یا دفار اتتشبھین بالحرائر حافظ ابن حجر نے فرمایا لم اجدہ اس پر علامہ قاسم نے لکھا ہے: قلت تقدم فی شروط الصّلوٰۃ انہ لم یقف منہ الا یا دفار ولا یتوقف الحکم علیہ واللہ اعلم،

۲۵- حدیث: من آجر ارض مکۃ فکانما اکل الربا کی نسبت حافظ نے فرمایا، ھٰذا کانہ تصحیف من قولہ فانما یاکل نارًا اس پر علامہ قاسم نے تحریر فرمایا، قلت رواہ الدارقطنی بلفظ اکل الرّباء

۲۶۔ حدیث حریم العین خمس مایۃ ذراع وحریم بیر العین[۱] اربعون ذراعاً و حریم بیر الناضح ستون ذراعاً کے باب میں حافظ ابن حجر کا ارشاد ہے، لم اجدہ ھکذا، علامہ قاسم فرماتے ہیں، رواہ ھکذا الامام محمد بن الحسن،

۲۷۔ ہدایہ میں ہے وتعلیم الکلب ان یترک الاکل ثلاث مرات وتعلیم البازی ان یرجع ویجیب اذا دعوتہ وھو ماثور عن ابن عباس، اس پر حافظ نے لکھا لم اجدہ[۱] علامہ قاسم فرماتے ہیں رواہ محمد بن الحسن فی کتاب الآثار،

۲۸۔ ہدایہ میں ہے، اجمع الصحابۃ علی ان الرھن مضمون واختلفوا فی کیفیۃ حافظ نے لکھا لم اجدہ، مگر اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے آثار نقل کئے، اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قلت قد شرح المؤلف ما قال انہ لم یجدہ،

۲۹۔ حدیث لا یعقل العواقل عمداً ولا عبداً ولا صلحاً ولا اعترافاً کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا، لم اجدہ مرفوعاً الا ما روی الخ اس پر علامہ قاسم نے لکھا ساقہ مرفوعاً رزین العبدری فی مسندہ،

میں نے اس نسخہ کی اطلاع علامہ زاہد کوثری کو دی تو انھوں نے اس کو فاخرۃ جداً قرار دیا، اور منیۃ الالمعی بما فات الزیلعی کے ساتھ تعلیقات قاسم حنفی کو منگوا کر چھپوا رہے ہیں،

---

[۱] ھکذا فی الاصل والصواب بئر العطن،

رحمتِ عالم

مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لئے عام فہم اور سادہ زبان میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت:- مجلد عا، غیر مجلد ۱۲ (طبع پنجم)

"منیجر"

شہاب الدین محمود آلوسی

از

جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دار المصنفین

تفسیر روح المعانی ابھی حال ہی یعنی تیرہوین صدی کے وسط کی تصنیف ہے لیکن مقبولیت کے لحاظ سے اس کو بہت سی متقدم تفسیرون پر بھی فوقیت حاصل ہے، یہ کتاب مصنف نے بارگاہ قدس کے اشارۂ غیبی پر تصنیف کی تھی، تفسیر کے مقدمہ مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے،

مصنف کے نام اور اُن کی تفسیر سے تو عام طور سے اہل علم واقف ہین، مگر ان کی دوسری تصانیف اور اُن کے سوانح حیات سے کم لوگون کو واقفیت ہے، اس لئے اردو مین ان کے حالات لکھنے کی ضرورت تھی، لیکن افسوس ہے کہ مصنف کی شخصیت اور اُن کے علمی کارنامون کی اہمیت کے لحاظ سے اُن کے حالات بہت کم ملتے ہین، تلاش سے جو معلومات حاصل ہو سکے ہین، وہ پیش کش ناظرین ہی،

خانوادۂ آلوسین آلوس عراق مین ایک بستی ہے جو دریاے فرات کے ساحل پر واقع ہے[۱] یہ قدیم آبادی ہے، دوسری تیسری صدی ہجری مین اس کی حیثیت ضلع کے مرکزی مقام کی تھی، اس کی جانب بہت سے علما و صلحا بھی منسوب ہین معجم البلدان مین اس کا مفصل تذکرہ موجود ہے، لیکن اس وقت اس کی حیثیت ایک قصبہ سے زیادہ نہین ہے، تیرہوین صدی مین یہان کے ایک خاندان نے علم و فضل مین بڑی شہرت و ناموری حاصل کی، اس خانوادہ کو عام طور پر خانوادۂ آلوسین کہا جاتا ہے، یہ خاندان علم و فضل کے لحاظ سے پورے

---

[۱] معجم المطبوعات جلد ۱ ص ۳،

عراق میں ایک خاص حیثیت کا مالک تھا، اور پورے اہل عراق کا مرجع علم تھا، صاحب روح المعانی اسی خاندان کے ایک فرد تھے،

نام و نسب اور ابتدائی حالات | شہاب الدین محمود نام، ابو عبد اللہ کنیت تھی، ۱۵ر شعبان بروز جمعہ ۱۲۱۷ھ کو آلوس میں پیدا ہوئے، اُن کے والد کا نام عبد اللہ صلاح الدین تھا، جو بڑے صاحب علم و فضل تھے انہی کی آغوش فیض میں اُن کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی، صاحبزادہ کو عربی اور فقہ، اور منطق کی متوسط تعلیم دینے کے بعد وہ عراق کے دوسرے علماء کی خدمت میں لے گئے، جن سے انھوں نے تکمیل کی، اُن کے اساتذہ کے متعلق صاحب[1] جلاء العینین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

اخذ العلوم عن علماء المحققین واجلاء مدققین، (صفحہ ۲)	انھوں نے محقق علماء اور اہل نظر فضلا سے علم حاصل کیا،

لیکن کسی کے نام کی تصریح نہیں کی ہے، الاب لویس شیخو نے اپنی کتاب آداب العربیہ میں اُن کے ایک استاذ علاء الدین متوفی ۱۲۲۲ھ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

علاء الدین واحد شیوخ شہاب الدین آلوسی،	آلوسی کے شیوخ میں ایک شیخ علاء الدین بھی تھے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھی شیوخ تھے،

ذہانت اور قوتِ حافظہ | بچپن ہی سے نہایت ذہین و فطین تھے، حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا، جلاء العینین میں ہے،

وکان ذا حافظۃ غریبۃ وفطنۃ عجیبۃ (صفحہ ۲)	عجیب وغریب ذہانت اور حافظہ پایا تھا،

---

[1] جلاء العینین کے مصنف شیخ آلوسی کے صاحبزادے ہیں،

قوت حافظہ کا خود ان کے بیان کے مطابق یہ حال تھا،

ما استودعت ذهنی شیئا خاننی[۵]	ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اپنے ذہن میں کوئی بات رکھی ہو، اور وہ پھر ذہن سے نکل گئی ہو

اسی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ ۱۳ برس کی عمر میں ابن ہشام کی کتاب شرح قطر الندی پر حاشیہ لکھا،[۶] ابھی بیس برس سے بھی کم عمر تھی کہ مسند درس کے زینت بنے، اور اسی زمانہ میں صاحب تصنیف بھی ہوئے، جلاء العینین میں ہے،

وقد الف ودرس وهو دون العشرين (ص ۲۷)	بیس برس سے کم ہی کے تھے، کہ صاحب درس وتصنیف ہو گئے،

تلامذہ | ابتداے عمر سے لے کر آخر عمر تک افادہ وتعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس مدت میں ہزاروں تشنگان علم اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہوں گے لیکن افسوس ہے کہ ان کا مفصل تذکرہ نہیں ملتا، اُن کے صاحبزادہ کا بیان ہے کہ

وانتفع به خلق كثير، (جلاء ص ۲)	اُن سے ایک مخلوق نے استفادہ کیا،

متفرق طور پر حسب ذیل تلامذہ کے نام ملتے ہیں،

۱-ان کے دو صاحبزادے عبد الباقی سعد الدین (۲) خیر الدین ابو البرکات جو اپنے وقت کے جید علماء میں تھے اور متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، جلاء العینین خیر الدین ابو البرکات ہی کی تصنیف ہے (۳) الشیخ عبد الفتاح شواف زادہ ان کو حدیث وفقہ اور عربی ادب سے زیادہ دلچسپی تھی، ادب کی تعلیم خاص طور سے انھوں نے شیخ آلوسی سے حاصل کی تھی، اُن کی متعدد تصانیف ہیں، حدیقۃ الورد کے نام سے دو جلدوں میں شیخ آلوسی کی سوانح حیات بھی لکھی ہے کاش یہ کتاب مل جاتی تو شیخ کے مفصل

---

[۵] جلاء العینین ص ۲۷ [۶] آداب العربیۃ ج ۱ ص ۸۰ [۳] معجم المطبوعات،

حالات اور کارنامے سامنے آجاتے (۴) محمد الاخفش، یہ شیخ کے خاص تلامذہ مین تھے، ان کی تحریری یادگارون مین شرح الفیہ زیادہ مشہور ہے (۵) عبد الفتاح الاخرس انھون نے شیخ سے اور کتابون کے علاوہ کتاب سیبویہ خاص طور سے پڑھی تھی۔[۱]

افتار | اس علم و فضل کے باوجود عام مجالس وعظ مین جانا پسند نہین کرتے تھے، سنہ ۱۲۵۰ھ مین اُن کو جامع بغداد مین وعظ کے لئے بلایا گیا، تو بہت بار خاطر ہوا، جب زیادہ اصرار کیا گیا تو بکراہت گئے، اس وعظ مین والی بغداد بھی موجود تھا، وہ بہت متاثر ہوا، اور اس کو اسی دن سے شیخ سے ایک خاص عقیدت ہوگئی، اور اس کے بعد سے وہ برابر ان کی خدمت مین حاضر ہوتا رہا اور بعد مین بغداد کے مفتی کی حیثیت سے اُن کا تقرر کردیا، شیخ نے ۱۵ برس تک یہ خدمت نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دی۔[۲]

وفات | ۱۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۰ھ کو ۵۳ برس کی عمر مین وفات پائی، اور حضرت شیخ معروف کرخی کے پہلو مین سپرد خاک کئے گئے، ..... وفات کا صدمہ خواص اور عوام سب کو ہوا، آج بھی آپ کی قبر زیارت گاہ عام و خاص ہے[۳] متعدد شعرا نے طویل مرثیے لکھے، زندگی مین شعرا نے جو مدائح لکھے، اور موت کے بعد جو مراثی کہے گئے، ان سب کو الاب لویس نے کتابی شکل مین جمع کردیا ہے[۴] اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اولاد و احفاد | ان کے دو صاحبزادون عبد الباقی اور خیر الدین کا ذکر اوپر آچکا ہے، اُن کے علاوہ ایک اور صاحبزادے عبد اللہ بہار الدین تھے، دوسرے بھائیون کی طرح یہ بھی صاحب علم تھے، اُن کے صاحبزادے (یعنی شیخ آلوسی کے پوتے) ابو المعالی متوفی سنہ ۱۳۴۲ھ نے علم و فضل مین باپ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، متعدد قیمتی تصانیف یادگار چھوڑین، ان مین بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب بہت مشہور ہے، اور چھپ کر شائع ہوچکی ہے،

اخلاق و عادات | شیخ کے صاحبزادے نعمان نے ان کے ظاہری و باطنی محاسن کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا ہے

وکان حُسن المنظر والمحاضرۃ نہایت خوبصورت اور خوش گفتار تھے اور

---

[۱] یہ پچھلے تین آدمیون کا ذکر آداب العربیہ مین ہے جلد ۱ ص ۹۳ تا ۹۵ [۲] معجم المطبوعات ص ۴ [۳] جلاء العینین ص ۲۵ [۴] آداب العربیہ

والمفاكهة ورعاً تقيا عفيفا (جلاء ص۲)	پرہیزگار اور پاک دامن تھے،

صاحب حدیقۃ الورد لکھتے ہیں :-

كريم الذات حميد الاخلاق	کریم النفس اور اخلاق میں نادر روزگار تھے،

اور جلاء کے مصنف کا بیان ہے،

ولم يسمع بمثله في كافة الاقاليم	بہت دنوں سے ان ممالک میں ایسا صاحب علم
منذ سنين عديدة مع تقوى	وفضل سننے میں نہیں آیا، اس علم وفضل کے
وصلاح وديانة قوية وسخاء	ساتھ صلاح وتقوی، راست بازی اور
وكرم وصدقات خفية	سخاوت اور پوشیدہ صدقات کرنے میں وہ
(جلاء ص۲)	اپنی مثال تھے،

فضل وکمال | شیخ آلوسی کے علم وفضل کا صحیح اندازہ تو اُن کی تصانیف ہی سے ہو سکتا ہے لیکن انکے معاصرین بھی اُن کے کمالات کے معترف تھے،

وہیں شیخو نے لکھا ہے،

كلف بالعلوم منذ حداثة	اوائل عمر ہی سے اُن کو علوم سے دلچسپی اور
سنه وبذل النفس والنفيس	لگاؤ تھا اور علمی جواہر پاروں کے جمع کرنے میں
في احراز جواهرها فان رغبته	انھوں نے اپنی جان ومال ہر چیز لگا دی
في طلب المعارف شغلته عن	تھی، طلب علم کی رغبت وشوق نے ان کو
حطام الدنيا وانسته هناء	اپنی طرف اتنا مشغول کر لیا کہ وہ زخارف
العيش وملاذ الحياة وبرز	دنیوی اور لذت آرام سے بھی بے نیاز ہو گئے،
بالعلوم الدينية فصار اماما	اس ذوق وشوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم دینیہ

فی التفسیر والافتاء وکان مع	مین اُن کو پورا کمال حاصل ہوگیا، چنانچہ
ذلک کاتباً بلیغاً۔[۱]	تفسیر اور افتا مین اُن کی حیثیت امام
	کی ہوگئی، اسی کے ساتھ انشا پردازی اور
	بلاغت مین بھی کمال حاصل تھا،

صاحب حدیقۃ الورد جو اُن کے شاگرد ہین لکھتے ہین،

کشاف رموز الحقائق وغواص	حقائق علم کا راز فاش کرنے والے اور
بحر الدقائق، علامۃ الفضلاء	بحر معانی کے غواص تھے، اہل فضل کی نشانی
وحید الدھر بالاتفاق، خاتم	اور بالاتفاق نادرۂ روزگار تھے، خاتم
المفسرین وسعد المحققین	المفسرین تھے اور اہل تحقیق اور علمائے اُمت کیلئے
وفخر علماء المسلمین الواصل	سعادت اور فخر کا موجب تھے، اُن کو
الی رتبۃ الاجتھاد ذکرہ فی البلاد	اجتہاد کا رتبہ حاصل تھا، تمام ممالک مین
(جلاء صفحہ ۲)	ان کا چرچا ہے،

صاحب اریج الند کا جو شیخ کے شاگرد ہین، بیان ہے،

وکان نادرۃ الاوان حصل	نادرۂ روزگار تھے، انھون نے علوم نقلیہ
العلوم النقلیۃ والعقلیۃ فتفرد	اور عقلیہ کی تحصیل کی اور اس مین تفرد
بھا ودرس العربیۃ والبیان	حاصل کیا، ادب عربی، معانی وبیان
والحدیث والتفسیر ووقف	تفسیر وحدیث کا درس دیا، اور انھی علوم
علی غامضۃ العسیر۔۔۔ ولقویمع	کی مشکلات حل کرتے رہے،........

[۱] آداب العربیہ ج ۴ ص ۸۵،

بجشلہ فی کافۃ الاقالیم (صفۃ) اُن کے جیسا نادرہ روزگار سننے میں نہیں آیا،

عربی نظم ونثر | عربی نظم ونثر دونوں پر پوری قدرت تھی، نثر میں ان کی قدرت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں،
صاحب آداب العربیہ ان کی تحریر کے متعلق لکھتے ہیں،

کان السید محمود سریع الخاطر	شیخ محمود نہایت ذکی الفہم اور اپنے انداز تحریر
ونسیج وحدہ فی قوۃ التحریر	اور عبارت کی سلاست وروانی میں
سھولۃ لکتابۃ (ج ۲ ص۵)	منفرد تھے،

جلاء العینین میں ہے :-

والنثر العجیب الذی لم یسبق	ایسی اچھوتی نثر لکھتے تھے، کہ اُن کے اسلوب
حسن اسلوبہ (صفۃ)	تحریر کی مشکل ہی سے تقلید کیجا سکتی تھی،

عربی شعر وشاعری کا بھی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ مذاق تھا، نثر کی طرح ان کی نظم میں بھی دو خصوصیتیں یعنی رقت وسلاست زیادہ نمایاں ہیں، نمونۃً چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں، ایک موقع پر عراق کے چھوٹنے پر کہا ہے،

اھیم بآثار العراق وذکرہ	وتغدو عیونی من مسرتھا عبری
والثم اخفافاً وطئن ترابہ	واکحل اجفاناً بتربتہ العطری
واسھر ارعی فی الدیاجی کواکباً	تمرّ اذا سارت علیٰ ساکنی الزورا

بغداد کی تعریف اور اس کے فراق میں کہتے ہیں،

ارض اذا مرّت بھاریح الصّبا	حملت من الارجاء مسکا اذفرا
لا تسمعن حدیث ارض بعدھا	یروی فکل الصید فی جوف الفرا
فارقتھا لا عن رضی وھجرتھا	لا عن قلی ورحلت لا متخیرا

لکنها ساقت علی برحبها لما رایت بها الزمان تنکرا

آخری شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کو انھوں نے خوشی سے نہین، بلکہ حالات سے مجبور ہو کر چھوڑا،

علم نحو نحو ان کا خاص فن تھا، اوپر ذکر آچکا ہے کہ کتاب سیبویہ خاص طور سے وہ پڑھایا کرتے تھے، اس فن سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ اُن کی تفسیر سے ہوتا ہے، اس مین نحو کے جو مسائل آئے ہین اگر ان کو الگ کر لیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے،

امر بالمعروف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علماء کا خاص فریضہ ہے، شیخ آلوسی کو اس فرض کا پورا احساس تھا، اور وہ درس مین علمی و دینی خدمت کے ساتھ اس فریضہ کو بھی انجام دیتے تھے، ان کے صاحبزادے نعمان اُن کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہین،

والامر بالمعروف والنھی عن المنکر	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور سُنت
والذب عن السنۃ (جلاء ص۲۳)	نبوی کی طرف سے مدافعت بھی ان کی
(جلاء ص۲۳)	خاص خصوصیت تھی،

مسلک پورا خانوادۂ آلوسیین شافعی المسلک تھا، اس لئے شیخ آلوسی بھی شافعی تھے، لیکن ان مین تشدد نہین تھا، چنانچہ بعض مسائل مین وہ حنفی مسلک کے پابند تھے، شاید اسی وسعت کا نتیجہ تھا کہ عہدۂ افتاء پر ان کا تقرر ایک حنفی مفتی کی حیثیت سے ہوا تھا،[۱]

تصانیف شیخ کا اصل کارنامہ ان کی بیش بہا تصانیف ہین، جن کی اہمیت اُن کی کمیت کی وجہ سے نہین بلکہ معنوی کیفیت کے لحاظ سے ہے، اور اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس لئے اس مضمون مین صرف اُن کے نام اور مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے،

---

[۱] معجم المطبوعات ص۱۷،

قیل انہ کان لا یقصر تالیفہ فی

الیوم و اللیلۃ عن اقل من ورقتین

کبیرتین (صف)

صاحب جلا العینین نے اُن کی ۸ تصانیف کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ۱۳ مطبوعہ ہیں،

۱- الاجوبۃ العراقیۃ عن الاسئلۃ الایرانیہ:- ایران کے علماے شیعہ نے چند سوالات کئے تھے، یہ کتاب اسی کے جواب میں لکھی گئی ہے، ۱۳۱۷ھ میں آستانہ سے شائع ہو چکی ہے،

۲- الاجوبۃ العراقیۃ عن اسئلۃ اللاہوریہ، یہ بھی چند سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہے، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ ہے، بغداد سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کی ضخامت ۶۵ صفحات ہے،

۳- قطر الندی: فن نحو کی کتاب ہے، ابن ہشام نحوی متوفی ۷۶۲ھ کی تصنیف ہے، خود اس نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی ہے، اس کتاب کی صاحب کشف الظنون نے بڑی تعریف کی ہے، اس پر متعدد حواشی لکھے گئے ہیں، شیخ آلوسی نے بھی اس پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، صرف باب الحال تک لکھ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا، انکے بعد انکے صاحبزادے نعمان نے اسے پورا کیا، ۱۳۲۰ھ میں بیت المقدس سے شائع ہو چکی ہے،

۴- الخریدۃ الغیبیہ فی تفسیر قصیدۃ العینیہ، عبد الباقی موصلی نے حضرت علیؓ کی مدح میں ایک قصیدہ عینیہ لکھا تھا، مصنف نے اس کی تشریح کی ہے، قصیدہ مع تشریح ۱۲۷۰ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے، اس کی ضخامت ۱۵۶ صفحات ہے،

۵- سفرۃ الزاد لسفرۃ الجہاد:- یہ جہاد سے متعلق ہے، ۱۲۷۰ھ میں مطبع دار السلام مصر نے اُسے شائع کیا ہے،

۶۔ الطراز المذہب شرح قصیدۃ الباز الاشہب: عبد الباقی عمری کے ایک قصیدہ کی شرح ہے، مطبع جریدۃ الفلاح نے ۱۳۱۳ھ ہجری میں اسے شائع کیا ہے اسکی ضخامت ۱۹۶ صفحات ہے،

۷۔ غرائب الاغتراب ونزھۃ الالباب: مصنف نے فلسطین کا سفر کیا تھا، اس میں اسی سفر کے حالات ہیں، اسی میں ان تمام علماء و صلحاء کے حالات بھی لکھ دیئے ہیں، جن سے انھوں نے اثنائے سفر میں ملاقات کی تھی، ۱۳۲۷ھ میں بغداد سے یہ سفرنامہ شائع ہوچکا ہے، کتاب کے شروع میں احمد شاکر آلوسی کے قلم سے مصنف کا ترجمہ بھی ہے، اسکی ضخامت ۴۵۱ صفحے ہیں،

۸۔ الفیض الوارد: سید محمد جواد نے اپنے شیخ الشیوخ خالد الکردی النقشبندی کا ایک طویل مرثیہ والیہ لکھا تھا، یہ اس کی شرح ہے، ۱۲۸۰ھ میں مطبع کاستلیہ نے شائع کیا، ضخامت ۲۴۸ صفحات ہیں،

۹۔ کشف الطرۃ عن الغرۃ درۃ الغواص فی اوھام الخواص، ابو محمد قاسم الحریری متوفی ۵۱۶ھ کی تصنیف ہے، اس کتاب میں مصنف نے خواص کے معائب اور اُن کے اوہام باطلہ پر بڑی اچھی بحث کی ہے، اس کتاب کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، دو شرحیں نظم میں بھی کی گئی ہیں، شیخ آلوسی نے بھی کشف الطرہ کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے، یہ کتاب دمشق سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوچکی ہے، کتاب کے شروع میں شیخ کے صاحبزادے نعمان آلوسی کا ایک مقدمہ بھی ہے، کتاب کی ضخامت ۱۰۰ صفحات ہیں،

۱۰۔ المقامات الخیالیہ: یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کتاب کس موضوع پر ہے، بغداد یا کربلا سے شائع ہوچکی ہے،

۱۱۔ نشوۃ الشمول: یہ سفرنامہ ہے ۱۲۶۷ھ میں مصنف نے استنبول کا سفر کیا تھا، اس میں اسی سفر کے حالات ہیں،

۱۲۔ نشوۃ المدام فی العود الی مدینۃ السلام، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، غالباً یہ سفر سے واپسی پر بغداد کے متعلق کچھ لکھا ہے، واللہ اعلم، یہ کتاب دو بار بغداد سے شائع ہو چکی ہے،

۱۳۔ تفسیر روح المعانی: اُن کی زندگی کا اصلی اور سب سے اہم علمی اور دینی کارنامہ یہی تفسیر ہے، اس کی تالیف ۱۲۵۲ھ میں جب کہ مصنف کی عمر ۳۴ برس کی تھی، شروع ہوئی، اور ۱۲۶۷ھ میں اختتام کو پہنچی، یہ کتاب دوبار چھپ چکی ہے،

کتاب کے شروع میں مصنف نے لکھا ہے کہ نوجوانی ہی میں قرآن کے بہت سے حقائق و معارف اُن پر منکشف ہونے لگے، اور بہت سے دقائق اُن کے ذہن میں ایسے آئے، جو متداول تفسیروں میں نہیں ملتے، چنانچہ ان کو ان دقائق و معارف کے قلمبند کرنے کا خیال پیدا ہوا، ابھی وہ اس ادھیڑ بن ہی میں تھے کہ ایک رات خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین و آسمان کے لپیٹنے اور اس میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے، اس کو پُر کرنے کا حکم دے رہا ہے، اسی حالت میں انھوں نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اور دوسرا پانی کی طرف بڑھایا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی، اور تفسیر لکھنے میں جو کچھ تامل و تردد تھا، وہ رفع ہو گیا، اور انھوں نے اس کام کو شروع کر دیا،

کتاب کے شروع میں، فائدے دیئے ہیں جن میں تفسیر کے تمام اہم مسائل آگئے ہیں، مثلاً تفسیر و تاویل، تفسیر بالرای، اسمائے قرآن، کلام اللہ غیر مخلوق، حروف سبعہ، جمع و ترتیب قرآن، اعجاز القرآن وغیرہ مباحث پر مختصر طور سے اچھی بحث کی ہے، پوری تفسیر ۳۰ حصوں میں ہے،

اس خاندان کے دوسرے اکابر شیخ کے صاحبزادوں کا ذکر اوپر آچکا ہے، جن میں ہر ایک صاحب علم و فضل تھا، اُن کے دو پوتوں نے بھی اس لحاظ سے بڑی ترقی کی، ان میں ایک ابو المعالی محمود شکری ہیں جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، دوسرے علی علاء الدین ہیں، جنھوں نے پوری زندگی علم دین کی تدریس میں گذار دی، کچھ

تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، ۱۲ ویں اور تیرہویں صدی کے اکابر کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، اس کے علاوہ نحو میں ایک کتاب لکھی ہے، جو چھپ گئی ہے، ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی،

شیخ آلوسی کے دو بھائی عبد الحمید اور عبد الرحمان بھی اپنے زمانہ کے ممتاز علما میں گذرے ہیں، عبد الرحمن نہایت فصیح و بلیغ تھے، خطابت میں خاص طور سے مشہور تھے، اس کے علاوہ کرخت کی جامع مسجد میں زندگی بھر درس و تدریس کا کام کرتے رہے، ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی، دوسرے بھائی عبد الحمید نابینا تھے، لیکن اپنے وقت کے بہترین ادبا و شعرا میں ان کا شمار ہوتا تھا، نہایت مقبول عوام تھے، ایک آدھ تحریری یادگاریں بھی چھوڑی ہیں، ۱۳۲۴ھ میں وفات پائی،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے،

قیمت :- مجلد للعہ غیر مجلد ہیر

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

"پروفیسر رام پرشاد کھوسلا، ام اے (پنجاب) بی، اے (آکسن) پنجاب کے رہنے والے تھے، اور پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، تاریخ ہند پر اُن کی ایک کتاب Mughal Kingship and Nobility ۱۹۳۴ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئی تھی، اس کے خاتمہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ موجودہ جمہوری، اور سیکولر حکومت کے زمانہ میں مطالعہ کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں، ص، ع"

فیض رسان بادشاہت مغلوں کی بادشاہت ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کے لئے بہتر طور پر فائدہ مند تھی، ان کی حکومت مطلق العنان ضرور تھی، لیکن انھوں نے اس ملک کے باشندوں کے قدیم حقوق میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، ان کی بادشاہت کے عیوب اپنی جگہ پر ہیں، اور کوئی مطلق العنان حکومت کلیۃً باعثِ رحمت نہیں ہو سکتی، لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغلوں کی بادشاہت اپنی شان و شوکت کے ساتھ اس زمانہ کے لئے بالکل مناسب تھی، اور اپنی خوبیوں ہی کی وجہ سے یہ پرشکوہ حکومت ایک طویل مدت تک قائم رہی، اس خاندان میں مسلسل چھ ایسے بادشاہ گذرے جن کی شخصیتیں بہت ہی اعلیٰ تھیں، عام طور پر ان کی حکومت میں نرمی اور رحمدلی تھی، انھوں نے کبھی اپنی فوجی قوت کو رعایا کی فلاح و بہبود سے لاپرواہ ہو کر استعمال نہیں کیا، وہ کبھی لوگوں کے نجی معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے، ملک کے رسم و رواج کو کسی قانون کے ذریعہ پس پشت نہیں ڈالتے تھے، نظری طور پر ان کی حکومت مطلق العنان ضرور

تھی، لیکن عملی طور پر بڑی ہی فیض رسان رہی،

قیام امن پورے ملک میں ایک ایسا دبدبہ قائم تھا کہ دور دراز صوبون کے حکام بھی اُن کے خلاف سر اُٹھانے کی جرأت مشکل ہی سے کرتے تھے،

مغلون کے زمانہ میں جب کہین بدامنی ہوتی، تو سختی سے دور کردی جاتی تھی، اس عہد کے حکمرانون نے امن وامان قائم کرکے ملک کو کمزور حکومت اور متزلزل نظام سلطنت کی خرابیون سے بچائے رکھا، اُن کو قوت واقتدار کی ہوس ضرور تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے بھی برابر کوشان رہتے، اگر امراء کو شاہانہ سرپرستی مین ترقی ہوئی تو ادنیٰ درجہ کے لوگون کو بھی شاہانہ عنایتون کی بدولت خوشحالی نصیب ہوئی،

کاشتکارون کی محافظت حکومت کی جانب سے زراعت کی ترقی کے لئے بڑی کوشش اور نگرانی کی جاتی، آمدنی کا بڑا حصہ زمین ہی سے حاصل ہوتا تھا، اس لئے کاشتکارون کی فلاح وبہبود کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا، جب کسی علاقہ سے فوج گذرتی تو وہان کی رعایا کی حفاظت کا پورا سامان کیا جاتا تھا، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ شاہجہان (۱۶۳۳ء) مین لاہور جارہا تھا، تو اُس نے بخشیون کو حکم دیا کہ وہ تیرانداز کو لے کر راستہ کے ایک جانب کی حفاظت کرین اور میرآتش کو بندوقچیون کے ساتھ راستے کی دوسری سمت تعینات کیا تاکہ شاہی فوج کھیتون کی فصل کو نقصان نہ پہنچا سکے، لیکن یہ بھی احتمال تھا کہ اس انتظام کے باوجود فصل کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچ جائے گا، اس لئے پہلے ہی سے داروغہ مشرف اور امین مقرر کردیئے تھے کہ رعایا اور ایک ہزار سے کم کے جاگیردارون کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے، ایک بار شاہی فوج ۱۶۴۹ء مین قندھار کی طرف جارہی تھی، جس سے غزنی مین کھیتون کو بڑا نقصان پہنچا، چنانچہ وہان کے کاشتکارون کو اس کے معاوضہ مین دو ہزار اشرفیان دی گئین، ہر بادشاہ کاشتکارون کی بڑی پاسداری کرتا تھا، کیونکہ اسی پر حکومت کی اصلی آمدنی کا انحصار تھا،

فنون کی ترقی

صرف زراعت ہی کو شاہانہ سرپرستی حاصل نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ میں دوسرے قسم کے آرٹ نے بھی بڑی ترقی کی، اور یہ ترقی بادشاہوں کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی، یورپین سیاحوں نے اس زمانہ کے آرٹ کی بڑی تعریف کی ہے، جہانگیر کے عہد میں مصوری کو بڑا فروغ ہوا، پادری فرانیکو کارڈکا بیان ہو کہ جہانگیر کے عہد میں ایسے باکمال مصور تھے کہ جو یورپ کی مصوری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں کی نقل اس طرح اُتار دیتے تھے کہ اصل کا دھوکا ہوتا تھا،

ملک میں اعلیٰ قسم کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے، اس زمانہ کا مشہور کپڑا بافتہ ہالینڈ کے کپڑوں سے بہتر ہوتا تھا، اونچے طبقہ کے لوگ جو کپڑے پہنتے، ان میں طلائی اور نقرئی تار بھی استعمال کیا جاتا،

تعمیراتِ عامہ میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کیجاتیں، ان تعمیرات کے نمونے آج بھی موجود ہیں ملک کے ہر حصہ میں محلوں، مسجدوں، حماموں، مقبروں، قلعوں اور دوسری قسم کی عمارتوں کی تعمیر بکثرت ہوتی رہی، شاہراہوں کے کنارے مسافروں کی راحت وآسایش کے لئے سرائیں اور مسافرخانے بنائے گئے، مغلیہ عہد کی شاندار عمارتوں کے دیکھنے کے لئے آج تک دنیا کے مختلف حصوں سے سیاح آتے رہتے ہیں

علوم کی سرپرستی

مغل بادشاہ علوم کے بھی بڑے سرپرست تھے، اُن کی فیاضی کا شہرہ سُن سُن کر دوسرے ملکوں کے علماء وشعراء اُن کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے، ان بادشاہوں میں بعض خود بھی بلند پایہ اہلِ قلم تھے، بابر کی تزک ایک علمی شاہکار ہے، اکبر نے ملک الشعراء کا ایک نیا عہدہ قائم کیا، اور سب سے پہلے غزالی اس عہدہ پر فائز ہوا، آئینِ اکبری میں ابوالفضل کا بیان ہے کہ اکبر کے دربار میں ایران کے بہت سے ممتاز شعراء کا اجتماع ہو گیا تھا، ان میں سے بعض شعراء کے نام یہ ہیں حکیم ثنائی، نظیری نیشاپوری، ہاتفی اصفہانی، جعفر بیگ قزوینی، خواجہ حسین ہروی، حیاتی گیلانی، انیسی، خسروی، وفائی، رفیقی، عرفی شیرازی، فسونی، نادری، قدسی، حیدری، تبریزی، اشکی، فہمی، آذری، جذبی، سنجر کاشی، تشبیہی، سرمدی، قاسم ارسلان، مشہدی، باباطالب، باباغوری وغیرہ،

جہانگیر شاعر بھی تھا، اور شعر و سخن کا نقاد بھی، اُس نے بھی ایک تزک لکھی ہے،

بادشاہون اور شاہزادون کے علاوہ امرار بھی علم و ادب کے سرپرست تھے، ابو الفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کی قدردانی نے شعر و سخن کی ایک اکیڈیمی ہی قائم کر دی تھی، خان زمان شعرار کا بڑا مربی تھا، غزالی نے اس کی شان مین ایک ہزار اشعار کا ایک قصیدہ لکھا، خان زمان نے اس کے ہر شعر کے صلہ مین ایک اشرفی دی، کشمیر کا صوبہ دار ظفر خان مشہور شاعر صائب کا مربی تھا، بیرم خان بھی شاعر تھا، نظیری کو اس کی سرپرستی حاصل تھی، اکبر کا رضاعی بھائی خان اعظم کوکلتاش اہل قلم تھا، سبزواری، بدخشی، جعفر ہروی آتھی، اور مداحی وغیرہ شعرا اس کی فیاضیون کے رہین منت رہے، عرفی نے ایک قصیدہ کے صلہ مین ایک لاکھ روپیہ انعام پائے، امرار کے یہان برابر مشاعرے ہوا کرتے تھے، شہزادہ دانیال ہندی زبان کا شاعر تھا، شہزادہ مراد نظیری نیشاپوری کا سرپرست رہا، جہانگیر کے عہد مین طالب آملی ملک الشعرار تھا، شاہجہان نے ابو طالب کلیم کو یہ اعزاز بخشا، جہانگیر کے زمانہ مین قندھار کا صوبہ دار غازی وقاری شعراء اور علمار کا بڑا دلدادہ تھا، ایران سے جو شعرار ہندوستان آتے وہ پہلے اسی کے دربار مین قیام کرتے تھے،

ملک مین بڑے بڑے کتب خانے بھی تھے، جب بابر کی فوجون نے لاہور کے پاس قلعہ ملوٹ مین داخل ہو کر اس کو لوٹنا شروع کیا، تو بابر نے وہان کے کتب خانہ کو بچا لیا، اس کو لاہور کے علم نواز غازی خان نے قائم کیا تھا،

ملک مین ماہرین فن اور شعرار کی کثرت اس کا ثبوت ہے کہ مغل بادشاہ ان فنون کی جانب سے کبھی غافل نہین رہے، جن کو امن و امان کے زمانہ مین فروغ پانا چاہئے تھا، اُن کو جنگ و جدل سے جب بھی فرصت مل جاتی، تو رعایا کی حالت سدھارنے کی کوشش مین لگ جاتے، اُن کی آمدنی وافر تھی لیکن جو روپیہ بادشاہ کے ہاتھ مین آتا تھا، وہ مختلف ذرائع سے پھر رعایا کے ہاتھ مین پہنچ جاتا تھا،

عدل گستری | مغل حکمران عدل کو ایک مقدس فرض سمجھتے تھے، اُن کے زمانہ مین ادنی آدمی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست بادشاہ کی خدمت مین پہنچکر انصاف کا طلب گار ہو، گو اس حق کے استعمال کا موقع کم آتا تھا تاہم اس کی وجہ سے بے انصافی کی بڑی روک تھام رہتی تھی بعض اوقات یہ حق رعایا کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوتا تھا،

مذہبی رواداری | عدل و انصاف مین اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاستون مین سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلون کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ پیدا ہونے نہین پایا، اور کسی زمانہ مین بھی یہ کوشش نہین کی گئی کہ حکمران قوم کا مذہب محکومون کا بھی مذہب بنایا جائے، حتی کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہین رکھی تھی، مغلون کے عہد مین (Corporation Act) یا (Five Mile Act) یا (Act of Uniformity) کی کوئی مثال نہین ملتی ہے، لوگون کے ضمیر کے خلاف کوئی (Conformity) جیسا قانون نہین بنایا گیا، ایلزبتھ کے زمانہ مین ایک ایسا قانون تھا جس کے ذریعہ جبری طور پر عبادت کرائی جاتی تھی، مغلون کے زمانہ مین اس قسم کا جبر نہین کیا گیا،

(St Bartholomew Solay) کے جیسے قتل عام سے مغلون کی تاریخ کبھی داغدار نہین ہوئی، مذہبی جنگ کی خونریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، لیکن مغلون کے عہد مین ایسی مذہبی جنگ کی کوئی مثال نہین ملتی، بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا تھا، لیکن اُس نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے عقائد پر کوئی دباؤ نہین ڈالا، بابر سے لیکر اورنگزیب کی تخت نشینی تک مغلون کی تاریخ تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی تلخی سے تقریبًا پاک ہے، مغلون مین ولندیزیون سے زیادہ رواداری تھی، یورپین مورخ اورم کا بیان ہے کہ ولندیزیون نے متعصبانہ مذہبی پالیسی اختیار کی تھی، اور جب مرہٹون نے عیسائی مذہب اختیار کرنے

سے انکار کیا تو بہت سے مرہٹہ خاندانون پر بڑی سختیان کی گئین، ان ولندیزیون سے سیواجی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی، وہ ولندیزیون کو اپنے مذہب کا دشمن سمجھتا تھا، اسی انتقام مین اس نے ہندوستان کے مغربی حصہ کے ولندیزیون سے چوتھ وصول کیا،

رعایانوازی | مغلون کے زمانہ مین وقتاً فوقتاً جو شاہی اعلانات ہوتے رہے، اُن سے مغلون کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے، اکبر کہا کرتا تھا کہ ظلم ہر شخص کے لئے ناجائز ہے، اور بادشاہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور بھی ناروا ہے کہ وہ تو دنیا کا محافظ ہوتا ہے، جہانگیر اپنی تزک مین لکھتا ہے،

بہر نگہبانی خلقِ خدا شب نکنم دیدہ بخواب آشنا

از پئے آسودگی جملہ تن رنج پسندم بہ تن خویشتن

اورنگ زیب نے شاہ جہان کو اس کی معزولی کے بعد ایک موقع پر لکھا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو کچھ عطا کرتا ہے جس مین رعایا کی حالت سدھارنے اور اُن کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگون کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

مغل اپنے ان اقوال کا ثبوت عمل سے دیتے تھے، ان کا نظامِ سلطنت نہ صرف مستحکم بلکہ فائدہ مند بھی تھا، حکومت کا استحکام اور اقتدار لوگون کے حق مین بہت مفید تھا، اسی کی بدولت ایک عرصہ تک ملک مین امن اور اقتصادی خوشحالی رہی،

مغلون کا طرزِ حکومت اگرچہ مطلق العنان تھا، لیکن اس زمانہ کے لئے یہی طرزِ حکومت موزون تھا، حکومت کے لئے عوام کی نمایندہ جماعت کی ضرورت سمجھی نہین جاتی تھی، تمام لوگ اس طرزِ زندگی سے مطمئن تھے، جس کو وہ اپنی خواہش سے اختیار کرلیتے تھے، حکومت کا انحصار بظاہر فوجی قوت پر تھا، لیکن عملاً وہ فیض رسان تھا، رعایا کی تمام پرانی چیزین باقی رہنے دی گئین، ان کے رسم ورواج کو قائم رکھا گیا، جس سے ملک کو ترقی ہوتی رہی، اور لاقانونیت کو روکے رکھا گیا، امن وامان پر زیادہ

زور دیا گیا، مغلون کے شخصی استبداد مین مستعدی اور ہوشمندی تھی، اس لئے وہ کامیاب رہا، ازمنۂ وسطیٰ مین اصلی خطرہ انارکی یعنی طوائف الملوکی کا پھیلنا تھا، کسی کے ہاتھ مین تمام اقتدار کا مرکوز ہوجانا خطرہ نہین سمجھا جاتا تھا، مغلون نے ملک مین تخریبی عناصر کو کبھی بڑھنے نہین دیا، قانون کا اقتدار اعلیٰ کامیابی کے ساتھ ہر حال مین برقرار رکھا گیا، گو زیادہ تر بادشاہ کی خواہش ہی کا نام قانون ہوتا ہے لیکن لوگون نے اس زمانہ کے طرزِ حکومت کو آسانی سے تسلیم کر لیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طرز اُن کے سیاسی خیالات و رجحانات کے مطابق تھا، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغل مطلق العنان ضرور تھے لیکن اس کے ساتھ بڑے مدبر اور سیاست دان بھی تھے،

"ص، ع"

کثیر التصانیف مصنفین

قدیم مسلمان علما و مصنفین مین بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا ہوے جن کی تصانیف کی تعداد سینکڑون سے متجاوز ہے، اور ان کی تحریر کا اوسط روزانہ کئی کئی جزو پڑتا ہے، ہر قوم اور ہر زمانہ مین کثیر التصانیف اہلِ قلم موجود رہے ہین، چنانچہ یورپ کے بہت سے ایسے مشہور ناول نگار ہین، جنھون نے بے شمار ناول لکھے، ڈوما نے بارہ سو جلدین لکھین، لوپ ڈی دیگا نے اٹھارہ سو ڈرامے لکھے، عورتون مین مرجوری بوون کی تصانیف مین ایک سو ساٹھ ناول ہین، وہ کبھی مرد اور کبھی عورت کے نام سے اپنی کتابین شائع کرتی تھی، مسز ہمفری وارڈ اور ایولن ایورٹ گرین ننانوے ناولون کی مصنفہ ہین، مسز اولی فینٹ نے ایک سو بیس ناول لکھے، ای فلپس اوپنہیم کے نام سے تقریباً دو سو ناول شائع ہوے، ایک فرانسیسی اہلِ قلم ایبل ہرمنٹ کے ناولون ڈرامون، افسانون اور مضامین کی تعداد سو سے زیادہ تھی، رابرٹ ہوپ مون کریف نے دو سو کتابین تصنیف کین، وہ بچون کے لئے چھوٹے چھوٹے قصے بھی اسکارٹ ارہوپ کے نام سے لکھا کرتا تھا، پادری اس بارنگ گولڈ نے

تین سو معیاری کتابیں لکھیں، ان میں بہت سی ایسی بھی ہیں جو برسوں کی تحقیقات کا نتیجہ ہیں، مشہور ناول نگار جی۔ پی۔ برجن نے نوّے کتابیں لکھ کر شہرت حاصل کی، ایڈگر ویلیس زود نویسی میں ضرب المثل تھا، اور وہ خود لکھنے کے بجائے بول کر دوسروں سے قلمبند کراتا تھا، اس نے ڈیڑھ سو ناول، چودہ ڈرامے، اور ہزاروں مضامین اور افسانے لکھے، اس کا خود بیان ہے کہ اس نے ۱۹۲۷ء میں یعنی ایک سال میں چھ ڈرامے اور چھبیس ناول لکھے، ایچ۔ جی۔ ویلس کی تصانیف کی فہرست بڑی لمبی ہے، اس کے ناول، افسانے، اور دوسری سیاسی اور عمرانی تصانیف کی تعداد ایک سو اسّی سے اوپر ہے، ارنلڈ بینیٹ نے زیادہ عمر نہیں پائی، اور اپنی مختصر زندگی میں ستّر کتابیں لکھیں، سر والٹر اسکاٹ اور مسٹر کریک دونوں نے ساٹھ ساٹھ کتابیں تالیف کیں، والٹے نے ایک سو چالیس کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں، ہیل زیک نے پچاسی کتابیں تصنیف کیں، ان میں بعض بہت ضخیم تھیں، کوبن راڈ ایک دن میں ۳۵۰ اور ڈبلیو۔ ڈبلیو جیکبس ۲۵۰ الفاظ لکھا کرتا تھا، بعض مشہور ناول نگار میں ہزار الفاظ تک روزانہ لکھتے ہیں، ایڈن فل پوٹس کی عمر اسّی سال سے زیادہ تجاوز کر چکی ہے، برنارڈ شا کا سن بھی نوّے سال سے زیادہ ہے، اور ان دونوں کی زندگی میں مختلف قسم کے مشاغل رہے ہیں، تاہم وہ اب تک لکھتے رہتے ہیں، فل پوٹس نے بیس ناول اور بیسیوں قصے اور ڈرامے لکھے، برنارڈ شا کے ڈرامے کی تعداد تو گنی جا سکتی ہے، لیکن اس کے مقالات، تنقیدی مضامین، ہجویات، بے شمار خطوط اور تقریروں وغیرہ کا شمار آسان نہیں ہے، وہ بوڑھا ہو چکا ہے، لیکن کام کرنے میں اب تک نہیں تھکتا، وہ اپنے سامنے گھڑی رکھ کر ہر پندرہ منٹ کے بعد ڈھائی سو الفاظ لکھتا ہے، وہ عموماً صبح کے ناشتے سے پہلے لکھا کرتا ہے، اس نے جو ناول لکھے ہیں، وہ بہت مفید ہیں، زین گرے نے بھی بہت سی دلچسپ اور حیرت انگیز کتابیں لکھیں، لکھتے وقت اس میں مشین کی جیسی تیزی اور باقاعدگی ہوتی ہے، اگاتھا کرسٹی نے پچاس طلسمی ناول لکھے، جو سب کے سب بہت

مشہور ہوئے، بو تھ ٹارکنگٹن ۱۸۹۹ء سے اپنی موت تک ہر سال ایک کتاب لکھ کر شائع کرتا رہا،

جی سی پی فرانس کی مشہور افسانہ نگار خاتون ہے، یہ کریمیا کی جنگ سے پہلے پیدا ہوئی، اور ۱۹۲۶ء تک برابر لکھتی رہی،

بہت سے ایسے اہل قلم گذرے ہیں جنھوں نے بہت کثرت سے لکھا لیکن بہت زیادہ مشہور نہ ہو سکے، ایک ناول نگار نے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان تیس ناول لکھے، لیکن اس نے زیادہ شہرت نہیں پائی، ص ، ع

اقبال کامل

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کیلئے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل کی گئی ہے، پہلے سوانح حیات ہیں، اس کے بعد ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعوں یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریۂ ملیت تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف یعنی عورت، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ضخامت چار سو صفحے قیمت ۳ر

"منیجر"

ادبیات

رنگِ تغزل

از

جناب عارف عباسی بلیاوی

"معارف کے ذریعہ متعدد شعراء ادبی حلقہ میں روشناس ہوئے آج ایک ایسے نوجوان و ہونہار شاعر کا تعارف کرایا جاتا ہے جس سے کم لوگ واقف ہونگے، نئے شعراء میں بہتوں نے جگر کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی مگر وہ نقالی سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن عارف کا تغزل جگر کے رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ اگر تخلص موجود نہ ہو، تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ یہ جگر کی غزل نہیں ہے، ابتدائی مشق میں یہ رنگِ تغزل اُن کے مستقبل کے لئے فال نیک ہے"۔ "م"

جس جگہ عشق کو احساسِ نظر ہوتا ہے — عالم حسن وہین زیر و زبر ہوتا ہے
لالہ و گل کہین خورشید و قمر ہوتا ہے — حسن ہر رنگ مین فردوسِ نظر ہوتا ہے
ایک وہ بھی طلبِ دوست کی منزل ہے جہان — وقت خود ساتھ مرے گرمِ سفر ہوتا ہے
کعبہ بھی راہ مین ہے، جلوہ گہ ناز بھی ہے — دیکھنا ہے کہ مرا عزم سفر ہوتا ہے
اب مٹی جاتی ہے یہ لذتِ ناکامی بھی — کیا قیامت ہے کہ آہون مین اثر ہوتا ہے
ہر طرف چشمِ تمنا نگران ہے لیکن — تیرا جلوہ کہین پابندِ نظر ہوتا ہے
وسعتِ کون و مکان ڈوب کے رہجاتی ہے — وہ بھی عالم کبھی اے دیدۂ تر ہوتا ہے

میری اس نیند پہ بیداری کونین نثار آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پہ سر ہوتا ہے

ہائے اس سوختہ سامان کا مقدر عارف

ایک جلوہ میں جو برباد نظر ہوتا ہے

حشر جذبات

از جناب ثاقب صاحب کانپوری

جہانِ عشق میں یہ انقلاب کیا کم ہے
قرار ہو کہ نہ ہو اضطراب کیا کم ہے

شعاعِ حسن سے رنگین نقاب کیا کم ہے
کہ تیرے لطف سے تیرا عتاب کیا کم ہے

سمجھ نہ عشق میں آزار اس ودیعت کو
دلِ خراب بحالِ خراب کیا کم ہے

سکونِ دل کا تو مژدہ کسی کو ادھر سنا
ترے خیال میں یہ پیچ و تاب کیا کم ہے

ہے آشیان میں بھی بیچارگی کا اک عالم
نہیں قفس تو قفس کا خواب کیا کم ہے

وہ جس نے جادۂ الفت میں جان تک دیدی
کسی کی راہ میں وہ کامیاب کیا کم ہے

یہی ہے عشق میں وجہ سرور کیف و نشاط
حسین آنکھوں میں یہ رنگِ خواب کیا کم ہے

کروں میں اپنی تباہی کا اُس سے کیا شکوہ
ہجوم غم میں وہ چشم پُرآب کیا کم ہے

وہی ہے اب بھی ترے التفات کا عالم
خرابِ عشق ترا کامیاب کیا کم ہے

نہیں ہے بحر میں نظارۂ جمال اگر
کنار آب و شب ماہتاب کیا کم ہے

حیاتِ عشق تھی تابندہ جس سے اے ثاقب

یہ سوچتا ہوں کہ وہ اضطراب کیا کم ہے

مطبوعات جدیدہ

جامع المجددین از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۶۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد صہ پتہ:- شبستان قدم رسول ہارڈنگ روڈ لکھنؤ،

اسلام چونکہ آخری اور ابدی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہین آئے گا اور اسلام کے بعد کوئی نیا دین آنے والا نہین ہے، اور امت مسلمہ ساری دنیا کی قومون کے لئے شاہد اور نمونہ بنائی گئی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ ہر زمانہ مین ایسے صلحاء و اخیار و مصلحین و مجددین پیدا کرتا رہا، جو اسلام اور مسلمانون کی تجدید و اصلاح کا فرض انجام دیتے رہے، اس مفہوم کی حدیثین بھی ہین، اور اسلام کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے، اس دور کے مسلمانون کی پوری زندگی اسلام کی شاہراہ سے ہٹ گئی ہے، اور مذہب و معاشرت، حکومت و سیاست، علوم و فنون، عقائد و عبادات، معاملات و اخلاق، زندگی کا ہر شعبہ اصلاح کا محتاج ہے، اس لئے یہ زمانہ بھی مصلحین و مجددین سے خالی نہین، اور بہت سے صلحاء و اخیار اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اصلاح و تجدید کی خدمت انجام دیتے رہے، لیکن جو جامعیت حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کی تجدید و اصلاح مین پائی جاتی ہے، وہ کسی دوسرے مصلح مین نظر نہین آتی، انھون نے خواص و عوام، علماء و جہلاء، عورت مرد، ہر طبقہ اور ہر صنف کے معاملات و مسائل اور مذہب و معاشرت و سیاست وغیرہ کے دقیق سے دقیق مسائل سے لے کر، روزانہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتون تک کی جن کی جانب نظر بھی نہین جاتی اصلاح فرمائی ہے، اور دین و دنیا کے جملہ معاملات کے متعلق صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کر کے اسلامی زندگی کا ایسا قدآدم آئینہ بنا دیا ہے جس مین ہر مسلمان اپنی صورت دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کہان تک

اسلام کے مطابق ہے، اور اس کے کون کون سے گوشے اصلاح کے محتاج ہین، فاضل مرتب نے جو اس سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و مواعظ و ملفوظات سے سلوک و تصوّف کی تجدیدات کو مرتب کر چکے ہین، اب جامع المجددین کے نام سے مسلمانون کی دینی و دنیاوی زندگی کے متعلق حضرت کی ہمہ گیر اصلاحات و تجدیدات کو مرتب فرمایا ہے، اور اپنی تعلیق و تشریح سے اس کو نہایت مؤثر و دلنشین بنا دیا ہے، جس کے ذریعہ ہر مسلمان اپنی خامیون اور کوتاہیون کی اصلاح کرکے اپنی زندگی کو صحیح اسلامی سانچے مین ڈھال سکتا ہے، مباحث و مسائل کے تنوع کثرت اور جامعیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع مین حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے حقیقت شناس قلم سے ایک فاضلانہ اور حکیمانہ مقدمہ ہے، اس مین ایک طرف منصب تجدید کی حقیقت و ضرورت اس کی تاریخ اور حضرت مولینا رحمہ اللہ کی تجدیدی جامعیت کی تفصیل ہے، دوسری طرف ان خطرات کو بھی دور فرمایا ہے، جو تجدید و مجددیت کے عقیدہ مین افراط و تفریط سے پیدا ہو سکتے ہین، اور خود مولانا رحمۃ اللہ کی تحریرون سے اس کی وضاحت فرما دی ہے کہ "کسی مجدد کا مجدد ہونا اذعانی اور یقینی مسئلہ نہین ہے، اور نہ اس کے دعوی پر موقوف ہے، بلکہ خواص امت کو اس کے دینی کارنامون کی بنا پر یا خود اس شخص کو اپنی کوششون کی مقبولیت کی بنا پر یہ گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس کو اس صدی کا مجدد بنا کر بھیجا ہے" (ص ۲۴)، "یا مجدد کو مجدد ماننا ایمان کا ادنی جز بھی نہین ہے، خصوصاً کسی ایک زمانہ کے کسی خاص مجدد کو مجدد تسلیم کرنا بھی ضروری نہین ہے" (ص ۲۰)، بلکہ یہان تک احتیاط فرمائی ہے، کہ "اس تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت و تلقین نہین ہے، بلکہ یہ مصنف و مرتب (جامع المجددین) کی عقیدتمندانہ تعبیر ہے، کہ وہ حضرت (مولانا اشرف علیؒ) کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہین" (ص ۲۴)، ان تشریحات کی اس لئے ضرورت تھی کہ مجددیت کے عقیدہ مین افراط و تفریط نے بڑے بڑے فتنے پیدا کئے ہین، اسی لئے خود حضرت مولانا رحمہ اللہ نے بھی دوسری اصلاحات کی طرح اس عقیدہ کی

بھی اصلاح کی ضرورت سمجھی تھی، یہ کتاب اپنے گوناگون فوائد کے لحاظ سے مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق تو ہی ہے، اسکے بہت سے مسائل سے غیر مسلم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہین، اللہ تعالیٰ مصنف کو اس خدمتِ دین کی جزائے خیر دے،

نور النور از مولانا غوث علی شاہ صاحب قادری چشتی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت نفیس قیمت مجلد ؎ غیر مجلد ۱۲؍ پتہ:- (۱) بیت النور چنچل گوڑہ (۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

اس کتاب میں مسئلہ وحدۃ الوجود کا اثبات اور اس کی تشریح کی گئی ہے، دیباچہ نگار کا بیان ہے کہ اس مین توحید حقیقی (وحدۃ الوجود) خودشناسی وحق شناسی کا صحیح راز کتاب وسنت کے مطابق آسان فہم ہے اور ان عام خیال، غلط فہم بے تحقیق اور ادھ کچے اسلامی خیالات کے مدعیون کی غلط فہمیون کو دور کیا گیا ہے جو عنوان وحدۃ الوجود کے صحیح اعتبار کو جو مترادف توحید حقیقی ہے، یعنی فہم لاالٰہ الا اللہ اور آیت ہو ہیت ہے اپنی نافہمی سے غیر اسلامی اور ہندی وغیرہ سمجھتے ہین" راقم نے اس کتاب کو غور و تامل سے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی لیکن یہ اسکا قصور فہم ہے، یا مصنف کا انداز بیان اتنا پیچیدہ ژولیدہ اور متصوفانہ کہ اس کا بیشتر حصہ سمجھنے سے قاصر رہا، یہ انداز تحریر عوام کیا خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کے فہم سے بھی باہر ہے، جن لوگون کو اس کا ذوق ہے وہ شاید اس چیستان کو سمجھ سکین، اور اس مین ان کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو، ورنہ عام مسلمانون کے لئے اس قسم کی کتابون سے کوئی فائدہ نہین، بلکہ ان سے گمراہی کا اندیشہ ہے، اور جو لوگ توحید کے اس مقام پر فائز ہین، اُن کے لئے اس کے اثبات کی ضرورت نہین،

کارنامہ اسلام از جناب میان بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا اڈیٹر ہمایون تقطیع اوسط ضخامت ۲۱۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ؏ پتہ مکتبہ:- رسالہ ہمایون نمبر ۳۲ لارنس روڈ لاہور،

مصنف نے جن کو تاریخ اسلام سے ذوق اور اس پر اُن کی نظر بھی ہے اس کتاب مین اسلام اور مسلمانون کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا ہے، اور دنیا مین اسلام کے انقلاب انگیز اثرات و نتائج مسلمانون کے سیاسی علمی اور تمدنی کارنامون، اور تاریخ اسلام کی تمام قابلِ ذکر حکومتون کا اجمالی نقشہ اور ان کا عروج و زوال دکھایا ہے اور قیام پاکستان تک ہندوستان کے مسلمانون کی مختصر سرگذشت بیان کی ہے جس سے مسلمانون کا سیاسی مدوجزر سامنے آجاتا ہے، اس کو رنگین نقشہ سے بھی دکھایا گیا ہے، کتاب کے آخر مین مرحوم اقبال کے منتخب و ولولہ انگیز اشعار بھی دیدیئے ہین، اس کے مطالعہ سے مسلمانون کے شاندار ماضی کے ساتھ ان کا مستقبل بھی درخشان نظر آتا ہے، البتہ وہابی سنوسی اور اتحادِ اسلامی کی مذہبی و اصلاحی تحریکون مین بانی تحریک کو شامل کرنا تعجب انگیز ہے، اس کو سرے سے اسلام ہی کو کوئی علاقہ نہین، تو اصلاح کا کیا ذکر ہے،

کلمۂ طیبہ کی حقیقت ؛ از مولانا منظور صاحب نعمانی اڈیٹر الفرقان تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۳ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ :- مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ،

کلمۂ طیبہ کا حقیقی مقصد محض زبان سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہین ہے، بلکہ اس مختصر کلمہ مین اسلامی عقائد و اعمال کی پوری روح پوشیدہ ہے البتہ اس کے مدارج ہین، زبان سے اقرار اس کا ادنیٰ ترین درجہ ہے، اور آخری درجہ تفویض کامل یعنی تمام اعمال اور پوری زندگی کو مرضی الٰہی کے تابع کر دینا ہے، اس رسالہ مین اسی نقطۂ نظر سے کلمۂ طیبہ کی تشریح کی گئی ہے، اور غیر اللہ کی نفی، توحید الٰہی اور رسالت محمدی کی تصدیق کا حقیقی مفہوم و منشا، اُس کے مدارج، اس کے حصول کی تدبیر، عقائد و اعمال مین اس کے آثار و نتائج محبت رسول وغیرہ کلمہ طیبہ کے تمام مضمرات، و متعلقات کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، رسالہ گو مختصر لیکن نہایت مفید، اور مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے، انداز بیان مؤثر و دلکش ہے،

عربی سیکھنے کا آسان طریقہ از جناب مولوی عبد الرحمٰن صاحب طاہر سورتی، فاضل آد

تقطیع اوسط، ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

پتہ:- انجمن ترقی عربی ہند، محمد علی روڈ، بمبئی، ۳

یہ اردو میں عربی قواعد کی کتاب ہے، مصنف نے اس میں جدید طرز کے مطابق صرف و نحو کے اسباق مرتب کیے ہیں، کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو عربی زبان کا صحیح مذاق اور تعلیم کا بھی تجربہ ہے، اور انھوں نے اس نئی کتاب کی تالیف میں دونوں امور کا لحاظ رکھا ہے، اردو میں عربی قواعد کی جتنی کتابیں نظر سے گذریں ان سب میں یہ بہتر نظر آئی، اس کے ذریعہ جلد اور آسانی سے عربی زبان سیکھی جا سکتی ہے، خصوصاً جو تعلیم یافتہ اشخاص عربی سیکھنا چاہیں ان کے لیے زیادہ کارآمد ہے،

نوائے حیات: (طبع دوم) از جناب یحییٰ اعظمی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ غیر مجلد عہ، پتہ :- دار المصنفین اعظم گڈھ

ناظرین معارف جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے پوری طرح واقف ہوں گے، کئی سال ہوئے اس کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے شائع ہوا تھا، اب مزید ترمیم و اضافوں کے ساتھ دوسرا اڈیشن نکلا ہے، اس مجموعہ کا بیشتر حصہ منظومات پر مشتمل ہے، کچھ غزلیں بھی ہیں، مصنف کے کلام میں بڑا اعتدال و توازن ہے، جو نئے شعراء میں کم پایا جاتا ہے، اس میں مذہبی و ملی روح بھی ہے، وطنی و قومی حرارت بھی، جذبات و تاثرات اور واقعات و مناظر کی مصوری بھی، تغزل کی رنگینی و لطافت بھی، اور مشق و مہارت کی پختگی بھی، غرض یہ مجموعہ شاعری کے تمام ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ اسم بامسمّی اور صاحب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

*

جلد ۶۶ ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء عدد ۳

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

الجزیہ	جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین،	۱۶۵-۱۹۰
اعجاز القرآن	جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،	۱۹۱-۲۱۳
ملا خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل	سید سلیمان ندوی	۲۱۴-۲۱۸

باب المراسلہ والمکاتبہ

طرز لطیف	جناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری	۲۱۹-۲۲۲

استفسار وجواب

تقویم الابدان	"م"	۲۲۳-۲۲۴

ادبیات

دورِ حاضر اور اسوۂ فاروقی	جناب یحیٰی اعظمی	۲۲۵-۲۲۶
غزل	از جناب فضل اختر صاحب سیتاپوری	۲۲۷

باب التقریظ والانتقاد

"تعیین الارواح"	سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے	۲۲۸-۲۳۵
مطبوعات جدیدہ	"م"	۲۳۶-۲۴۰

شذرات

افسوس ہے کہ ہماری بزم دوشین کی وہ آخری یادگار شمع بھی خاموش ہوگئی جس سے مدتون بزم کمال منور رہی یعنی ۱۱ر اگست کو نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی نے چھیاسی سال کی عمر مین اس خاکدان سفلی کو داع کہا، عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد موت ناگزیر ہے لیکن بعض مرنے والون کے ساتھ ایک پورا عہد اور پوری تاریخ دفن ہو جاتی ہے، مولانا شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات انہی مین ہے، وہ مشرقی و اسلامی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور علم و عمل، فضل و کمال، دین و تقوی، وقار و متانت اخلاق و تواضع کا پیکر اور تنہا ایک عالم تھے، کامل ساٹھ سال تک مسلمانون کی قومی زندگی سے وابستہ رہی اس لئے اُن کی وفات شخصی نہین بلکہ قومی حادثہ اور ایک مرقع کمال اور قدیم تہذیب و شرافت کا ماتم ہے،

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیا دی دولت و جاہت سے بھی نوازا تھا، وہ خاندانی رئیس تھے، اور اپنے اوصاف مین دور زوال کے امراء سے بالکل مختلف تھے، وہ خود صاحب علم، اصحاب علم کے قدردان، علم دوست، علما نواز اور علم و فن کے شیدائی اور سرپرست تھے، اُن کی پوری زندگی علمی مشاغل مین گذری، مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ان کا نمایان حصہ رہا، وہ ابتدا سے مدرستہ العلوم، مسلم یونیورسٹی اور دار العلوم ندوۃ العلما کے رکن رکین معاون و مددگار، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری انجمن ترقی اردو کے سرپرست اور مجلس دار المصنفین کے صدر نشین تھے، عرصہ تک ریاست حیدرآباد کے شعبۂ امور مذہبی کی صدارت پر فائز رہے، اُن کے خدمات کی فہرست بہت طویل ہے، کوئی علمی و تعلیمی ادارہ انکی اخلاقی امداد و اعانت سے محروم نہ تھا، مسلم یونیورسٹی نے ان خدمات کے اعتراف مین ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی،

وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف، اردو کے صاحب طرز ادیب اور نکتہ سنج،

سخن فہم اور سخن گو تھے، ان کا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانون کی علمی تاریخ سے انکو عشق تھا، ان کا مشغلہ خالص علمی تھا، مختلف مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی موضوعون پر دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی تصانیف ایک مجموعۂ مضامین مقالات شروانی اور دیوان فارسی، ان کی علمی یادگارین ہین، نادر کتابون کا بڑا شوق تھا خود اپنی تلاش و محنت اور زر کثیر صرف کرکے ایک عمدہ کتب خانہ جمع کیا، جو نوادر کتب کا بیش قیمت ذخیرہ ہی، اس کو اپنی زندگی مین مسلم یونیورسٹی پر وقف کر گئے تھے،

ان کی ذات مین جدت و قدامت کا بڑی لطیف امتزاج تھا، وہ خود پرانی تعلیم و تہذیب کی یادگار لیکن زمانہ کے حالات و ضروریات سے واقف تھے، ان کا وطن علی گڈھ مغربی تعلیم کا مرکز تھا، اس لئے وہ جدید تعلیم اور نئی مفید تحریکون کے حامی و مددگار رہے، لیکن اس کے سحر سے مرعوب و مسحور نہ تھے، اور جدید تعلیم و تہذیب مین بھی اسلامی روح دیکھنا چاہتے تھے، قدیم تہذیب سے والہانہ شیفتگی تھی، ان کی تحریرون مین جہان اس کا ذکر آجاتا، اور ان کی بہت کم تحریرین اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی تھین، ان کا قلم بے قابو ہوجاتا، اور ان کی تحریر قدیم تہذیب کا مرثیہ بن جاتی،

صورۃً خوش جمال، کشیدہ قامت، اور طبعاً نفاست و لطافت پسند تھے، وضع قطع، لباس، رفتار و گفتار نشست و برخاست ہر چیز مین تہذیب و نفاست نمایان تھی، بڑے خوش لباس اور جامہ زیب تھے، بڑھاپے کے نور نے اس مین اور زیادہ لطافت اور جذب و کشش پیدا کردی تھی، زندگی کے تمام معمولات مین وضعداری کی شان تھی، پوری زندگی کسی معمول مین کوئی فرق نہین آیا، اُن کے تعلقات بہت وسیع اور مختلف و متضاد مذاق و مشرب کے لوگون کے ساتھ تھے، جن کو آخر تک نباہا، سیاست سے طبیعت کو ذوق و مناسبت نہ تھی، اور اس خارزار سے ہمیشہ دامن بچایا، لیکن بہت سے اصحاب سیاست سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے جو برابر قائم رہے، اور ان پر اختلاف رائے و خیال کا اثر نہ پڑنے پایا، مولانا شبلی مرحوم سے اُن کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، جو اُن کے بعد وراثۃً ارکان دارالمصنفین کے حصہ مین آئے اور

آخر تک برابر قائم رہی، وہ دارالمصنفین کے محض قانونی صدر نہ تھے، بلکہ اس کے اور اس کے کارکنوں کے ساتھ ان کو دلی تعلق تھا، چنانچہ پیرانہ سالی میں کئی مرتبہ اس اجڑے دیار میں آنے کی زحمت گوارا کی جب آنا ہوتا تو بلا لحاظ عمرو مرتبہ ہر شخص کی قیامگاہ پر جاکر ملتے، اور بڑی شفقت و محبت سے خیریت و حالات پوچھتے اب اس وضعداری کی مثال کہاں ملیگی،

مرحوم کی ذات پر ایک عزیز دور اور اس کی خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا، جس کا ذکر اب صرف تاریخ کے اوراق میں ملے گا، اللہ تعالیٰ اس مرقع کمال کی تربت پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے اللّٰھم صبب علیہ شآبیب رضوانک برحمتک یا ارحم الراحمین۔

دارالمصنفین کے ساتھ مرحوم کے گوناگون تعلقات تھے، اس لئے آیندہ کسی نمبر میں انکے تفصیلی حالات پیش کئے جائینگے۔

اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ سے معلوم ہوا تھا، کہ سیوہارہ کے کسی تاجر کتب نے سر اقبال مرحوم کی بعض کتابیں چھپوائی ہیں، لیکن پھر اخبار الجمعیۃ کے بیان سے معلوم ہوا، کہ کتابیں حیدر آباد کے کسی تاجر نے چھپوائی تھیں اور سیوہارہ کے تاجر نے صرف اُن کے ٹائٹل چھپوائے ہیں، جس نے بھی کتابیں چھپوائی ہوں ہندوستان کے کسی شخص کا پاکستان کی کتابیں چھپوانا صد درجہ نازیبا اور بڑا اخلاقی جرم ہے، اگر یہ صورت قائم رہی تو ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مصنفوں اور علمی و تجارتی اداروں کو بڑا نقصان پہنچیگا، اور قانونی بندش کے بغیر محض اخلاقی اثر سے اس کا انسداد نہیں ہو سکتا، اور دونوں ملکوں کا نفع و نقصان اس سے متعلق ہے اس لئے انکی حکومتوں کو اس کی جانب توجہ کرنا چاہئے، اور ایسا قانون بنا دینا چاہئے کہ ایک ملک کی کتابیں بغیر اجازت کے دوسرے ملک میں نہ چھپ سکیں، اور اخبارات کو ایسے جری اور بددیانت ناشروں کا پردہ فاش کرنا چاہئے کہ اس سے کچھ تو ان کو عبرت حاصل ہو،

مقالات

الجزیہ

(۳)

از مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین

یہ ثابت ہونے کے بعد کہ جزیہ موجودہ معاشی معیار سے ایک بہترین محصول ہے، آیندہ یہ دکھایا جائیگا کہ اسلام کے علماے معاشیات نے اس پر کس حیثیت سے بحث کی ہے، ہم نے جہان جزیہ کے سات نظریات بیان کئے ہین، وہین مبسوط کے حوالہ سے یہ بھی دکھایا ہے کہ جزیہ کی حیثیت محصول مکان کی ہے، یہ حیثیت کس طرح نمایان کی گئی ہے؟ اس کا جواب آگے آتا ہے،

معاشیات کے متعدد مسائل کی طرح محصولِ مکان کی بحث بھی معمول سے زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہے، تاہم مختصراً بعض اہم پہلوؤن پر روشنی ڈالی جاتی ہے، محصول سے مراد مکان کی ملکیت کا خراج ہے، لیکن اسلام نے غیر مسلمون کے ساتھ جو رعایتین کی ہین، ان مین ایک یہ بھی ہے کہ مکان کو غیر مسلم کی ملکیت[1] تصور کرتے ہوئے بھی وہ اس سے ملکیت کا محصول طلب نہین کرتا، بلکہ سکونت کا محصول مانگتا ہے، اس طرح زمین کے متعلق مکاندار کی اصلی پوزیشن کو قائم رکھتے ہوئے بھی اسلام وصولی محصول کے وقت اس کو گویا یہ "دائن"[2] فرض کر لیتا ہے،

---

[1] مبسوط ص ۱۸ جلد ۱۰ فانما الیسکن دار نفسہ یہ مصنف کا نظریہ ہے۔ [2] ایضاً صفحہ جلد ۱۰، ولا یسکن بین المسلمین فی دار الغیر الا بکراء یہ معاشی علماء کا خیال ہے،

اوراس پر ہلکا ٹکس لگتا ہے، پھر دوسری رعایت یہ بھی ہو کہ ۲۰۰ درہم سے کم آمدنی والے پر کرایہ کا کوئی محصول نہین اور وہ مستثنی ہے،

مسلمان معاشی علما نے محصول مکان کے نظریہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ فقیر کو مکان کے لئے ایک درہم (چار آنہ) ماہوار دینا کافی ہے، متوسط الحال کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہے' اس لئے اس کا دوگنا (دو درہم یا آٹھ آنے ماہوار) ہونا چاہئے، اور جو بہت بڑا غنی ہو، اس کی بھی یہی حالت ہی، (یعنی اس کو متوسط الحال سے بھی زیادہ بڑے مکان کی ضرورت ہوتی ہو اس لئے دو درہم کا دوگنا چار درہم یا ایک روپیہ ماہوار اس کا کرایہ ہونا چاہئے) یہ نظریہ مبسوط (ص ۸، جلد ۱۰) مین درج ہے، اوراس کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکان کو مالی حالت کا معیار فرض کیا گیا ہے،

گذشتہ عنوان مین جن چھ قانونون کا حوالہ دیا گیا ہے، جزیہ محصول مکان ہونے کے بعد بھی ان کا پابند نظر آتا ہے، مثلاً اس کی پیدا آوری یہ ہے کہ ۲۰۰ درہم سے کم مالیت والون پر عائد نہ ہونے کے باوجود اس کی مقدار معقول رہتی ہے، کفایت یہ ہو کہ اس کی فراہمی مین زیادہ خرچ نہین پڑتا، نہ مقدار معین سے زیادہ دینا پڑتا ہے نہ ترقی دولت اور مرفہ الحالی مین مزاحم ہے، کیونکہ اس کی شرح مناسب ہی، عدل یہ ہو کہ کرایہ مکان' دراصل خود مکان) کی حیثیت مکاندار (اب کرایہ دار) کی مالی حالت کے مطابق ہے، (بلکہ دراصل مکان کی حیثیت کرایہ سے بدرجہا زیادہ ہے) تغیر پذیری یہ ہے کہ معاشی ترقیون کے ساتھ مکانات کی قیمت اور کرایہ بڑھتا رہتا ہی تعین خود اختیاری ہے' سہولت ظاہر ہے،

کیا جزیہ فرقہ وارانہ محصول ہی؟ معاشیات مین یہ بھی معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کسی ملک مین فرقہ وارانہ محاصل قائم کئے جائین، ہمارے ملک کے سفری پرندے جو بقول مسٹر ہولینڈ ہندوستان کے ذریعہ انگلستان کو تونگر بنانا چاہتے ہین[۱]

۱؎ مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب ص ۴۳، از جے سی کمار اپا ایم اے، بی ایس سی، مترجمہ قاضی محمد حسین بحوالہ انڈیا ان ٹرانزٹ،

اسلام کو اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہین کہ اوس نے فرقہ وارانہ محصول غیر مسلمون پر قائم کیا تھا، اور اس طرح معاشی حیثیت سے ایک فاش غلطی کی تھی، نظریۂ توبیت کے یہ مبلغین جب اس الزام کا اعادہ کرتے ہین تو ان کے چہرون پر فرحت و انبساط کی لہرین دوڑنے لگتی ہین، ہم الزامی جواب کے طور پر اگرچہ اس سلسلہ مین انگلستان کی تاریخ کے اس دور کو پیش کرسکتے ہین، جس مین ٹیوڈر خاندان حکمران تھا، لیکن ایسا کرنے سے صرف ایک عیب کی پردہ پوشی ہوگی، جس کو ممکن ہے کہ معاشین کے لائق اور تعلیم یافتہ دماغ اپنی توہین خیال کرین، اس لئے ہم اصل حقیقت پر متوجہ ہوتے ہین،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ محصول کا مفہوم ادا کرنے کے لئے عربی زبان مین دو لفظ پہلے سے موجود تھے، خراج اور جزیہ، اور دونون فرقہ واری اور ذلت کے مفہوم سے خالی تھے، اسلام کے بعد زمین کے محصول کا اصلاحی نام خراج رکھا گیا، جو (Land Tax) کا مرادف ہے، انسانون کی آمدنی کے محصول (Income Tax) کے دو نام رکھے گئے،

(۱) اگر وہ ڈھائی سیکڑہ کی شرح یا دوسری شرحون سے قائم کیا گیا ہو، اور اس کا طریقہ آج کل کے محصول مجموعی (Plural Taxation) کا ہو تو اس کا نام زکوٰۃ ہے، اور یہ مسلمانون سے لیا جاتا ہے) اس مین بہت سی چیزون کی زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اور بحیثیت مجموعی زکوٰۃ دینے والون پر مساوی بار پڑتا ہے۔)

(۲) اور اگر محصول مجموعی کے طرز پر ہونے کے باوجود مختلف طبقون کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف شرحون سے قائم کیا گیا ہو، تو اس کا نام جزیہ ہے، اور غیر مسلمون سے لیا جاتا ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ اور جزیہ کے نامون کا فرق، فرقہ وارانہ جذبات کی وجہ سے نہین پیدا ہوا بلکہ شرح محصول کے اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا ہے، جس طرح انکم ٹکس، ہاؤس ٹیکس، امپیریل ٹیکس، پرسنل اینڈ فرنیچر ٹیکس وغیرہ علٰحدہ علٰحدہ نام شرحون کے مختلف ہونے کی وجہ سے رکھے گئے ہین،

کیا جزیہ بھاری محصول ہے؟ | زکوٰۃ اور جزیہ کا بلاواسطہ متزاید محصول جو اسلام نے مسلمان اور غیر مسلمون پر لگایا تھا، اگرچہ شخصی حکومتون کے زمانہ مین رائج نہین ہو سکتا تاہم یہ اسلام کا حیرت انگیز معجزہ ہے کہ اس نے تمام ادوارِ حکومت (یعنی جمہوریت و شخصیت) مین یہ محصول ہمیشہ قائم رہا، اور آج کل کے سرمایہ دارون کے علی الرغم اوس زمانہ کے دولتمندون نے اوس کو بطیبِ خاطر برداشت کیا، اس محصول کا تقرر دو مختلف اصول کو پیشِ نظر رکھ کر ہوا ہے،

(۱) اسلامی سلطنت چونکہ مسلمانون کی قومی سلطنت تھی اس لئے محصول متزاید (Progressive Tax) کی وہ شکل اختیار کی گئی جس مین آمدنی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ محصول کی رقم برابر بڑھتی جاتی ہے گو شرح ایک ہی رہتی ہے، اور اس محصول کا بار دولتمند طبقہ پر زیادہ پڑتا ہے،

(۲) اسلامی سلطنت چونکہ غیر مسلمون کی قومی سلطنت نہ تھی اس لئے محصول متزاید کی دوسری شکل پسند کی گئی جس مین ہر طبقہ کی الگ الگ حسب حیثیت ایک ایک شرح ہوتی ہے تاکہ مجموعی طور پر کسی ایک طبقہ پر زیادہ بار نہ پڑے، اور رقم محصول مین شرح کی وجہ سے اضافہ نہ ہو سکے،

چونکہ یہ دونون محصول (زکوٰۃ اور جزیہ) آج کل کی اصطلاح مین انکم ٹکس (Income Tax) کہے جا سکتے ہین، اس لئے مناسب ہوگا کہ انکم ٹکس سے جزیہ کا موازنہ کیا جائے تاکہ معترضین کو یہ نظر آئے کہ آج کل کا یہ مقبول ٹکس اسلام کے اس ناپسندیدہ محصول پر کیا فضیلت رکھتا ہے؟

انکم ٹکس کی شرح ۱۹۱۶ء تک یہ تھی،

ہزار سے لے کر دو ہزار سے کم تک	۴ پائی فی روپیہ
۲ ہزار " ۵ ہزار " "	۵ " "
۵ ہزار " ۱۰ ہزار " "	۶ " "
۱۰ ہزار " ۲۵ ہزار " "	۹ " "

۲۵ ہزار سے لے کر زیادہ	۸ رفی روپیہ

سنہ ۱۹۱۷ء مین سوپر ٹیکس (Super Tax) حسب ذیل ہوگا،

۲۵ ہزار سے لیکر ۵۰ ہزار تک	۱ رفی روپیہ
۵۰ ،، ایک لاکھ	۲ ر ،،
ایک لاکھ ،، ڈیڑھ لاکھ	۲؍۰ ،،
ڈیڑھ لاکھ ،، دو لاکھ	۳ ر ،،
دو لاکھ سے لیکر ڈھائی لاکھ تک	۳؍۰ ر ،،
ڈھائی لاکھ ،، اوپر	۴ ر ،،

یہ بھی واضح رہے کہ اس مین عورتین، بچے، پاگل، بوڑھے، اپاہج، اور ہر صاحب آمدنی جو ایک ہزار سے اوپر کماتا ہو، سب شامل ہین، ٹکس سے کوئی مستثنیٰ نہین ہے[1] البتہ جو ایک ہزار روپیہ سے کم آمدنی رکھتے ہین، وہ مستثنیٰ ہین، خواہ تندرست ہون یا بیمار، عورتین ہون یا مرد، بوڑھے ہون یا بچے،

جزیہ کی شرح یہ تھی، اور ہمیشہ یہی رہی،

فاضل رقم صہ تک	ے رسالانہ
صہ سے لے کر ڈھائی ہزار تک	سے رسالانہ
ڈھائی ہزار سے ،، اوپر	عہ ر ،،

یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ عورتین، بچے، اور مخبوط الحواس جزیہ سے بالکل مستثنیٰ تھے، ان کے علاوہ اور لوگ جن کا کاروبار چلتا ہو، خواہ اس کو وہ خود چلاتے ہون یا کارندون کے ذریعہ سے انجام پاتا ہو،

---

۱ معارف: انکم ٹیکس کی موجودہ شرح اس سے کہین زیادہ ہے، جو شاید مضمون نگار کو معلوم نہ ہو سکی، اس حساب سے انکم ٹیکس کا بار سنہ ۱۹۱۶ء کی شرح سے بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے،

جزیہ ادا کرتے تھے،

فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے، تو ۵ پائی فی روپیہ کے حساب سے اس کو سال میں عـہ ۲ ر ۱۴ انکم ٹکس ادا کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کے جزیہ کی رقم صرف سے ر سالانہ ہوگی، اسی طرح اگر ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپیے ہیں تو ان کا انکم ٹکس ۴ر فی روپیہ کے حساب سے ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ ہوگا، اور جزیہ صرف عـہ ر!

ناظرین انصاف فرمائیں کہ سوا لاکھ کی رقم گران ہے یا بارہ روپیہ! اور انکم ٹکس رعایا کے لئے سہل و مفید ہے یا جزیہ ؟

جزیہ کا اثر معاشیات اسلام پر: شاید اس موازنہ سے یہ خیال پیدا ہو کہ جزیہ کا بار امراء پر بہت کم پڑتا تھا لیکن متوسطین اور غرباء اس کے بار کے نیچے دبے ہوئے تھے، اس لئے سلطنتِ اسلامیہ کی معاشی حالت کا سرسری طور پر جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غیر مسلم اسلامی سلطنت کے زیرسایہ معاشی حیثیت سے کس حالت میں زندگی بسر کرتے تھے،

مسٹر ہوبسن (J. A. Hobson) نے کام اور دولت (work & wealth) میں اندازۂ تونگری کے لئے پیمانۂ زر کے بجائے انسانی خوشحالی کے ایک درجہ کو پیمانہ بنانا پسند کیا ہے[1] لیکن اسلام نے ایک درجہ کے بجائے انتہائی درجہ کو پیمانہ بنانا اپنا نصب العین قرار دیا تھا، چنانچہ امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پایۂ تخت کے ایک دور افتادہ صوبہ (عراق) کی سب سے کمزور آبادی (بیوہ عورتوں) کی بہترین معاشی حالت کو وفات سے ۴ روز قبل ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا،[2]

"اگر خدا نے مجھکو زندہ رکھا تو میں اہل عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسی حالت میں چھوڑ جاؤنگا،

---

[1] مالیات عامّہ و ہمارے افلاس کے اسباب ص، انہ جے سی، کمان رپا مترجمۂ قاضی محمد حسین [2] صحیح بخاری کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ

کہ میرے بعد اُن کو کسی شخص کی امداد کی احتیاج باقی نہ رہے گی"،

اور اپنے خلیفہ کو عین اُس وقت جب وہ بستر مرگ پر تھے، غیر مسلمون کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی،[۱]

"اور مین اس کو اُن لوگون کے حق مین وصیت کرتا ہون، جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے کہ اُن سے جو معاہدہ ہے وہ پورا کیا جائے، اور اُن کی حمایت مین لڑا جائے، اور اُن کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے"،

ان احکام اور اعلانات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے زمانہ مین ہمیشہ غیر مسلم رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھا گیا،

جزیہ کی شرح جس قدر کم تشخیص کی گئی تھی، اس کا بیان ابھی ہو چکا ہے، تاہم جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جزیہ کی یہ شرح مجموعی آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کر کے تخمینی دولت و ثروت کے لحاظ سے سہولۃً مقرر ہوئی تھی ورنہ اندرونی طور پر بعض صوبون مین گذشتہ معیارِ دولت کے علاوہ بعض اور معیار بھی پائے جاتے تھے، اور انھی کے مطابق جزیہ وصول کیا جاتا تھا، اسی بنا پر شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) مین لکھا ہے، کہ

"یہ ممکن نہین ہے کہ مال کا کوئی (صحیح) اندازہ کیا جا سکے، کیونکہ وہ شہرون کے (حالات کے) مطابق مختلف ہوتا ہے"،

اس کا یہ مطلب ہو کہ غربا، متوسطین اور امرار کی دولت کا جو معیار ۲۰۰، ۱۰ ہزار، اور زیادہ کی شکل مین قائم کیا گیا ہے، وہ دراصل غربت و تموّل کا کوئی صحیح معیار نہین ہے، کیونکہ بعض صوبے زیادہ متمول ہین، بعض اُن سے کم، اور بعض ان سے بھی کم، اس لئے ہر جگہ کا معیار بالکل مختلف ہوگا، اسی نکتہ کا خیال کر کے امام ابوجعفر (طحاوی) کہتے ہین،[۲]

"ہر شہر کا عرف معتبر ہے جس شخص کو لوگ اپنے شہر مین فقیر یا متوسط، یا غنی شمار کرین، وہ ویسا ہی سمجھا جائے گا، اور یہی صحیح مذہب ہے"۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ماجاء فی قبر النبی [۲] فتاوائے عالمگیری ص ۲۴۴، ج ۲

اس نقطۂ نظر کے مطابق تشخیص جزیہ میں جو تغیر پیدا ہوا، وہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا،

پہلی صدی ہجری میں **شام** کا صوبہ ذرائع آمدنی زیادہ رکھتا تھا، اس لئے زیادہ خوشحال تھا، یمن کا صوبہ معاشی حیثیت سے اس کی برابری نہین کرسکتا تھا، اس لئے دونون صوبون کے جزیہ کی شرح مختلف رکھی گئی، شام مین فی کس ۴ دینار سالانہ، اور یمن مین ایک دینار سالانہ وصول کیا جاتا تھا، اس کا سبب جب مشہور تابعی مجاہد سے دریافت کیا گیا، تو بولے کہ

"دولت مندی کی بنا پر ایسا کیا گیا"[۱]

پانچوین صدی کے آخر مین اسلامی سلطنت کے دو دور صوبون عراق، اور ترکستان کی معاشی حالت کے متعلق ایک تصریح ملتی ہے شمس الائمہ سرخسی، مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) مین لکھتے ہین کہ

"عراق مین پچاس ہزار کا مالک متوسط الحال سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے ملک مین دس ہزار درہم کا مالک غنی شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا فیصلہ امام کی رائے پر چھوڑنا چاہئے"

اس تصریح کا منشا یہ ہے کہ صوبون کے معیار دولت کا صحیح اندازہ امام کرسکتا ہے اور وہی شرح جزیہ کو مالی حالت پر منطبق کرنے کا بھی مجاز ہے، مثلاً جس صوبہ مین ۲۰۰ درہم سے لے کر ۱۰ ہزار تک کا مالک متوسط سمجھا جاتا ہے، وہان وہ اس رقم پر چھ روپیے سالانہ جزیہ دیگا، لیکن عراق مین چونکہ پچاس ہزار کا مالک بھی متوسط ہے، اس لئے وہان پچاس ہزار پر چھ روپیے لئے جائین گے، اور اس کے اوپر بارہ درہم امراء کی شرح جزیہ ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر کسی صوبہ کی استعداد پیداوار بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر جزیہ کا بار ہلکا ہوتا جاتا ہے، اور یہ اسلامی حکومت کی منفعت بخش پالیسی کا ایک بین ثبوت ہے، (موجودہ انکم ٹکس مین جس قدر استعداد پیداوار بڑھتی ہے ٹکس کا بار بہت زیادہ ہوتا جاتا ہے، جو آخیر مین ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے)

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الجزیہ والموادعۃ،

سرجادو ناتھ سرکار کا مغالطہ | پروفیسر جدو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخ وانی کے زعم مین جزیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس مین پے درپے بہت سی غلطیان کی ہین جن کا دور کرنا ضروری ہے، سب سے پہلی غلطی بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ انھون نے جزیہ کا نام (Poll Tax) رکھا ہے، جو نہ صرف غیر مسلمون بلکہ خود انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہے، پروفیسر صاحب نے اگر یہ لفظ خود ایجاد کیا، یا اس کے استعمال مین علماے یورپ کی تقلید پسند کی، تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے، لیکن اگر اس کا جواز کسی اسلامی سند کی بنیاد پر ہے، تو واضح ہونا چاہئے کہ طبری وغیرہ نے جو "جزیۃ الجماجم" یا "جزیۃ الرؤس" کا لفظ لکھا ہے، وہ علم نہین ہے، یعنی اُس ٹکس کا یہ نام نہین ہے، بلکہ اس ٹکس سے پہلے چونکہ زمین کی پیداوار اور محصول کا ذکر آگیا ہے، اور آخر مین اس کا نام آیا ہے، اس لئے دوسری پیداوار مثلاً گیہون، جو، ترکاریون وغیرہ کی طرح انسانون کا تذکرہ بھی ضروری تھا، کیونکہ ذکر کے بغیر یہ کیونکر معلوم ہوسکتا تھا، کہ کس چیز کا محصول ہے؟ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ذہن مین رہنی چاہئے کہ طبری نے یہ الفاظ نوشیروانی محصول کے تذکرہ مین لکھے ہین، اس لئے اسلامی عہد کے جزیہ کی نسبت اُن کا اطلاق ثبوت طلب ہے،

دوسرا مغالطہ | دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھون نے جزیہ کی رقم کا نہایت غلط اندازہ لگایا ہے، اور جزیہ کی مقدار کی زیادتی کو مثال کے طور پر گجرات کے صوبہ مین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ وہان سالانہ پانچ لاکھ روپیے کی آمدنی تھی[1]، اور اس کی شکل یہ اختیار کی ہے کہ انڈیا آف اورنگ زیب کے بیان کے مطابق (جس کا حوالہ حاشیہ ص ۴۲ تاریخ اورنگزیب مین ہے،) تقریباً ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) مین گجرات کی تحصیل محض یا محاصلِ خام (Gross Revenue) ۱۲۵ لاکھ روپیہ (ایک کرور پچیس لاکھ روپیے) سالانہ تھی، جس مین اور جزیہ کی آمدنی مین ۳ ½ فیصدی کا تناسب ہے، جو اُن کے نزدیک بہت زیادہ ہے اس کے متعلق چند باتین عرض کرنا ہین،

---

[1] مرآۃ احمدی ص ۲۹۴، ج ۱

(۱) گجرات کے جزیہ اور اس کے تناسب پر تمام ہندوستان کے جزیہ اور اس کے تناسب کو قیاس نہین کیا جاسکتا، کیونکہ گجرات مین اگرچہ ہندوؤن کی اکثریت تھی، تاہم پنجاب، کشمیر، اور سندھ وغیرہ مین مسلمان زیادہ آباد تھے، اس لئے ان صوبون مین جزیہ کی آمدنی کم اور نہایت کم ہوگی، اور تناسب بھی ۳ ۱/۲ فیصدی سے بہت کم ہوگا،

(۲) گجرات کے جزیہ کا تناسب دکھاتے وقت گجرات کی زکوٰۃ کا "تناسب" بھی دکھانا چاہئے تھا، کیونکہ بقول پروفیسر صاحب (ص ۲۰۴ ج ۳) گجرات مین بہت زیادہ مسلمان آباد تھے،

(۳) زکوٰۃ کی شرح ۲ ۱/۲ فی صدی ہے، اور وہ مختلف قسم کے چیزون سے وصول کی جاتی ہے، اسلئے مسلمانون کی ایک بڑی آبادی مین اس کی مقدار گجرات کے جزیہ کی رقم کے قریب قریب ہوسکتی ہے، اور تناسب بھی شاید وہی ہوسکتا ہے، اس بنا پر اورنگزیب پر مسلمانون کی پاسداری اور ہندوؤن کی طرف سے ذاتی نفع کا الزام غلط ہے،

(۴) گجرات کے جزیہ اور محاصلِ خام کا تناسب صرف ۳ ۱/۲ فیصدی ہے، جو بہت کم ہے لیکن پروفیسر صاحب اس پر بھی متحیر ہین، حالانکہ اگر اُن کو محصولون کی اس تعداد اور تناسب کا علم ہوتا، جو آج کل حکومت برطانیہ کے اندر رائج ہین، تو اُن کی حیرت سکون و خاموشی سے بدل جاتی، ! مثلاً مطالبات وطن (Home Changes -) کی رقم کو لیجئے، جو ہر سال انگلستان چلی جاتی ہے، وہ پرتھ ناتھ بنرجی کی تصریح کے مطابق مجموعی مداخل (یعنی دو ارب ایک کرور روپیہ) مین چالیس فی صدی سے زیادہ ہے[۱] افیون، نمک، اسٹامپ، چنگی و آبکاری، ابو آب، کروڑ گیری، انکم ٹکس رجسٹری، جنگلات، ریلوے وغیرہ سے پچاس کرور روپیہ سے زیادہ وصول ہوتا ہے، جو مجموعی مداخل (دو ارب ایک کرور) کا کم از کم پچیس فی صدی ہے، (یہ واضح رہے، کہ اورنگزیب کے زمانہ مین آج کل

---

[۱] معاشیات ہند ص ۲۹۵، مترجمہ مولوی محمد الیاس برنی،

کی طرح کثرت سے محصول نہ تھے، بلکہ اکثر محصول معاف کر دیئے گئے تھے،) جزیہ کو اگر فوجی محصول مانا جائے، (جیسا کہ بعض علمار کا خیال ہے) تو اس ۳½ فی صدی محصول کا موازنہ اس ۳۲ کرور روپیے سالانہ سے کرنا چاہیئے، جو ہندوستان کے فوجی انتظام پر حکومتِ برطانیہ صرف کرتی ہے، اور جو محاصل خالص (Net Revenue) کا ۴۲ فی صدی ہے،[1]

غالباً محصولون کی یہ تعداد اور تناسب حیرت دور کرنے کے لئے کافی ہوگا،

تیسرا مغالطہ | تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھون نے اشخاص کی آمدنی سے جزیہ کی شرح کا تناسب معلوم کرکے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے، کہ غربار پر اس کا بہت زیادہ بار پڑتا تھا، اس کے لئے انھون نے غریب کی شرح چھ روپیے فی صدی، متوسط کی چھ فی صدی سے ۴ فی صدی تک (یعنی ۲۰۰ درہم سے ۱۰ ہزار درہم تک حسبِ مدارج) اور امیر کی ۴/ فی ہزار شرح بتلائی ہے (ص۲۵ جلد ۳) اگرچہ آج بھی امرا کے بہ نسبت غربا پر محصول کا بار جس قدر زیادہ پڑتا ہے، اس کی شہادت مین فرد ورلیڈر مسٹر میکڈانلڈ، سابق صدر اعظم حکومتِ برطانیہ کے اقوال گورنمنٹ آف انڈیا، مین درج ہین، اور سراسے کولن، اور سر ولیم ہنٹر وغیرہ نے بھی اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، تاہم موجودہ انکم ٹکس کی شرح سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ اس کی شرح ایک ہزار روپیہ سے لے کر ۲ ہزار سے کم تک ۴/ پائی فی صدی پچیس ہزار سے زیادہ کی ۴/ فی صدی، ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی ۵/ فی صدی اور ڈھائی لاکھ سے اوپر کی ۶/ فی صدی ہے، اس کو دوسرے الفاظ مین یون سمجھئے کہ جزیہ کی سب سے کم شرح (بقول پروفیسر صاحب) ۴/ فی ہزار ہے لیکن انکم ٹکس کی سب سے کم شرح ۱۲/۴ پائی فی ہزار ہے، اسی طرح جزیہ کی سب سے زیادہ شرح ۱۰/ فی ہزار ہے، لیکن انکم ٹکس کی آخری شرح ۱۰/ فی ہزار ہے، ان اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ جزیہ مین اگر ایک طبقہ کسی قدر زیادہ بار برداشت کرتا تھا، تو انکم ٹکس مین ہر طبقہ

---

[1] محاصلِ خالص ۵۰ کرور اور محاصلِ خام ایک ارب ۲۰ کرور ہے (دیکھو معاشیات ہند صفحات ۲۷۰، ۲۸۰، مترجمۂ برنی) یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے،

محصول کے بارگران سے دبا ہوا ہے، اور جزیہ مین غربا اگر محصول سے کچھ پریشان ہو سکتے تھے، تو انکم ٹکس سے امرا اس سے کہین زیادہ پریشان ہو سکتے ہین، شاید پروفیسر صاحب بار کے اس "تناسب" کو حساب لگاتے وقت بھول گئے تھے،

اگر تمام طبقون کو یکجا کرکے اس بار کا اوسط نکالا جائے تو جزیہ کا اوسط صرف ۲ فی صدی ہوتا ہے (کیونکہ متوسطین کا سب سے کم اوسط یہی ہے) لیکن آج کل محصول کا بار اوسطاً آمدنی کے نو فیصدی (یعنی ۱۰ فیصدی) رہتا ہے، ناظرین ۲ فی صدی اور ۱۰ فی صدی کے تناسب پر غور فرمائین،

سر جادو ناتھ نے غربا کے متعلق جو تمن لکھا تھا، ہمارے "ارسطو" نے اس پر ایک پرلطف شرح تصنیف فرمائی ہے، "ارسطو کہتے ہین" تقریباً ۲۰ سال مین ساری جائداد ہی غائب غلہ ہو جائے گی" (آریہ گزٹ) اُن کی خدمت مین یہ عرض ہے کہ

(۱) معاشیات کے رو سے جزیہ پر جہان نظر ڈالی گئی ہے، وہان یہ لکھا ہے کہ چونکہ جزیہ بلاواسطہ متزائد ٹکس ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ شرح کے اضافہ کے ساتھ ساتھ آمدنی کا بھی اضافہ ہو، مثلاً اگر ایک شخص کے پاس پہلے سال ۲۰۰ درہم موجود ہین، تو وہ غربا کا جزیہ (۱۲ درہم) ادا کرے گا لیکن اگر اس کے پاس آیندہ سال صرف ۵۰ درہم رہ گئے ہین، تو اس سے کچھ نہ لیا جائے گا، اسی طرح اگر ایک متوسط نے پہلے سال ۲۴ درہم جزیہ ادا کیا، اور آیندہ سال اوس کا سرمایہ فقرا کے برابر ہو گیا تو اس سے متوسط کا جزیہ وصول نہ کیا جائے گا، بلکہ فقرا کا محصول لیا جائے گا، اس کی تصریحات فقہ کی کتابون مین موجود ہین، اس بنا پر جزیہ کی وجہ سے جائداد کے "تلف ہونے کا خطرہ نہین،

(۲) جزیہ مین غریب پر پہلے سال جو بار پڑتا ہے وہ آمدنی کا سولھوان حصہ ہے یعنی پچاس پر سے لیکن انکم ٹکس مین پہلے ہی سال امیر کی آمدنی کا چوتھائی حصہ (شرح اعلیٰ مین) نکل جاتا ہے یعنی ۵ لاکھ پر سوا لاکھ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غریب پر جزیہ سے تباہی (اگر آمدنی مین اضافہ نہو) بہ تدریج اور دیر مین آتی ہے اور انکم ٹکس پہلے ہی سال امیر کی کمر توڑ دیتا ہے،

---

۱ معاشیات ہند پرمتھ ناتھ بنرجی ص ۲۰۹، مترجمہ مولوی الیاس برنی،

(۳) جزیہ سے غریب طبقہ دیر مین متاثر ہوتا ہے، اور متوسطین وامرا پر کچھ اثر نہین پڑتا، لیکن انکم ٹکس مین سب سے زیادہ امرا تباہ ہوتے ہین، اور متوسطین و فقرا بھی بربادی سے محفوظ نہین رہتے،

(۴) بیس سال مین اگر جزیہ پچاس کی جائداد یا آمدنی کو برباد کرسکتا ہے، تو اسی قدر عرصہ مین انکم ٹکس ۵ لاکھ کی رقم اور جائداد پر پانی پھیر سکتا ہے،

چوتھا مغالطہ چوتھا مغالطہ، تیسرے مغالطہ کی دوسری شکل ہے یعنی اونھون نے جزیہ کی شرح اور غلہ کے نرخ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غریب طبقہ مظلومی کی انتہائی حد تک پہنچا ہوا تھا کیونکہ ایک غریب کی شرح ٹکس اس کے سال بھر کے مصارفِ طعام کے برابر تھی، (تاریخ اورنگزیب جلد ۳ صفحہ ۲۷۰)

اس "تاریخی دیانت" کی "تحلیل" کے لئے حسب ذیل امور ذہن نشین ہونے چاہئین،

(الف) جیسا کہ مسٹر ڈبلیو، ایچ، مورلینڈ نے "ہندوستان وفاتِ اکبر کے وقت"[۱] مین لکھا ہے آج کل ہندوستان کی اوسط آمدنی تین صدی قبل کی حالت سے زیادہ نہین ہے،

(ب) بقول مسٹر پرمتھ ناتھ بنرجی اس زمانہ مین جماعتِ کثیر کی سالانہ آمدنی کا اوسط صرف اٹھارہ شلنگ یعنی للعہ فی کس ہے، (معاشیاتِ ہند مترجمہ برنی ص ۴۲)

(ج) مورلینڈ کی تصریح کے مطابق اگرچہ عہد مغلیہ و برطانیہ مین آمدنی کے اوسط کے لحاظ سے کوئی فرق نہین ہے، تاہم اجناس کے نرخ مین سات گنے کا فرق پیدا ہوگیا ہے، (اکبر تا اورنگ زیب[۲])

(د) ۱۶۲۳ء (مطابق ۱۰۳۳ھ) کے نرخ سے ایک من گیہون کی قیمت ایک روپیہ تھی (معاشی

---

[۱] مترجمہ مولوی حبیب الرحمن خان ایم اے، ال ال بی باسم "ہند کی معاشی حالت شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت" ص ۲۹۲ [۲] مترجمہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، باسم "معاشی حالاتِ ہند از اکبر تا اورنگ زیب" ص ۲۴۵ ص ۲۴۶،

حالات ہند از اکبر تا اورنگ زیب، مترجمہ ہاشمی ص۲۴۶ لیکن ۱۹۳۳ء (۱۳۵۲ھ) کے نرخ سے اس کی قیمت چار روپیہ ہے، (سات گنے کا فرق اس لئے نہین ہے کہ ہم نے مغلیہ کے گران نرخ اور برطانیہ کے ارزان نرخ کو لیا ہے،)

(ھ) محصول زمین بزمانۂ اکبر کے لحاظ سے ۱ بسوہ کی مالگذاری ۵؍ تھی، (۱۰ بسوہ مین ۴ من ۲۰ ار غلہ باسانی پیدا ہو سکتا ہے، مالگذاری ثلث پیدا وار ہوتی تھی، دیکھو آئین اکبری ص ۲۰۰ ج ۱) اور آج کل کے مطابق عا؍ ہے، (بحساب للعہ فی بگھہ)

(و) اگرچہ اورنگزیب کے زمانہ مین محصول کا بار فی کس وہ نہ تھا، جو آج کل ہے، کیونکہ اس نے بہت سے محصول معاف کر دیے تھے تاہم اس زمانہ کے سرکاری حساب کے مطابق ہم دونون زمانون (مغلیہ و برطانیہ) مین محصول کا بار فی کس عا؍ ۴ پائی فرض کئے لیتے ہین،

اب یہان سے ۳ طریقہ پر حساب شروع ہوتا ہے،

(۱) اگر غلہ کے مصارف فی کس ۴ من ۲۰ ار سالانہ (بحساب ۱۰ روپیہ) رکھے جائین، تو ۱۴ ع؍ سالانہ آمدنی والا شخص عہد مغلیہ مین للعہ؍ کا غلہ ۵؍ مالگذاری اور عا؍ ۴ پائی محصول ادا کرکے صرف ۵ پائی کپڑے وغیرہ کے لئے بچا سکتا تھا، لیکن عہد برطانیہ مین وہ ۴ع؍ کا غلہ عا؍ مالگذاری اور عا؍ ۴ پائی محصول دیکر عہ؍ ۴ پائی کا قرضدار ہو جائے گا،

(۲) اگر غلہ کا حساب فی کس ۹ من رکھا جائے، جو سرکار نے (تاریخ اورنگزیب ص ۲۰۰) رکھا ہے، تو عہد مغلیہ مین لعہ؍ کا غلہ عا؍ مالگذاری (ایک بگھہ کی) اور عا؍ ۴ پائی محصول پر خرچ کرنے کے بعد وہ صرف پانچ آنے دس پائی کا قرض دار ہوتا ہے، جس کو وہ معمولی سی محنت سے ادا کر سکتا ہے، لیکن عہد برطانیہ مین ۳۶ع؍ کا غلہ للعہ؍ مالگذاری (ایک بگھہ کی) اور عا؍ ۴ پائی محصول پر صرف کرکے وہ ع؍ عا؍ ۴ پائی کا قرض دار ہو جائے گا، جو سال بھر کی آمدنی کا پورا دو گنا ہے، اور جس کو وہ سال بھر محنت کرکے بھی ادا

نہین کرسکتا[۵]

(۳) اگر جزیہ اور انکم ٹکس وغیرہ کا اوسط نہ نکالا جائے، بلکہ ان کی پوری شرح کے مطابق پوری رقم فرض کر لی جائے، تو عہد مغلیہ مین للعہ؍ کا غلہ عہ؍ مالگذاری، اور سے؍ جزیہ ادا کرکے ۲؍ ۹ پائی پس انداز ہونگے، اور سرجادوناتھ کے حساب سے اس رقم کو دوگنا کرکے بھی وہ صرف دس آنے ۶ پائی کا قرضدار ہوگا، لیکن عہد برطانیہ مین ہے عہ کا غلہ، عار مالگذاری اور عہ ۱۳؍ ۴ پائی انکم ٹکس ادا کرکے وہ عہ ۱۳؍ ۴ پائی کا قرضدار ہوجائے گا (واضح ہو کہ محصول مین صرف انکم ٹکس کی رقم رکھی گئی ہے، اور بہت سے محصول جو اس زمانہ مین ادا کرنا پڑتے ہین، ان کا حساب نہین لگایا گیا ہے) اور جادوناتھ صاحب کے حساب سے اس پر للعہ ۱۳؍ ۴ سالانہ کا ایسا وزنی بوجھ پڑے گا، جس سے چند ہی سال مین اس کی ایک ہزار کی آمدنی یا جائداد بالکل ہی غائب ہوجائے گی، اس سے ایک بات اور ثابت ہوتی ہے، جزیہ دالا صہ؍ کی جائداد یا آمدنی مین جس قدر مطمئن تھا، انکم ٹکس والا الف ہزار کی آمدنی یا جائداد مین بھی اتنا مطمئن نہین ہے، (جزیہ اور انکم ٹکس بالترتیب صہ؍ اور ہزار سے کم پر نہین ہین)

پہلے اور تیسرے حسابون کے لحاظ سے عہد مغلیہ مین نصف آمدنی سے کچھ کم رقم پس انداز رہتی ہے صرف دوسرے حساب کے رو سے پانچ آنے دس پائی، کا قرض رہتا ہے جو ۳۰ وین حصّہ سے کسی قدر زائد ہے بخلاف اس کے عہد برطانیہ مین پہلے اور تیسرے حساب کے مطابق سال کی پوری آمدنی صرف غلہ کے لئے بھی کافی نہین ہوتی، بلکہ للعہ؍ کی مزید ضرورت ہوتی ہے، اور مالگذاری و محصول وغیرہ کے لئے علحدہ قرض لینا پڑتا ہے، جو دوسری صورت حساب مین سالانہ آمدنی کا پورا دوگنا، اور تیسری صورت حساب

۵؎ معارف :۔ یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، جب یہ ہوش ربا گرانی نہ تھی، ورنہ اگر آج کل کے نرخ سے حساب لگایا جائے، تو ۹ من غلہ کی قیمت دو سو روپیے کے قریب ہوئی، اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے،

کی ایک شکل میں تین گنے سے کچھ اوپر ہو جاتا ہے[1]

ان حسابات سے ظاہر ہو گا کہ سرکار نے جو یہ لکھا ہے کہ جزیہ میں غریب طبقہ کے سال بھر کے مصارف طعام غائب ہو جاتے تھے، وہ کسی حسابی اصول پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ایک ساحرانہ خطابت ہے، جو صرف عوام پر اثر ڈالنے کے لئے کام میں لائی گئی ہے، ا

پانچواں مغالطہ | پانچواں مغالطہ جزیہ کی "تحصیل" کے متعلق ہے، جس کو انھوں نے سخت تحصیل سے تعبیر کیا ہے، اور اس سلسلہ میں چند واقعات لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جزیہ کی وصولی میں اورنگ زیب کے حکم سے اتنا تشدد ہوتا تھا کہ غیر مسلم رعایا شورش، مظاہرہ، بلکہ بعض اوقات بغاوت پر آمادہ ہو جاتی تھی،

اس مغالطہ میں پہلی قابل اعتراض بات یہ ہے کہ باقاعدہ تحصیل کو "سخت" تحصیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور امیر عبدالکریم محصل جزیہ برہان پور کو سخت وصول کنندہ (a strict collector) کے لقب سے یاد فرماتے ہیں، حالانکہ جس کتاب سے یہ واقعہ لکھا گیا ہے، اس میں میر عبدالکریم کے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں،

"میر عبدالکریم را کہ ضابطہ و استاد زادہ پادشاہی شد و بکلیہ فضیلت و دیانت آراستہ بود"

(خافی خان ص ۲۰۸ ج ۲)

کیا ضابطہ، ہشیار اور باقاعدہ شخص کو سخت (Strict.) کہتے ہیں؟

دوسری چیز یہ ہے کہ پروفیسر جادوناتھ نے جزیہ کی سخت تحصیل کا تو ذکر کیا ہے، لیکن اس کے اسباب کا ذکر غائب کر دیا ہے، جو تاریخی دیانت کے خلاف ہے، (تفصیل آگے آتی ہے۔)

تیسری قابل گرفت بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے ان واقعات کو بالکل فراموش کر دیا ہے جو

---

[1] اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ میں اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے،

انہی کے ماخذون مین جزیہ کی "نرم تحصیل" کے متعلق مذکور ہین، مثلاً مرأۃ احمدی (ص ۳۲۱ ج ۱) مین اورنگزیب کا دیوان صوبہ کے نام یہ حکم مذکور ہے،

"و نیز حکم والا بنام دیوان صوبہ در دو یافت کہ کسانیکہ بعد وضع جزیہ پیش اناوائے آن یکسال برآنہا گذشتہ و سال دوم درآمدہ باشد اگر بے تساہل متصدیان سال اول نداده باشند موافق قول ابی حنیفہ رحمہ اللہ اصل را اعتبار نمودہ جزیۂ سال اول از آنہا نگیرند، و جزیۂ سال دوم بگیرند، و اگر از راہ تمرد جزیۂ سال اول ادا نکردہ باشند، موافق صاحبین ہر دو سال از آنہا استانند"

اس سے زیادہ رعایت کیا ہوسکتی ہے کہ تحصیلدارون کے مطالبہ کے باوجود اگر غیر مسلمون نے جزیہ نہین دیا ہے، تو وہ معاف کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جزیہ نہ دینا "سرکشی" کے باعث نہ تھا! (یہ گرہ آگے کھولی جائے گی)

خود پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب کے حاشیہ (ص ۲۷۳) مین ایشور داس ناگر کی کتاب فتوحات عالمگیری (باب ۳۵) سے نقل کیا ہے کہ

"شہنشاہ (اورنگ زیب) نے حیدرآباد فتح کرنے کے بعد وہان ایک سال کے لئے جزیہ، سائر اور تمام محاصل معاف کر دیئے، کیونکہ گورنر نے یہ اطلاع دی تھی کہ رعایا غربت کی وجہ سے محصول ادا کرنے کے قابل نہین ہے، اور اگر محصول لیا گیا تو ملک برباد ہو جائے گا"

ایشور داس ناگر گجرات کے "شیخ الاسلام" کے دفتر مین ملازم تھا، اور پٹن مین رہتا تھا، اس کی کتاب کو سرکار نے اپنی تاریخ (جلد اول) کے دیباچہ مین مستند قرار دیا ہے، لیکن اس کے باوجود انھون نے متن مین اس واقعہ کا ذکر نہین کیا ہے، بلکہ حمید الدین خان نیمچہ کی احکام کے حوالہ سے (جس کا سرکار نے انگریزی مین ترجمہ کیا ہے) اس کے متضاد یہ واقعہ لکھا ہے کہ

"چونکہ جزیہ کی تحصیل کا کام سختی سے ہوتا تھا، اس لئے ہندو تاجر دکن کو چھوڑ کر چلے گئے، اور غلہ کی کمی فوجِ شاہی میں محسوس ہوئی، اس وقت اورنگزیب نے امرار کی رائے کے مطابق دکن کا جزیہ معاف کیا"

حیرت ہو کہ اس روایت کے استناد اور پہلی روایت کے عدمِ استناد کی نسبت کوئی رائے نہ رکھنے کے باوجود سرکار نے خواہ مخواہ اس روایت پر کیونکر اعتماد کر لیا؟ کیا ایک مورخ کی حیثیت سے تحقیق کی کی ذمہ داری اُن کے سر نہ تھی!

ان گزارشوں کے بعد اب اصل مغالطہ کی جانب توجہ کیجاتی ہو لیکن اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر سرکار کی حسب ذیل عبارت پیش نظر رہنی چاہئے،

"قدیم مسلم فرمانرواؤں ہند کے زمانہ میں جزیہ برہمنوں کو مستثنیٰ کرکے تمام ہندوؤں پر مقرر ہوا تھا، جو اس مبصرانہ اور مسالمانہ نظام میں معاف رکھے گئے تھے، جس کو سندھ میں محمد بن قاسم نے پیدا کیا تھا، فیروز شاہ نے اپنی پیرانہ سالی میں اس امتیاز کو مسترد کر دیا، اور برہمنوں پر دوسر کفار کی طرح محصول لگایا، اکبر کی دانشمندانہ سیاست دانی نے اس محصول کو منسوخ کر دیا اور ذلت کی ایک ہیجان انگیز علامت کو رعایا کی اکثریت سے ہٹا دیا، ایک صدی کے بعد اورنگزیب نے اس سیاست کو پلٹ دیا، (تاریخ اورنگزیب ص ۲۷۰، ۲۷۱)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ آغازِ حکومتِ اسلامیہ سے لے کر عہدِ اورنگزیب تک برابر ہندوستان میں جاری رہا، صرف اکبر کی حکمتِ عملی کے سبب سے سو برس تک اس کا نفاذ نہیں ہوا، اورنگزیب نے پھر قدیم دستور کے مطابق اس کو جاری کر دیا،

اب سوال یہ ہو کہ وہ محصول جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے تھا، اور جس پر غیر مسلم رعایا نے کبھی شور نہیں مچایا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں اس کے متعلق ناراضی پیدا

ہوئی ؟ بلا شبہہ فیروز شاہ نے جب برہمنوں پر جزیہ تشخیص کیا تھا، تو اُن کی طرف سے "پُر امن نافرمانی" ہوئی تھی اور بھوک ہڑتال چند روز تک قائم رکھی گئی تھی، لیکن چونکہ برہمنوں کا جزیہ سے استثنا سلاطین قدیم کی غلطی تھی، اس لئے فیروز شاہ نے کچھ پروانہ کی، اور خود ہندوستان نے برہمنوں کو سمجھا کر بھوک ہڑتال سے باز رکھا[۱]، اور پھر عرصہ تک جزیہ کے خلاف کوئی آواز نہین اٹھائی گئی، لیکن اورنگزیب کے زمانہ مین دفعۃً ایک ہیجان پیدا ہوا، جس نے ملک کے متعدد حصون مین آگ لگا دی، فیروز شاہ کے زمانہ کے برہمن تو اپنی امتیازی شان قائم نہ رہنے پر ناراض تھے، اور اورنگزیب کے زمانہ کے ہندوؤن کو کس بات کا گلہ ہو سکتا تھا ؟

علامہ شبلی مرحوم نے مضامین عالمگیر (ص ۴۷) مین اس سوال کا یہ جواب دیا ہے، "کہ چونکہ یہ محصول (جزیہ) ایک مدت سے موقوف ہو چکا تھا، اوس کا نئے سر سے قائم کیا جانا کیونکر گوارا ہو سکتا تھا ؟" لیکن جب یہ واقعہ ہے کہ جزیہ نہایت قدیم محصول تھا، اور ہندوستان صدیون سے اس کا عادی تھا، اور اورنگزیب نے ۱۰۶۸ھ سے لے کر ۱۰۹۰ھ تک تمام خلافِ شریعت محصول اور نذرانے بند کر دیئے تھے[۲]، اور اُن کے بجائے نہایت خفیف محصول (جزیہ) ۱۰۹۰ھ مین جاری کیا تھا تو پھر اس محصول کی اتنی شدید مخالفت اور اس کے خلاف بغاوتین سمجھ مین نہین آتیں،

سر جادو ناتھ سرکار نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ محصول "ذلت" کی ایک علامت تھی جس سے بغض وحسد کے جذبات مین ہیجان پیدا ہوتا تھا، نیز تحصیل کی شدت بھی مظاہرون اور بغاوتون کا باعث تھی، آخری بات کا جواب اسی عنوان مین اور پہلی چیز کا گذشتہ صفحات مین آچکا ہو،

لیکن حقیقت یہ ہو کہ ان بغاوتون سے اسلامی سیادت کی مخالفت مقصود تھی، ہم نے اوپر لکھا ہو کہ بلا واسطہ ٹکس سے سیاسی بیداری پیدا ہوتی ہے، اور جزیہ اس کا شاہد عدل ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بیداری ہندوؤن مین پیدا ہوئی، سب سے پہلے فیروز شاہ کے زمانہ مین برہمنون نے سیاست مین قدم رکھا،

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی عفیف ص ۳۸۲، ۳۸۳ [۲] یہ واقعات خافی خان نے لکھے ہین، اور الفنسٹن کی تاریخ مین اس کا تذکرہ کیا ہو،

اور ہمارے اس زمانہ کے لیڈروں کی طرح اس زمانہ میں بہت سے لیڈر پیدا ہوگئے جنھوں نے پرامن ترک موالات کا مقاطعہ جوئی کی شکل میں آغاز کیا جس سے شہر کے تمام ہندوؤں کو اُن سے ہمدردی پیدا ہوئی بعد میں شاید آگے چل کر یہ چنگاری اندر اندر سلگ کر اور بھڑکتی لیکن اکبر کی حکمت عملی نے اس کے ضرر سے محفوظ رہنے کے لئے خود اس محصول ہی کو موقوف کر دیا[1] اور یہ آگ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی اورنگزیب کے زمانہ میں راجپوتانہ کے راجپوتوں اور مہاراشٹر کے مرہٹوں نے از سر نو اس آگ کو ہوا دی، جس پر جزیہ کی دوبارہ تشخیص نے تیل کا کام دیا، اور سیواجی، مہارانا چتور اور راجہ جسونت[2] وغیرہ نے سلطنت مغلیہ کے خلاف وہ فضا پیدا کی کہ راجپوتانہ کی طرح دکن بھی اس سے متاثر ہوا، اور مختلف مقامات میں مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی سیواجی نے جزیہ کے متعلق بارگاہ سلطانی میں جو خط بھیجا تھا، اس کو سرجادو ناتھ نے نقل کیا ہے[3] راجپوتانہ کے راجاؤں کی سرکشی کے واقعات خافی خان وغیرہ نے قلمبند کئے ہیں، گجرات والوں کی مخالفت کا پتہ اس فرمان شاہی سے چلتا ہے، جو دیوان صوبہ کے نام آیا تھا، اور مرآۃ احمدی کے حوالہ سے اوپر نقل ہوچکا ہے، برہانپور اور دکن کے ہنگاموں کا تذکرہ خافی خان میں ہے، اور سرکار نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے،

---

[1] مگر اس کے بجائے اور دوسری قسم کے محصول بڑھا دیئے، جن پر ہمیشہ مغلوں کے عہد حکومت میں اورنگزیب کے زمانہ تک عمل رہا۔ [2] خافی خان ص ۲۶۱، ۲۶۲، ج ۲، [3] سیواجی کے اس خط کے متعلق سخت اختلاف ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ میں اس کو سیواجی کی طرف منسوب کیا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مسودہ میں شمبھوجی کا نام آیا ہے، آرم (Orme) کے اقتباسات میں جسونت سنگھ اور ٹاڈ (Tod) نے مہارانا راج سنگھ کا نام لیا ہے، شمبھوجی اور جسونت تو تاریخوں کی وجہ سے خارج از بحث ہوجاتے ہیں، البتہ اندرونی شہادت اور خود نوشت سوانحی تفصیلات راج سنگھ کے بجائے سیواجی پر منطبق ہوتے ہیں، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خط کا مضمون نیلا پربھو نے بنایا تھا جو سیواجی کا فارسی کاتب تھا، لیکن تحریر کا انداز

ان واقعات کی روشنی میں جزیہ کی تحصیل میں باقاعدگی، یا پروفیسر جدوناتھ کے الفاظ میں تشدد کا سبب کچھ اور معلوم ہوتا ہے، جس کو ہم بہ تفصیل لکھتے ہیں،

(۱) **مقاومتِ مجہولہ**: اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوؤں نے آزادی کے لئے جو لڑائی شروع کی، اس کی ابتدا "فیر فدشاہی" برہمنوں کی تقلید میں مقاومتِ مجہولہ یا پرامن ترک موالات سے کی گئی، سرجادوناتھ نے لکھا ہے، کہ ۲ اپریل ۱۶۷۹ء یکم ربیع الاول ۱۰۹۰ھ سے تمام سلطنت میں جزیہ کا قانون نافذ ہوا، جب یہ خبر پھیلی تو دہلی اور مضافات کے صدہا ہندو جمع ہو کر جمنا کے کنارے قصر شاہی کے سامنے جاکر کھڑے ہوئے، اور جزیہ کی منسوخی کے لئے شور مچایا، اس کے بعد جمعہ کے دن نماز کے وقت باب قلعہ سے لے کر جامع مسجد تک سڑک پر دہلی شہر اور چھاؤنی کے ہندو کھڑے ہو گئے، اس کے بعد بھی چند روز تک یہ سلسلہ جاری رہا، اسی زمانہ میں سیواجی کا خط آیا، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۷۱، ۲۷۲) ظاہر ہے کہ ان شورشوں میں جزیہ کی آمدنی کم ہو گئی ہوگی،

(۲) **بغاوت**: چونکہ عالمگیر کی رعایا مسلح تھی، اس "پرامن" مقابلہ نے جنگ کی شکل بہت جلد اختیار کر لی، اور رانا راج سنگھ والی جے پور اس تحریک کا سرگروہ بن گیا، رانا کو سیواجی نے اپنے خط میں ہندوؤں کا سردار لکھا ہے، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۸۹، Appendix VI) **سیواجی** پہلے سے مخالف تھا، اور مرہٹہ حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی اس تحریک میں شامل ہوا، اور نگزیب نام ایک سخت لکھا، ان دو کے علاوہ راجپوتانہ کے بہت سے راجا مخالف ہو گئے، پھر دکن کی رعایا بگڑ گئی، اور ایسی سرکشی اختیار کی کہ تحصیلداروں کے تقاضہ کے باوجود جزیہ دینا بند کر دیا، خافی خان لکھتا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) بتلاتا ہے کہ اس خط میں بہت سے ٹکڑے الحاقی ہیں، اس کا لکھنے والا اورنگزیب کا معاصر اور کم از کم جزیہ سیواجی نہیں معلوم ہوتا، بلکہ آج کل کا "مصلح" اور ملک کا نجات دہندہ "سیواجی" معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس خط میں راج سنگھ کو ہندوؤں کا لیڈر کہا گیا ہے، اور اس جملہ پر خود سرجادوناتھ کو بھی اعتراض ہے، اور جنوری ۱۹۰۸ء کے ماڈرن ریویو میں انھوں نے اس پر تنقید بھی لکھی ہے، اس لئے اس خط کی صحت بہت مشکوک، ناقابل اعتبار بلکہ جعلی ہے،

"ازانکہ کفار بلدہ و پرگنات در اداے جزیہ بسیار بسختی یا منصوب کردہ پادشاہی پیش می آمدند

و ہیچ پرگنہ نبود کہ رعایا بہ امداد فوجداران و مقدمانِ سرکش جنگ و ہنگامۂ فساد ننماید"

(ص ۲۷، جلد ۲)

گجرات کی رعایا مین بھی بعض ایسے سرکش موجود تھے، چنانچہ "شہنشاہ" کے فرمان بنام دیوان صوبہ

مین یہ فقرہ بھی ہے،

"داگرازراہِ تمرد جزیہ سالِ اوّل ادا نہ کردہ باشد" (مراۃ احمدی ص ۳۲۲ ج ۱)

غور کرو! وہ رعایا جو سلطنت کے تحصیلدارون کے ساتھ زیادتی کرے، سرکش چودھریون، اور

فوجدارون کے جتھون مین شامل ہو کر آمادۂ فساد ہو، اس کا جزیہ نہ دینا، کیا غربت اور مسکنت کی بنا پر ہو سکتا

ہے؟ ایسی سرکش رعایا کے متعلق اگر اورنگزیب نے یہ حکم دیا کہ تحصیلدارون کی مستعدی اور طلب و تقاضے کے

باوجود جس نے جزیہ نہ ادا کیا ہو، اور سرکشی کی نیت بھی نہ رہی ہو، تو اس کا جزیہ (بقایا) معاف کر دیا جائے،

اور جس نے سرکشی سے جزیہ بند کیا ہو، اس سے وصول کیا جائے، تو اس مین کیا بے انصافی ہوئی؟ اور اگر یہ

بے انصافی تھی، تو سرجدونا تھ کو "انصاف" کی کوئی مثال تاریخ ہند سے پیش کرنی چاہئے تھی۔

سرجدونا تھ نے اعتراض کیا ہو کہ دکن کی رعایا سے بجبر جزیہ وصول کیا جاتا تھا، بے شبہ میر عبدالکریم

کے ساتھ سوار اور پیادے گئے تھے، اور کوتوال کو بھی حکم پہنچا تھا کہ "جو ادائے جزیہ مین سستی کرے، اس کو سزا

دی جائے" (خافی خان ص ۲۷۸، جلد ۲) اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کی رعایا تحصیلدارون پر سختی کرتی تھی، اور

سرکش فوجدارون اور چودھریون سے اس معاملہ مین مدد لیتی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، جسے معترض

نے نظر انداز کر دیا ہے،

اس سرکشی کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی پر جو اثر پڑا تھا، اس کا اندازہ صرف ایک صوبہ (دکن) کے

ایک واقعہ سے کرنا چاہئے، میر عبدالکریم امین جزیہ برہان پور، بارگاہِ سلطانی مین اطلاع دیتے ہین،

"جزیہ تمام بلدۂ برہان پور سال گذشتہ بیست وشش ہزار روپیہ داخلِ خزانۂ سرکار گشتہ خانہ زاد در مدت سہ ماہ از پورجاتِ نصفِ بلد و یک لک وہشت ہزار روپیہ عائدِ سرکار ساختہ" (خافی خان ص ۲۷۹)

آدھے شہر کے مواضعات سے تین ماہ میں ایک لاکھ ۸ ہزار روپیہ وصول ہوا، جو میر عبد الکریم کے حسن انتظام کا نتیجہ تھا، حالانکہ اُن سے پیشتر بُرہان پور کے تمام مواضعات کا سالانہ جزیہ ۲۶ ہزار وصول ہوا تھا، پروفیسر سرکار کے نزدیک یہ حاکم کی سختی کا نتیجہ تھا، حالانکہ خافی خان کے مطابق یہ اس وصف کا کرشمہ تھا جو لفظ "ضابط" کے اندر جھلک رہا ہے، "ضبط" کے معنی ہیں کسی چیز کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا،

(۳) **رقم جزیہ کی معافی:** تیسری چیز جس نے جزیہ کی آمدنی پر اثر ڈالا یہ تھی کہ بعض رحم دل اور سادہ لوح مسلمان حکام نے ہزاروں ہندوؤں کو غیر مستطیع سمجھ کر جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا تھا، حالانکہ وہ غیر مستطیع نہ تھے، ان حکام میں سے ایک امانت خان بھی تھا، خافی خان (ص ۷۷، ۳۰۸، ۳۰۷) اس کے متعلق لکھتا ہے:

"آمار وزرے رشید خان دیوانِ خالصہ کہ با امانت خان بارہ سوے فراخ چشمی داشت، پروانہا معافی جزیہ را کہ امانت خان بادوست آویز ہائے مختلف بہنود نوشتہ میداد و بادشاہ در اجرائے جزیہ نہایت تقید بود از نظر گذرانیدہ، عرض نمود کہ از لطف ہنود بیشتر را امانت خان سندِ عدم مزاحمت جزیہ دادہ خلافِ مرضی بظہور آمد"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی آبادی کے نصف سے زائد حصہ کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، پھر آمدنی کیوں کم نہ ہو جاتی؟

اورنگ زیب نے اسی موقع پر امانت خان سے فرمایا تھا کہ

"در مقدماتِ دیگر مالی و ملکی آنچہ سندِ معافی برودم می دہند، مختارید، اما جزیہ کہ بہزار دشواری بر کفار جاری ساختہ ایم، معاف نمودن آن بدعت، و باعثِ برہم خوردن بند و بستِ جزیہ می گردد" (خافی خان)

سرکار نے اس فرمان کو اورنگزیب کی سختی اور وصولی جزیہ میں تشدد پر محمول کیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ چونکہ جزیہ کی آمدنی بہت کم رہ گئی تھی، اور ناکم ٹکس کے طور پر غیر مسلموں کا وہی ایک محصول تھا، اس لئے بادشاہ نے تاکید کی کہ اور معاملات میں معافی کی سند دینے کا اختیار ہے لیکن جزیہ میں ایسا نہیں کرنا چاہئے، سرکار نے ہنراً دشواری اور "بدعت" کے الفاظ کو بڑی اہمیت دی ہو لیکن اس میں کیا چیز خلاف واقعہ ہے؟ کیا شور شوں، بغاوتوں، اور مظاہروں نے جزیہ کے نفاذ میں دشواری نہیں پیدا کی تھی؟ اور کیا پرانے اور صحیح دستور کو اٹھا دینا "بدعت" (نئی بات) نہیں ہے؟

ناظرین! گذشتہ تینوں صورتوں سے بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ جزیہ کے باقاعدہ نظم و نسق کا کیا سبب تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ بدامنی مقابلہ بغاوتوں اور جزیہ کی معافی کے سبب سے آمدنی کم ہوگئی تھی، اس لئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا تھا، سرجادوناتھ نے سبب کو مسبب اور مسبب کو سبب قرار دیکر معاملہ کو بالکل الٹ دیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ چونکہ محکمہ میں سختی تھی، اس لئے گذشتہ واقعات پیش آئے، حالانکہ واقعہ یہ ہو کہ چونکہ واقعات پیش آئے اسلئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا،

بعض اور غلط فہمیاں گذشتہ پانچ بڑے مغالطوں کے علاوہ پروفیسر جادوناتھ کی بعض خوش فہمیاں اور بھی ہیں، مثلاً

(۱) جزیہ اشاعت اسلام کا ذریعہ تھا، اس کا جواب اگرچہ علامہ شبلی مرحوم نے نہایت معقول اور دلچسپ دیا ہے کہ:

"ایسا ہلکا ٹکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی،.... کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اوس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہئے"!

(مقالات شبلی مضمون الجزیہ ص ۲۳۰ ج ۱)

لیکن یہ جواب معترض کے لئے اس بناء پر کافی نہین ہے، کہ وہ ساری ذمہ داری عالمگیر کے "ضعیف کاندھے پر ڈالنا چاہتے ہین، وہ مآثر عالمگیری کے حوالہ سے یہ دکھانا چاہتے ہین کہ اس محصول (جزیہ) کا مقصد اسلام کی اشاعت اور کفر کا ازالہ تھا، حالانکہ یہ مقصد اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کہان سے نکلتا ہے کہ عالمگیر کی یہ رائے تھی، جزیہ کا فرمان اگر بلفظہٖ موجود ہو، اور یہ ثابت ہو جائے کہ الفاظ خود عالمگیر نے لکھوائے تھے تو بے شبہہ یہ استدلال صحیح ہوگا، لیکن عمال حکومت کے منشی اور محرر یا اس زمانہ کے مؤرخ اپنے جذبات کو اگر فرامین شاہی یا اپنی عبارتون کی تمہید مین ظاہر کرین، تو اُن کا ذمہ دار عالمگیر کیسے قرار پائے گا؟ مآثر عالمگیری یا مرأة احمدی جس کو بھی اٹھا لیا جائے، الفاظ خود مصنفین کے ہین، اس لئے عالمگیر اُن کی بناء پر مورد الزام نہین ہو سکتا،

(۲) جزیہ زائد ٹکس تھا جس سے صرف مسلمان محفوظ تھے، یہ غلط ہے، اورنگ زیب نے جزیہ کی طرح وصولی زکوٰة کا فرمان بھی نافذ کیا تھا، جو مرأة احمدی وغیرہ مین درج ہے، اس لئے پروفیسر صاحب کے الفاظ کو ذرا بدل کر یون بھی کہا جا سکتا ہے "کہ زکوٰة زائد ٹکس تھا جس سے صرف ہندو محفوظ تھے"

(۳) ملازمین سلطنت جزیہ سے مستثنیٰ تھے، اس خیال مین سرکار اور ارسطو مختلف ہین، ارسطو نے فوج مین امرائے جزیہ کی موجودگی سے جن کا ذکر ۲ر جولائی ۱۷۰۲ء (۱۱۱۳ھ) کے اعلان مین ہے، یہ استدلال کیا ہے کہ فوج مین ہندؤن سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ امرائے جزیہ کی موجودگی کے کوئی معنی نہین ہین، لیکن مرأة احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) مین اورنگ زیب کے اس حکم کی موجودگی مین جو عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ہے،

"از ملازمان سرکار دولت مدار مواخذہ نکند و سوائے آن از جمیع ذمیان مطابق شرع شریعت بگیرد"

ارسطو کے خیال کی کوئی اصلیت نہین رہتی، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ نقدی صورت

ین ملازمین سلطنت سے جزیہ لیا جاتا تھا، اور نہ خدمت کی صورت مین، بلکہ اُن کی خدمات پر اُن کو انکا معاوضہ ملتا تھا، فوج مین امراے جزیہ کی موجودگی کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہین یعنی امیر جزیہ کے ساتھ امداد کے لئے فوج ہو، جیسا کہ میر عبد الکریم کے ساتھ فوج بھیجی گئی تھی، کیونکہ رعایا باغی تھی، اور یہ تو بہرصورت ممکن ہے، کہ فوج مین جزیہ کا کوئی دفتر ہوتا ہو تا کہ باغی علاقون کے قبضہ مین آنے کے بعد جزیہ وصول کیا جا سکے،

(باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وی پی اور منی آرڈر آ جا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آ جا سکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور، دار المصنفین کے نمایندہ ہین، اُن کے یہان ہماری تمام مطبوعات ملجائینگی، جن لوگون کو ضرورت ہو اُن سے منگا لین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین،

"مینجر"

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی دسنوی سابق رفیق دار المصنفین

اس مین سندھ کا جغرافیہ، مسلمانون کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھوین صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتون کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دورون کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت للعہ،

"مینجر"

اعجاز القرآن

اور

اس کے وجوہ اور دیگر متعلقہ امور

از

جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈہ

عم محترم جناب مولانا سید محمد بدر الدین علوی صاحب نے اسلامک کلچر حیدر آباد دکن کی فرمایش پر اس مقالے کو انگریزی زبان مین لکھا تھا، مضمون کی اہمیت کی وجہ سے بعض اصحاب نے اصرار کیا کہ اس کو اردو کے سانچے مین ڈھال کر ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کیا جائے، موصوف نے اسے منظور فرماکر مجھے ترجمے کی خدمت پر مامور فرمایا، مین نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع اصل کی خوبی ترجمے مین باقی رہے لیکن اگر اس کے باوجود کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس کو میری ناتجربہ کاری پر محمول کیا جائے اس لئے کہ یہ میری پہلی علمی کوشش ہے،"

"محمد فخر الدین علوی بی اے علیگ"

کلام پاک کو اپنے متبعین کی بے نظیر عقیدت حاصل ہے، بہت سے مسلمانون نے پوری کتاب کو حرف بحرف حفظ کرنے کے علاوہ اپنی ساری زندگی مختلف طریقون پر اس کی خدمت کے لے وقف کر دی، ان کے لئے کلام پاک علوم کا گنجینہ رہا ہے محض پچھلے علوم ہی کا نہین، بلکہ ان نئے علوم کا بھی جن کا سرچشمہ حرف قرآن ہی ہے، قرآن پاک کے علوم پر بحیثیت مجموعی اور ہر فن پر علحدہ علحدہ کتابین لکھی گئی ہین، اس مضمون مین

ان سب کا مفصل ذکر ممکن نہین، اس لئے اس مضمون مین صرف اعجاز قرآنی پر بحث کی جائے گی، کہ اس کی مثال پیش کرنے سے کیون انسان قاصر رہا ہے،

اس علم کی ابتداء اور ترقی | قرآن خود اس بات کا دعوی کرتا ہے کہ اس جیسی کوئی چیز پیش کرنی محال ہے اور مندرجۂ ذیل آیات اس دعوی کا اعلان کرتی ہین،

(۱) فلیاتوا بحدیث مثلہ، پس ان کو اس جیسا اسلوب بیان پیش کرنا چاہئے،

(۲) قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات کہہ دو کہ اس جیسی دس سورتین بناکر لائین

(۳) وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداء کم، اگر تمھین اس مین کچھ شبہ ہے، جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو اس جیسی ایک سورۃ بنالاؤ، اور اپنے حمایتیون کو بھی بلالو،

نزولِ وحی کی تئیس سالہ مدت مین اس تحدی کا نہ تو کسی مخالف نے مقابلہ کیا، اور نہ اس جیسا کلام پیش کیا، اس طرح قرآن شریف کے اعجاز کا عقیدہ قائم ہو گیا، جو تیسری صدی ہجری کی ابتدا تک اسی صورت سے قائم رہا، تاآنکہ معتزلہ پیدا ہوئے، ان کا خیال تھا کہ قرآن کی بلاغت کے مثل لانا ممکن ہے، اس زمانہ کے عوام عربی زبان مین مہارت نہ رکھتے تھے، اور بلاغت کا کیا ذکر وہ جملے کی صحیح و غلط شکل مین بھی تمیز نہ کر سکتے تھے، اس لئے اہلِ سنت نے پیش بندی کے طور پر وجوہِ اعجاز تشریح کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس موضوع پر پہلے مصنف محمد بن یزید واسطی متوفی ۳۰۶ھ تھے، ان کے بعد مشہور عالم الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ ہوئے جنھون نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کا ذکر خود اپنی کتاب الحیوان مین کیا ہے، ان کے بعد رمانی نحوی متوفی ۳۸۲ھ کا نمبر آتا ہے، اسی زمانے کے ایک دوسرے محدث خطابی متوفی ۳۸۸ھ ہوئے، جنھون نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، علامہ باقلانی متوفی ۴۰۳ھ اس موضوع پر بہترین مصنف تسلیم کئے گئے ہین،

متاخرین میں سے جنھون نے اس موضوع پر لکھا ان مین مشہور متکلم امام فخرالدین رازی متوفی ۶۰۶ھ ،

ابن ابی الاصبع متوفی ۶۵۴ھ .... ابن سراقہ شاطبی متوفی ۶۶۲ھ قابلِ ذکر ہین کشف الظنون سے

معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، زملکانی ۷۲۷ھ، دورِ حاضر کے

مصری عالم مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی اس موضوع پر کتاب لکھی ہے، ایسے علما جنھون نے اس موضوع

پر سرسری طور پر قلم اٹھایا اتنے زیادہ ہین کہ اُن کی صحیح تعداد بیان نہین کی جا سکتی، ان مین ایسے جنھون نے اس

موضوع پر بہت لطافت کیساتھ عالمانہ انداز مین تبصرہ کیا ہو مندرجۂ ذیل ہین :-

(۱) ماوردی متوفی ۴۵۰ھ جنھون نے رسالہ اعلام النبوۃ مین اس مسئلہ کو بہت خوبی کے

ساتھ لکھا ہے،

(۲) علامہ عبدالقاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ علم بلاغت کے بانی عالم جن کی کتاب دلائل الاعجاز

مین قرآن مجید کے اعجاز پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہی،

(۳) قاضی عیاض اندلسی متوفی ۵۴۴ھ کی کتاب الشفا، نے قبولیتِ عامہ حاصل کی بہت سے

علما نے اُس کی شرحین لکھین،

جیسا کہ ابھی ظاہر ہوگا، یہ مضمون علامہ جرجانی، علامہ باقلانی، ماوردی اور قاضی عیاض کی تصانیف

سے ماخوذ ہے،

قرآن شریف کے اعجاز کے معنی علامہ جرجانی نے اس اعجاز کی تشریح اس طرح کی ہے،

قرآن پاک کی طرف سے عربون کو اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس جیسا کلام پیش کرین

لیکن انھون نے اس دعوت کو قبول نہین کیا، اور اس سے روگردانی کرکے تلوار سے لڑنا پسند کیا، اگر قرآن

پاک کی مثال لانا اُن کے بس کی بات ہوتی، تو یہ اُن کے لئے مقابلہ لڑائی کے زیادہ آسان تھا، یہان یہ

سوال پیدا ہوتا ہے، جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہو کہ قرآن پاک کی وہ کونسی خصوصیت تھی

جس نے اہلِ عرب کو اس کی نظیر لانے سے قاصر رکھا؟ کیا وہ قرآن مجید کے صحیح، عمدہ اور خوبصورت مضامین تھے یا محض الفاظ؟ اگر دوسری صورت اختیار کی جائے تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی مثال وہ نہ لاسکے؟ ان سوالات کے جوابات حسبِ ذیل ہون گے،

قرآن شریف کے مخالفین نے اس کی شستگی الفاظ، اُن کی ترتیب بیان کی خصوصیات، آیات کا غیر معمولی آغاز و اختتام، الفاظ کی روانی، واقعات کا بیان، اسلوبِ نصیحت اور یاد دہانیون اور دلائل کو خوب دیکھا، اور اس کی ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت پر غور کیا، مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو اپنی جگہ پر غیر موزون ہو، یا جس پر اعتراض کیا جاسکتا ہو، اور اس میں ترمیم کیجاسکتی ہو، ان خصوصیات کی وجہ سے کسی شخص کو بھی اس کی مثال لانے کی ہمت نہ پڑی، علامہ جرجانی کے جوابون کا خلاصہ یہ ہو کہ الفاظ اور مضامین دونون نے مجموعی طور پر وہ خوبی پیدا کردی جس نے کلام پاک کو ناقابلِ مثال بنا دیا،

علامہ جرجانی ایک طویل بحث کے بعد مندرجہ ذیل آیت کی خوبیون کی تشریح کرتے ہوئے اپنے بیان کی توضیح کرتے ہین کہ

وقیل یاارض ابلعی ماءك ویاسماء	کہا گیا کہ اے زمین اپنا پانی سوکھ لے اور
اقلعی وغیض الماء وقضی الامر	اے آسمان پانی کو روک لے پانی کم ہوگیا
واستوت علی الجودی وقیل بعداً	اور حکم کی تعمیل ہوگئی، اور کشتی جودی کی پہاڑی
للقوم الظالمین ٥	پر رُک گئی، اور کہا گیا کہ ظالمون پر لعنت ہو،

ان آیات کا حُسن اُن کے الفاظ اور جملون کی مخصوص ترتیب سے ظاہر ہے، موقع کی اہمیت کی وجہ سے زمین کو حرف ندا سے پکارا گیا ہو، یا ایتھا سے نہین، اُس کے بعد آگے اور پیچھے کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ابلعی کو لیجئے، یہان پانی کو کاف خطاب سے منسوب کیا گیا ہو، جو زمین کی طرف اشارہ کرتا ہو، یہ طرز خطاب بڑی خوبی کیساتھ منتخب کیا گیا ہے، اور ابلعی الماء کا سادہ طریقہ نہین اختیار کیا گیا، اس کے بعد آسمان کو

پکارا گیا، اور اس کو اپنا کام انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد تعمیل حکم کی خبر بصیغۂ مجہول یہ ظاہر کرنے کے لئے دی گئی ہے، کہ پانی خود اپنے اختیار سے زمین میں جذب نہیں ہوا، بلکہ ایسا خدا کے حکم سے ہوا، پھر تعمیل حکم کے بیان سے واقعہ کی تائید لائی گئی ہے، اور اس کشتی کے بیان سے جس کا اس سے پہلے کوئی ذکر نہیں ہے اس واقعہ کا فائدہ اور انجام بتایا گیا ہے، بلاغت کی رو سے یہ طرز بیان واقعہ کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے، آخر میں لفظ قیل کو دوبارہ استعمال کیا گیا ہے، تاکہ جملے کے آغاز کے ساتھ مطابقت ہو جائے، یہ تمام خوبیاں سننے والے کے دماغ پر عظمت طاری کرتی ہیں، محض سادہ الفاظ کی مدد سے ہی نہیں بلکہ ان عجیب و غریب مضامین سے بھی جو ان الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں،

علامہ جرجانی نے اپنی رائے کو اسی کتاب میں ایک اور جگہ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"جب عربوں کو یہ چیلنج دیا گیا کہ وہ قرآن پاک کی مثل بنا لائیں، اس وقت اُن کو قرآن کی وہ مخصوص خوبیاں جو اپنی عبارتوں میں وہ نہیں پیدا کر سکتے تھے، ضرور معلوم رہی ہوں گی، کیونکہ یہ مہمل بات ہے کہ کوئی شخص اپنے فعل کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کئے بغیر دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ تم میری طرح اس کام کو نہیں کر سکتے، قرآن کی یہ خاص خوبی محض اس کے الفاظ حروف اعراب اور مسجع جملوں ہی میں مخصوص نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو عربوں کے نزدیک کوئی مشکل بات نہ تھی، اس لئے وہ خوبی محض ترتیب الفاظ ہی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین کو ادا کرتی ہے جو نزول قرآن سے پہلے نامعلوم تھے"

یہاں علامہ جرجانی نے اپنے بیان کی تائید میں اشتعل الراس شیبًا کی تشریح کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سر ضعیف العمری سے چمک نکلا" تا وقتیکہ کلمہ راس کو معروف بالام نہ بنایا جائے، اور اس کو اشتعل کا فاعل نہ قرار دیا جائے، اور دونوں کلموں کے ساتھ شیبًا کو حالت نصبی میں بصورت نکرہ اضافہ نہ کیا جائے،

جملے مین کوئی خوبی نہین پیدا ہوگی، کیونکہ جو مضمون بیان ادا کیا گیا ہے وہ اسی طرز کے ساتھ مخصوص ہے،

وجوہ اعجاز علامہ باقلانی کی رائے کے مطابق قرآن کے اعجاز کی تین خاص وجوہ ہین، انھون نے آخری وجہ کو دس قسمون مین تقسیم کرکے کل تعداد بارہ تک کر دی ہے، ماوردی نے اُن کی تعداد بیس قرار دی ہے، اُم قاضی عیاض چار وجہین بتاتے ہین، مگر آٹھ کا اضافہ کرکے انھون نے بھی تعداد بارہ تک پہنچا دی ہے، اِن سب کی میزان چالیس ہوتی ہے، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

(۱) الفاظ کی صحت اور ان مین آپس کی ایسی مشابہت جو عربون کی رسائی سے باہر تھی، اہل عرب زبان مین غیر معمولی مہارت کے باوجود بھی قرآن کی مثال پیش نہ کر سکے، حالانکہ یہ دعوی ۲۳ سال تک قائم رہا، ولید بن مغیرہ نے جو مکہ کا بڑا آدمی تھا، آنحضرت صلعم کو آیہ

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ — بیشک اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے

پڑھتے ہوئے سُن کر کہا، "اُس بیان مین مٹھاس اور حُسن ہے اُس کا زیرین حصہ پانی مین ڈوبا ہوا اور بالائی حصہ پھلون سے لدا ہوا ہے، اور یہ انسان کا کلام نہین ہے" ایک بدوی کسی شخص کو آیت

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ — تمھین جس امر کا حکم دیا گیا ہے، اس کا اعلان کرو۔

تلاوت کرتے ہوئے سُن کر سجدے مین گر گیا، اور کہا کہ مین اس کی فصاحت کے سامنے سجدہ کر رہا ہون" ایک رومی بطریق نے جو اچھی عربی جانتا تھا کسی مسلمان کو یہ آیہ پڑھتے سنا،

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَخْشَی اللّٰہَ وَیَتَّقْہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ — کامیاب ہونے والے وہی لوگ ہین جو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت اور خدا کا... بچتا

تو کہا کہ صرف ایک آیت مین دنیا و آخرت کے وہ تمام مسائل موجود ہین، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے،

(۲) قرآن شریف کی حیرت انگیز عبارت اور اس کا غیر معمولی طرز بیان جو مختلف مضامین سے

متعلق ہونے کے باوجود عربوں کے مروجہ طرز بیان سے علحدہ تھا، ان کے مروجہ طرز میں صرف دو چیزیں تھیں، نثر اور نظم، نثر کی دو قسمیں تھیں، مسجع اور غیر مسجع نظم کی بہت سی قسمیں تھیں، شاعری بلند پایہ فن تھا، لیکن نثر ہر ایک کے بس کی تھی، قرآن اُن میں سے کسی قسم کی نثر یا شاعری سے مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ آیات کے آخری حروف شعر کے قافیوں اور نثر کے سجع سے مختلف تھے، ان بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن نے ایک نیا اسلوب بیان ایجاد کیا، جو اہلِ عرب کے بس سے باہر تھا، اور معاصر اہلِ عرب اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوئے،

(۳) عرب میں ایسے بلیغ کلام کا وجود نہ تھا جس میں نازک خیالات اور پختہ حقائق بیان کئے گئے ہوں، اور اسالیب بیان میں طول کے باوجود باہم مشابہت بھی ہو، یہ صحیح ہے کہ عقلا نے اچھے اچھے جملے بھی کہے، اور شعراء نے اشعار بھی، مگر ان جملوں اور اشعار میں اختصار کے باوجود بھی خامیاں موجود تھیں، اس کے برعکس قرآن پاک ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے،

(۴) قرآن شریف کے طرز ادا میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ بیان میں کوئی نقص ہے، اگرچہ اس میں قصے، نصیحتیں، دلائل، حقائق، قوانین، معذرتیں، وعدے، وعید، محاسن اخلاق کی تعلیم اور دوسری مختلف قسم کے مضامین ہیں، اور کسی ایک تحریر میں ان تمام خوبیوں کا مجتمع ہونا ناممکن ہے، مختلف لوگ بیان کی مختلف شاخوں میں ماہر ہوتے ہیں، مثلاً شاعر جو مدح کرنے میں ماہر ہو وہ ہجو کا ماہر نہیں ہوسکتا، اور جو شخص ہجو نگاری میں بلند پایہ ہوگا، وہ مدح میں کمتر ہوگا، اگر بعض مرثیہ گوئی میں بہتر ہیں، تو دوسری اصناف شاعری سے بے بہرہ ہیں، بعض رجز میں مہارت رکھتے ہیں، تو دوسرے اقسام پر قادر نہیں بعض اونٹوں اور گھوڑوں کے اوصاف، رات کے سفر، باغ، شراب اور جذبات کی مصوری کرنے میں استاد مانے گئے ہیں، اگر امرء القیس سواری کا بیان کرنے میں مشہور ہے، تو نابغہ ڈرانے اور ترغیب دلانے میں ماہر ہے، اسی طرح تقریروں پیاموں اور دوسرے قسم کے بیانات میں اختلاف ہے

ایک شخص اپنی دلچسپی کے کسی خاص مضمون میں اپنے ہنر کا مظاہرہ کر سکتا ہے لیکن جب وہ کسی اور موضوع کو ہاتھ لگاتا ہے تو پیچھے رہ جاتا ہے، اور اس کی عبارت کی خامی نمایان ہو جاتی ہے، اسی بنا پر مندرجۂ بالا شعرا جن کی برتری اُن کے خاص مضامین میں مسلّم ہے دوسرے مضامین میں کمتر سمجھے گئے ہیں، ایک ہی جملہ جس میں کوئی بندش نہ ہو، ادا کرنے والوں کے اختلاف سے اختلاف پذیر ہو جاتا ہے، قرآن پاک اپنی تمام تفصیلات میں ایسی منضبط قوت کا حامل ہے، جو تمام نقائص سے پاک ہے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کیجا سکتی جس میں قرآن پاک اپنی فصاحت کے یکسان معیار کو قائم نہ رکھ سکا ہو، ایک ہی مضمون کو بار بار دہرانے میں طرز بیان کا یکسان رہنا ناممکن ہوتا ہے لیکن قرآن مضامین کی تکرار کے باوجود بھی اپنے معیاری طرز بیان سے کبھی نہیں ہٹا، اور اپنی بلاغت قائم رکھی،

(۵) فصحا کی عبارتون میں جہان وہ مختلف جملون اور خیالات کو آپس میں ملاتے اور جدا کرتے ہیں، ایک نمایان بے ضابطگی پائی جاتی ہے، اُن کی یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے، جب وہ اپنی زبان کے اسالیب بیان کے مطابق کسی مضمون کو اس کے ابتدائی درجہ سے آغاز کر کے انتہا تک پہنچاتے ہیں، یا اس کے برعکس انتہا سے ابتدا میں لیجاتے ہیں، یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے جب کسی مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانے یا کسی مضمون کو غیر دلچسپ اور مشکل بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن قرآن میں اس قسم کی کوتاہی نہیں بلکہ اس کے ہر قسم کے بیانات میں مناسبت ہے،

(۶) آیاتِ قرآنی کی ساخت سے تین خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں،

(الف) الفاظ کا اس طریقہ سے استعمال کہ وہ موثر ہوں ا

(ب) خیالات کی ایسی جامعیت جو ابتدا ہی سے واضح ہیں، اور ان کے سمجھنے کا دار و مدار آیت کے اختتام پر نہیں ہے، اور خیالات اور الفاظ میں بھی مطابقت ہے، اس میں نہ کمی ہے اور نہ زیادتی،

(ج) آیات کی ساخت میں حسن ہے، اور غیر موزون بندشوں کا کہین وجود نہین، اوزان مین مشابہت ہی،

(۷) عربی زبان مین متعدد اسالیب بیان ہین، مثلاً تفصیل و تطویل، اختصار، اجتماع، افتراق اور استعارہ وغیرہ، یہ تمام اصناف قرآن پاک مین موجود ہین، جب اُن کے قرآنی استعمال کا مقابلہ دوسرون سے کیا جاتا ہے، تو یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن کا طرز بیان انسانی طاقت سے بالاتر ہے،

(۸) قرآنی خیالات جو مذہب اور شرع کی بنیاد ہین، اس استدلال و مباحثہ اور ایسی ہم آہنگی نزاکت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہین کہ اس کی مثال انسانی کلام مین ملنا ممکن ہے، اس مین اگر بہت سے معمولی اور جانے بوجھے ہوئے خیالات ہین، تو بہتیرے نئے اور غیر معمولی بھی ہین، جدید خیالات کے مقابلہ مین جانے بوجھے ہوئے خیالات کے لئے الفاظ منتخب کرنا آسان ہے، اور معمولی تخیل کے لئے بہت عمدہ الفاظ کے استعمال کے مقابلہ مین بلند اور بہترین تخیل کے لئے بہترین الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے، اسی کے ساتھ اگر الفاظ خیالات کے مطابق ہون، اور خیالات الفاظ کے اور دونون اپنی جگہ پر بے مثال ہون جیسا کہ قرآن مین ہے، تو اس کی ندرت اور کمال فصاحت مین کوئی شبہہ نہین ہو سکتا،

(۹) کلام کا اصل حسن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کسی نظم یا نثر مین اس کا اقتباس دیا جائے اور اس وقت اس کی خوبی ہیرے کی طرح چمکے، قرآنی اقتباسات کو جب اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، تو انکی خوبی اور نمایان ہو جاتی ہے، اور وہ دوسرے کلام مین نگینہ کی طرح چمک اٹھتے ہین،

(۱۰) عربی مین حروف تہجی ۲۹ ہین، اور قرآن کی وہ سورتین جو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہین، ۲۸ ہین، اور ان حروف مقطعات کی تعداد جو ان مین لائے گئے ہین، ۱۴ ہے، شاید ایسا اس لئے ہو کہ قرآن اُن کی زبان کے الفاظ سے مرکب ہے، یہ حروف بعد کے نحویون کی رائے کے مطابق دو قسم کے ہین مہموسہ اور مجہورہ، دس مہموسہ ہین، اور باقی انیس مجہورہ، دونون قسمون مین سے نصف نصف سورتون

کے شروع مین لائے گئے ہین، حروف کی ایک اور تقسیم بھی ہے، حلقی و غیر حلقی، پہلے حروف تعداد مین چھ ہین، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین لائے گئے ہین، ایک تیسری تقسیم بھی ہے شدید ہ اور منطبقہ، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون قسمون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین موجود ہین، یہ تقسیمین نزول قرآن کے بہت بعد دریافت ہوئی ہین، اس لئے اس متاخر انکشاف کے مطابق سورتون کا افتتاح اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہو کہ قرآن انسان سے بالاتر ہستی کا کارنامہ ہے،

(۱۱) قرآن کا طرز بیان سادہ آسان اور غیر مانوس بندشون اور الفاظ سے پاک ہے، اس کی ترکیب مین کہین گنجلک نہین، اس کے مضامین ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، مگر اس سادگی کے باوجود بھی قرآن کی مثال نہین لائی جاسکتی کسی بھی انسانی کلام مین یہ خوبی نہین پائی جاتی، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، اچھے شاعرون کی نظمون تک مین غیر مانوس الفاظ اور دور افتادہ خیالات بہت پائے جاتے ہین، اور اُن کی ساری کی ساری نظمون مین یکسانی نہیں پائی جاتی، اور ان مین اچھی، بُری، اور اوسط درجہ ہر قسم کی عبارتین ہین،

(۱۲) طویل مضامین اور خیالات بڑی خوبی کے ساتھ مختصر طریقہ سے ادا کئے گئے ہین، مثلاً آیہ :-

لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ ، یعنی قصاص مین تمھارے لئے زندگی ہے،

القتل انفی للقتل سے موازنہ آیہ کی برتری ثابت کرتا ہے اس کی دوسری مثال

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ	یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی بھیجی کہ اس کو
فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ	دودھ پلاؤ، اور جب تم اس کے بارے مین
وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَادُّوْهُ	خوف زدہ ہو تو سمندر مین پھینک دو، ڈرو
اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (قصص ۱)	مت اور نہ رنجیدہ ہو، ہم اُس کو تمھارے پاس
	ضرور واپس لائین گے، اور اس کو پیغمبرون مین

ہے، اس آیت میں دو امر دو نہی کے صیغے، دو خبرین اور دو بشارتین ہیں،

(۱۳) ایک ہی سلسلہ مین مختلف اقسام کے مضامین کا یکجا کرنا جو انسانی طاقت سے باہر ہے، قرآن مین بعض وقت یہ خوبی ایسے الفاظ کے استعمال سے پیدا کی گئی ہے، جن کی مختلف تشریحات ممکن ہیں،

(۱۴) اطلاعات اور پیشین گوئیان جو آیندہ سچی ثابت ہوئین، مثلاً یہ دعوی کہ مخالفین کبھی بھی قرآن کی مثال لانے مین کامیاب نہ ہون گے یا جنگ بدر کے بارے مین کفار کی شکست کی پیشینگوئی،

(۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدیم صحیفون سے ناواقف تھے، آپ کو اُن لوگون سے ملنے کا بھی کبھی اتفاق نہین ہوا جن کو ان صحیفون کا علم تھا، مگر قرآن مین پچھلی قومون کے قصے ابتدائے آفرینش یعنی آدم و حوا کا قصہ، اُن کا جنت مین قیام اور پھر یہان سے نکلنا، طوفان نوح اور فرعون کے قصے، انبیاء علیہم السلام کی سوانح اور خصوصیت کے ساتھ ان واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے، جن کے بارے مین امتحاناً دریافت کیا گیا تھا، یہ تمام بیانات اصلی واقعات کے مطابق تھے، اُن کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھلے علم پر نہ تھی

(۱۶) لوگون کے دلون کے راز جن کو وہ چھپاتے تھے، اور جنھین کوئی بھی معلوم نہ کر سکتا تھا، قرآن نے کھول دیئے، مثلاً

اِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا،	یعنی جب تم مین سے دو گروہون نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا،
اور: وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ	وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ ان دو مین سے ایک گروہ تمھارے لئے ہوگا، اور تم نے یہ چاہا کہ تمھارے لئے وہ گروہ ہو جو غیر مسلح ہے۔

یہان جن رازون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ظاہر نہین تھے،

(۱۷) قرآن مین علم و حکمت کے ایسے اصول موجود ہین جن سے عرب نابلد تھے،

(۱۸) قرآن مین خالق کے وجود، اس کی توحید اور معاد کے ثبوت اور دوسری جماعت سے مقابلہ و اس کی تردید کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کئے گئے ہین، جن کو ایک امی خود اپنی انسانی کوشش سے پیش نہین کر سکتا،

(۱۹) مضامین کو بختگی کے ساتھ ایسے آسان طریقہ سے بیان کرنا کہ سہولت بیان کی وجہ سے کلام میں عامیانہ پن پیدا نہ ہو، اور غیر مانوس مضمون بھی مشکل نہ معلوم ہو، جملے کی ساخت مین آسانی اُس کو عامیانہ بنا دیتی ہے اور نادر ترکیبون کا استعمال مشکل بنا دیتا ہے، دونوں کا یکجا ہونا غیر مانوس تصور کیا جاتا ہے لیکن قرآن پاک نے ان تمام باتون کو بڑی خوبی سے نبایا ہے، اور جہان بھی آسان اور نادر مضمون کو یکجا کیا گیا ہے، وہان ان مین پوری مطابقت ہو اور کوئی اجنبیت نہین معلوم ہوتی،

(۲۰) قرآن کو یاد کرنا اور اُس کو اپنے حافظ مین محفوظ کر لینا آسان ہے، اس لحاظ سے دنیا کی کوئی کتاب یا صحیفہ قرآن کی برابری نہین کر سکتا، قرآن کو حفظ کرنے مین کسی شخص کی خصوصیت نہین، خواہ وہ عرب ہو یا عجم، بالغ ہو یا نابالغ، ہر ایک بڑی آسانی کے ساتھ یاد کر لیتا ہے، ابتدائے اسلام ہی سے ایسے لوگون کی ایک بڑی جماعت ہوتی آئی ہے، اور اب بھی موجود ہے، جس نے قرآن کو حفظ کیا ہے، اور کرتی ہو،

(۲۱) قرآن ایک غیر فانی معجزہ ہے، جو ابد الآباد تک رہے گا،

(۲۲) قرآن شریف مین رعب کا ایک ایسا عنصر ہے، جس سے سننے والون اور خصوصیت کے ساتھ کفار کے دل بہت مرعوب ہوتے ہین، جیسا کہ محدثین کے روایت کردہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے،

جبیر بن مطعم سے روایت ہو کہ انھون نے کفر کی حالت مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز مین سورۂ طور تلاوت کرتے سُنا، جب آپ اس آیت پر پہنچے،

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ | کیا اُن کی تخلیق بغیر کسی خالق کے ہوئی ہے

.... اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ، یا وہ خود اپنے خالق ہین یا وہ اپنے (تقدیری) معاملات کے خود مالک ہین"

تو اُن کا دل ہیبت سے لرز گیا، اور وہ سمجھے کہ اب قلب کی حرکت بند ہو ئی، اس طرح اُن کے دل مین ایمان راسخ ہو گیا،

(۲۳) قرآن کے مختلف حصّے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت ومطابقت رکھتے ہین، اور اس مین مختلف اقسام کے مضامین کا ایک خوبصورت امتزاج ہے، اور جب اس کا انداز بیان ایک موضوع سے دوسرے کی طرف جاتا ہی، تو اس تبدیلِ موضوع مین بھی خوبی ہوتی ہے، اور بے لگاؤ نہین معلوم ہوتا، حالانکہ دونون مضمونون مین بڑا اختلاف ہوتا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی سورہ مین جو مختلف مضامین بیش کئے گئے ہین کہین بھی کوئی خلا، یا بے تعلق تبدیلی نہین معلوم ہوتی، قرآن پاک جگہ جگہ اپنے موضوع کا رُخ وعدے سے وعید کی طرف، ترغیب سے ترہیب کی طرف، ماضی سے مستقبل کی طرف، قصّون سے امثال کی طرف اور حکم سے نزاع کی طرف بدلتا ہے، لیکن اس سے مضمون مین کوئی ناموافقت نہین پیدا ہوتی، جو نہایت ہی مشکل امر ہے، اور موضوع بدلتے وقت غیر موزونیت کا ہونا لازمی ہے، اسی لئے بہت سے شعرا ایسے مواقع پر ناکام رہتے ہین، بحتری گو عمدہ بندش اور خوبی بیان مین مشہور ہے، لیکن جب وہ غزل سے مدح کی جانب آتا ہی تو اس تبدیلی کو وہ مناسب طور پر نباہ نہین سکتا، اور اس مین ناکام رہتا ہی،

(۲۴) قرآن پاک کی نقل در وایت مین اس توجہ سے کام لیا گیا ہے، کہ اس کے الفاظ، مضامین وترتیب مین تغیر کا کیا ذکر حرکات تک مین بھی ذرہ برابر تغیر نہین ہوا، ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگون کی بس یہی کوشش رہی، کہ قرآن پاک اُن کے پاس بعینہٖ اسی حالت مین بغیر ذرہ برابر تغیر کے محفوظ رہے جس مین ان تک پہنچا،

(۲۵) آیات کے چھوٹے اور بڑے ہونے سے قرآن مجید کے مخصوص طرز بیان مین کسی قسم کا فرق نہین پیدا ہوتا، انسانی کلام مین اس قسم کا تفاوت ہونا لازمی ہے،

(۲۶) قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والے اس سے کبھی نہیں گھبراتے، اور یہ ان کے لئے ہمیشہ تازہ اور نیا رہتا ہے، جو انبساط او حسن بیان کا نتیجہ ہے، یہ خوبی کسی کلام میں نہیں پائی جاتی، خواہ وہ کتنا ہی شیریں کیوں نہ ہو،

(۲۷) جب ایک شخص بلاغت کے مطالعہ میں مشغول ہوتا ہے، تو وہ اس میں ماہر ہو جاتا ہے، اور فصاحت میں عبور حاصل کر لیتا ہے یعنی فصاحت اس کے مطالعہ کو وسیع کرتی ہے، لیکن قرآن پاک اُس شخص کو فصیح و بلیغ نہیں بناتا جو اس کو مسلسل پڑھتا رہتا ہے، اور اس میں لگا رہتا ہے، یہ خصوصیت صرف اس کے اعجاز کی وجہ سے ہو، تاکہ دوسری بلاغت کی کتابوں سے ممتاز رہے،

(۲۸) قرآن شریف میں اگر کوئی بھی اضافہ کیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ تمیز کی جا سکتی ہے، اور اگر الفاظ میں کوئی تبدیلی کیجاتی ہے، تو وہ بھی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے، اور چھپائی نہیں جا سکتی،

(۲۹) قرآن کے مخالفین اس کی مثال لانے سے قاصر رہے، باوجودیکہ اس کا یہ دعویٰ اب بھی قائم ہے، اور اس کی مثال لانے سے اپنی نا اہلیت کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے، ان کا حد کچھ کام نہ آیا، اور انھوں نے اس کی مثال لانے سے مایوس ہو کر تلوار سے لڑنے کو ترجیح دی جس کے نتیجہ میں ان کے آدمی قتل و غارت ہوئے اور قیدی بنائے گئے،

(۳۰) علامہ ماوردی کے نزدیک سب سے آخری وجہ الصرفہ ہے یعنی خود قرآن نے اپنی مثال لانے سے مخالفین کا منہ پھیر دیا، اس بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا قرآن کی مثال لانا اُن کے بس ہی میں نہ تھا یا یہ کہ ان میں اس کی صلاحیت تھی، مگر سلب کر لی گئی تھی، پہلا عقیدہ معتزلہ کا ہے اور دوسرا اہل سنت کا، چونکہ یہ فلسفیانہ نازک مسئلہ ہے، اس لئے میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا،

کیا قرآن میں سجع ہو؟ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک کا ایک جداگانہ طرز بیان ہے جسے نہ تو نثر کہا جا سکتا ہے، اور نہ نظم، اب اس کی تفصیل پیش کیجاتی ہے، نثر چونکہ عموماً مسجع ہوتی تھی اس لیے پہلے

اسی کو لینا چاہئے، اس مسئلہ میں اختلاف ہو کہ قرآن میں سجع ہے یا نہیں، علماء کی ایک جماعت جو سجع کو حسن بیان اور فصاحت کا جزء تصور کرتی ہے، اس خیال کی ہے کہ قرآن میں سجع ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت

قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى، ہم ہارون اور موسی کے رب پر ایمان لائے،

میں ہارون کو موسی سے پہلے رکھا گیا ہے، حالانکہ معکوس ترتیب عموماً استعمال ہوئی ہے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، مگر یہ تبدیلی (یعنی ہارون کو موسی سے پہلے رکھنا) سجع کی غرض سے کی گئی ہے، سجع کا تقاضا ہو کہ اس جگہ الف مقصورہ ہو، یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تغیر بے ارادہ ہوا ہے، جیسا کہ اس جگہ کے لئے کہا جاتا ہو، جہاں کوئی قرآنی آیت وزن شعری کے مطابق پڑ گئی ہو جس کی مثالیں بہت ہیں،

علامہ باقلانی کی رائے سجع کے خلاف ہو، وہ لکھتے ہیں "قرآن میں سجع ہونے کی جو یہ دلیل پیش کیجاتی ہو، وہ پوری طرح صحیح نہیں معلوم ہوتی، اول یہ کہ قرآن میں اگر سجع ہوتا، تو وہ عربوں کے طرز بیان سے جدا گانہ نہ ہوتا، اور اس صورت میں اس کی مثال لانا ممکن ہوتا، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہو کہ قرآن کا سجع بھی غیر ممکن المثال ہے لیکن قرآن کو شعر ماننے کی صورت میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے، اور اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اور پھر اس کے کوئی معنی نہ رہ جائیں گے کہ قرآن شعر نہیں ہو، دوسرے یہ کہ سجع شاعری کی بنیاد ہے، یعنی وہ شاعری کا پہلا درجہ تھا، جس نے بڑھتے بڑھتے شاعری کی موجودہ صورت اختیار کر لی، قرآن میں شاعری کی مذمت اور اس سے احتراز کا اعلان اس شدت سے کیا گیا ہے کہ دونوں میں دور کا تعلق بھی نہیں مانا جا سکتا، اور قرآن میں سجع ماننے کی صورت میں اس تردید کا زور باقی رہنا مشکل ہو جائے گا، تیسرے یہ کہ جاہلیت کے کاہن سجع سے واقف تھے، خود قرآن شریف اور حدیث نبوی

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ، یعنی یہ کسی کاہن کی تصنیف نہیں ہے،

دونوں نے اس کا انکار کیا ہے، ایک مرتبہ کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے جنین کے بارے میں کہا :-

کیف ندی من لا شرب ولا اکل — اس کا انتقام کیسے لیں جس نے کھایا نہ پیا،

ولا صاح فاستھل الیس دمہ — اور نہ آواز کی، کیا اس کا خون بغیر انتقام

قد یطل، — کے رہے گا؟

آنحضرت صلعم نے جواب میں فرمایا :-

"اسجاعۃ کسجاعۃ الجاھلیۃ — یعنی کیا یہ جاہلیت کی سی سجع ہے، یا کاہنوں

او اسجعا کسجع الکھان — کی سی،

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم سجع کو برا سمجھتے تھے،

اب ان آیات کا سوال رہ جاتا ہے جو بظاہر سجع معلوم ہوتی ہیں لیکن درحقیقت وہ سجع نہیں ہیں، بعض موقعوں پر قرآنی ترکیب سجع کے طرز کی ضرور ہے، مگر وہ حقیقۃً سجع نہیں، سجع کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور معنی و مضامین کی کم، اور قرآن میں زیادہ اہمیت معنی کی ہے، اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے،

اس کے علاوہ سجع جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ایک مخصوص طرز ادا کا نام ہے جس میں اگر ذرا بھی بے توجہی سے کام لیا جائے، تو کلام انکل بے جوڑ ہو جاتا ہے، اور اس کی ساری فصاحت خاک میں مل جاتی ہے، جیسا کہ اگر شاعری میں اس کے اصول کا خیال نہیں کیا جاتا، تو وہ شعر نہیں رہ جاتا، اور اس کی فصاحت بھی ختم ہو جاتی ہے، بعض آیات قرآنی جن کو مسجع کہا گیا ہے، وہ دراصل سجع کے اصولوں کے مطابق نہیں ہیں، کیونکہ ان کے بعض جملے چھوٹے اور بعض لمبے ہیں کہ سجع کا حرف اس وقت آتا ہے، جب کہ دوسرا جملہ پچھلے کا دو چند ہو جاتا ہے، جو سجع کے نزدیک ناپسندیدہ اور فصاحت کے خلاف ہے، اس سے قرآن کی فصاحت پر نقص لازم آئے گا، جس کو اس کے مخالفین بھی نہیں کہتے، اگر ایسا ہوتا تو مخالفین خاموش نہ رہتے، انھوں نے یقیناً اعتراض کیا ہوتا، اور اس کو سحر کبھی نہ کہتے، اس لئے سجع کو آیات قرآنی پر منطبق نہیں کیا جا سکتا،

آیاتِ قرآنی کے آخری حروف فواصل خود اپنی جگہ پر ایک مخصوص طرز کے ہین، ان مین اور سجع و شعر کے قافیہ مین کوئی چیز مشترک نہین، ایک آیت مین ہارون کو اوّل اور موسیٰ کو بعد مین اور دوسری جگہ اس کے برعکس رکھنے کی وجہ سجع نہین، بلکہ اس سے مقصد ایک مفہوم اور ایک ہی قصّہ کو مختلف الفاظ مین بیان کرنا ہے، جو لوگ فنِ بیان کے ماہر ہین، وہ جانتے ہین کہ ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ ور مختلف طریقون سے بیان کرنا کتنا مشکل ہی اس مین فصاحت کا قائم رکھنا مشکل ہوجاتا ہے، قرآن پاک نے ایک ہی قصّہ کو مختلف الفاظ اور مختلف پیرایون مین بار بار بیان کرنے کے باوجود اپنی فصاحت کے معیار کو قائم رکھا اور تکرار کی وجہ سے اس کی بلاغت مین کہین بھی خامی نہین پیدا ہوئی، اور یہ تنوع بھی اس خوبی کا ایک رُخ ہے جس نے قرآن کو معجزہ بنادیا، الفاظ کو آگے پیچھے رکھنے کا مقصد دوسرا ہے، اور سجع سے فواصل کی یہ ظاہری مشابہت آیاتِ قرآنی کو حقیقۃً سجع کے زمرے مین نہین لاسکتی،

قرآن شاعری نہین شاعری کے تمام اصناف عربون مین عام تھے، یہان تک کہ لڑکے بھی نظمین کہا کرتے تھے، اور اس مین کوئی دقت نہین محسوس کرتے تھے، پچھلے صفحات مین یہ بات بار بار کہی جاچکی ہے کہ قرآن پاک کا طرزِ بیان شاعری سے مختلف ہے، اور یہ فرق قرآن کے معجزہ ہونے کی وجہ ہے ورنہ اگر قرآن شعر ہوتا تو اس کی مثال لانا ممکن ہوتا،

قرآن بڑے زور و قوت سے اس بات کا اعلان کرتا ہی کہ وہ شعر نہین ہے، حسب ذیل آیات اس کی شاہد ہین،

(۱) وَمَا علمناہُ الشّعر :- ہم نے رسول کو شعر نہین سکھایا،

(۲) وَمَا هُوَ بقول شاعرٍ :- اور یہ کسی شاعر کا کلام نہین،

قرآن پاک کی آیتون مین یہ کہا گیا ہے، کہ کفار نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن پاک ایک شاعر کا کلام ہے، اس اعتراض کی تحقیق بہت آسان ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ جب مخالفین قرآن اس کے طرزِ بیان

پر متحیر ہوئے، قرآن کو بے اصل اعتراضات پر مجبور ہونا پڑا، چنانچہ انھون نے کبھی کہا کہ یہ شاعری ہے اور کبھی دعوی کیا کہ کسی کاہن کا کلام ہے، علامہ باقلانی کا خیال ہے کہ ان اعتراضات سے مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کو شاعری ہی کی کوئی صنف سمجھتے تھے، (مگر پورے طور پر نہین) جس سے وہ آشنا نہ تھے، اس پر شعر کا اطلاق انھون نے اس وجہ سے کیا تھا کہ قرآن فطرت کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، یعنی جس معنی مین فلسفیون نے شعر کو لیا ہے اگرچہ اہل عرب کے نزدیک شاعری کی تعریف دوسری تھی، ایک اور ضعیف وجہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ عوام نے اوزان شعر سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن پاک کو شعر کہہ دیا،

قرآن مین ایسی آیات بھی ہین جو وزن مین مصرعہ سے مطابقت رکھتی ہین، علامہ باقلانی نے ان آیات کو مع اوزان کے پیش کیا ہے، اختصار کے خیال سے یہان صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

وجفان کالجواب وقدور راسیات — اور پانی کے بڑے بڑے برتنون جیسی نادین

. . . . اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگین، (سلیمان

. . . . کے تابع جنات ان کے لئے بنایا کرتے تھے)

لیکن اس اعتراض کے جواب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کہتے کسے ہین، شعر کی تعریف ہے کہ

"وہ کلام جو ارادۃً مقفیٰ رکھا گیا ہو، اور جو وزن پر منطبق ہو، اور جو اپنی جگہ پر اکمل تخیل پیش کرنے کیساتھ ساتھ ایک سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو شعر کہا جاتا ہے"

اس سے ظاہر ہوا کہ شعر کے لئے دو شرطین ہین ایک یہ کہ وزن اور قافیہ ارادۃً ہو، اور دوسری یہ کہ اس مین ایک ایسے زیادہ اشعار ہونے چاہئین، اور قرآن پاک کی بعض آیات غیر ارادی طور پر علم عروض کے مطابق ہین، جیسے بعض اوقات روزمرہ کی گفتگو مین بھی اتفاقاً کوئی فقرہ شعر کے وزن پر ہو جاتا ہے، جیسے کوئی کہے :

اغلق الباب واتنی بالطعام — یعنی دروازہ بند کرو اور میرے لئے کھانا لاؤ،

یا ۴- اسقنی الماء یا غلام سریعًا، یعنی اے لڑکے مجھے پانی جلدی پلا،

یہ جملے وزن کے مطابق ہین، مگر ایسا ارادۃً نہین کیا گیا، اس لئے اُن کو شعر نہین کہا جا سکتا، اس کے علاوہ دوسری شرط کہ شعر مین ایک سے زیادہ بیت ہونی چاہئین، قرآن پاک کی آیات پر منطبق نہیں ہوتی، دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن شعر ہوتا، تو یہ حقیقت یقینًا مخالفین قرآن کے علم مین ہوتی، اور بغیر کسی پس و پیش کے وہ یہ سمجھتے کہ قرآن شعر ہے، اور یہ ناقابل قیاس ہے کہ پچھلے لوگون نے وہ سمجھا جس کو معاصرین نہ سمجھ سکے تھے، ایک اور جواب یہ ہے کہ اگر مخالفین قرآن نے اس کو شاعری سمجھا ہوتا، تو انھون نے اس کا مقابلہ کیا ہوتا، کیونکہ تمام اصناف شاعری پر انھین قدرت حاصل تھی، قرآن شریف کی مثال لانے سے اُن کی عاجزی اس بات کا بین ثبوت ہو کہ وہ قرآن کو شاعرانہ کلام تصور نہ کرتے تھے،

قرآن کے معارضین تاریخ مین ایسے چند لوگون کے نام بھی ملتے ہین، جنھون نے پچھلی ۱۴ صدیون کے دوران مین یا تو خود قرآن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی یا دوسرون نے اُن کی تصنیف کو قرآن کے مقابلہ مین پیش کیا، ایسے لوگ دو قسم کے ہین (۱) وہ جنھون نے پیغمبری کا ڈھونگ رچایا، اور جھوٹا الہامی کلام بھی پیش کیا (۲) وہ جنھون نے محض فن کی حیثیت سے کچھ لکھا، انھون نے یا دوسرون نے سمجھا کہ اس کو قرآن شریف کے مقابلہ مین پیش کیا جا سکتا ہے پہلی قسم کے لوگون مین پانچ نام لئے گئے ہین، اُن کے اس مشن کا نتیجہ خود ان کے انجام سے ظاہر ہے، ان مین سے دو تو بغیر کسی کامیابی کے مارے گئے، دو مسلمان ہو گئے، اور پانچوان اپنی معمولی حالت پر آگیا،

(۱) مسیلمہ یمامہ کا رہنے والا تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام مین پیغمبری کا دعویٰ کیا، اُس نے مدینہ آنے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یہ ڈھونگ رچایا، اس سے اس کا مقصد بادشاہت کا حصول تھا، چنانچہ اُس نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین صلح کی یہ شرط پیش کی: کہ آپ اس کو اپنا شریک بنا لین یا اپنا جانشین مقرر کر دین، اس کا یہ دعویٰ تھا کہ رحمان نامی فرشتہ اس پر قرآن لایا تھا جس مین فصلین اور

جملے تھے، اس کا دعویٰ تھا کہ منصب پیغمبری بھی کہانت کا جزو ہے، اس لئے اس کا کلام کاہنوں کی سجع کے مشابہ تھا، اس کا نمونہ یہ ہے:۔

الفیل ما الفیل وما ادراک ما الفیل	(یعنی ہاتھی! ہاتھی کیا ہے، اور تم نے یہ کیسے
لہٗ ذنبٌ وبیل وخرطوم طویل	جانا کہ ہاتھی کیا ہے، اس کے ایک سخت دم ہے
	اور لمبی سونڈ،

اس نمونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا کلام احمقانہ اور ذلیل خیالات سے بھرا ہوا تھا، اس کے انجام نے ثابت کردیا کہ نہ وہ پیغمبر تھا اور نہ اس کا کلام وحی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ اول نے ایک بہت بڑی فوج بھیجکر اس کا خاتمہ کرایا، اس نے اپنا کوئی نام لیوا نہ چھوڑا، جو اس کا ذکر زندہ رکھتا اور صرف مسلمانوں کی تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔

(۲) اسود عنسی اس کا نام ابہلہ تھا، یمن کا رہنے والا تھا، اپنی فصاحت وبلاغت، خطابت، شاعری، سجع اور کہانت میں مشہور تھا، اس نے آنحضرت صلعم کے آخری عہد میں دعویٰ کیا کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے لیکن اس وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، جب مفروضہ وحی اس پر نازل ہوتی تو وہ اپنے سر جھکا لیتا، اور تھوڑی دیر بعد اپنے سر کو اٹھا کر کہتا، وہ (خدا) مجھ سے یہ باتیں کہتا ہے، یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چوبیس گھنٹے قبل مارا گیا،

(۳) طلیحہ بن خویلد قبیلۂ اسد کا آدمی تھا، اور عرب کے بہادروں میں گنا جاتا تھا، وہ اپنے قبیلے کے وفد کے ساتھ سنہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اس کے پورے قبیلہ نے اسلام قبول کرلیا، جن میں وہ بھی تھا، جب وہ وطن واپس آگیا، تو پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے قبیلہ میں بڑا مرتبہ حاصل کرلیا، اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی ذوالنون نامی اس پر وحی لاتا تھا، لیکن اس نے بھی اس کو قرآن نہیں کہا، اس کے ساتھ کچھ فصیح لوگ تھے، جو اس کا اتباع

محض فرقہ بندی کے جذبہ اور بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے کرنے لگے، اس کی صرف ایک وحی یاقوت نے نقل کی ہے، خلیفہ اوّل نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی، فریقین مین جنگ ہوئی، اور انجام کار طلیحہ شکست کھاکر ملک شام کو بھاگ گیا، اس کے بعد پھر مسلمان ہوگیا، اور جنگ قادسیہ میں بڑی شجاعت دکھلائی،

(۴) قبیلہ تمیم کی ایک عورت سجاح بنت حارث اپنے ننہالی خاندان بنو تغلب مین رہتی تھی، یہ قبیلہ عیسائی تھا، سجاح نے اُن کے مذہبی گیت یاد کرکے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد پیغمبری کا دعوی کر دیا، قبیلہ کے چند لوگون نے اس کی پیروی کی، ان کو ساتھ لے کر اس نے خلیفہ اوّل کا مقابلہ کیا، راستہ مین بعض قبیلون سے لڑی اور بعض سے صلح کی، اسی زمانہ مین مسیلمہ کی قوت بھی بڑھ رہی تھی، وہ سجاح کے اس پروپیگنڈے کا حال سُن کر خوفزدہ ہوا، اور اس سے مل کر شادی کا پیام دیا، سجاح نے منظور کرلیا، اور دونون کی شادی ہوگئی، سجاح نے بھی اپنی وحی کے قرآن ہونے کا دعویٰ نہین کیا بلکہ اسود اور طلیحہ کی طرح اس کا صرف یہ عقیدہ تھا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے، اور کچھ مسجع عبارت بھی تیار کرلیتی تھی، مسیلمہ کے قتل کے بعد اس نے اپنا دعویٰ ترک کردیا، اور دوسری مرتبہ اسلام مین داخل ہوکر اپنی بقیہ زندگی ایک مسلمان کی حیثیت سے گذاردی،

(۵) مشہور شاعر احمد بن الحسین متنبی نے جو ۳۵۴ھ مین مارا گیا، اپنی زندگی کے ابتدائی ایام مین پیغمبری، اور اپنے اوپر ایک قرآن نازل ہونے کا دعویٰ کیا، کچھ لوگ اُس کے پیرو ہوگئے، لیکن بعد مین وہ اس دعویٰ سے باز آگیا، اور اپنی بقیہ زندگی ایک معمولی انسان کی طرح گذاردی،

دوسری قسم کے لوگون مین چار نام بتائے گئے ہین :-

(۱) نضر بن حارث یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمعصر تھا، اس کی لڑکی کے اشعار حماسہ مین درج ہین، اُس نے پیغمبری کا دعویٰ تو نہین کیا، لیکن کچھ لوگون کا خیال تھا کہ اُس نے اہل عجم کی تاریخ اور ان کے

ایسے قصے بیان کرکے جن سے عرب بالکل واقف نہ تھے، قرآن کا مقابلہ کیا، اس دعویٰ کی حماقت کی بنا پر کسی مورخ نے اس کی عبارتوں کا نمونہ تک دینا گوارا نہیں کیا،

(۲) ابن مقفع اپنے زمانہ کا فصیح و بلیغ مصنف تھا، کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ تک اپنے آپ کو قرآن کے مقابلہ کے لئے وقف کر دیا لیکن پھر جو کچھ لکھا تھا، چاک کر دیا، اور اس کو ظاہر کرنے میں بھی شرم محسوس کرنے لگا، دہریوں کا خیال ہے کہ اس کی الدرۃ الیتیمہ قرآن کے مقابلہ میں لکھی گئی تھی، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جو متعدد بار چھپ چکا ہے لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے، کہ ابن مقفع نے کبھی قرآن کے مقابلہ کا دعویٰ کیا ہو، یہ محض دہریوں کی من گھڑت ہے کہ اس نے قرآن کا مقابلہ کیا تھا، اس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ مذہب کے بارہ میں متہم تھا،

(۳) راوندی موسوم بہ احمد بن یحییٰ ابو الحسین متوفی ۲۹۳ھ یہ بھی دہریہ تھا، اس نے مذہب کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں، اور کہا جاتا ہے کہ التاج لکھ کر قرآن کا مقابلہ بھی کیا، ابو الفداء کا بیان ہے کہ مسلمان علماء نے راوندی کے تمام دلائل کی تردید کی، خاص کر اس دعویٰ کی کہ اس نے قرآن کا مقابلہ کیا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس نے قرآن کے مقابلہ کے لئے التاج لکھی تھی، قیاس یہ ہے کہ اس نے دوسری کتابوں کی طرح اس میں بھی اعجاز قرآنی کے خلاف دلائل پیش کئے ہوں گے، معری نے اپنی کتاب الغفران میں راوندی کی التاج کے بارے میں لکھا ہے:

واما التاجه فلا يصلح ان يكون نعلاً وهل تاجه الا كما قالت الكاهنة أُفّ وتُفّ:	رہی اس کی کتاب التاج تو وہ جوتی ہونے تک کے قابل نہیں، اس کی کتاب التاج کی کوئی حقیقت نہیں، بجز اس کے جیسا کہ کاہنہ نے اسے اُف تف کیا ہے،

(۴) ابو العلاء معری متوفی ۴۴۹ھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے الفصول والغایات فی

فی مجاراۃ السور والآیات لکھ کر قرآن کا مقابلہ کیا لیکن معری پر دہریوں کا یہ ایک بے بنیاد الزام ہے، اس الزام کے خلاف ایک بین ثبوت بھی موجود ہے کہ خود معری نے اپنی کتاب الغفران میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے،

واجمع ملحد ومهتد ان هذا الكتاب	ملحد اور مومن سب ہی اس بات پر متفق ہیں
الذي جاء به محمد صلى الله عليه	کہ محمد کی لائی ہوئی کتاب اپنے معجزے کی وجہ
وسلم كتاب بهر بالاعجاز ولقي	سے سب پر چھا گئی، اور اپنے دشمن کا مقابلہ
عدوه بالارجاز ما حذي على	سرا ہی کے ساتھ کیا، یہ کتاب کسی خاص
مثال ولا اشبه غريب الامثال	نمونے پر تیار نہیں کی گئی، غیر مانوس طرز بیان
ما هو بالقصيد الموزون ولا الرجز	سے مشابہت نہیں رکھتی، یہ نہ تو مقفی نظم ہے اور
ولا شاكل خطابة العرب ولا	نہ رجز، اسے نہ تو عربوں کی خطابت سے کوئی
سجع الكهنة،	مشابہت ہے اور نہ کاہنوں کی سجع سے"،

اس کے علاوہ جو کتاب قرآن کے مقابلہ میں پیش کی گئی ہے، اس کا نام الفصول والغایات ہے اور یہ الفاظ "فی مجاراۃ السور والآیات" محض تہمت کی بنیاد پر اضافہ کرلئے گئے ہیں،

مصر کے ایک جدید رسالہ الزہراء جلد اول ص، ۳۰۰، ۳۱۰، اور ۵۸۹ میں اس کتاب کا ذکر آیا ہے، اس مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طرز قرآن شریف سے بالکل مختلف ہے، معری پر قرآن کے مقابلہ کا الزام لگانا بالکل غلط ہے، ذاتی اور ملحدانہ خیالات سے قطع نظر اس نے قرآن کے بارے میں بڑی عمدہ رائے دی ہے،

رحمت عالم

مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لئے عام فہم اور سادہ زبان میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت،
قیمت مجلد ۔۔ غیر مجلد ۔۔ "منیجر"

ملاّ خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل

از

سید سلیمان ندوی

استاد ملاّ احمد معمار کے جس نے لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی عمارتیں بنوائی تھیں، اور انکی فاضل و نامور اولاد کے احوال پر جو مقالہ میں نے کچھ سال پہلے ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور میں پیش کیا تھا، اور جو بعد کو معارف میں چھپ کر شائع ہوا، وہ بظاہر اس قدر مکمل تھا کہ اس میں اضافہ کی گنجایش نہ تھی لیکن چونکہ تلاش و تفحص برابر جاری رہی، اس لئے ان میں سے بعض کی مزید تصنیفات ہاتھ آتی رہیں، جن کی بنا پر اُن کے متعلق معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ مضمون مذکور کے چھپنے کے بعد ملاّ لطف اللہ مہندس کی تصانیف میں ایک نیا رسالہ بیانیہ ندوہ کے کتب خانہ[۵۱] میں ملا جو فصاحت و بلاغت کے فن میں فارسی میں شاہزادی زیب النساء کے لئے مصنف نے تصنیف کیا تھا، خیال آتا ہے کہ معارف میں اس پر ایک مختصر مضمون حوالۂ قلم ہوچکا ہے، ندوہ ہی کے کتب خانہ میں اتفاق وقت سے لطف اللہ کے بیٹے مرزا خیر اللہ مہندس کے رسالوں کا ایک قلمی مجموعہ[۵۲] کئی سال ہوئے، کہ نظر سے گذرا تھا، میں نے اس کی یادداشت لے لی تھی، لیکن اس کی تکمیل اس لئے نہ ہوسکی کہ دل و دماغ اب ان مباحث سے اُچاٹ ہوچکے ہیں، اور اب کوئی اُمنگ طبیعت پر غالب نہیں مگر ظاہر ہے کہ مدت کا چڑھا ہوا رنگ ایک دم زائل بھی نہیں ہوسکتا، چنانچہ ابھی ایک صاحب نے "مضامین سید سلیمان ندوی"

---

۵۱ نواب صدیق حسن خان کی کتابوں میں،

۵۲ واحد علی سندیلوی کی کتابوں میں،

کے نام سے میرے میں بیس مضمونوں کا مجموعہ چھپا ہے، اس میں یہ مقالہ نظر آیا، تو خیال ہوا کہ اس کا تتمہ بھی لکھ کر چھاپ دیا جائے کہ تحقیق کے میدان میں ایک قدم کی اور وسعت پیدا ہو جائے،

رصد خانہ محمد شاہی کے نگران ملا خیر اللہ مہندس کے رسائل کا یہ مجموعہ تین رسالوں پر مشتمل ہے، پہلا طب میں ہے، دوسرا تصوف میں، اور تیسرا نجوم میں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرزا موصوف نہ صرف ہندسہ اور تعمیر میں ید طولیٰ رکھتے تھے، بلکہ وہ طبیب بھی تھے، صوفی بھی تھے اور منجم بھی، اب ذیل میں تینوں رسالوں کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا جاتا ہے،

۱۔ پہلے رسالہ کا نام السبع الثوابت ہے یہ طب میں ہے اور عربی زبان میں ہے، دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے کسی معاصر طبیب نے السبع السیارات کے نام سے سات مسئلوں کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا تھا اسی لئے اس کا نام السبع السیارات رکھا تھا، مرزا خیر اللہ نے اس کے جواب میں السبع الثوابت کے نام سے یہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ میں جن سات مسئلوں پر بحث ہے، وہ یہ ہیں، (۱) دردِ سر کی حقیقت، (۲) دوا معتدل کے معنی، (۳) خلط کی تعریف، (۴) اخلاط کی تعداد، (۵) مرکب اور مفرد اعضاء کے بیان میں، (۶) کھڑے ہونے کے کچھ حصہ میں کیا کھوکھلا پن ہے، (۷) ادھیڑ عمر کی حقیقت،

رسالہ کی تالیف کی تاریخ ۱۱۱۱ھ میں لکھی ہے،

۲۔ دوسرے رسالہ کا نام الرسالۃ القدسیہ فی مذہب الصوفیۃ الحقیقیۃ ہے، یہ تصوف میں وحدۃ الوجود کی تحقیق میں ایک عربی رسالہ ہے، جس میں اس مسئلہ کے باب میں چند شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، رسالہ کی تاریخ تالیف ۱۱۱۱ھ ہے،

۳۔ تیسرے رسالہ کا نام مُدخل ہے، یہ فارسی نظم میں نجوم کا رسالہ ہے، اس رسالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا موصوف شاعر بھی تھے، اس رسالہ کے شروع میں اس رسالہ کے نظم کرنے کے سبب میں

۱؎ پتہ: شفیق احمد، سکونت کلاں، بہار شریف پٹنہ اور محمد سلیمان اشرف ۲/۶ بتیا پوکھر روڈ کلکاتہ ۱۴،

اپنے خاندان کا کچھ حال لکھا ہے، جو درج ذیل ہے،

فی سبب نظم الرسالہ

بندۂ ذرّہ وار خیر اللہ ۔۔۔ کہ ندارد بہ اہل دنیا راہ

لیکن از محض فضل لطف و عطا ۔۔۔ شاہ والا نژاد بحر سخا

باز وے دارد زمین و زمان ۔۔۔ وارث حاکم مکین و مکان

مرشد فیض بخش، دین پرور ۔۔۔ قبلۂ اہل حق بلند اختر

دوسرے شعر میں "لطف و عطا" میں ایک خاص لطف ہے، لطف اللہ مہندس اس کے باپ اور عطاء اللہ اس کے چچا کا نام تھا:

تیسرے اور چوتھے شعروں میں غالباً ولی عہد سلطنت یا کسی شہزادہ کے نام کی طرف اشارہ ہے، یہ نظم ۱۱۵۵ھ میں لکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے، اس لئے اس کے شہزادوں میں سے کسی کی طرف اشارہ ہوگا، اس وقت اس کے شہزادوں کے نام پیش نظر نہیں، اس لئے تعیین نہ کرسکا،

اس کے بعد ایک مختصر باب "فی معرفۃ اصل المؤلف والتاریخ" کے عنوان سے ہے، جس میں مؤلف نے اپنے بزرگوں کا حال بتایا ہے،

بہ مہندس شہیر در افواہ ۔۔۔ والد این فقیر لطف اللہ

کسب این علم از پدر فرمود ۔۔۔ نادر العصر آن کہ احمد بود

ہست از علم این حقیر نحیف ۔۔۔ در ریاضی رسالہ ہاے شریف

در ریاضی ہمین برادر من ۔۔۔ چند تصنیف ہست در ہر فن

ہم ازین ذرّہ وار تصنیفات ۔۔۔ ہست گز رنج جہل داد نجات

در ہزار است دیکصد و پنجاہ نظم این چند گوہر دلخواہ

پہلے شعر مین مصنف نے اپنے باپ لطف اللہ مہندس کا نام لیا ہے، دوسرے مین اپنے دادا نادرالعصر احمد کا نام بتایا ہے، پھراپنی اور اپنے بڑے بھائی کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، بڑے بھائی کا نام نہین بتایا ہے، مگر مقالہ کے گذشتہ نمبر مین اس کا نام مذکور ہے، یعنی ملا امام الدین مؤلف تصریح الافلاک،

اس مجموعہ کے آخر مین ہے :-

"از تصانیف نادرالعصر معلم عالمیان مرزا ابوالخیر عرف خیراللہ غفرلہ ذنبہ تقبلہ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط اسی کے دست و قلم کا ہے،

کل تصنیفات کی تاریخون کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۱۸ھ سے ۱۱۶۵ھ تک تقریباً چالیس برس تک اس کا قلم مختلف علوم و فنون کی کتابون کی تصنیف مین رواں رہا ہے، چنانچہ ذیل مین اس کی تصنیفات کے سنین یکجا لکھدیئے جاتے ہین،

۱- الرسالۃ القدسیۃ	۱۱۱۸ھ	۴- مدخل فی النجوم	۱۱۵۰ھ
۲- السبع الثوابت	۱۱۱۹ھ	۵- تقریب التحریر	۱۱۶۱ھ
۳- شرح زیج محمد شاہی	۱۱۴۰ھ کے بعد	۶- حاشیہ شرح بست باب	۱۱۶۵ھ

اب تک تو ہمین یہ معلوم تھا کہ یہ خاندان پہلے لاہور مین تھا، پھر یہ دہلی چلا آیا، لیکن اس مجموعہ مین مرزا خیراللہ مہندس کے نام کے ساتھ بانگرمئوی لکھا ہے، بانگرمئو کانپور کے پاس موجودہ ضلع اناؤ کے حدود مین ایک بستی ہے، سمجھ مین نہین آتا کہ مرزا خیراللہ کا تعلق بانگرمئو سے کیونکر پیدا ہوا، کیا یہ مان لیا جائے کہ دلی کے احمد شاہی یا نادر شاہی ہنگامہ سے گھبرا کر یہ پورب کے امن کے مقام مین چلا آیا تھا، مگر یہ بہت ہی مشکوک بات ہے،

امام الدین کا تتمہ امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس بن ملا احمد معمار کی تصنیفات کے ذکر میں حاشیہ شرح چغمنی کا ذکر آیا ہے، امام الدین نے اپنی کتاب تصریح میں اپنے اس حاشیہ کا خود حوالہ دیا ہے، دیکھیے تصریح ص ۱۳، و ۲۴، مطبوعہ مجتبائی،

امام الدین نے تصریح میں (ص۱۵ مجتبائی) اپنے ایک اور رسالہ کا نام لیا ہے، جس کا ذکر گذشتہ مضمون میں نہیں آیا ہے، اور وہ اضافہ کے قابل ہے، زمین کے کردی ہونے پر زمین کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑوں اور گہرے غاروں کی بنا پر اعتراض کیا گیا ہے، اُس کے جواب میں محقق طوسی اور قطب شیرازی نے کہا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کی اونچائی کی نسبت زمین سے ایسی ہے، جیسے ایک ہاتھ کے کرے کے قطر کو جو کے عرض کے ساتویں حصہ سے اس لئے وہ لحاظ کے قابل نہیں محقق رومی نے شرح چغمنی کے حاشیہ میں اس جواب پر اعتراض کیا ہے، امام الدین نے اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا ہے،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہوا ہے اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے،

قیمت :- مجلد للعمر، غیر مجلد ہے

"منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

طنز لطیف

از

از جناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری حکومت صوبہ متحدہ

راج رشی ٹنڈن جی نے چند دنوں سے ہندو مسلمانوں میں ازدواج کی تحریک شروع کی ہے، اس کی مصلحت جو بھی بیان کیجائے لیکن ٹنڈن جی کے خیالات کے پیش نظر اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ شادی بیاہ کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں ضم کر لیا جائے یا کم از کم ان کا کلچر بدل کر ان کی امتیازی حیثیت ختم کر دیجائے، وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری نے بھی اس تحریک کے بارے میں پانیر میں اپنے خیالات ظاہر کئے تھے جن سے بظاہر ٹنڈن جی کی تجویز کی تائید ہوتی تھی، اس لئے ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے بھی اس کی مخالفت میں شذرات لکھے تھے، اب وحید احمد صاحب کا بیان ہے کہ ان کا مضمون طنزیہ و ظرافیہ تھا، اور اس میں انھوں نے ٹنڈن جی کی تجویز کا مذاق اڑایا تھا، اس کو سنجیدگی پر محمول کرنا معترضین کا قصور فہم ہے، لیکن عجیب اتفاق ہے یا معترضین کی بدذوقی کہ ان میں سے کسی کو بھی طنز اور سنجیدگی میں امتیاز نہ ہو سکا، اور سب نے اسے سنجیدگی پر محمول کر کے اس کی مخالفت میں مضامین لکھے، لیکن لکھنے والے کو اپنی تحریر کی تشریح کا زیادہ

حق ہے اس لئے ہم کو وحید احمد صاحب کے بیان کے ماننے مین تامل نہین ہے، اور اس سے مسرت ہوئی کہ الحمد للہ اس مسئلہ مین وہ جمہور مسلمانون کے ہم عقیدہ ہین، وہ اپنا یہ جواب اخبارات مین بھی شائع کرا چکے ہین، اس کے بعد **معارف** مین اس کی اشاعت کی ضرورت نہین تھی لیکن ان کا اصرار ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے، باقی انھون نے مسلمانون کی جس ذہنیت اور احساس کمتری کی جانب اشارہ کیا ہے اس کو وہ ہم سے بہتر سمجھتے ہین، ع :-

این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

البتہ اس دعا مین ہم اُن کے ساتھ شریک ہین، کہ اللہ تعالیٰ مسلمانون کو قوتِ ایمانی عطا فرمائے آمین۔

"م"

جناب محترم ایڈیٹر صاحب رسالہ معارف :-

السلام علیکم،

رسالہ معارف مین "مختلف فرقون مین شادیان" والابصیرت افروز نوٹ دیکھا، مسرت ہے کہ ایک مغالطہ کی وجہ سے ایک خاص مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی زحمت آپنے گوارا فرمائی لیکن افسوس ہے کہ اس نوٹ کی بنیاد میرے پانیر والے مضمون پر رکھی گئی ہے، اگر آپ اجازت دین، اور گستاخی معاف کردین تو مین وثوق سے کہہ سکتا ہون کہ میری تحریر آپ کی نظر سے نہین گذری، بلکہ کسی اور صاحب نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا ہوگا، ورنہ نہ اس قدر مغالطہ پیدا ہوتا، اور نہ آپ کو سخت تکلیف پہنچتی، مین کہہ سکتا ہون کہ آپ کی اس سخت تکلیف کے باعث وہ سخن فہم ہین جنھون نے آپ کو وہ مضمون سنایا، اور مین نہین ہون، مگر باین ہمہ مجھے سخت ایذا ہوئی، اور میری گردن شرم سے جھکی جا رہی ہے، اس امر کی کہ باعثِ تکلیف مین نہین ہون میرے مضمون کی وضاحت بہترین شہادت ہو سکتی ہے،

آپ کا آخری قیاس صحیح ہے جو آپنے میرے مضمون سے سمجھا کہ ٹنڈن جی کی یہ تحریک مسلمانون کی

امتیازی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے تھی یہی احساس تھا جس کے ماتحت وہ مضمون لکھا گیا تھا میرے مضمون کی سرخی تھی Tandon ji The grand mughal یہ سرخی بولتی ہوئی تھی، اس کا ترجمہ "مغل اعظم ٹنڈن جی" نہیں ہو سکتا، بلکہ "ٹنڈن جی مغل اعظم کے بھیس میں" ہو سکتا ہے، اردو میں میں نے اپنے اس مضمون کی سرخی "ٹنڈن جی کی اپج" رکھی تھی، اور یہ مضمون قومی آواز اور ذوالقرنین میں شائع ہوا تھا، مذاق سلیم اور فراست ان سرخیوں سے ثابت کر رہی ہیں کہ مجھے اکبر اعظم پر بھی اعتراض تھا، چہ جائیکہ ٹنڈن جی، اب میں اس کو کیا کروں کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ میں ٹنڈن جی کو اعزازی لقب اکبر کا دے رہا ہوں، میں نے اس مضمون میں مزاح اور طنز آمیز ظرافت سے کام لے کر ٹنڈن جی کو جواب دیا تھا کہ اکبر نے بھی یہی تحریک شروع کی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہم مذہب اس سے خفا ہو گئے، مگر تاریخ میں اس کا نام محفوظ ہو گیا، اسی طرح ٹنڈن جی سے اُن کے ہم مذہب خفا ہو جائیں گے، اور راج رشی کا لقب چھین لیں گے، مگر تاریخ میں اُن کی خوبیاں یادگار رہیں گی، ابھی تک ٹنڈن جی زبان و کلچر پر طبع آزمائی فرما رہے تھے، اب اس نئی تحریک سے ان کے گذشتہ منصوبوں کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے، کیونکہ مشترکہ شادی سے نئی زبان اور نئے کلچر اب وجود میں آئیں گے لیکن مسرت ہے کہ غلط روی نے ٹنڈن جی کو صحیح راستہ پر لگا دیا، اور یہ نئی تحریک شروع کر دی، ...... مسلمانوں کے یہاں اہل کتاب سے شادی کا جواز پہلے سے موجود ہے، اب مسلمان اگر کسی طرح یہ ثابت کر سکیں کہ ہندو اہل کتاب ہونے کے اہل ہو سکتے ہیں، تو ہم ان کی تحریک کو لبیک کہنے کو تیار ہو سکتے ہیں، ...... ہر قوم اور ہر زمانہ میں نبی بھیجے گئے ہیں، ہندوستان میں بھی کوئی نبی آیا ہوگا، ..... وغیرہ وغیرہ"

ملاحظہ ہو کہ باہمی شادی پر مسلمانوں کے متعلق کتنے بریک لگا کر میں نے بات کہی ہے، گویا اس امر میں میں مفتی و مفسر نہیں بنا ہوں، بلکہ مستفسر کے حدود میں رہا ہوں،

معارف :- مذکورہ انگریزی فقرے کا یہ مفہوم صرف مضمون نگاری کے ذہن میں آ سکتا تھا،

یہ شگفتہ دلی میں نہیں سمجھ سکتا کہ متانت و سنجیدگی کا کبھی بھی پہلو اختیار کر سکتی ہے، اس اظہار کے بعد باعث مغالطہ ہونے کا مجھے اعتراف ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمان کی ذہنیت کو کیا ہو گیا ہے احساس کمتری کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ نظر قطعی بند ہو کر رہ گئی ہے، لہذا تمنا اور دعا ہے کہ خداوند کریم مسلمانوں کو اپنی رحمت سے قوت ایمانی مرحمت فرمائے، اور ان کے صدقہ میں مجھ گنہگار کو، آمین،

مجھے امید ہے کہ میری اس معذرت اور وضاحت کا تذکرہ رسالہ معارف میں شائع فرما کر میری خفت و ندامت کو دور کرنے کی سعی فرمائیے گا،

نیازمند :- "وحید احمد"

انتخابات شبلی

یعنی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں ان کلام کے حسن و قبح اور عیب و ہنر اور شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے،

(مرتبہ :- سید سلیمان ندوی)

ضخامت :- ۲۲۰ صفحے

قیمت :- دو روپے چار آنے

"منیجر"

استفسار وجواب

تقویم الابدان

قاضی نورالدین حسین صاحب
راجپند دیپ چند لائبریری بھروچ بمبئی

مکرمی جناب مدیر صاحب معارف اعظم گڈھ،
سلام مسنون

براہ کرم ذیل کے استفسار کا جواب بذریعہ معارف تحریر فرما کر مشکور فرمائین، صوبہ گجرات کے ایک قصبہ انکلیسر (ضلع بھروچ) مین ایک رئیس سید محمود علی بن سید غلام علی انعامدار صاحب کے کتب خانہ مین طب کی ایک عربی قلمی کتاب تقویم الابدان مصنفہ و مرتبہ یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ (کتابت سنہ ۸۸۵ھ) کا نایاب نسخہ ہے، حضرت قبلہ ... مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے مذکور کتاب کے متعلق نقوش سلیمانی مین اپنے سفرنامہ مین ذکر فرمایا ہے(۱)، اس راقم الحروف نے بھی معارف کے گذشتہ جولائی سنہ ۱۹۴۹ء کے پرچہ مین ضمیمہ گجرات کے کتب خانہ کے عنوان والے مضمون مین حکیم روح اللہ بھروچی جہانگیری کے کتب خانہ کی کتاب کے ذکر مین اس کا ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کتاب کے کہان کہان نسخے موجود ہین، اور آیا یہ کتاب طبع ہوئی ہے یا نہین، وہ تحریر فرما کر مشکور و ممنون فرمائین، مذکورہ کتاب حسب ذیل حصص مین منقسم معلوم ہوتی ہے، ۹ × ۱۵، جلد دونون مین واضح خط سے لکھی گئی ہے، کل صفحات ۲۰۲ ہین،

(۱) تقویم الابدان (نقوش سلیمانی مین تقویم الادویہ مسطور ہے) صفحہ ۹۶،

(۲) مختصر لجالینوس فی علاج الامراض و مزاج الطبائع .... الخ صـ۱۲

(۳) تقویم الصحت بالاسباب " صـ۴۲

(۴) تقویم الادویہ المفردۃ والاغذیہ " صـ۵۳

کاتب (۱) حمد بن عمر بن جبار، ابتدا بسم اللہ کے بعد ...... کتاب تقویم الابدان،

بمداواۃ الامراض المجتمعۃ فی ثلاثۃ اجناس متشابھۃ والیہ

...... والازمنۃ والبلدان ...... الخ

اختتام:- تم کتاب تقویۃ الابدان بعون اللہ تعالیٰ وحسن توفیق

علی ید الفقیر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ وغفرانہ (ا) حمد بن عبد الجبّار

الورزقنی وقد وقع فراغ تحریرہ فی منتصف ذی القعدۃ سنہ ثمان

وثمانین خمسمایۃ والحمد للہ ربّ العالمین والصّلوٰۃ ...... اجمعین،

معارف: تقویم الابدان کوئی نایاب کتاب نہیں ہے، اس کا ایک حصہ چھپ بھی چکا ہے،

اس کی تصحیح سلیمان الدخیل نے کی تھی، اور امیر ابن الرشید امیر نجد کے ایجنٹ رشید پاشا نے ۱۳۳۲ھ میں

دمشق میں اس کو چھپوایا تھا، ہندوستان کے بہت سے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے پائے جاتے

ہیں، پٹنہ لائبریری، کتب خانہ ریاست رامپور اور سبحان اللہ لائبریری مسلم یونیورسٹی میں اُس کے قلمی

نسخے موجود ہیں، اور کتب خانوں میں بھی ہونگے، اس کتاب کا لاتینی ترجمہ ۱۵۳۲ء میں اسٹرا

برگ سے شائع ہوچکا ہے۔

لغات جدیدہ

چار ہزار جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری معہ ضمیمہ مسعود عالم صاحب ندوی

قیمت ۸؍ ضخامت ۲۵۷ صفحے، "منیجر"

ادبیات

دورِ حاضر

اور

اسوۂ فاروقی

از جناب یحییٰ اعظمی

بنائے عدل و اخوت کی جہان مین جس نے محکم کی — وہ جس نے زندہ سنت کی شہنشاہِ دو عالم کی
تمنا سرورِ دین کو تھی جس کے خیر مقدم کی — ضرورت ہے جہان کو پھر اسی فاروقِ اعظم کی
کہ ظلمت ہر طرف چھائی ہے پھر باطل پرستی کی
مگر حد ہو گئی ہے نوعِ انسانی کی پستی کی

کوئی بھی انتہا ہو اس کے اخلاقِ ذمائم کی — کہ انسان سے کہین بہتر ہو اب حالت بہائم کی
کرے شرح آہ کوئی کس طرح اسکے عزائم کی — کہ آغشتہ بخون ہے داستان اس کے جرائم کی
کیا ہو تازہ اس نے عصرِ نو مین دورِ چنگیزی
ہے کھیل اس کا یتیمون اور معصومون کی خونریزی

صف آرا ہین گھٹائین نیّرِ حق کے مقابل مین — نہ جانے کاوشین کب کی بھری ہین قلبِ باطل مین
تشتت رونما ہے ملتِ بیضا کی محفل مین — پریشانی سی ہے ہر بندۂ توحید کے دل مین
عزیمت ہے نہ وہ عہدِ سلف کی شان باقی ہے
نہ اس کا نقشِ لاتحزن یہ اب ایمان باقی ہے

جہاں میں کیا یہی مسلم کے جینے کا قرینہ ہے / کہ خودداری کا اس کی چور چور اب آبگینہ ہے

پڑا موجِ بلا میں آکے اُمت کا سفینہ ہے / نشیمن خوفِ غیراللہ کا مومن کا سینہ ہے

اکھڑتا جا رہا ہے پائے عزمِ استوار اس کا

کہ شیوہ بن گیا ہے رزمِ ہستی سے فرار اس کا

نہیں کیا یاد اسے لَا تَقْنَطُوْا کی نصِ قرآنی / نہیں کیا یاد اُسے کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ کا عہدِ ربانی

بتائے کوئی پھر ہے کس لئے یہ ضعفِ ایمانی / رہی ہے اس سے پہلے کیا یہی شانِ مسلمانی

ملیں گے تم کو ایک ایک حرف سے اس کے سبق اب بھی

کتب خانوں میں ہیں تاریخِ ماضی کے ورق اب بھی

مسلماں کے لئے یہ دور دورِ سرفرازی ہے / کہ رنج و ابتلا مومن کی شانِ امتیازی ہے

حقیقت میں اسی کا سب یہ فیضِ کارسازی ہے / کہ دنیا میں ابھی تک سرخرو دینِ حجازی ہے

ملا ہے بہرہ اس کو روئے گلگونِ شہادت سے

کہ تاریخ اس کی ہے تابندہ تر خونِ شہادت سے

ہمارے کارناموں سے ہے دہر ایک پر آوازہ / حنین و بدر کی ہے داستانِ فخر ابھی تازہ

زمانہ کو ہو پھر زورِ یدِ اللّٰہی کا اندازہ / خداوندا مرتب کردے پھر ملت کا شیرازہ

ہمارے بازوؤں میں پھر وہی اگلی سی قوت دے

وہی جوشِ شجاعت دے وہی ذوقِ عزیمت دے

اٹھا دے پھر کوئی فاروق یارب عصرِ حاضر سے / جہاں میں کر دے بزمِ عدل و صدق آراستہ پھر سے

نہیں کچھ بھی یہ مشکل تیری قدرت کے مظاہر سے / خداوندا سبھی ممکن ہے تیرے دستِ قادر سے

عمر جیسا جلیل القدر پھر دنیا میں پیدا کر

جلالِ عہدِ فاروقی جہاں میں پھر ہویدا کر

سکھا دی جو جہان نو کو آئین جہانبانی | بتا دے جو زمانہ کو رموز فقر و سلطانی
وہ جس کا شہرۂ آفاق دور عدل لاثانی | بلند اک بار پھر کر دے مقام نوع انسانی

ہو قلب دہر پہ سکہ رواں اس کی جلالت کا
مساوات و اخوت کا صداقت کا عدالت کا

غزل

از جناب فضل اختر سیتاپوری

سما گیا ہے کچھ ایسا جمال جانانہ | مری نگاہ میں رقصاں ہے آئینہ خانہ
تری نگاہ وہی ہے اثر جداگانہ | کہ جس سے ہے کوئی دیوانہ کوئی فرزانہ
فروغ سجدۂ اخلاص کا یہ عالم ہو | کہ بڑھ کے چومے قدم کعبہ ہو کہ بتخانہ
حیات اس پہ نہ ہنستی ہے اور نہ روتی ہے | نکل گیا حد فرزانگی سے دیوانہ
حیات و مرگ کے پھر اٹھ کھڑے ہوئے جھگڑے | یہی ہے حشر یہی حشر کا ہے افسانہ
اب اس مقام پہ ہے عشق کی جنوں خیزی | کہ حسن یار ہوا آپ اپنا دیوانہ
کبھی یہ سوچتا ہوں کاش وہ مرے ہوتے | کبھی یہ کہتا ہوں اچھا ہے جو ہیں بیگانہ
چراغ لے کے بڑھا رہنمائی کو شعلہ | قریب شمع دکھائی دیا جو پروانہ
سکون حسن کا اور بیقراریاں دل کی | ہر ایک چیز کا اسلوب ہے جداگانہ
میں راز عشق چھپاتا ہوں اور نہیں چھپتا | مرا سکوت بنا جا رہا ہے افسانہ
پیام یار تو دیتی ہیں دھڑکنیں دل کی | نگاہ شوق سناتی ہے دل کا افسانہ

کرشمہ اس نگہ مست کا ہے یہ اختر
چھلک رہا ہے جو چھلکا ہوا تھا پیمانہ

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدینؒ چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے رفیق دار المصنفین

ہندوستان کے صوفیۂ کرام میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے ان ہی کے فیوض سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہوا، اور ان کے وصال کو سات سو برس سے زیادہ گذرے، لیکن ان کی روحانی برکات کا سرچشمہ ابھی تک جاری ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک فارسی یا اردو زبان کی کسی کتاب میں ان کے مبسوط حالات زندگی نہیں ملتے، تذکروں میں زیادہ تر یا تو ان کے کشف و کرامات یا اُن کے اوراد و وظائف کی تفصیلات ملتی ہیں، اب سے پہلے ان ہی چیزوں کی زیادہ تلاش رہتی تھی، اسلئے تذکرہ نویس انہی کی تفصیل لکھکر اپنے ناظرین کی تشنگی بجھاتے تھے، لیکن اب جبکہ زمانہ کا ذوق بدل گیا ہی، صوفیۂ کرام سے عقیدت رکھنے والا گروہ ان کی سیرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کا زیادہ خواہاں ہوتا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات زندگی پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ چند اوراق

ملنے کا پتہ:- منیجر شعبۂ اشاعت معینی گدڑی شاہی انجمن جوالرہ، اجمیر شریف: قیمت ۱-صہ

سے زیادہ نہیں پھیل سکا ہے، معلومات کی کمی کی وجہ سے ایک اہل قلم اپنے کو چند اوراق ہی میں محدود کر دینے پر مجبور پاتا تھا لیکن ہم جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے معین الارواح میں حضرت خواجہ صاحب کے مفصل اور مبسوط حالات لکھنے کی کوشش کی ہے،

کتاب کے شروع میں جناب ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ام اے پی، ایچ ڈی، ڈائرکٹر اورینٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرس کا طویل دیباچہ ہے، پھر فاضل مؤلف کا معروضہ ہے، جس میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جن کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جدید ذوق کے مطابق اگر ان ماخذوں کے مصنفین کے نام اور سنین تالیف بھی لکھ دیئے جاتے، تو بہتر تھا، فاضل مؤلف نے اپنی محققانہ کتاب میں مسالک السالکین کا حوالہ کثرت سے دیا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس کی تصنیف ہے، اور کس زمانہ میں لکھی گئی ہے، شاید یہ تیرہویں صدی ہجری ہی کی تصنیف ہے، حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے میں ... حال کی کسی تصنیف کو بکثرت استعمال کرنا احتیاط کے خلاف ہے،

ماخذوں کے سلسلہ میں فاضل مؤلف نے ان کتابوں کی بھی فہرست دی ہے جو ان کو دستیاب نہیں ہو سکیں، ان میں خیر المجالس، مونس الارواح، مراۃ الاسرار، تواریخ فیروز شاہی (شاید ضیاء الدین برنی اور شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی مراد ہو) . . . .

. . . . اور اکبر نامہ اور سیر العارفین کے نام بھی ہیں، یہ کتابیں تو ایسی ہیں کہ تھوڑی سی تلاش اور جستجو کے بعد ہر اچھے کتب خانہ میں مل سکتی تھیں،

حاشیہ میں ماخذوں کا حوالہ دیتے وقت صفحوں کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، صرف کتابوں کے نام لکھ دیئے گئے ہیں، آج کل کی تحقیق و تدقیق میں صفحوں کا حوالہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، فاضل مؤلف اگر صفحوں کا بھی حوالہ دیدیتے، تو ان کی تحقیق میں وزن پیدا ہو جاتا،

پوری کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں سوانح مبارکہ، دوسرے میں سیرۃ مقدسہ تیسرے

مین حلقۂ ارادت، چوتھے مین آپ کی درگاہ اور مراسم، پانچوین مین آپکے دربار اور چھٹے مین تاریخ اجمیر" درج ہے،

پہلے حصہ مین حضرت خواجہ کے سوانح حیات سنہ وار لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جو آج تک حضرت خواجہ کے کسی سوانح نگار نے نہین کی، گو ان سنین کے تعین کرنے مین فاضل مؤلف نے زیادہ تر قیاسات ہی سے کام لیا ہے، جو ممکن ہے کہ صحیح ہون، اور اگر ان مین تسامح بھی ہو گیا ہو، تو آیندہ جب کوئی اہل قلم حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کرے گا، تو ان سنین سے اس کو واقعات قلمبند کرنے مین بڑی مدد ملے گی،

کتاب کے مطالعہ سے حضرت خواجہ کی سیاحت کا بہت ہی واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، فاضل مؤلف کی تحقیق ہے کہ حضرت خواجہ اپنی سیاحت کے دوران مین چار بار ہندوستان آئے، ممکن ہے یہ صحیح ہو، کہا جاتا ہے کہ وہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے، اور اُن کا وصال ۶۳۲ھ مین ہوا، اکہتر برس کے طویل وقفہ مین بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان سے کئی بار باہر تشریف لے گئے ہون، اور پھر واپس آئے ہون، اُن کے بارہ مین تو مشہور ہے جیسا کہ فاضل مؤلف نے بھی لکھا ہے کہ وہ اجمیر سے ہر سال حج کے لئے جاتے تھے (ص ۵۶) حج سے واپسی مین بلادِ اسلامیہ کی سیاحت بھی کرتے ہون، اس لئے اس سے انکار نہین کیا جاتا کہ وہ چار بار ہندوستان نہین تشریف لائے ہون گے، لیکن اس سلسلہ مین فاضل مؤلف نے جو دلائل دیئے ہین وہ اطمینان بخش نہین،

حضرت خواجہ کے پہلی بار ہندوستان آنے کے ذکر کے سلسلہ مین لکھتے ہین،

"غزنین سے روانہ ہو کر آپ پہلی بار بروایت متواتر بتاریخ ۱۰ محرم الحرام ۵۶۱ھ ہندوستان مین تشریف فرما ہوئے، اس وقت خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی (جو بہرام شاہ کا پوتا تھا) لاہور مین حکمران تھا، (ماخوذ از تاریخ فرشتہ وغیرہ)

مگر اس سنہ مین چونکہ رونق اسلام صرف لاہور اور ملتان تک تھی، اور یہی ہر دو مقامات شمالی ممالک سے آنے والے کے لئے قیام وسیر کے قابل تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس

درود ہند کے موقع پر آپ صرف لاہور و ملتان تک ہی تشریف لائے؟

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ)

مذکورۂ بالا دعویٰ کی تائید تاریخ فرشتہ سے نہین ہوتی، تاریخ فرشتہ مین جو کچھ ہی وہ یہ ہی:-

"دخود بغزنین آمد و شمس العارفین عبد الواحد را کہ پیر شیخ نظام الدین ابو المؤید است دریافتہ بلاہور آمد و از آنجا بدہلی تشریف آورد، چون اژدحام خاص و عام از حد گذشت و آن بزرگوار ازان متنفر بود، بہر آئینہ از آنجا نیز متوجہ بلدۂ اجمیر شد، دہم ماہ محرم سنہ ۵۶۱ھ احدی وستین خمسمأۃ سایہ وصول بر آن خطہ انداخت و سید السادات سید حسین المشہور بخنگ سوار کہ شیعہ مذہب بود و بصلاح و تقویٰ آراستہ در سلک اولیاء اللہ انتظام داشت و سلطان قطب الدین ایبک او را داروغۂ آن بلدہ ساختہ بود، قدوم شیخ را با عزاز و اکرام تلقی فرمود، چون از علم و تصوف و اصطلاحات صوفیہ بہرۂ تمام داشت، صحبت خواجہ را نعمت شگرف دانستہ اکثر اوقات بمجلس شریف حاضر می شد و بسیارے از کفار اجمیر، ببرکت انفاس آن پیر طریقت بشرف ایمان مشرف گشتند و آنانکہ ایمان نیاوردند، محبت خواجہ را در دل جائے دادہ پیوستہ فتوح بے حد و حصر بحضرت او می فرستاد و خواجہ در عہد شمس الدین التمش دو مرتبہ جہت دیدن مرید خود قطب الدین بختیار کاکی، بدہلی تشریف برد" (جلد دوم ص ۳۷۷)

فرشتہ کے مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ غزنین سے لاہور، اور لاہور سے دہلی آئے، یہان لوگون کا ہجوم بڑھا، تو اس جگہ سے متنفر ہو کر اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور وہان بتاریخ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ پہنچے، پھر فرشتہ یکایک سید حسین مشہدی کا ذکر کرتا ہے، جن کو سلطان قطب الدین ایبک نے اجمیر کا داروغہ مقرر کیا تھا، سلطان قطب الدین ۶۰۲ھ مین تخت نشین ہوا، فرشتہ نے اکتالیس برس کے وقفہ کے حالات کو صرف ایک سطر مین قلمبند کر دیا ہے، لیکن مذکورۂ بالا اقتباس سے

معین الارواح کے فاضل مؤلف کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو لاہور اور ملتان تک آکر پھر مراجعت فرمائی، فرشتہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے اجمیر میں آکر قیام پذیر ہوگئے،

حضرت خواجہ کے دوسری بار ورود ہند کے سلسلہ میں فاضل مؤلف رقمطراز ہیں،

"جب دلیل العارفین آپ کے ورود ہند کے وقت اجمیر ہندوؤں کی ملکیت تھی، اور جب سالکان لکین وتاریخ فرشتہ وغیرہ اجمیر میں پرتھوی راج کی حکومت تھی، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج پر آخری بار حملہ کرکے اجمیر فتح کیا اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کیا چونکہ یہ واقعہ بالاتفاق ۵۸۸ھ میں ہوا اس لئے آپ کا دوسری بار ورود ہند ۵۸۸ھ میں ثابت ہے"

حضرت خواجہ ۵۶۱ھ یا ۵۸۸ھ میں اجمیر آئے، تو دونوں سنہ میں اجمیر ہندوؤں ہی کی ملکیت تھی لیکن اجمیر کا ہندوؤں کی ملکیت ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ حضرت خواجہ دوسری بار ہندوستان آئے،

"ورود ہند بار سوئم" کے بارہ میں فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہیں،

"صاحب سیر العارفین کا بیان ہے کہ جب معز الدین سام غزنی جاتے ہوئے (۶۰۲ھ) میں واصل بحق ہوا اس زمانہ میں آپ وارد لاہور ہوئے"

فاضل مؤلف نے اپنے معروضہ میں لکھا ہے کہ ان کو سیر العارفین دستیاب نہیں ہو سکی، (ص، ۵) اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا بیان سیر العارفین کے دیکھے بغیر قلمبند کیا گیا ہے، عاجز راقم کے پیش نظر اس وقت سیر العارفین کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۰۱ء میں شمس المطابع سے چھپ کر شائع ہوا ہے اس میں حضرت خواجہ کے اجمیر شریف میں نزول اجلال کا ذکر ان الفاظ میں ہے :-

"بعدہ خواجہ صاحب شہر غزنی کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ عبدالواحد غزنوی پیر شیخ

نظام الدین ابوالمؤید کے ہیں وہ اس جگہ موجود تھے، اُن سے ملاقات کی، پھر وہاں سے روانہ ہوکر لاہور میں آئے، اس ایام میں پیر علی ہجویری قدس سرہٗ......کا انتقال ہوچکا تھا لیکن شیخ حسین زنجانی کہ پیر شیخ سعدالدین حمویہ قدس سرہٗ کے ہیں، زندہ تھے، اُن سے اور خواجہ صاحب سے دوستی اور محبت ہوگئی، کچھ دنوں تک وہاں قیام فرماکر پھر وہاں سے متوجہ دارالخلافہ دہلی کے ہوئے، جب اس مقام مبارک پر پہنچے، چند عرصہ تک وہاں قیام فرمایا، وثاق متبرکہ جناب خواجہ صاحب کا اس مقام پر پہنچا جہاں کہ قبر شیخ رشید مکی کی ہے، اور آج تک اس زمانہ کی نشانیوں میں سے اُن کی مسجد کی محراب اب تک قائم ہے، غرضکہ دہلی میں ہجوم خاص وعام اہلِ اسلام کا خواجہ صاحب کے گرد بہت ہوا، تب آپ نے طرف دارالخیر اجمیر کے سفر کیا اگرچہ اس زمانہ میں اجمیر شریف میں اہلِ اسلام کی رونق شروع ہوگئی تھی، لیکن غلبہ کفار نابکار کا آس پاس اجمیر شریف کے بہت تھا، اس زمانہ کے خلیفہ وقت سلطان قطب الدین ایبک نے سیادت پناہ میر سید حسین مشہدی کو اجمیر شریف میں داروغگی کی خدمت پر ممتاز فرمایا تھا، (حصہ اول ص ۱۲)

سیر العارفین کے مندرجہ بالا اقتباس سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت خواجہ اس وقت لاہور وارد ہوئے جب معزالدین سام غزنی جاتے ہوئے (۱۱۸۶ء) میں داخل بھی ہوا،

ورود ہند بار چہارم کے بارہ میں فاضل مؤلف ارقام فرماتے ہیں،

حسب خزینۃ الاصفیا بموجب ارشاد حضرت قطب صاحب جب آپ خراسان سے ہندوستان وارد ہوئے، اس وقت قباچہ بیگ اور کفار مغلوں کے درمیان جنگ شعلہ زن تھی، اور قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استعانت باطنی سے قباچہ بیگ نے فتح پائی، چونکہ حسب منتخب التواریخ یہ جنگ قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد قباچہ بیگ اور کفار مغلوں سے ۶۱۱ھ میں ہوئی

لہذا غریب نواز کا چوتھی بار وارد ہندوستان ہونے کا سال بھی یہی ہے"،

مذکورۂ بالا بیان خزینۃ الاصفیار کی حسب ذیل روایت سے مرتب کیا گیا ہی جو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ذکر میں درج ہے،

"نقل است کہ وقتیکہ خواجہ معین الحق والدین از خراسان وارد ہندوستان شد، خواجہ قطب الدین بختیار و شیخ جلال الدین تبریزی باتفاق ہم دیگر باشتیاق ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی در ملتان تشریف بردند، روزے ہر سہ بزرگوار در یک مجلس تشریف می داشتند کہ قباچہ بیگ حاکم ملتان بخدمت حاضر آمدہ عرض کرد کہ لشکر کفار مغل برائے تسخیر ملتان آمدہ اند، و لشکر بے شمار دارند، و مرا طاقت مقابلہ و مجادلہ بایشان نیست برائے خدا امداد فرمائید، اتفاقاً خواجہ قطب الدین دران وقت تیرے بدست خود داشت حوالہ حاکم ملتان کرد و فرمود کہ این تیر بوقت شب در لشکر دشمن بیندازد و فارغ بنشیند، قباچہ ہمچنان بعمل آورد در لشکر دشمن متنفسے نماند کہ زخم سر با و نرسیدہ باشد، و ہمہ کفار بفرار نہادند،" (ج ۱ ص ۲۶۸)

خزینۃ الاصفیا کی مندرجۂ بالا روایت غالباً سیر الاقطاب (ص ۱۴۹) سے لی گئی ہے، سیر الاقطاب کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بختیار کاکی اپنے مرشد کے ساتھ ہندوستان نہیں آئے، انھوں نے یہ خبر سُنی کہ حضرت خواجہ خراسان سے ہندوستان جا رہے ہیں، تو مرشد کے شوق ملاقات میں وہ بھی ہندوستان روانہ ہوگئے، ملتان پہونچے اور وہاں سے دہلی آئے اور دہلی سے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی لیکن اُن کو حکم ملا کہ وہ وہیں قیام کریں لیکن دلیل العارفین (مجموعۂ ملفوظات حضرت خواجہ معین الدینؒ) کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ قطب الدین ہندوستان اور پھر اجمیر اپنے مرشد کی معیت میں آئے، دلیل العارفین کی مجلس یازدہم میں ہے،

"چو خواجہ درین خواہد رسید چشم پرآب کرد، فرمود مسافری شدم، جائیکہ مدفن ما خواہد بود

یعنی در اجمیر می رویم ہر کسے را وداع کردہ دعاگو بر در راہ بودیم، بعد ازان در اجمیر رسیدیم وآن ممکن روز اجمیر رسیدیم وآن روز اجمیر از ان ہند وآن معمورہ وآباد و مسلمانی چنان نبود، چون قدم مبارک خواجہ انجا رسید، چندان اسلام ظاہر شد، کہ ان را حد نبود" (ص ۵۵-۵۴)

اب سمجھ مین نہین آتا کہ دلیل العارفین کی روایت کیا سیر الاقطاب اور خزینۃ الاصفیاء کے بیانات کو قابلِ قبول سمجھا جائے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذکر مین خزینۃ الاصفیاء کا ایک بہت ہی واضح بیان ہی جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہو کہ حضرت خواجہ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ مین اجمیر وارد ہوئے، اور وہین مستقل قیام فرما کر رشد و ہدایت اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا، وہ بیان ملاحظہ ہو،

"من بعد حضرت خواجہ از بلخ بغزنین آمد و بعد حصول صحبت شمس العارفین کہ ذکر آن سابق مذکور شد فائز لاہور شد تا دو ماہ مزار پر انوار مخدوم علی علوی ہجویری لاہوری قدس سرہٗ معتکف ماند بعد حصول فوائد باطنی از لاہور روانہ دہلی گشت و چندے در دہلی قیام پذیر ماندہ بتاریخ دہم ماہ محرم سال پانصد و شصت و یک رونق افزائے دار الخیر اجمیر گشت و در آنجا اول شخصی کہ بتشرفِ ارادت آنحضرتؒ مشرف شد میر سید حسین خنگ سوار بود کہ اول ازان مذہب شیعہ داشت و بعد ازان تائب شدہ مرید گشت و بمراتب اعلیٰ رسید، و من بعد ہزار در ہزار از صغار و کبار بجذبۂ محبت آن محبوب کردگار حاضر شدہ، مشرف بشرف اسلام و ارادت آنحضرت شدند بحدیکہ چراغ اسلام در ہندوستان بطفیل این خاندان عالی شان روشن گشت" (ج ۱ ص ۲۵۹)

عاجز راقم کے ان معروضات سے معین الارواح کے لائق مؤلف کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ انھون نے حضرت خواجہ کے چار بار ہندوستان آنے کے سلسلہ مین جو دلائل پیش کئے ہین وہ صحیح نہین ہین،

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

ہزار سال پہلے از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی تقطیع اوسط ضخامت ۸۸ ۲صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ ر پتہ :- انجمن ثمرۃ التربیۃ دار العلوم دیوبند،

مسلمانوں کے دورِ عروج میں اُن کو علمی تلاش و تحقیق اور نئے نئے اکتشافات اور اس کے لئے سیر و سیاحت کا شوق اتنا غالب تھا کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب سفر میں بڑی دشواریاں تھیں، زمین کا چپہ چپہ چھان مارا، اور اس زمانہ کی معلوم دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا، جہاں اُن کے قدم نہ پہنچے ہوں، یورپ کے برف پوش پہاڑ، افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا، اور ایشیا کے مرغزار یکساں اُن کی جولانگاہ تھے، ان میں سے بہت سے اہلِ علم و قلم سیاحوں نے اپنے سفر کے مشاہدات و نتائج کتابی شکل میں قلمبند کئے، ان میں سلیمان تاجر، بزرگ بن شہریار، ابن بطوطہ، ناصر خسرو کے سفرنامے، ابو جعفر خوارزمی، ابن رستہ، ابن خردادبہ، ابن الفقیہ ہمدانی، ابن حوقل اصطخری، بشاری مقدسی، اور ادریسی وغیرہ کے جغرافیے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، جو اس زمانہ کے جغرافی اور تمدنی حالات کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں، فاضل مصنف نے جن کا ہمہ گیر ذوق نئے نئے رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے، قدیم سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں کی مدد سے آج سے ہزار سال پہلے کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو غالباً رسالہ دار العلوم میں شائع ہوا تھا، اسی کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس میں ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے بعض علاقوں کے مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور علمی حالات اور دوسرے عجائب و نوادر کی جھلک دکھائی گئی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی لیکن غالباً

مضامین کی تحریر کے وقت کتاب کی شکل میں اُن کی اشاعت کا خیال نہیں تھا، اس لئے اس موضوع سے متعلق معلومات کا پورا استقصار اور مضامین میں ترتیب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو دوران مطالعہ میں جو معلومات حاصل ہوتے گئے، ان کو قلم برداشتہ لکھتے گئے، اور ناشرین نے اسی طرح انکو شائع کر دیا، ورنہ مصنف جیسے وسیع النظر کے قلم سے یہ کتاب اس سے زیادہ جامع اور مرتب شکل میں ہوتی لیکن موجودہ شکل میں بھی وہ بہت مفید اور دلچسپ ہے،

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں | مرتبہ جناب اصغر علی صاحب عابدی تقطیع اوسط ضخامت ۲۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد سے پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن،

کمیونسٹ، اشتراکی نظام کو دنیا کے سارے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل، حریت و آزادی، عالمگیر انسانی و معاشی مساوات کا سب سے بڑا علمبردار اور مادی پہلو سے انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، ممکن ہے کارل مارکس، انجلس اور لینن کی متخیلہ اشتراکیت میں یہ خوبیاں رہی ہوں، لیکن سوویٹ حکومت میں جو اشتراکیت عملاً قائم ہے، اس میں سرمایہ داری نظام سے بھی زیادہ خرابیاں ہیں، جس کا اعتراف بہت سے کمیونسٹو تک کو ہے، اور اس کے متعلق انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں، مرتب نے اُن کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، ان میں دلائل و شواہد سے دکھایا گیا ہے کہ موجودہ روسی اشتراکی نظام سیاست و معاشیات اور اخلاق و معاشرت ہر پہلو سے بدترین استبدادی نظام ہے، اس میں کسی قسم کی مساوات کا وجود نہیں بلکہ شخصی آزادی تک مفقود ہے، اور وہ ساری اخلاقی قدریں ختم کر دی گئی ہیں جن کو دنیا اب تک مانتی چلی آتی ہے، اور خود اس کے نظام اخلاق کی بنیاد تمامتر جبر و استبداد، مکر و فریب اور حیوانیت پر ہے، اس کتاب سے روس کی اشتراکیت کی پوری قلعی کھل جاتی ہے، اور وہ خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے مطالعہ کے لائق ہے، جو اشتراکیت کے سراب کو چشمۂ حیوان سمجھتے ہیں،

کلیل بین غلیل از جناب ناطق گلاوٹھوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ:۔ کوثر بک ڈپو مسکر بنگلور۔

عرصہ ہوا رسالہ خیام لاہور میں یہ بحث چھڑی تھی کہ حالی کے اس شعر

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں بس اتباع مصحفی و میر کر چکے

میں پیروی مغربی سے کیا مراد تھی یورپ کے خیالات کی تقلید یا مغربی شاعر کی، اس بارہ میں ادیبوں اور سخن سنجوں کی رائیں مختلف تھیں، جناب ناطق کے نزدیک یورپ کے خیالات کی تقلید مراد تھی، اور اس صورت میں مغربی کی "ی" کو مولانا حالی کی غلطی پر محمول کرنا ناگزیر تھا، لیکن اس سلسلہ میں انھوں نے اُن کی شاعرانہ حیثیت اور شاعری پر بھی تنقید کر ڈالی ہے اور مسدس کی مخالفت کے زمانہ کی یہ روایت بھی نقل کر دی کہ وہ مولانا آسی کی تصنیف ہے، اس پر اعتراضات ہوئے، اس کے جواب میں انھوں نے جو خط اڈیٹر خیام کے نام لکھا تھا، اس کو کلیل بین غلیل کے فصیح نام سے شائع کیا ہے، اس میں حالی اور دور جدید کے دوسرے شعرا، ادیبوں اور نقادوں کی نااہلیت، پارٹی بندی، رشک و رقابت، پروپیگنڈے اور اس قبیل کے دوسرے مسائل پر جو مذکورۂ بالا امور سے متعلق ہو سکتے ہیں، اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں، اور اس لپیٹ میں بعض پرانے اساتذہ تک آ گئے ہیں، شعر و ادب میں مصنف کے صاحب نظر ہونے میں کلام نہیں، انھوں نے موجودہ زمانہ کے معیار علم و شاعری کے متعلق بہت سی باتیں صحیح لکھی ہیں، اگر وہ سنجیدگی سے ان مسائل پر بحث کرتے، تو اُن کی یہ تحریر وقیع اور غور و توجہ کی مستحق ہوتی، لیکن غیر سنجیدہ اور حریفانہ انداز تحریر، دوسروں کی تنقیص کے ساتھ خود اپنے قلم سے اپنے کمالات کے اظہار کی بنا پر یہ کتاب بھی پارٹی بندی اور پروپیگنڈے کے دائرے میں آ گئی ہے، مصنف نے ایک دلچسپ روایت یہ بھی نقل کی ہے، کہ مسدس حالی کی تصنیف میں سرسید کی محنت اور کاوش کو زیادہ دخل تھا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسدس اُن کی تصنیف ہے، یا کم از کم اس پر اُن کی اتنی اصلاح ہے کہ گویا ان کی

تصنیف سمجھنا چاہئے، جن لوگون کو سرسید اور حالی سے واقفیت ہے، وہ اس قسم کا تصور بھی نہین لا سکتے، سرسید کو شعر و شاعری سے کیا علاقہ، اور اگر یہ مراد ہے کہ مسدس کے خیالات سرسید کے ہین، تو یہ بھی صحیح نہین، مولانا حالی مسلمانون کے مد و جزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ سے سرسید سے کم واقف اور ان کی زبون حالی سے ان سے کم متاثر نہین تھے کہ مسدس کے خیالات کو سرسید کا القا سمجھا جائے، یہ اور بات ہے کہ مسدس سرسید کی تحریک سے لکھی گئی ہو یا اسکی تصنیف کے دوران مین مولانا حالی سرسید سے بھی صلاح و مشورہ کرتے رہے ہون، لیکن اس سے مسدس کو سرسید کی جانب منسوب نہین کیا جا سکتا، اس قسم کا علمی افادہ و استفادہ اہل علم مین عام ہے، بہرحال یہ کتاب لطف و دلچسپی سے خالی نہین ہے، نام کی جدت و فصاحت خصوصیت کیساتھ حسن ذوق کا نمونہ ہے،

جمہوریۂ ہند کے دستور اساسی کا خاکہ — از جناب محمد ہاشم صاحب قدوائی ایم اے لکچرار شعبہ پولیٹیکل سائنس مسلم یونیورسٹی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ :- ایجوکیشنل ہاؤس سول لائن شمشاد بلڈنگ علی گڈہ،

جمہوریہ ہند کے دستور کا متن خاصہ ضخیم ہے، اور غالباً ابھی اردو مین اس کا ترجمہ نہین ہوا ہے، لائق مرتب نے اردو مین اس کا خلاصہ لکھا ہے، اس مین دستور کی مختصر تاریخ اس کی خصوصیات، شہریت، اس کے حقوق و فرائض، ملکی پالیسی کے اصول، ہندیونین کے اجزاء اور اس کا نظام، مرکزی حکومت، پارلیمنٹ، ریاستون، ریاستی مجالس قانون ساز، عدلیہ، ہائیکورٹ، ماتحت عدالتون، پبلک سروس کمیشن وغیرہ سے متعلق دستور کے تمام آئین و قوانین کا پورا خاکہ آگیا ہے، زبان صاف اور سلیس ہے یہ کتاب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن عام اردو خوانون کے مطالعہ کے لائق بھی ہے،

حبیبؐ خدا، چاند ستارے اور مہاجرینؓ و انصار، از جناب الیاس احمد صاحب مجیبی

تقطیع اوسط، ضخامت علی الترتیب ۱۹۲، ۱۶۰، ۱۶۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عار

عہ، عہ، پتہ:- اردو گھر ۳ مارٹن روڈ کراچی،

بچکانی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے مجیبی صاحب کو خاص شہرت حاصل ہے، انھوں نے مسلمان بچوں کی اخلاقی تعلیم وتربیت کے لئے دار المصنفین کی کتابوں کی مدد سے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدین اور صحابۂ کرام کی سیرت پر متعدد مختصر اور مفید کتابیں لکھی ہیں، جو بہت مقبول ہوئیں مذکورۂ بالا تینوں کتابیں اُن کے نئے اڈیشن ہیں، اس میں مصنف نے بہت سے مفید اور نئے اضافے کئے ہیں، جیسا کہ ان کتابوں کے نام سے ظاہر ہے، پہلی کتاب سیرت نبوی پر ہے، دوسری خلفاے راشدین اور تیسری اکابر مہاجر وانصار صحابہ کے حالات ہیں، ان میں ان بزرگوں کے سوانح کے ساتھ اُن کی زندگی کے اخلاقی پہلوؤں اور اُسوۂ حسنہ کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے، زبان بہت صاف، سادہ اور آسان اور انداز بیان بچوں کے ذوق کے مطابق، یہ پورا سلسلہ مسلمان بچوں کے پڑھانے کے لائق ہے،

زندگی کے سایے، مترجم بلال احمد مرحوم تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و

وطباعت بہتر قیمت مجلد عار پتہ:- لاجپت راے اینڈ سنز اردو بازار دہلی،

امریکہ کی مشہور افسانہ وناول نگار خاتون پرل بک کو چین سے بڑی دلچسپی ہے، وہ وہاں رہ بھی چکی ہیں، اور چینی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے بہت سے افسانے لکھے ہیں، زندگی کے سایے اُن کے سات افسانوں کا ترجمہ ہے، ایک افسانہ اطالوی افسانہ نگار اگنیزیو سلونے کا ہے، یہ سب افسانے دلچسپ اور خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کے پڑھنے کے لائق ہیں، جن کو چین میں امریکہ کی سیاست سے دلچسپی ہو، کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم مترجم نے کل ۱۹ سال کی عمر پائی جس میں عموماً قلم پکڑنا بھی نہیں آتا، ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے، تو ادبی صف میں نمایاں جگہ حاصل کرتے لیکن موت نے اس کا موقع نہیں دیا،

"م"

جلد ۶۶ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۴۲ - ۲۴۴

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت	مولانا عبد السلام ندوی	۲۴۵ - ۲۶۲
اجتماعیات کا قرآنی تصور	جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی	۲۶۳ - ۲۸۰
مولانا عبد الملک نبیانی	ڈاکٹر سید باقر علی صاحب ترمذی استاذ شعبہ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی،	۲۸۱ - ۲۸۸
تاریخ یمن کا ایک ورق	جناب مولانا ابو الجلال ندوی	۲۸۹ - ۲۹۸

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۲۹۹ - ۳۰۳

ادبیات

فطرت اور مرد مومن	جناب شہزور کاشمیری	۳۰۴ -
غزل	جناب سید شاہ ولی الرحمن صاحب ڈپٹی کلکٹر اڑ	۳۰۵

باب التقریظ والانتقاد

"معین الارواح"	سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم۔ اے علیگ	۳۰۶ - ۳۱۵
مطبوعات جدیدہ	"م"	۳۱۶ - ۳۲۰

شذرات

کانگریس کی صدارت مین ٹنڈن جی کی کامیابی کو فرقہ پرستون نے اپنی فتح سمجھا اور بڑی خوشیان منائین کہ اب کانگریس پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا، قوم پرستون کو تشویش پیدا ہوئی کہ دیکھین فرقہ وارانہ مسائل مین کانگریس کی پالیسی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے، لیکن ہندوستان کی فلاح کا صرف ایک راستہ ہے، سیکولر حکومت، تمام فرقون کے حقوق مین قانونی اور عملی یکسانیت، قومی اتحاد و یکجہتی، اور پاکستان و ہندوستان کے تعلقات مین خوشگواری، اسکے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائیگا وہ ملک کو ہلاکت اور بربادی کیطرف لیجائیگا، اسلیے اگر ٹنڈن جی ملک کے سچے بہی خواہ ہین تو انکو بھی اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑے گا۔

کانگریس کی صدارت کے بعد اگرچہ انکا اب وہ لہجہ بدل چلا ہے اور ادھر انھون نے جو تقریرین کی ہین ان مین وہ محض فرقہ پرست، مسلم آزار اور پراچین بھارت کے نمایندے نہین معلوم ہوتے، بلکہ انکی زبان سے غیر مذہبی حکومت، مختلف فرقون کے حقوق مین مساوات، مسلمانون کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد کے الفاظ بھی نکلنے لگے ہین، بلکہ بعض تقریرون مین تو اپنے محبوب مشن کلچر کے متعلق یہانتک کہا ہے کہ ہندوستانی کلچر ہندو مسلمانون نے مل کر بنایا ہے، اور انکا اور انکے وطن الہ آباد کے مسلمانون کا کلچر ایک ہے، اگر وہ بھی اسکو مانتے ہین تو پھر انکے اور مسلمانون کے نقطۂ نظر مین کوئی اختلاف نہین رہ جاتا، مسلمان بھی یہی کہتے ہین کہ ہندوستانی کلچر وہی ہے جو ہندو مسلمانون کے میل جول سے بنا ہے، اور جسمین دونون کے اثرات ہین اور اسی کو ہندوستان کا مشترک کلچر ہونا چاہیے، لیکن ٹنڈن جی کی زبان سے ہندو کلچر کا نعرہ بھی نکل جاتا ہے، اس نعرہ کیساتھ ہندو مسلم اتحاد کی اپیل بے معنی ہے، اگر وہ حقیقۃً اتحاد چاہتے ہین تو یہ نعرہ چھوڑ دینا چاہیے، اتحاد کے معنی ہندون مین ضم ہوجانے کے نہین ہین، اس کے بغیر بھی اتحاد ہوسکتا ہے اور ہوکر رہے گا، ٹنڈن جی کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ مسلمان ہندوستان ہی مین رہینگے، اور پورے اتحاد قومی کے ساتھ اپنا مستقل وجود بھی قائم رکھین گے،

ٹنڈن جی کو ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت کی قیادت سپرد کیگئی ہے، انھین اپنے کو اسکا اہل ثابت کرنا چاہیے اور اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتین چھوڑ دینی چاہئین، کانگریس تمام فرقون کی نمایندہ جماعت کہی جاتی ہے، اور مسلمان اب بھی ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہین، اسکے علاوہ صدارت کی کامیابی مین ٹنڈن جی کو مسلمانون کے ووٹون سے بھی مدد ملی ہے، اسلیے انکی نمایندگی بھی کرنا انکا قانونی اور اخلاقی فرض ہے، غلط نقطۂ نظر ہمیشہ نہین چل سکتا، یا اسکو صحیح کرنا ہوگا یا ملک کو تباہی کے حوالہ کرنا ہوگا، ٹنڈن جی کے محب وطن ہونے مین شبہ نہین، اسلیے کیا عجب ہے کہ صدارت کی ذمہ داری انکے خیالات کی تصحیح کرے، حق و صداقت مین بڑی طاقت ہے، اگر ہمت و جرأت سے مقابلہ کیا جائے تو باطل اسکو مغلوب نہین کرسکتا اور بالآخر فتح حق ہی کی ہوگی، ناسک کانگریس کے فیصلے اس کے شاہد ہین، ٹنڈن جی کو بھی ان فیصلون کی پابندی کا عملی ثبوت دینا چاہیے،

گائے اور زبان کے بارہ مین بھی ان کے خیالات مین اصلاح کی ضرورت ہے، ہندی کے حکومت کی زبان ہونے کے معنی یہ نہین ہین کہ اردو کو مٹا دیا جائے، اسکے بعد بھی ملکی زبان کی حیثیت سے اسکو زندہ رہنے کا حق ہے، اسلیے اگر ٹنڈن جی اردو دشمنی چھوڑ دین تو انکا کیا حرج ہے، گائے کی اقتصادی اہمیت سے انکار نہین، ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، یہان گائے کی نسل کو ترقی دینے کی ضرورت ہے، اسی بنا پر اسکو قدیم ہندوستان مین مذہبی تقدس کا درجہ دیا گیا تھا، لیکن اس اہمیت کو اسکی حد کے اندر رکھنا چاہیے، اسکو ملکی مفاد پر ترجیح نہ دینا چاہیے، ایک طرف ٹنڈن جی کی عقل پرستی کا یہ حال ہے کہ وہ اس ترقی کے دور مین الہامی اور مذہبی کتابون کی ہدایات ماننے کیلیے تیار نہین ہین، دوسری طرف انکی قدامت پرستی یہ ہے کہ گائے کے تقدس کو ٹھیس لگانا گوارا نہین اور اسکے لیے وہ ربڑ اور کریچ کے جوتے اور نواڑ کے بستر بند استعمال کرنا ترک کر دین اور قوم کا اقتصادی نقصان برداشت کرنے کیلیے آمادہ ہین، اپنی ذات کیلیے وہ اس سے بھی زیادہ سادگی اختیار کرسکتے ہین، اور چمڑے کے جوتے کے بجائے لکڑی کی کھڑاوین، رسی کے بستر بند اور کھاروے کے تھیلے استعمال کرین، لیکن ملکی بلکہ فوجی ضروریات کو تو وہ گائے کے لیے قربان نہین کرسکتے، کیا فوجی سپاہیون کو بھی وہ ربڑ اور کینوس کے جوتے پہنا کر، انکی کمر مین نواڑ کی پیٹیان باندھ کر میدان جنگ مین بھیجین گے، ان کے اسلحہ سوت کی ڈوری سے کسے اور کینوس کے تھیلون مین رکھے جائین گے، ان کے گھوڑون کی لگامین، رسی کی چار جامے نمدے کے اور ساز نواڑ کا ہوگا، یہ فوج کیا ہوگی عجوبہ روزگار ہوگی،

اس کے علاوہ چمڑا تو ضروریات زندگی مین ہے، اور اس زمانہ مین تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہو ہزارون لاکھون بوڑھے بیل اور ناکارہ گائین کہان جائین گی، ان کے چارہ کا کیا انتظام ہوگا، رہے مسلمان تو وہ خود ہی گاؤکشی چھوڑ چکے ہین اس لیے اب ٹنڈن جی کو ان کے بجائے ہندوون کو روکنا چاہیے، جو بوڑھی گائین قصابون کے ہاتھ خفیہ بیچدیتے ہین،

صوبۂ بمبئی اگرچہ اردو زبان کے مرکز یو، پی اور دہلی سے دور ہے، اور وہان کی صوبائی زبانین گجراتی اور مرہٹی ہین لیکن ہر زمانہ مین وہان اردو زبان و ادب کا چرچا اور شعر و شاعری کا مذاق رہا ہے اردو کے بہت سے اخبارات و رسالے نکلتے ہین، اردو کی خدمت کے لیے متعدد ادبی ادارے قائم ہین، ان مین مشہور انجمن اسلام کی خدمات خصوصیت کے ساتھ اہم ہین، اسی سلسلہ مین ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب مرحوم پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی نے ۱۹۴۸ء مین اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اس کا مقصد گجرات کے قدیم اردو ادب کی تحقیقات، وہان کے کتب خانون مین اس کے قلمی نوادر کی تلاش اور ان کی فہرست کی ترتیب، اردو کے ریسرچ اسکالرون کی علمی اعانت ہے، یہ ادارہ وقتاً فوقتاً اردو کے فضلاء سے مقالات بھی پڑھاتا رہتا ہے، اسکے لائق کارکنون نے گذشتہ جنوری سے ایک سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کے نام سے جاری کیا ہے، اسکا مقصد تقریباً وہی ہے جو پرانی انجمن ترقی اردو کے رسالے کا تھا، اس وقت تک اس کے تین نمبر نکل چکے ہین، اور ہر نمبر اردو زبان و ادب سے متعلق مفید مضامین و معلومات پر مشتمل ہے، اسکے ترجمان ہمارے پرانے رفیق پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد ابراہیم صاحب ڈار ہین، امید ہے کہ ان دونون صاحب ذوق فضلاء کی نگرانی مین یہ رسالہ ترقی کریگا، اور یہ رسالہ اردو کے پاکستان منتقل ہوجانے سے جو کمی ہوگئی ہے وہ پوری ہوجائے گی۔

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبد السلام ندوی

"کلام مجید لفظی اور معنوی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، اس کے لفظی اور ظاہری اعجاز پر گذشتہ مہینہ مولانا سید بدر الدین صاحب علوی کا مفید مضمون شائع ہو چکا ہو لیکن ارباب بصیرت کی نگاہ مین اس کا اصلی اعجاز معنوی ہے جس نے دلون کی کایا پلٹ دی اس لئے اس مہینہ اعجاز القرآن کے اس پہلو پر مولانا عبد السلام صاحب ندوی کا فاضلانہ مقالہ شائع کیا جاتا ہے تاکہ دونون پہلو سامنے آجائین، "م"

اعجاز قرآنی کے ثابت کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہو کہ اعجاز قرآنی کی نوعیت کیا ہے؟ معجزہ چونکہ دلیلِ نبوت ہے اور دلیل کی قسمین اور اُن کے آثار و نتائج مختلف ہوتے ہین، اس لئے معجزہ کی بھی مختلف قسمین ہین،

بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین جن سے صرف مدلول علیہ کا علم ہو جاتا ہے لیکن اُن سے دل مین ترغیب و ترہیب یا دوسرے قسم کا اور کوئی جذبہ نہین پیدا ہوتا،

مثلاً اگر ایک شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر کچھ لوگ موجود ہین جن سے اُس کا کوئی تعلق نہین

تو اس سے اس مقام پر اُن لوگون کے موجود ہونے کا علم تو اس کو ہوجائے گا، لیکن اس کے دل مین اُن لوگون کے بغض و محبت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوگا، پیغمبرون کے عام مادی معجزے اسی قسم مین داخل ہین کہ اُن سے صرف اُن کی صداقت کا علم ہوتا ہے، اگرچہ اُن کی صداقت کے تسلیم کرلینے کے بعد اُن کے اوامر و نواہی اور وعدہ و وعید کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ اُن کے معجزات کا بالذات نہین، بلکہ بالواسطہ اثر ہے، خود ان معجزات مین ترغیب و ترہیب کا کوئی عنصر شامل نہین،

۲- اس کے بخلاف بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین، جو مدلول علیہ کے علم کے ساتھ ترغیب و ترہیب یا بغض و محبت کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہین، مثلاً اگر کسی شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دوست واحباب، اعزہ و اقارب اور اہل و عیال موجود ہین تو اس کو اس مقام پر صرف اُن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ اس کے دل مین اُن کی محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ بے اختیار ان سے ملنے کا مشتاق ہوگا،

اسی طرح اگر اس سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دشمن یا ڈاکو موجود ہین، جو تم کو مار ڈالینگے یا تمھارا مال لوٹ لینگے، تو اس کو صرف دشمنون اور ڈاکوؤن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے دل مین خوف کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ وہان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا،

قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے اور اس حیثیت سے اس کو تمام گذشتہ پیغمبرون کے معجزات پر فضیلت حاصل ہو کہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہی پر دلالت نہین کرتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے پیغمبرون کے پیرؤن کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اُن کی کیونکر مدد کی؟ اُن کو دشمنون سے کیونکر بچایا؟ دنیا مین کیونکر اُن کا بول بالا کیا؟ اور آخرت مین اُن کو کس طرح سرفراز کیا؟ اُس کے بخلاف جن لوگون نے پیغمبرون کی تکذیب کی، وہ کیونکر تباہ و برباد کئے گئے؟ اور دین و دنیا مین متوجب لعنت ہوئے؟ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا، کہ جن لوگون کے سامنے اس قسم

کا معجزہ پیش کیا جائے گا، اُن کے دل میں پیغمبر کی صداقت کے یقین کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کی طرف خود بخود مائل ہوں گے۔

علامہ ابن تیمیہ ان دونوں قسم کی دلیلوں کا فرق بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی دلیل کے متعلق لکھتے ہیں:-

وَهٰذِهِ الطَّرِيْقُ اَكْمَلُ وَاَبْلَغُ	مقصد کے حاصل کرنے کا یہ کامل ترین اور
فِيْ حُصُوْلِ الْمَقْصُوْدِ فَاِنَّهَا	موثر ترین طریقہ ہے، کیونکہ وہ پیغمبروں
تُفِيْدُ الْعِلْمَ بِصِدْقِهِمْ وَ	کی صداقت کے علم کے ساتھ اُن کی پیروی
الرَّغْبَةَ فِيْ اِتِّبَاعِهِمْ وَالرَّهْبَةَ	کی رغبت دلاتا ہے، اور ان کی مخالفت
مِنْ خِلَافِهِمْ،	سے ڈراتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے مجمعوں مثلاً عیدین میں سورۂ قاف اور سورۂ اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور جمعہ میں سورۂ قاف پڑھتے تھے، کیونکہ ان سورتوں میں توحید، اصول دین اور نبوت اور معاد کے اثبات کے ساتھ پیغمبروں کے پیروؤں اور اُن کے مخالفین کا حال بھی بیان کیا گیا ہے۔[1]

اس لئے قدرتی طور پر ان واقعات کا اثر پڑتا ہے، اور لوگوں کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ دوسری قسم کی یہ دلیل جس کی بہترین مثال قرآن مجید ہے پہلی دلیل کی طرح بالکل سادہ نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ترغیب و ترہیب کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں، اس لئے یہ دلیل جس قدر زیادہ موثر ہوگی، اُسی قدر اُس کی معجزانہ حیثیت زیادہ نمایاں ہوگی، اور قرآن مجید اس حیثیت

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۲۰۴، ۲۰۶،

سے حد اعجاز تک پہونچ گیا ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ خود کہتا ہے،

وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل
جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	کرتے، تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف
مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (الحشر-۳)	سے دب جاتا اور پھٹ جاتا،

اگرچہ قساوت قلبی کی وجہ سے کفار نے اس کے معجزانہ اثر کو قبول نہین کیا، تاہم ان کو یہ یقین تھا کہ یہ ایک موثر کلام ہے، اس لئے اس کے اثر کے روکنے کے لئے بعض سفیہانہ تدبیرین اختیار کین، مثلاً

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اور یہ کافر لوگ کہتے ہین کہ اس قرآن
لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّکُمْ	کو سنو ہی مت، اور اس کے بیچ مین غل
تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ-۴)	مچا دیا کرو، شاید تم ہی غالب رہو،

امام رازی اس آیت کی تفسیر مین لکھتے ہین کہ کفار کو یہ معلوم تھا کہ قرآن مجید لفظاً و معنی دونون حیثیتون سے کامل ہے، اور جو شخص اس کو سنے گا، وہ اس کے الفاظ کی جزالت سے واقف ہو جائیگا، اور اس کی عقل اس کے معانی کا احاطہ کرے گی، اور وہ یہ فیصلہ کر دے گی کہ یہ کلام حق ہے اور اسکا قبول کرنا ضروری ہے، اس لئے انھون نے لوگون کو اس کے سننے سے روکنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ آپس مین یہ کہنے لگے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب وہ پڑھا جائے تو شور وغل کرو، اشعار پڑھو اور دوسرے قسم کے خرافات بکو تاکہ قاری کی قرأت مین گڑبڑی پیدا ہو جائے، قریش باہم ایک دوسرے کو یہی سمجھاتے تھے، اور اس کا مقصد یہ تھا، کہ اس طریقہ سے لوگ قرآن کا مطلب نہ سمجھ سکین،

قرآن مجید کے اس معجزانہ اثر کے متعلق متعدد شہادتین موجود ہین، مثلاً کفار و مشرکین پر تو اس کا یہ اثر پڑتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیتون کو سُن کر اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے، اور ان کے دلون مین اسلام کے قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری باب الہجرۃ مین ہے کہ

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی، اور مقام برک الغماد تک پہنچ گئے، تو راستے مین ابن الدغنہ جو عرب کے ایک بڑے قبیلہ کا سردار تھا مل گیا، اور پوچھا کہ "کہان کا قصد ہے" انھون نے کہا کہ "مجھکو میری قوم نے گھر سے نکال دیا ہے، اب دنیا مین گھوم پھر کر اپنے خدا کی عبادت کرون گا" لیکن ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اخلاقی فضائل گن کر کہا کہ "تم جیسا شخص گھر بار سے نکالا نہین جا سکتا، مین تمھارا ضامن ہوتا ہون، واپس چلو اور اپنے شہر مین اپنے خدا کی عبادت کرو"

چنانچہ ابن الدغنہ نے سرداران قریش کو اس پر راضی کر لیا، اور انھون نے اس کی ضمانت کو اس شرط پر منظور کر لیا، کہ "وہ اپنے گھر ہی مین اپنے خدا کی عبادت کرین اور قرآن اور نماز پڑھین لیکن اس کا اعلان نہ کرین کیونکہ ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچے اسلام کی طرف مائل ہو جائینگے" اس شرط پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چند روز تک عمل کیا لیکن اس کے بعد اپنے گھر کے صحن مین انھون نے ایک مسجد بنائی، جس مین نماز پڑھتے تھے، اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، جس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ مشرکین کی عورتین اور اُن کے بچے اُن کے اوپر ٹوٹے پڑتے تھے، اور ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کفار گھبرا گئے، اور ابن الدغنہ کو بلا کر کہا کہ "ہم نے ابو بکر کو صرف اس شرط پر پناہ دی تھی کہ وہ اپنے گھر مین خدا کی عبادت کرین لیکن انھون نے اس حد سے آگے قدم بڑھایا ہے، اور اپنے گھر کے صحن مین ایک مسجد بنالی ہے، اور کھلم کھلا اس مین نماز ادا کرتے ہین، اور قرآن پڑھتے ہین، ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچے اسلام کی طرف نہ مائل ہو جائین اتم اُن کو منع کر دو، اگر وہ صرف اپنے گھر مین عبادت کرنے پر اکتفا کرنا چاہین تو کر سکتے ہین لیکن اگر وہ علانیہ عبادت کرنا چاہتے ہین تو تمھاری ضمانت کو منسوخ کر دین"، ابن الدغنہ نے اُن کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا، تو انھون نے اس کو نامنظور کر دیا، اور اُس کی ضمانت منسوخ کر دی،

لیکن باوجود اس شور و غل اور روک تھام کے قرآن مجید کے اثر کا کلیۃً ازالہ نہ ہو سکا، اور متعدد لوگ قرآن مجید کے اثر سے اسلام کی طرف مائل ہوئے، اور متعدد لوگوں نے اس کے اثر سے اسلام قبول کیا، مثلاً:-

حضرت عثمان بن مظعونؓ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اُتری،

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ، (نحل-۱۳)	خدا عدل و احسان اور قرابتداروں کے ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، اور بدکاری، بُرائی اور ظلم سے روکتا ہے، وہ اس لئے یہ نصیحتیں کرتا ہے کہ شاید تم لوگ اس کو قبول کرلو،

تو اس کے سننے کے ساتھ ہی ایمان اُن کے دل میں گھر کر گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اون کو محبوب ہوگئے،[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے، جب اس آیت تک پہنچے،

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْئٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَا یُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَھُمْ خَزَائِنُ رَبِّکَ اَمْ ھُمُ الْمُصَیْطِرُوْنَ، (طور-۲)	کیا یہ لوگ خود بخود پیدا ہوگئے؟ یا یہ لوگ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا آسمان اور زمین کو انہی لوگوں نے پیدا کیا ہے؟ سچ یہ ہے کہ اُن کے دل میں ایمان نہیں، کیا اُن کے پاس خدا کے خزانے ہیں؟ کیا یہ لوگ سربراہ کار ہیں

---

[1] مسند ابن حنبل جلد اص ۳۱۸،

اور حضرت جبیر بن مطعمؓ نے اُس کو سنا تو اُن کا دل اڑنے لگا، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہوگئے،[۵۱]

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ شاعر اور اپنی قوم کے سردار تھے، وہ مکہ مین آئے، اور سرداران قریش سے ملے، تو اُن لوگون نے کہا کہ تم شاعر اور اپنی قوم کے سردار ہو، اس لئے ہم کو خوف ہے کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے ملے، اسکی بعض باتین تم کو متاثر کردین، کیونکہ اوس کی باتین جادو کا اثر رکھتی ہین، اور وہ اُن کے ذریعہ سے باپ، بیٹے اور میان بی بی مین جدائی ڈال دیتا ہے، سرداران قریش نے بار بار اس پر اصرار کیا، تو انھون نے دل مین ٹھان لیا کہ مین مسجد مین داخل ہون گا، تو کان بند کرلونگا، چنانچہ انھون نے کان مین کپڑا ٹھونس لیا، اور مسجد کے اندر گئے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، وہ آپکے قریب کھڑے ہوگئے، اور بے ساختہ قرآن مجید کی بعض آیتین سن لین تو دل مین کہا کہ مین ہوشیار آدمی ہون، اور بُرے اور بھلے مین امتیاز کرسکتا ہون، مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتین ضرور سنون گا، اگر وہ اچھی ہین تو اُن کو قبول کرلون گا، ورنہ اُن سے احتراز کردون گا، اب کان سے کپڑا نکال کر پھینک دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن مجید سننے لگے، ان کا بیان ہے کہ مین نے کبھی اس سے بہتر کلام نہین سُنا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پلٹے تو وہ بھی ساتھ ہولئے، اور آپ کے گھر کے اندر گئے، اور قریش کی ممانعت کا پورا واقعہ سنا کر کہا باوجود اس ممانعت کے مین نے بے ساختہ آپ کی بات سُن لی اور مجھے یقین ہوگیا کہ وہ حق ہے، میرے سامنے اپنا دین اور اپنے اوامر و نواہی پیش کیجئے، آپ نے ان کو دعوتِ اسلام دی اور وہ مسلمان ہوگئے،[۵۲]

اسلام لانے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کے لئے نکلے لیکن مسجد مین آپ کی زبانِ مبارک سے چند آیتین سنین اور اُن سے متاثر ہوئے، پہلے تو اُن کے دل مین چند شکوک پیدا ہوئے، اور قریش کی طرح دل مین یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ شاعر ہین، کاہن ہین، لیکن جب آپ

---

۵۱ صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ طور مع فتح الباری ۵۲ استیعاب تذکرہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ

سورہ ختم کر چکے، تو یہ تمام شکوک دور ہوگئے، اور اسلام ان کے دل مین پوری طرح جاگزین ہوگیا،[1]

نجاشی کے دربار مین حضرت جعفرؓ نے جب سورہ کھیعص کی ابتدائی آیتین پڑھ کر سنائین تو وہ رو پڑا اور اس کی داڑھی تر ہوگئی، پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور توراۃ ایک ہی چراغ کے پرتو ہین،[2]

اشخاص سے الگ کفار کی جماعت کی جماعت قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہو کر اسلام لائی حبش مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا چرچا ہوا، تو بیس عیسائی آپ کی خدمت مین حاضر ہوئے آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور اُن کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا، تو اُن کی آنکھون سے آنسو جاری ہوگئے، اور اسی وقت اسلام قبول کرلیا،[3]

حضرت ابو عبیدہ بن حارث، حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسدؓ، حضرت ارقم بن ابی الارقمؓ اور حضرت عثمان بن مظعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتین پڑھ کر سنائین، تو اُن لوگون نے فوراً اسلام قبول کرلیا،[4] لیکن مسلمانون پر قرآن مجید کا اثر اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا تھا، خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

تقشعر منه جلود الذين يخشون	جس سے ان لوگون کے جو اپنے رب
ربهم ثم تلين جلودهم و	سے ڈرتے ہین، بدن کانپ اٹھتے ہین،
قلوبهم الى ذكر الله،	پھر اُن کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے
(زمر-۳)	ذکر کی طرف متوجہ ہوجاتے ہین،

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی دادی سے پوچھا کہ صحابۂ کرام جب قرآن مجید پڑھتے تھے تو اُن کا کیا حال ہوتا تھا؟ بولین وہی جس کو خدا نے اُن کا وصف قرار دیا ہے یعنی اُن کی آنکھین

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ا صلا [2] ایضاً جلد ا صفحہ ۲۰۳ [3] ابن ہشام مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۲۱۲،
[4] اسد الغابہ تذکرہ ابو سلمہ بن عبد الاسد،

اشکبار ہوجاتی تھیں، اور اُن کے بدن کانپ اٹھتے تھے۔

اس اثر پذیری کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن مجید نے صحابۂ کرام کے دلوں میں خوف و خشیت کا ایک مستقل جذبہ پیدا کردیا تھا، اس لئے وہ ہر وقت اس کے خوف سے کانپتے رہتے تھے، حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ عہد نبوت میں ہم لوگ اس خوف کے مارے عورتوں سے ہنسی خوشی کی باتیں نہیں کرتے تھے کہ مبادا اس بارے میں کوئی آیت نازل نہ ہو جائے،

صلح حدیبیہ میں حضرت عمرؓ نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا، جواب نہ ملا تو آگے نکل گئے اور دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں انکے بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہو جائے، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی دیوار کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو ذر غفاریؓ آگئے، تو آپ نے اُن کو دیکھ کر فرمایا ھُمُ الخاسرون یعنی وہ لوگ گھاٹے میں ہیں، وہ گھبرا گئے کہ میرے بارے میں کوئی آیت تو نازل نہیں ہوئی،

بالخصوص جن آیتوں میں کسی فعل پر عذاب کی دھمکی دی جاتی تھی، صحابۂ کرام اُن سے اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے، چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ — جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور اُن کو خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے ان کو سخت عذاب کی بشارت دو،

تو تمام صحابہ پر گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے، حضرت مالک بن ثعلبہؓ کا جو ایک دولتمند صحابی تھے، گذر ہوا، تو آیت کو سُن کر اُن پر غشی طاری ہوگئی، ہوش میں آئے، تو خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا یہ آیت اُن لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے، جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں، ارشاد ہوا، ہاں" بولے شام تک مالک کے پاس ایک درہم اور ایک دینار بھی نہ ہوگا، چنانچہ

شام تک انھوں نے اپنی کل دولت خیرات کر دی، قرآن مجید کا یہی اثر ہے جس کو خطابی نے قرآن مجید کی ایک وجہ اعجاز قرار دیا ہے، اور اس نکتہ آفرینی پر اُن کو ناز ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں قرآن مجید کے وجہ اعجاز کے متعلق ایک بات کہتا ہوں جس سے اور لوگوں نے غفلت برتی ہے، اور وہ اس کا وہ اثر ہے جو قلب و روح پر پڑتا ہے، کیونکہ قرآن کے علاوہ کوئی کلام خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں باوجود خوف و ہیبت پیدا کرنے کے دل میں لذت و حلاوت کی وہ کیفیت نہیں پیدا کرتا، جو قرآن مجید پیدا کرتا ہے[1] خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :-

"لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ"۔ اللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ[1]"۔

اس کے بخلاف اور انبیاء کے بعض معجزے تو بالکل بے اثر تھے مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہ معجزے :-

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا وَکُنَّا بِکُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ وَمِنَ الشَّیٰطِیْنِ مَنْ یَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَیَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِکَ وَکُنَّا لَهُمْ حٰفِظِیْنَ

(انبیاء - ۶)

اور ہم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا زور کی ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی، جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے، (مراد ملک شام سے) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں اور بعضے بعضے شیاطین ایسے تھے کہ سلیمان کے لئے (دریاؤں میں) غوطہ لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر دیں) اور وہ اور اور کام بھی اس کے علاوہ کیا کرتے تھے اور ہم اُن کے سنبھالنے والے تھے،

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۲۱

وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ
وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ
الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ یَّعْمَلُ بَیْنَ
یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ
مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ
وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ
اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا وَقَلِیْلٌ
مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ

(سباء - ۲)

اور ہم نے سلیمان (علیہ السّلام) کے لئے ہوا کو
مسخر کر دیا کہ اُس کی صبح کی منزل ایک
مہینہ بھر کی اور اس کی شام کی منزل ایک
مہینہ بھر کی ہوتی اور ہم نے اُن کے لئے
تانبے کا چشمہ بہا دیا، اور جنات میں بعضے
وہ تھے، جو اُن کے آگے کام کرتے تھے اُن
کے رب کے حکم سے اور ... وہ جنات اُن کیلئے
وہ چیزیں بناتے تھے جو اُن کو منظور ہوتا،
بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے
حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں
اے داؤد کے خاندان والو تم سب شکریہ
میں نیک کام کیا کرو، اور میرے بندوں
میں شکرگزار تھوڑے ہیں

وَالشَّیٰطِیْنَ کُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّ
اٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ

(ص - ۳)

اور جنات کو بھی اُن کا تابع کر دیا، یعنی تعمیر
بنانے والوں کو بھی اور غوطہ خوروں کو بھی
اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں
جکڑے رہتے تھے،

تابع اور متبوع دونوں کے قالب و روح میں کوئی مذہبی اور اخلاقی اثر نہیں پیدا کرتے، بلکہ سرے سے اُن کو منصب نبوت ہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جن و شیاطین کی یہ اطاعت پیغمبرانہ اطاعت نہ تھی، بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہانہ اقتدار کا نتیجہ تھی، اور وہ اُن سے اسی طرح کام لیتے تھے

جس طرح غزوات مین گرفتار ہونے کے بعد کافر قیدیون سے لیا جاتا ہے[۵۱]،

البتہ جن وشیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی جو اطاعت کرتے تھے، وہ اس اطاعت سے مختلف تھی، جو وہ کاہنون اور جادوگرون کی کرتے تھے، کیونکہ کاہنون اور جادوگرون کو جن وشیاطین ناجائز کامون مین مدد دیتے تھے،

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اُن سے جائز اور مُباح کام لیتے تھے، اس لئے یہ ایک دنیوی احسان تھا جس پر خدا کا شکر گذار ہونا چاہئے[۵۲]،

غرض معجزہ کی یہ وہ قسم ہے جو شرعاً نہ محمود ہے نہ مذموم، اس سے اگر کوئی جائز فائدہ حاصل ہوجاتا ہے، تو وہ ایک احسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے، ورنہ ایک فعل عبث اور تماشا بن جاتا ہے[۵۳]، مثلاً اگر کوئی شخص بلا ضرورت شہر کے اوپر سوار ہوتا ہے، یا پل کے موجود ہوتے ہوئے پانی کے اوپر چلتا ہے، تو یہ ایک فعل عبث اور محض تماشا ہے[۵۴]،

لیکن معجزہ کی ایک قسم اور ہے، جو اُس سے اعلیٰ واشرف ہے، اور وہ صاحب معجزہ اور اسکے پیروؤن کو نیکی اور پرہیزگاری پر آمادہ کرتی ہے،

معجزہ کی یہی قسم منصب نبوت سے براہ راست تعلق رکھتی ہے، اور قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے، جنات نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بھی اطاعت قبول کی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مطیع ہوئے تھے، لیکن دونون اطاعتون کے نتائج مختلف تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ اطاعت سے ان کو ذلت وخواری کے سوا کچھ نہین ملا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ اطاعت کا جو نتیجہ ہوا اس کو قرآن مجید نے خود انہی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے،

---

۵۱ کتاب النبوات لابن تیمیۃ، صفحہ ۲۱۱،

۵۲ کتاب المعجزات والکرامات لابن تیمیہ، صفحہ ۹، ۵۳ ایضاً صفحہ ۱۲، ۵۴ ایضاً صفحہ ۱۲،

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا،

(جن - ۱)

آپ کہئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے، کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سنا، پھر انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست بتلاتا ہے، تو ہم تو اس پر ایمان لے آئے، اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ، قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ، يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ،

(احقاف - ۴)

اور جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سنتے تھے، غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آپہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو، پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے، کہنے لگے کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے بھائیو! تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو عذاب دردناک سے محفوظ رکھے گا

ان دونون اطاعتون کا مقابلہ کرکے علامہ ابن تیمیہ کتاب النبوات مین ایک موقع پر لکھتے ہین، کہ جن وانس کے ساتھ ہمارے پیغمبر کا معاملہ حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کے معاملہ سے زیادہ مکمل ہے، کیونکہ یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت شاہانہ اقتدار کی وجہ سے کرتے تھے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پیغمبرانہ اطاعت تھی[1]، دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنون کو فرمانبردار بناکر اُن سے چند مُباح کام لیتے تھے، لیکن ہمارے پیغمبر اُن کو خدا پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے تھے، اس لئے آپ کی پیروی کرکے وہ سعادت مند ہوگئے تھے، اور پیغمبر کے لئے اور ان کے لئے زیادہ کامل ترین طریقہ ہے[2]، لیکن بہت سے معجزے ایسے بھی ہوتے ہین، جن کا اثر خود صاحب معجزہ پر بھی پڑتا ہے، اور دوسرون پر بھی وہ اثر ڈالتے ہین لیکن بااین ہمہ قرآن مجید کے روحانی اثر کے مقابلہ مین اُن کا درجہ بہت کم ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ خداوند تعالیٰ کے کلمات کی دو قسمین ہین

۱- ایک کلمات کونیہ جن مین تمام کائنات داخل ہے، انبیاء کے مادی معجزے ان ہی مین شامل ہین،

۲- دوسرے کلمات دینیہ جن مین قرآن، خدا کی شریعت اور اس کے اوامر و نواہی شامل ہین، اور بندہ کا کام یہ ہے کہ اس کا علم حاصل کرے، اور اس پر عامل ہو جس طرح کلمات کونیہ کے متعلق بندہ کا کام یہ ہے، کہ تکوینی امور کا علم حاصل کرے، اور اُن پر اثر ڈالے،

پہلی قسم کے معجزات سے تکوینی امور کا اور دوسری قسم کے معجزات سے شرعی امور کا علم حاصل ہوتا ہے، پہلی قسم کے معجزات مادیات پر اثر کرتے ہین، اور دوسری قسم کے معجزات شرعیات پر، اور جس طرح پہلی قسم کے معجزات کا خود صاحب معجزہ پر تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پانی پر چل سکتا ہے ہوا مین اُڑ سکتا ہے، آگ کے اندر گھس سکتا ہے، اور دوسرون پر وہ اُن کے ذریعہ سے یہ اثر

---

[1] کتاب النبوات ص ۲۱۲ [2] ایضاً ص ۱۰،

ڈال سکتا ہے کہ ان کو بیمار کرسکتا ہے، اُن کو تندرست بنا سکتا ہے، اُن کو مار ڈال سکتا ہے اور اُن کو محتاج اور دولت مند بنا سکتا ہے، اسی طرح دوسری قسم کے معجزات کا صاحب معجزہ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ خود خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور کتاب وسنت کا پابند ہو جاتا ہے، پھر دوسروں پر وہ یہ اثر ڈالتا ہے کہ اُن کو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، اور لوگ شرعی حیثیت سے اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں لیکن معجزات کا تعلق جہاں تک علم و قدرت سے ہے، اگر وہ موجود نہ ہوں، تو اس سے کسی مسلمان کو کوئی دینی نقصان نہیں پہنچتا، اگر ایک شخص کو غیبی امور کا علم حاصل نہ ہو، اور مادیات اس کے زیر اثر نہ ہوں، تو اس سے خدا کے نزدیک اس کا درجہ کم نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی شخص امور دینیہ کا پابند نہ ہو، تو اس سے اس میں ایک ایسا نقص پیدا ہو جائیگا جس سے یا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا یا ثواب سے محروم رہے گا، کیونکہ دین کا علم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم اور اس کی پابندی کا حکم دینا ایسی چیز ہے جس سے آدمی کو خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور وہ اُس کے ثواب کا مستحق ہوتا ہے، لیکن کائنات کا علم حاصل کرنا، اور اس پر اثر ڈالنا، تو اس سے یہ چیزیں اسی وقت حاصل ہوتی ہیں، جب وہ دین میں شامل ہوں، ورنہ کبھی کبھی اس سے آدمی گنہگار بھی ہو جاتا ہے؛[1]

معجزات پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُن سے پیغمبروں کا دعوائے نبوت ثابت نہیں ہوتا، مثلاً جو شخص دعوائے نبوت کرتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میں معاش و معاد کا سیدھا راستہ دکھاتا ہوں لیکن وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں، تو یہ دلیل گو کتنی ہی عجیب و غریب ہو، لیکن اس کو دعوی کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اس کا یہ دعوی تو صرف اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے، جب وہ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتائے اور

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۸، ۹،

لوگوں کو ان کا پابند بنائے، لیکن یہ اعتراض کلمات کونیہ یعنی مادی معجزات پر ہوتا ہے، کلمات دینیہ یعنی قرآن مجید پر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ نہایت تفصیل کے ساتھ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتاتا ہے اور لوگوں کو ان کا پابند بناتا ہے، اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی نبوت کے ساتھ نہایت گہرا ربط و تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہی آپ کا دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی؛

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہی خداوند تعالیٰ کی شریعت اور اس کے دینی کلمات ہیں، اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل بھی ہے، دعوت بھی ہے، اور معجزہ بھی ہے[1]،

بہرحال قرآن مجید ایک معجزۂ ناطق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت دیتا ہے وہ زبانِ قال ہے لیکن، اور انبیا کے مادی معجزے صرف زبان حال ہیں، زبان قال نہیں، وہ پانی کے اوپر چلنے ہوا میں اڑنے اور آگ میں گھسنے کی طاقت تو نہیں پیدا کرتا، لیکن نیک کاموں پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے، جو دین و دنیا دونوں میں مفید ہیں، مثلاً جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم لوگ جب تک اپنی محبوب ترین چیزوں
(آل عمران - ۱۰)	کو نہ صرف کروگے نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے،

تو حضرت ابو طلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا کہ "خدا ہمارا مال مانگتا ہے آپ گواہ رہئے کہ اریحا میں میری جو زمین ہے میں اس کے نام پر وقف کرتا ہوں"، زمانہ جاہلیت میں عرب کی عورتیں نہایت بے پروائی کے ساتھ ڈوپٹہ ڈالتی تھیں، اس لئے سینہ اور سر وغیرہ کھلا رہتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ	عورتوں کو چاہئے کہ اپنے ڈوپٹوں کو سینے پر ڈال لیں

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۱۰،

اس کا یہ اثر ہوا کہ عورتوں نے اپنے تہ بند اور متفرق کپڑوں کو پھاڑ کر ڈوپٹے بنائے اور اپنے آپ کو سیاہ چادروں سے اس طرح ڈھانپ لیا کہ حضرت عائشہؓ کے قول کے موافق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے سروں کے آشیانے بن گئے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو لوگ ناپ جوکھ مین سخت خیانت کرتے تھے، اس پر سورہ ویل للمطففین نازل ہوئی، اور لوگ دیانت سے کام لینے لگے،

اصحاب صفہ کی معاش کا بہت کچھ دارومدار انصار کی فیاضی پر تھا، یہ لوگ کھجور کے خوشے لاکر مسجد مین لٹکا دیتے تھے، اصحاب صفہ آتے تھے، اور چھڑی سے اُن کو ہلاتے تھے، جو کھجورین ٹپک پڑتی تھین اُن کو کھا لیتے تھے، لیکن انصار مین کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو سڑے گلے خوشے لاکر لٹکا دیتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

یا ایھا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون، (بقرہ)	مسلمانو! اپنی بہترین کمائی اور بہترین پیداوار سے صدقہ دو، بُرے مال کو خیرات نہ کرو،

اس کے بعد دفعۃً اس حالت مین انقلاب پیدا ہو گیا، اور تمام لوگ بہترین کھجورین لانے لگے،

اسلام کے فرائض و اعمال مین جہاد سب سے خطرناک کام ہے لیکن صحابۂ کرام کو قرآن مجید ہی کے اثر نے جہاد پر آمادہ کیا تھا، اور اسی اثر کی بدولت وہ سخت سے سخت جنگی خطرات مین ثابت قدم رہتے تھے، ایک بار قسطنطنیہ مین رومیون سے مسلمانون کا مقابلہ ہوا، رومی بالکل قسطنطنیہ کی دیوار کے متصل صف زن تھے، ایک مسلمان نے جرأت کر کے حملہ شروع کیا، تو لوگ پکارے "ہان ہان اپنی جان کو ہلاکت مین ڈالتے ہو" حضرت ابو ایوب انصاریؓ ساتھ تھے، بولے "یہ آیت تو ہم انصار کے بارے مین نازل ہوئی ہے، جب اسلام نے قوت حاصل کر لی تو ہم لوگ اپنی معاش کے کام

دھندے مین مشغول ہوگئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَانفقوا فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَلَا تُلقُوا بِایدِیکُم اِلَی التَّھلُکۃِ (بقرہ - ۲۴) — اور خدا کی راہ مین خرچ کرو اور اپنی جانون کو ہلاکت مین نہ ڈالو،

اس لئے اصلی ہلاکت یہ ہے کہ ہم معاش کے کاروبار مین مشغول ہوجائین، اور جہاد کو چھوڑ دین، راوی کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، حضرت ابو ایوب انصاری ہمیشہ مصروف جہاد رہے، یہان تک کہ قسطنطنیہ مین وفات پاکر مدفون ہوئے، جنگ یمامہ مین جب حضرت سالم کو علم عطا کیا گیا، تو ایک شخص نے کہا کہ ہم کو آپ کی جان کا خوف ہے، اس لئے جھنڈا دوسرے کے ہاتھ مین دینا چاہتے ہین، بولے تو مین اس حالت مین قرآن مجید کا بدترین حامل ہونگا، چنانچہ انھون نے علم کو داہنے ہاتھ مین لیا، جب وہ کٹ گیا، تو بائین ہاتھ مین لیا، وہ بھی کٹ گیا، تو علم کو سینے سے چمٹا لیا، اور یہ آیت پڑھنے لگے،

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُول ... وَکَاَیِّن مِّن نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَہٗ رِبِّیُّونَ کَثِیرٌ، (آل عمران - ۱۵) — محمد صرف ایک پیغمبر ہین .... اور بہت سے پیغمبر گذرے ہین جن کے ساتھ ہو کر بہت سے علماء نے جنگ کی ہے،

(باقی)

رحمت عالم

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت. ضخامت ...۲ صفحے،

قیمت مجلد عا، غیر مجلد ۱۲؍

منیجر

اجتماعیت کا قرآنی تصوّر

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی

کائناتِ ہستی فطرت کی عجوبہ زاییون اور جدت طرازیون کی آماجگاہ ہے اور اس جہانِ رنگ و بو کی ہر چیز کچھ اس طرح کی حسین و پرکشش واقع ہوئی ہے کہ اس مین نظر حقیقت شناس کو زندگی کی لطیف تر حقیقتین اُبھری اور نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حسن جلوہ طراز اور ایک ہی نور جہان تاب ہے جو پوری کائنات کو اپنے جلو مین لئے ہوئے ہے، صحن گلشن کا حسین منظر ہو، یا لق و دق صحرا کی تاحدِ نظر وسعت، شہری زندگی کی ہنگامہ پرور اور رنگین محفلین ہون، یا دشت وحشت خیز کی خاموش، اور پرسکون خلوتین، صبح حیات کی مسکراہٹین ہون، یا شامِ زندگی کی دلفریبیان، آبشارون کا سمع نواز ترنم ہو یا رعد و برق کی خوفناک کڑک، بزمِ طرب شادی کے نغمہ ہائے مسرت ہون، یا مجلس تعزیت کی دلفگار آہین، یہ سب کچھ دل خوذ آگاہ و حقیقت شناس کی نظر مین ایک ہی سلسلۂ وجود کی مختلف کڑیان ہین، ایک ہی نور مطلق پر اُن کی انتہا ہوتی ہے،

وفی الارض آیات للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون،
(الذاریات)

زمین اور خود تمھارے وجود مین اہلِ یقین ایمان کے لئے نشانیان ہین، کیا تم دیکھتے نہین ہو؟

انّ فی ذٰلک لذکریٰ لمن کان لہ

بلاشبہ اس مین نصیحت و عبرت ہے اس کیلئے

قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ جو اپنے پہلو میں حساس دل رکھتا ہے،
(ق) یا پوری طرح متوجہ ہو کر کان … لگاتا ہے

ارض وسما کی یہ کائنات جو روزمرہ ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے، اس کی ہر چیز بظاہر منفرد اور تنہا وجود رکھتی ہے اور اپنے کام اور وظائف طبعی کے لحاظ سے دوسری اشیائے عالم سے بالکل الگ تھلگ محسوس ہوتی ہے مگر پردۂ مجاز کو سامنے سے ہٹا کر حقیقت پر نگاہ ڈالئے تو چشم بینا ایک وسیع تر اور آفاق گیر نظام کائنات کا مشاہدہ کرتی ہے، اور ہر وجود و شخص دراصل اس کائناتی نظام کا ایک جزو لاینفک ہے، عالم لاہوتی ہو یا کائنات ناسوتی محفل انجم ہو، یا جہانِ نباتاتِ ارضی، نظام سحاب و باد و باران ہو، یا سلسلۂ کوہ و بیابان، غرض اس عالم کی ہر چیز ہمہ گیر نظام کائنات کی ایک کڑی ہے، یا دنیا کے اس عظیم ترین کارخانہ کا ایک پرزہ ہے جس کا وجود و بقا کارخانہ کے وجود و بقا پر موقوف ہے،

قرآن کریم بار بار عناصر کائنات کی ماہیت اور ان کی اجتماعی تاثیر و افادیت میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے عالم افلاک، عالم جو سما اور ہمارے جہانِ رنگ و بو کے اہم عناصر کو ایک ساتھ ذکر کرتا ہے جس سے ان اشیاء کے معنوی اور افادی تعلق و ربط کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ بیشتر مقامات میں قرآن خود ہی اشیائے عالم کے باہم افادی تعلقات کو اپنے مخصوص اسلوب بیان میں ذکر کرتا ہے،

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا، ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا، وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا، وَهُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ

کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کہ اس نے سایہ کو کیسے پھیلایا، اگر وہ چاہتا تو اسکو ٹھہرا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل قرار دیا، پھر آہستگی سے ہم نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا، خدا کی ذات نے تمھارے لئے رات کو لباس اور نیند کو راحت بنایا اور

الرِّیَاحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا
لِنُحْیِیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا
خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا،

(الفرقان - ۵)

اُسی نے زمین کے اندر پھیل جانے کی غرض سے دن بنایا، وہی ذات ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا، جو اس کی رحمت کی بشارت دینے والی ہیں، اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اُتارا، تاکہ ہم اس کے ذریعہ مردہ بستیوں کو آباد کریں اور یہ پانی اپنی مخلوق میں سے چارپایوں اور بہت سے لوگوں کو پلائیں،

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ
بَیْنَهٗ ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ
مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَیُصِیْبُ بِهٖ
مَنْ یَّشَآءُ وَیَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ یَّشَآءُ
یَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ یَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ

(النور)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ بادلوں کو چلاتا ہے، پھر اُن کو جمع کرتا ہے پھر اُن کو تہ بہ تہ رکھتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن کے اندر سے بارش نکلتی ہے، اور پہاڑوں کی بلندی کی جانب سے برف (جو فضا میں ہوا سرد سے منجمد ہوتی ہے) اتارتا ہے، پس یہ برف جس پر چاہتا ہے اُتارتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر لیتا ہو قریب ہے کہ بجلی (جو بادلوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہو) کی چمک آنکھوں کی بینائی کو اچک لے جائے

عالم ارض و سما کے اس وسیع تر نظام افادہ و اشتراک اور اُس کے حسین و جمیل مناظر میں اہل بینش کے لئے جو چیز وجہ کشش ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز ایک فوق الفطرت طاقت کے زیر اثر اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہے، چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ ذرہ سے لے کر بڑا

تک، آب جو سے لے کر سمندر تک، زمین کی پستی سے لے کر آسمان کی بلندی تک عالم نباتات سے لے کر جمادات مہر و انجم تک کائنات کی ہر چیز اطاعت شعاری اور اثر پذیری کا عجیب و غریب مرقع ہے، گویا وہ کیف و مستی کے عالم میں مستانہ وار آستانۂ دوست کی جانب بڑھ رہی ہے،

وابرح ما یکون الشوق یوماً

اذا دنت الخیام من الخیام

غلط کار لوگوں نے اسلام کو بس اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہ چند آداب و مراسم کا مجموعہ ہے، یا دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب ہے، جو صرف چند اخلاقی اصول و قوانین ہی کی پونجی اپنے پاس رکھتا ہے اور عصر حاضر کے کچھ حواس باختہ اور خود ساختہ مفسرین اسلام کو نازی ازم اور فیسی ازم کی طرح کا ایک خالص قوم پرستانہ نظام سیاست، اور قرآن کو محض سیاسی دستور اور بین الملی قوانین (انٹرنیشنل لاز) کا منشور تصور کرتے ہیں، لیکن قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام پوری کائنات کا مذہب ہے، ایک ہمہ گیر اور آفاقی نظام اطاعت ہے، کائناتی دستور حیات ہے اور عالم کون و مکان کا کوئی گوشہ اس کے تصرف سے باہر نہیں ہے،

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعاً وکرھاً والیہ یرجعون، (آل عمران)

کیا وہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرتے ہیں؟ حالانکہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں صرف اللہ کی اطاعت گذار ہیں، اور ان کو بالآخر اسی کی طرف جانا ہے

دراصل اسی نظام اطاعت اور سررشتۂ اجتماعیت سے اس عالم کا بناؤ سنگار اور حسن بہار آفرین قائم ہے، بلکہ سرے سے اس کا وجود و بقا ہی اس کا رہین احسان ہے، اور جو چیز اس آفاقی گیر نظام سے کٹ جاتی ہے اس کا انجام بہر حال خسران و نامرادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن

جو اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو تلاش

يَقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ، (آل عمران)

کرے گا تو وہ بارگاہ خداوندی میں ہرگز قبول نہ ہوگا، اور انجام کار وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا،

بلکہ ایسی چیز کے لئے آغوش عدم کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں ہے، درخت کا پتہ جب تک اپنے نباتاتی نظام سے وابستہ ہے، اس وقت تک وہ اپنے خوبصورت وجود کو قائم رکھ سکتا ہے، لیکن جونہی وہ اس نظام سے کٹا پاؤں کی رگڑ سے ذرہ ہائے خاک میں تحلیل ہوا، یا ہوائے تند وتیز اس کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی دریا کی طوفانی موج اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے لیکن کب تک؟ جب تک کہ وہ اپنے مرکز وجود سے کمک حاصل کر رہی ہے لیکن اس سے کٹ کر وہ اپنے وجود ہی کو باقی نہیں رکھ سکتی،

غرض اسلام اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پوری کائنات کا ضابطہ و دستور اور نظام اطاعت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس نظام کے زیر اثر جہاں کی تعمیر اور ممکنات حیات کو اجاگر کرنے میں مصروف کار ہے،

خلافت آدم کا مفہوم | نوع انسانی اسی عظیم الشان کارخانہ قدرت کا ایک فعّال اور موثر عنصر ہے، عالم امکان کے پے بہ پے ہنگامے ایجاد و تخلیق کی نو بہ نو حسن آفرینیاں اور جہان رنگ و بو کے رنگا رنگ نقش و نگار انسان ہی کے وجود موثر کے حیرت زا کرشمے ہیں، اگر اور سب کچھ ہوتا اور انسان نہ ہوتا تو نہ جانے یہ دنیا کس طرح کی بے ڈھنگی اور وحشت انگیز ہوتی، آخر یہ حضرت انسان ہی تو ہیں جس کی پیدائش پر دیار عشق میں ہنگامہ و شور اٹھا، جہان حسن میں تہلکہ بپا ہوا، اور فطرت نے ممکنات وجود کی تمام راہیں اس کے لئے وا کردیں،

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

یہ سچ ہے کہ عالم وجود کی زیب و زینت اور سوز و ساز انسان ہی کے دم سے ہے لیکن خود انسان کیا ہے اور عالم امکان میں اسکا مقام و موقف کیا ہے؟ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس کے حل ہو جانے سے انسانی تصور اجتماع

کی حقیقت خود بخود ہی واشگاف ہو کر سامنے آجائے گی،

قادر مطلق نے جب کائنات کو پیدا کیا، تو ایک ایسی ہستی کا پیدا کرنا بھی ضروری ہوا جو اپنی طبعی اور فطری قوت تخلیق سے انواع کائنات مین تصرف کر سکے، اس کا آہنی عزم ویرانون کو آباد کرے دریاؤن سے نہرین نکال کر خشک زمینون کو شاداب کرے، سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے دشت وصحرا کو کشت گل ولالہ مین تبدیل کرے، خوش منظر اور بارونق شہرون کی بنا ڈالے اور اس کا علمی وتحقیقی جوہر اشیار کی صلاحیتون کو اجاگر کرے، موالید وعناصر کی مدد سے نئے نئے اکتشافات کو منظر عام پر لائے، سمندر کی تلاطم خیز موجون کو مسخر کرے، ہوا پر اپنا تسلط جمائے، یہان تک کہ ارض وسما کی ناپیدا کنار وسعتین اس کے لئے سمٹ جائین اور وہ اپنے علم وعمل سے کائنات پر حکمرانی کرے، اسرار فطرت کی آگہی کیساتھ عالم وجود کی ہر شے کو منشائے قدرت کے مطابق کام مین لائے، اور اس مین کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو نظم کائنات کے فساد واختلال کا باعث ہو، بلکہ وہ ایسا تصرف کرے جس سے کائنات کے حسن ذاتی مین پہلے سے زیادہ چمک دمک پیدا ہو اور کوہ وبیابان اس کی بہار آفرینیون سے مہک اٹھین،

حاصل یہ ہے کہ خلاق عالم نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، اور اس کے ارتقار کے لئے کچھ قوانین طبعی بنا دیئے ہین تاکہ ان کے زیر اثر کائنات کی مختلف انواع اپنے نوعی وجزء وتشخص کی حفاظت وصیانت مین مصروف کار ہین لیکن ان انواع کی ترکیب سے کارخانہ فطرت مین حسن ودلکشی پیدا کرنے، ان کو خلاق عالم کے منشار کے مطابق وسعت عطا کرنے اور زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے ایک باشعور اور صاحب ارادہ ہستی کی ضرورت تھی، اور اس مقصد کے لئے خداوند عالم نے انسانون کو پیدا کیا،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی — خیابان وگلزار وباغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (اقبال)

اس لئے انسان کا نصب العین حیات صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسرار فطرت کی ٹوہ لگائے اور حقائق کائنات کی حقیقت جستجو میں اپنی علمی اور عملی قوتیں صرف کرے، بلکہ اس کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ اسرار فطرت کی دریافت اور حقائق اشیاء کے انکشافات سے، اپنے لئے ایک ایسی راہ پیدا کرے جس سے اشیائے عالم اور قوانین فطرت میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو، اور خالق عالم کے دیئے ہوئے علم و عمل کو کام میں [illegible] اخلاق [illegible] کے [illegible] ہو [illegible] خدا [illegible] نے انسان کو یہ حق دیا ہے، کہ وہ اپنی [illegible] علم و عمل [illegible] کے [illegible] نصرت [illegible] پیشی طور پر حق تعلق انسان کو حاصل ہے [illegible] گر وہ انسان [illegible] مخصوص نہیں ہے لیکن [illegible] کہ [illegible] اس [illegible] زمانہ میں حق یونہی [illegible] ق [illegible] میں [illegible] عملی [illegible] ضروری قرار دیئے گئے ہیں،

[illegible] کے [illegible] اس کے اصول کے مطابق ہوتے ہیں،

مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور دنیا سے زیادہ دولت کمائے لیکن اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس حق سے محروم ہیں، محض اس لئے کہ اس مقصد کے لئے جس طرز کی کوشش و سعی کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اس کو وہ کام میں نہیں لاتے، بالکل یہی حال خلافت کا ہے کہ اس منصب کو حاصل کرنے کی راہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں وا کر دی گئی ہیں لیکن اس کو علم و عمل کی صلاحیتوں سے مشروط کر دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن حکیم نے ایک جگہ ذکر خلافت کے بعد علم کا ذکر کیا ہے،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا، (بقرہ) خدا نے آدم کو حقائق اشیاء کا علم عطا کیا،

اور ایک دوسرے مقام پر خلافت کو عمل سے مشروط کیا گیا ہے،

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ	پھر ہم نے دوسری قوموں کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو
(سورۂ یونس)	

زمانہ حال کے خود ساختہ شارحین اسلام کے نزدیک خلافت، حکومت واقتدار کی ہم معنی ہے اور وہ ہر جگہ خلافت کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن یہ اُن کی تنگ نظری ہے، خلافت دراصل ایک اعلیٰ و برتر مقام بندگی ہے، شرفِ انسانیت کی معراج ہے، علم وعمل اور فضائل اخلاق کی وہ پاکیزہ تر منزل ہے، جو عصر حاضر کے کوتاہ نظر اور ہوا پرست انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی، سے

با تو چہ گویم کہ تو مجنون نئی!

یعنی خلافت آدم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ابتداے آفرینش سے یہ قوت عطا ہوئی ہے کہ وہ خدائی صفاتِ کمال کا مظہرِ اتم بن کر کائناتِ ارض کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لے، اور زندگی کے پورے کاروبار کو منشاے خداوندی کے مطابق چلائے،

نائبِ حق در جہان بودن خوش است | بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است | ہستیِ او ظلِّ اسمِ اعظم است
از رموز جزو کل آگاہ بود | در جہان قائم بامر اللہ بود
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است | از جلالِ اُو نجاتِ عالم است

زندگی را می کند تفسیر نو

می دہد این خواب را تعبیر نو

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ نیابت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ نائب فرائض مفوضہ کو اس طرح

انجام دے جس طرح اس کے منوب عنہ نے اس کو ہدایت کی ہے، اور اس ہدایت نامہ سے سرمو انحراف نہ کرے، اگر وہ اس سے انحراف کرتا ہے تو وہ اصولاً اپنے منصب نیابت کا اہل نہیں رہتا، کیونکہ یہ حق مشروط ہے اور انتفاء شرط انتفاء مشروط کو مستلزم ہے،

لہذا خلافت دراصل حکومت و اقتدار کی ہم معنی نہیں ہے، البتہ حکومت و اقتدار کو مستلزم ہے لیکن حکومت و اقتدار خلافت کو مستلزم نہیں ہے، یعنی جس گروہ انسانی کو منصب خلافت عطا ہوگا، حکومت و اقتدار کی مسند بھی اُسے حاصل ہوگی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس قوم کو حکومتی اقتدار حاصل ہو، وہ منصب خلافت سے بھی سرفراز ہو، گویا خلافت ایک عظیم القدر مقام حریت ہے، جو اس عالم رنگ و بو میں نہیں سما سکتا، بلکہ وہ سپہر نیلگون اور جہان انفس و آفاق کو محیط ہے،

نکتہ می گویمت روشن چو دُر تا شناسی امتیاز عبد و حر

عبد گردد یادہ در لیل ونہار در دل حُر یادہ گردد روزگار (اقبال)

آج اہل مغرب میں بہت کم سہی لیکن کچھ لوگ اس رمز سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سیاست و اجتماع حکومت و اقتدار کی بنیادیں جب تک ہمہ گیر انسانی بلکہ کائناتی قدروں پر نہ اٹھائی جائیں گی، عالم انسانیت کو امن و فراغت کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا، چنانچہ پروفیسر جوڈ اور یہودی النسل فلسفی اسکونڈ سمول اور دیگر کئی علماء و مفکرین نے بارہا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زندگی کے دوامی اور مستقل عقائد و افکار ہی انسانی زندگی کو صحیح راہ پر ڈال سکتے ہیں، اور اس طرح اس مادی زندگی میں ایک خوشگوار اور پُرامن انقلاب رونما ہو سکتا ہے، لیکن جس حقیقت کو ہم خلافت کی مقدس اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں، دراصل اسی طرح کے عالمی، آفاقی اور ہمہ گیر تصورات پر مبنی ہے، اور خلافت کا حقیقی منصب یہ ہے کہ اس کی نظر میں کسی ایک انسانی طبقہ یا کسی ایک خطہ ارضی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تعمیر کافی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر انسان اور ہر ملک کی فلاح چاہتی ہے، جہاں بھی اس کو بگاڑ نظر آتا ہے،

اس کو سنوارتی ہے، جہاں فساد کا ظہور ہوتا ہے اسکی اصلاح کرتی ہے، جہاں ظلم و قہر سے انسانیت مغلوب ہوتی ہے، وہاں اس کا دامن عدل و انصاف وا ہوتا ہے، اور جہاں فسق و خبیث کی وبا پھوٹتی ہے، وہاں وہ تقویٰ و صلاح کا تریاق مہیا کرتی ہے غرض خلافت کیا ہے؟ سراپا برکت و خیر، سراسر عدل و انصاف اور یہ ہمہ جود و اصلاح و تعمیر کی پیامبر۔

اجتماع انسانی کا قرآنی تصور | ان تصریحات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں، کہ انسانی اجتماعیت کا حقیقی موقف کیا ہے، اور یہ کس طرح کے فکری عناصر سے ترکیب پاتی ہے؟ دراصل قرآن عزیز کے نزدیک مجتمع انسانی کی فکری اساس کائنات کے وہی ہمہ گیر اور غیر متزلزل قوانین ہیں، جو انسان کے علاوہ جہان ارض و سما میں ہر لمحہ جاری و ساری ہیں، اس لئے یہ اصول اجتماعیت ازلی و ابدی ہیں، لیکن اُن کی خارجی اور عملی تشکیل کی ابتدا حضرت آدم کی پیدایش سے ہوتی ہے، جب کہ اُن کو پیدا کرنے کے بعد منصب خلافت سے نوازا گیا، یعنی حضرت آدم کو خلافت کا جلیل القدر منصب عطا ہونا سلسلۂ اجتماعیت کی پہلی کڑی ہے اور خلافت کا مفہوم ہی اس خاص نوعیت کے تصور اجتماع کی نشان دہی کر رہا ہے، کیونکہ خلافت کا لفظ انسانوں کی سیاسی و تمدنی اور اجتماعی ہیئت و وحدت پر دلالت کرتا ہے ... پہلے پہل انسان میں اجتماعیت کا شعور ہی موجود نہ تھا اور وہ ... غاروں میں تنہا ... زندگی بسر کیا کرتا تھا، قرآن حکیم جو اس کائنات میں آخری صحیفہ فطرت ہے، اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان اول ہی کو اجتماعیت کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے، اور پھر تاریخ کے ہر دور میں ان ہمہ گیر اصول اجتماع میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، اور ان کی خارجی تشکیلات بڑھتی پھیلتی اور بدلتی رہی ہیں،

غرض قرآن حکیم کے نزدیک وحدت انسانیت یا اجتماعیت کی اساس ایک ایسا پاکیزہ اور مقدس اخلاقی نصب العین ہے، جو رأس العین سے زرنگار و نورانی ہے، اور وہ اس تصور اجتماع کی بنیادوں پر انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہی وہ تصور حیات ہے جس سے انسان کو پہلے دن ہی آگاہ

کر دیا گیا تھا، لیکن جہان تک کہ مادی نظریہ ہائے اجتماع کا تعلق ہے، وہ انسانون کی عقل خود بین کی جدت کوشیون اور مفاد پرستیون کی پیداوار ہین، اور سراسر غیر فطری ہین، لیکن سطور بالا مین جس تصور اجتماع کا ذکر ہوا ہے، وہ دینی تصور اجتماع ہے، اور اسکی اساس عالمگیر اور محیط کل اصول حیات ہین جو کسی محصور نسل و قبیلہ یا قوم و وطن سے اختصاص نہین رکھتے اور اس کے برعکس انسانی تصورات اجتماع قبیلہ و نسب اور قوم و وطن کی حد بندی پر مبنی ہین اور نسل انسانی کو بے شمار چھوٹے چھوٹے نسلی طبقون اور وطنی قومیتون مین تقسیم کرنیوالے ہین۔

یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اجتماعیت کا احساس انسان کا طبعی اور نفسیاتی احساس ہے، اور دور کارگہ عالم مین انسان کو زندگی کے مرحلہ اول پر ہی اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یعنی جب وہ شکم مادر سے باہر آتا ہے، تو اسی وقت سے اجتماعیت کا جذبہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے، اور پھر وہ جس قدر نشو و نما کے مرحلے طے کرتا چلا جاتا ہے، اسی قدر اس کے علائق مین توسیع ہوتی چلی جاتی ہے، یہان تک کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک وسیع تر حلقہ علائق مین جکڑا ہوا پاتا ہے، اور یہان پہنچکر اس کو گرد و پیش کے اجتماعی اور ثقافتی تصورات سے سابقہ پڑتا ہے، اور وہ یا تو کسی ہمہ گیر رشتہ اخوت دینی مین منسلک ہو جاتا ہے یا وہ محدود اور سطحی علائق کے تنگ دائرہ مین سمٹ کر رہ جاتا ہے،

انسانون کے بنائے ہوئے تصور اجتماع کو مختلف ارتقائی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، چنانچہ پہلے پہل انسان نے دینی تصور اجتماع کے علی الرغم قبیلہ و نسب کو اجتماعی تعلقات کا محور قرار دیا، اور رفتہ رفتہ تعلقات مین وسعت پیدا ہوتی گئی، اور پھر انسان نے وطن اور وطنی قومیت (نیشنلزم) کو اپنا منتہائے مقصود بنا لیا، اور یہان پہنچ کر اس کی حرکت رک گئی ہے، اور آج وطنی قومیت نے اُس کے دل و دماغ پر اس طرح تسلط جما لیا ہے، کہ اس کی نظر مین انسانیت کا مقدس رشتہ کوئی حقیقت ہی نہین رکھتا، ایک قوم دوسری قوم پر درندون کی طرح چل پڑتی ہے، اس کے گوشت سے شکم پُر کرتی، اُس کی ہڈیون سے اپنے مستقبل کی سربفلک عمارت تعمیر کرتی، اور اُس کے خون سے اس عمارت کے گل بوٹے اور نقش و نگار بناتی ہے، غرض اس

کے ہاتھون آج انسانیت بستر مرگ پر کراہ رہی ہے،

فکر انسان بت پرستے بت گرے ہر زمان درجستجوے پیکرے
باز طرح آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب نام او رنگ است ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند پیش پائے این بت ناارجمند

مغرب کی نشأۃ ثانیہ نے جب مذہب کے خلاف محاذ قائم کیا، اور مذہب کو ہمیشہ کے لئے خارج البلد قرار دے دیا، تو یہ ناگزیر ہوا کہ اس خلا کو کسی دوسرے تصور زندگی سے پُر کیا جائے، یعنی کوئی ایسا تصور زندگی ڈھونڈھ نکالا جائے، جو قوم کے سیاسی اور معاشی ارتقار کے لئے ایک قوی تر اور منضبط تر محرک کا کام دے سکے، لیکن اس کا انسانی ذہن گرد و پیش کے جن مخصوص طبعی حالات سے گذر رہا تھا، ان کے تقاضون نے انسان کو تہذیب حاضر کے نوتراشیدہ بت (ملک و وطن) کے آگے سرنگون کر دیا، یہ زمانہ اٹھارہوین صدی کے اوائل کا زمانہ تھا، جب کہ وطنیت ایک سیاسی عقیدہ اور مستقل تصور مملکت کی حیثیت سے منظر ظہور پر آئی، اور اس نے ماضی کے تمام اجتماعی تصورات کو کالعدم قرار دیا، اس وقت سے آج تک وطنیت کا زہرناک تصور اقوام حاضرہ کی سیاست و معیشت کی روح روان ہے اور وطنی قومیتون کی سرفرازی کا منضبط محرک بنا ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس نے انسانی قدرون کو جس طرح رسوا کیا ہے، اس کی چند مثالین گذشتہ عالمگیر جنگون اور تقسیم ہند کے بعد کی وحشتناکیون مین دیکھی جا سکتی ہین،

دراصل وطن سے انسان کو ایک نسبت ہوتی ہے اور وہ نفسیاتی طور پر اس سے محبت کرتا ہے اسکے ریگزارون، بیابانون، کہسارون، دریاؤن اور چمنستانون مین اس کے لئے ایک مخصوص کشش ہوتی ہے لیکن انسان کی پاکیزہ اور آزاد فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ زمین کے کسی خطہ کو جو محض اسکی رہائش اور تمتع کے لئے بنایا گیا ہے، اپنا کعبۂ مقصود بنالے، آخر انسان کو اسی لئے تو نہین پیدا کیا گیا کہ وہ

ہتیوں میں اپنے آپ کو گم کر دے ؟ حضرت اقبال نے اس ضمن میں کیا خوب نکتہ بیان کیا ہے

با وطن اہلِ وطن را نسبتے است   زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است

اندریں نسبت اگر داری نظر   نکتہ بینی ز مو باریک تر

گرچہ از مشرق بر آید آفتاب   با تجلیہائے شوخ و بے حجاب

در تب و تاب است از سوز درون   تا ز قید شرق و غرب آید برون

بر دمد از مشرق خود جلوہ مست   تا ہمہ آفاق را آرد بہ دست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است

گرچہ او از روے نسبت خاوری است

جدید تصور | اس نئی وطنی شریعت میں قوم اور مملکت ایک ہی معنوں کے دو عنوان ہیں یعنی
ملک میں بسنے والے انسان ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو اُن کی اس ہیئت
مملکت کا نام دیا جاتا ہے ، اور دوسری حیثیت سے اسی کو قوم (نیشن) بھی کہا جاتا ہے گویا
ہو یا قوم اس کا بنیادی اور حقیقی محرک وجہ وطنیت کا تصور ہے ، اور عہدِ حاضر میں افرادِ انسانی
شتراک و تعاون کی بہترین صورت یہ ہے کہ قومیت اور اسٹیٹ کا مصداق الگ الگ نہ ہو،
کے رہنے والے لوگ خواہ عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے کتنے ہی گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں
لحاظ سے کہ وہ ایک آزاد خطۂ زمین میں اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم رکھتے ہیں ، اُن کی اس ہیئت اجتماعیہ
مملکت (اسٹیٹ) سے موسوم کیا جاتا ہے اور چونکہ ان میں اتحادِ وطن کا رشتہ موجود ہے اس لئے
قل اور جداگانہ قوم ہیں ، رہا عقیدہ اور مسلک کا معاملہ تو وہ ان کی پرائیوٹ زندگی سے تعلق رکھتا
ن کی قومیت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا ، گویا مملکت کا جدید تصور مذہب اور اخلاق کو نہ صرف ثانوی
ہے بلکہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کے ہنگاموں سے دور اور گھر کی چار دیواری یا عبادت گاہوں

مین محدود رکھنا چاہتا ہے، اور جہان تک ریاست و مملکت کا تعلق ہے وہ ایک بالاتر ادارہ معصوم ہے یا کم از کم ... ہے اور اخلاق تو روحانی قانون ہے اس کو ... کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ ... ایک دنیوی ... جس چیز کو یہ صحیح سمجھے وہ صواب اور جس کو وہ غلط کہے وہ خطا ہے۔

دین و سیاست اور مذہب و ریاست کی تفریق جدید تصور تو ہے لیکن پہلے سولھوین صدی مین منظم شکل مین آگئی تھی ... مشہور فلسفی میکیاولی ... اس شخص نے پہلی بار مملکت کو مذہب و اخلاق کی گرفت سے آزاد کیا اور ... ایک نئے تصور مملکت کی طرح ڈالی ... اس کا مقصد واحد مملکت کا عروج و اقتدار اور اس کی خوشحالی ہے، اس راہ مین جو چیز بھی حائل ہو اس کو ہٹا دینا چاہئے، خواہ وہ ... ہو، ہان اگر مذہب و اخلاق سے مملکت کو ... فائدہ پہنچ سکتا ہو تو ان سے ... اس غرض کے لئے ... استفادہ ... ایک مذہب کا ... نقطۂ نظر سیاسی حکمت عملی (پولیٹکل سنٹ) کے طور پر ہونا چاہئے ... بالذات مملکت ہی کو تصور کیا جائے، بلکہ اس کے نزدیک سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بڑے سے بڑا جرم، بڑی سے بڑی بداخلاقی بھی نہ صرف ... ہے، جب کہ اس سے مملکت کو کوئی طرح کا فائدہ پہنچ سکتا ہو، اور جہان کسی اخلاقی مقصد کی خاطر مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہان یہ اخلاقی مقصد اس کے نزدیک ناقابل معافی گناہ ہے۔

مغرب کی تاریک فضا مین جب یہ نئی آواز گونجی تو جو لوگ اہل کلیسا کی کارستانیون، غرض پرستیون اور اوہام طرازیون سے سخت نالان تھے، اور کلیسا و شاہی کے باہمی تصادم سے خطرناک ذہنی کشمکش مین مبتلا تھے، انھون نے میکیاولی کے اس نئے دین کو بہت آسانی سے قبول کر لیا، بالخصوص وقت کے بادشاہون نے اس سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا، اور کلیسا کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے لگا، مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرنے

پایا تھا کہ مطلق العنان حکمرانوں کے مظالم کا ردِ عمل عوامی طبقوں کی ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کی صورت میں نمودار ہوا، اور اب مغرب کے انقلاب پسندوں نے ایک جدید سیاسی جمہوری اور صنعتی انقلاب برپا کرنے کی ٹھان لی، بیشتر مغربی ممالک میں انقلابی تحریکیں اٹھیں، ہنگامے برپا ہوئے، اور عوامی طبقوں اور حکمرانوں میں شدید تصادم رونما ہوا، بالآخر عوامی طاقت کے آگے مطلق العنان حکمرانوں کو سرنگوں ہونا پڑا، اور انھوں نے ہٹ ہٹا کر مسند اقتدار عوام کے حوالے کر دی، یہ دور اہلِ مغرب کی نشأۃ ثانیہ کا تابناک اور انقلاب انگیز دور تصور کیا گیا ہے، جب کہ مغرب میں جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومتیں قائم ہوئیں، اور قدیم ملکی اور سیاسی تصورات کی جگہ نئے نئے سیاسی اور معاشی نظریوں (تھیوریز) نے جنم لیا، چنانچہ وطنی قومیت اور مملکت کا جدید تصور اسی عہد کی پیداوار ہے، مگر اس انقلاب نے اہلِ مغرب کو جو کچھ دیا، وہ اتنا ہی ہے کہ انھوں نے ملک و وطن کی بنیادوں پر جدید فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) کی داغ بیل ڈالی، اور اس طرح ہمہ گیر رشتۂ اخوتِ انسانی کو تار تار کر کے رکھ دیا، چنانچہ اب وطن ہی ان کا دین و ایمان بن گیا، اور اُن کے جینے مرنے صلح و جنگ اور تمام اعمالِ زندگی کا یہی آخری مقصد پایا،

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد زیر گردوں رسم لادینی نہاد

یعنی جہاں تک مذہب و اخلاق کا تعلق ہے، اس میں میکیاولی کا تصور ہی کارفرما تھا، چنانچہ عہد جدید کے یورپ میں جو علما، و مفکرین پیدا ہوئے، ان میں سے بیشتر حضرات نے اس لادینی تصور مملکت کو سراہا، بلکہ اُن کے جدید نظریوں نے اس کو اور زیادہ تقویت دی، اور اصولِ انسانیت کا احترام پہلے سے بھی کم ہوتا گیا، چنانچہ جرمنی کا مایۂ ناز فلسفی ہیگل مملکت کا اتنا دلدادہ تھا، کہ اُس نے اسٹیٹ کو ایک مقدس اور معصوم سیاسی ادارہ قرار دیا، یعنی اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ریاست ہر چیز سے بالاتر ہے، یہاں تک کہ مذہب پر بھی حاوی ہے، اور اخلاق کے لئے ماخذ و منبع ہے، گویا مملکت کسی چیز کی تابع نہیں ہوتی، دنیا کی تمام چیزیں مملکت کی تابع ہیں،

ہیگل کے تصور مملکت نے مذہب و اخلاق کی روحانی برتری پر چوٹ لگائی تھی، وہی کیا کم تھی کہ ڈارون کے نظریۂ کائنات نے اس کے جسد نیم جان پر ایسی ضرب رسید کی کہ مغرب میں مذہب و خدا کا تصور محض عجوبۂ روزگار یا دگار بن کے رہ گیا، اور اس کے بعد اس جدید ملکی تصور نے ہمہ گیر نوعیت اختیار کرلی، چنانچہ کارل مارکس اور انجلز جو دنیائے جدید کے خالق مانے جاتے ہیں، ہیگل اور ڈارون کے نظریات (تھیوریز) کی بنیادوں پر ہی اشتراکی فلسفۂ اجتماع کی عمارت کھڑی کی یعنی مارکس کا نظریۂ تاریخ دراصل ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا غماز ہے، اور اس کا نظریۂ مادی جدلیت درحقیقت ہیگل کی جدلیت ہی کی مسخ شدہ صورت ہے، لیکن تعجب ہے کہ جس شخص نے تمامتر دوسروں کے دماغی کارنامہ سے استفادہ کرکے ایک عجیب و غریب فلسفۂ زندگی مرتب کر ڈالا آج اس کو دنیائے انسانیت کا خدا تصور کیا جاتا ہے، اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ غریب تو خود دوسروں کے آستانۂ علم و دانش کا بھکاری ہے،

بہرحال فلسفۂ اشتراکیت کا ذہنی پس منظر یہی رہی ہے جس کی ابتدا سولھویں صدی میں ہوئی تھی لیکن اس نے اشتراکی سوسائٹی اور مملکت کی عظمت و تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیئے اور خدا و مذہب کو اشتراکی مملکت سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کردیا، چنانچہ کارل مارکس کے نزدیک مذہب و خدا کا تصور محض ایک فریب ہے، سرمایہ دارانہ ذہن کی اپج ہے جس کو عوامی طبقوں کی دولت و عزت کا شکار کرنے کے لئے بطور ہتھکنڈے کے استعمال کیا جا رہا ہے، اور اخلاق اس کے نزدیک کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ہر لمحہ بدلنے والی چیز ہیں خیر و شر اور صواب و خطا کا معیار ان کے نزدیک یہ ہے کہ جو چیز اشتراکی ریاست و سوسائٹی کی فلاح و تعمیر پر منتج ہو، وہ خیر اور صواب ہے، اور جو اس کی تخریب و فساد پر منتج ہو وہ شر اور خطا ہے،

لینن کہتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کسی ایسے نظام اخلاق کو نہیں مانتی جو معاشرہ سے باہر کسی فوق الفطر طاقت کا بنایا ہوا ہو، اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظام فکر و اخلاق سراسر فریب ہے،

نیز وہ کہتا ہے کہ قدیم اجتماعی نظام کے استیصال اور محنت کش طبقوں کی تنظیم کی راہ میں ہر چیز اخلاقاً درست ہے، ہم جب سرمایہ دار سے لڑیں گے، تو اس جنگ میں جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرنا ضروری ہیں،

غرض زمانۂ حال کا جدید تصور ملکت اور نظریۂ اجتماع جن فکری عناصر سے ترکیب پاتا ہے، ان کے سرسری تجزیہ سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اقوام حاضرہ آج جس راستہ پر گامزن ہیں، وہ اُن کو خلفشار و اضطراب اور ہلاکت و بربادی کے اُس اتھاہ سمندر کی پہنائیوں کی طرف لئے جارہا ہے، جہاں سے اُن کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے،

خود ہی انصاف کیجئے کہ جہاں ہمہ گیر اصول انسانیت اور آفاق گیر اقدار حیات کو اوہام و خرافات تصور کیا جاتا ہو، جہاں احترام آدمیت کا معصوم جذبہ قطعی ناپید ہو، جہاں ملک و وطن کے بُت کو خوش کرنے کے لئے ہزاروں ناکردہ گناہ انسانوں کے خون ناحق سے ہولی کھیلی جارہی ہو، جہاں وحشت و درندگی کو قابلِ فخر کارنامہ، اور معصوم بچوں، ضعیفوں اور عورتوں تک کو انتہائی بے دردی سے ذبح کرنے کو عین ثواب تصور کیا جاتا ہو، کیا وہاں انسانیت کو امن و عافیت کا ایک لمحہ بھی میسر آسکتا ہے ؟

بس یہ ہے کہ عالم انسانی کی روز افزوں خلفشار اور زمانۂ حاضر کے درندہ صفت انسانوں کی وحشت و بہیمیت نے ہمارے اس یقین و ایمان کو محکم تر بنا دیا ہے کہ مستقل اور دوامی اقدار حیات اور ہمہ گیر اخوت انسانی کے گہرے اور پائدار احساس کے سوا انسانیت کی فلاح و نجات کی کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں ہے،

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں
إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولٰٓئِكَ	نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ
لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُمْ	نہیں کیا، اُن کے لئے ہی امن

مُهْتَدُوْنَ ۝ کی زندگی ہے، اور وہی لوگ ہدایت

(الانعام) پانے والے ہیں،

ان ہمہ گیر اصول انسانیت کے سوا جو کچھ ہے، وہ ظن وتخمین اور ہوائے نفس کی تخلیق ہے، اور اس

کارحیات کی الجھنیں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جائیں گی، سہ

ع :- راہبر ہو ظن وتخمین تو زبون کارحیات

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخرالدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ اُن پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں اُن کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ، فلسفہ وعلم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات وخیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور وفکر کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے،

ضخامت ۳۹۰ صفحے،

قیمت سے روپے،

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

"منیجر"

مولینا عبد الملک بنبانی محدّث

از

ڈاکٹر سید باقر علی صاحب ترمذی استاذ شعبۂ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی

مولینا سید سلیمان صاحب ندوی نے عرصہ ہوا ہندوستان کے محدثین کرام کے تذکرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن چند کڑیوں کے بعد یہ اہم سلسلہ کسی وجہ سے جاری نہ رکھا جا سکا، اس کے بعد معارف مین ہندوستان کے محدثین پر چند اور مضامین شائع ہوئے، ذیل کی سطرین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہین،

ہندوستان مین گجرات وہ خوش قسمت صوبہ ہے جہان علم حدیث کی اشاعت سب سے پہلے ہوئی، عام طور سے ہندوستان مین علم حدیث کی اشاعت کی ابتدا حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، حضرت موصوف کی جلالت شان اور حدیث نبوی کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے ہندوستان مین یہ علم شریف پہلے پہل صوبۂ گجرات مین اشاعت پذیر ہوا، چنانچہ علامہ سخاوی کے دو شاگرد شیخ وجیہ الدین محمد بن محمد المالکی (متوفی ۹۲۹ھ) اور شیخ جمال الدین محمد بحرق (متوفی ۹۳۰ھ) شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے دو شاگرد شیخ عبد المعطی بن الحسن باکثیر المکی (متوفی ۹۸۳ھ) اور شیخ شہاب الدین احمد العباسی المصری (متوفی ۹۹۲ھ) علامہ ابن حجر کے دو شاگرد شیخ محمد ابن عبد اللہ الفاکہی الحنبلی اور شیخ سعید شافعی اور دیگر کئی محدثین کرام نے صوبۂ گجرات کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا، اور احمد آباد مین مدارس کھولے، اس کے علاوہ خود گجرات کے بے شمار علماء کو احادیث نبویہ کا بڑا ذوق تھا، حضرات صوفیہ نے اس کی تحصیل مین والہانہ انہماک کا ثبوت دیا، اور دربار کے اعلیٰ

عہدہ داروں نے اس علم شریعت کے حصول کے لئے بوریانشینوں کا تلمذ اپنے لئے باعث نجات سمجھا، علم حدیث کی خدمت میں بعض خاندانوں نے نمایاں حصہ لیا، ان میں سے ایک بنبانیوں کا خاندان ہے، اس خاندان نے بہت سے علماء پیدا کئے، جو آسمان علم کے درخشاں ستارے ثابت ہوئے، اور افتا و قضا کے جلیل القدر مناصب پشتوں تک اُن کے خاندان میں رہے، اور اس خاندان کے باکمال فرزندوں نے نہ صرف ملکی انتظام میں نام پیدا کیا، بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی، علماء کی قدردانی صلحاء و اتقیاء سے عقیدت و نیازمندی اور اپنے ذاتی علمی کمالات کا نقش تاریخ کے صفحات میں چھوڑا، بنبانیوں کی اصل کے متعلق جمعات شاہیہ جلد چہارم (قلمی) میں اس طرح لکھا ہے:-

"بنبان ولایتی ست مابین خراسان و ملتان و این جماعت کہ بہ ملک گجرات بہ بنبانیان مشہور اند از آنجا آمدہ اند و ایشان از حضرت عبد اللہ بن عباس اند"

ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس خاندان کے بزرگوں نے کس زمانہ سے گجرات میں سکونت اختیار کی لیکن اس کے علماء میں شیخ صدر الدین کا زمانہ سب سے مقدم معلوم ہوتا ہے، شیخ صدر الدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن کو انھوں نے شاہانِ گجرات کے نام سے معنون کیا، شیخ مذکور کو عربی ادب اور صرف و نحو سے خاص لگاؤ تھا،

قصیدۃ البردہ، قصیدہ کعب ابن زہیر، قصیدہ لامیہ (قاضی عبد المقتدر) وغیرہ پر انھوں نے حواشی لکھے ہیں، نحو کی مشہور کتاب الوافی کی شرح الکافی انہی کی ہے، ہندوستان میں غالباً اس کتاب کی سب سے پہلی شرح یہی ہے، شیخ نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام تفسیر بحر المعانی رکھا، وہ غالباً آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں بقید حیات تھے،

شیخ منہاج الدین بنبانی غالباً شیخ صدر الدین کے بیٹے تھے، انھیں علم حدیث تصوف اور صرف و نحو سے بہت دلچسپی تھی، علم النحو میں اُن کے مرتبہ کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ

ی عالم شیخ بدر الدین دمامینی احمد آباد مین قیام پذیر تھے، اس وقت ان مین اور شیخ منہاج
مسئلون کے متعلق بحث چھڑ گئی، اور دمامینی کو اُن کے رد مین ایک کتاب الفاتح الربانی
لبنبانی لکھنی پڑی، اُن کی تصانیف کی تعداد ۰۰ سے متجاوز تھی، لیکن حدیث کی تالیفات
بخاری اور مسلم کی شرحون کے نام ہم تک پہنچے ہین،

فیض اللہ بن زین العابدین بنبانی کا ہمین شکر گذار ہونا چاہئے کہ انکی مجمع النوادر سے اکثر
ہین، شیخ فیض اللہ گجرات کے مشہور سلطان محمود بیگڑے (۸۶۳ تا ۹۱۷ھ) کے خزانچی تھے
ن مجید کی تفسیر دستور الحفاظ اسی سلطان کے نام سے معنون کی ہے،
کے علاوہ اُن کی تاریخ صدر جہان اور مجمع النوادر نہایت مفید تصانیف ہین، اتفاق سے
دردستبردِ زمانہ کے ہاتھون برباد ہونے سے بچ گئے ہین،

ی خاندان کی ایک مایہ ناز ہستی شیخ عبد العزیز المعروف بہ عبد الملک بنبانی ہے، ان کا سلسلہ نسب
اللہ بن عباس سے ملتا ہے جس کی چند کڑیان حسب ذیل ہین،

خ عبد الملک بن شیخ محمود بن شیخ خضر بن شیخ نصیر الدین بن شیخ برہان الدین بن شیخ خضر بن شیخ
خ حسن بن شیخ الیاس،

خ عبد الملک زین البلاد احمد آباد مین پیدا ہوئے، اور وہین ۹۷۰ھ کے قریب انتقال
ان کے اور بزرگون کی طرح شیخ عبد الملک بھی خانوادۂ سہروردیہ سے منسلک تھے، غالباً
انقاہ مین تعلیم پائی ہوگی، حدیث اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین بنبانی سے پڑھی جن کو

ث کے لئے دیکھو روئداد کل ہند تاریخ کانفرنس اجلاس بمبئی گجرات کی چند تاریخی کتابون کی تعین
تاب پر پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے ایک پر مغز مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جو لاہور کے اورنٹیل کالج
بت اگست ۱۹۳۹ء مین شائع ہوا ہے،

مشہور مصری عالم شیخ شمس الدین سخاوی سے سند حاصل تھی، حدیث میں مولانا عبدالملک کے ممتاز شاگردوں میں مولانا کمال محمد عباسی (مفتی اجین مالوہ) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، شیخ عبدالملک نے تفسیر و حدیث میں کمال حاصل کیا، اور استاذ کے رتبۂ عالی پر فائز ہوئے، انھیں صحیح بخاری ازبر تھی، ہمیشہ مسجد اور حجرے میں ورد اوراد میں مشغول رہتے، توکل اور تجرید میں آپ کی مثال نہ تھی، تمام علوم کا زبانی درس دیا کرتے تھے! افسوس ہے کہ مولانا جیسے باکمال محدث کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں، اُن کے ایک فرزند شیخ عبداللطیف (متوفی ۹۱۵ھ) نے مشارق الانوار کی شرح مبارق الازھار لکھی ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھڑوچ کے قاضی صاحب سید نورالدین احمد حسین کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھا[۱]، شیخ خلیل محمد عباسی شیخ عبداللطیف کے صاحبزادے ہیں، والد سے علم حدیث حاصل کیا، احمد آباد کے بخاریوں کے ایک مشہور عالم اور صوفی سید محمد مقبول عالم[۲] انہی سے روایت کرتے ہیں، چنانچہ علامہ نورالدین (متوفی ۱۱۵۵ھ) نورالقاری فی شرح البخاری میں فرماتے ہیں :-

"وبہ قال مولانا مقبول عالم حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البنانی حدثنی والدی عبداللطیف حدثنی والدی عبدالملک حدثنی محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ الخ

ذیل میں ہم شیخ عبدالملک بنبانی محدث گجراتی کی اسناد حدیث پیش کرتے ہیں، یہ اسناد شیخ رشید الدین حسینی کی کتاب مجمع الاولیاء سے لی گئی ہیں، اس کتاب کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی

۱ہم قاضی سید نورالدین صاحب کے تہ دل سے شکر گذار ہیں، انھوں نے ازراہ کرم مبارق الازہار اور نورالقاری کے چند اقتباسات نقل کرکے ارسال فرمائے

۲ مختصر ترجمہ کے لئے دیکھو مرآت احمدی خاتمہ ص ۲۰، طبع بمبئی،

کے کتب خانہ میں موجود ہے، چونکہ سلسلۂ اسناد میں زیادہ تر نام ہی ہیں، اس لئے ہم عربی متن کے نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں،

صحیح بخاری | انه یروی من الشیخ محمد المذکور بجاز الله عن والدہ عز الدین عبد العزیز عن شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عن محمد بن محمد الهاشمی عن قاضی القضاة محب الدین محمد بن محمد بن محمد الطبری عن الشیخ ابی الفتح المراغی عن شهاب الدین ابی العباس احمد بن ابی طالب بن ابی نعیم نعمه بن حسن بن علی بن بیان بن شحمة الحجازی الدمشقی الصالحی عن سراج الدین ابی عبد الله الحسین بن المبارک بن محمد بن یحیی الزبیدی عن ابی الوقت عبد الاول بن عیسی بن شعیب بن اسحاق بن ابراهیم الصوفی السنجری ثم البردی عن جمال الاسلام ابی الحسن عبد الرحمن بن محمد بن المظفر بن محمد بن داؤد بن احمد بن معاذ بن اسهل بن الحکم الداؤدی عن ابی محمد عبد الله بن احمد بن حمویة بن احمد بن یوسف بن اعین الحموی السرخسی عن ابی عبد الله محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر بن ابراهیم البخاری العزیزی عن محمد بن اسمٰعیل البخاری رحمهم الله،

صحیح مسلم | انه یروی من محمد المذکور بجاز الله عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الصالحی المذکور فی سند صحیح البخاری وانه یروی عن محمد بن ابی السعادة الحامی قال اخبرنا الحافظ ابو القاسم عبد الرحمن بن محمد بن اسحٰق بن مندة الاصفهانی عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبد الله الجوزقی قال ابو حاتم المکی بن عبد الله التمیمی قال اخبرنا الامام ابو الحسین مسلم رحمه الله،

سنن ابی داؤد | انه یروی من محمد المدعو بجار الله قال اخبرنی والدی عز الدین بن عبد العزیز
سماعاً قال اخبرنا ابو العباس بن ابی بکر الواسطی و ابو عبد الله محمد بن احمد بن کامل
الترمذی عن الخطیب ابی الفتح محمد بن محمد المنذری قال اخبرنا ابو الفضل عبد الرحمن
بن یوسف بن یحیی الموصلی سماعاً قال اخبرنا ابو الفتح المفلح الدین بن احمد الدومی
و ابو النصر ابراهیم بن محمد الکرخی سماعاً عن المسند ابی طاهر محمد بن محمد بن عبد اللطیف
قال انبأتنا ام عبد زینب ابنة احمد بن عبد الرحیم المقدسی عن ابی القاسم بن الحاسب
قال حدثنی الحافظ ابو الطاهر احمد بن محمد السلفی اذناً قال کتب ابو جعفر العبادانی
من البصرة قال اخبرنی القاضی ابو عمر القاسم بن جعفر بن عبد الواحد الهاشمی قال
اخبرنا ابو علی محمد بن احمد بن عمر اللؤلؤی، قال اخبرنا الامام ابو داؤد السجستانی رحمهم الله تعالیٰ

سنن الترمذی | انه یروی من الشیخ محمد المدعو بجار الله عن والده عز الدین عبد
العزیز قال اخبرنی شیخ الحنفیة امین الدین یحیی بن محمد القاهری قال اخبرتنا
الاصیلیة ام محمد سارة ابنة عمر الحموی قال انبأنا الصلاح عمر بن الحسین
المراغی قال اخبرنا الفخر ابو الحسن علی بن احمد البخاری المقدسی قال اخبرنا
ابو الفتح عمر بن عبد الملک بن عبد الله الکرخی سماعاً قال اخبرنا ابو عامر محمود بن
قاسم الازدی قال اخبرنا ابو العباس احمد بن محمد بن احمد بن محبوب المحبوبی قال اخبرنا
الامام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی رحمهم الله،

سنن نسائی | انه یروی من محمد المدعو بجار الله عن والده عز الدین عبد العزیز
قال اخبرنا الحافظ تقی الدین محمد بن علوی المالکی اذناً قال اخبرنا قاضی القضاة
ابن زین الدین ابی بکر بن الحسین المراغی المدنی قال اخبرنا المسند برهان الدین

ابراهیم بن محمد الدمشقی الموذن سماعاً قال اخبرنا مسند الدنیا شهاب ابو العباس
احمد بن ابی طالب، قال أخبرنا ابو طالب عبد اللطیف بن محمد قال اخبرنی ابو ذرعہ
طاهر بن محمد بن طاهر المقدسی سماعاً قال اخبرنا محمد عبد الرحمن سماعاً قال
أخبرنا ابو النصر احمد بن الحسین بن محمد الدینوری قال حدثنی ابو بکر احمد بن محمد
بن اسحق السنی قال حدثنی ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی النسائی،

سنن ابن ماجہ | انہ یروی محمد المرعو بجار اللہ عن والدہ عز الدین عبد العزیز
قال أخبرنا الشیخان الحافظان تقی الدین محمد علوی المکی و قاضی القضاۃ
شهاب الدین احمد بن علی بن حجر اذنا قال البرهان ابراهیم بن صدیق الدمشقی
سماعاً، قال اخبرنا مسند الدنیا ابو العباس احمد بن ابی طالب الصالحی
إذناً قال اخبرنا ابو محمد عبد اللطیف بن محمد بن علی قال اخبرنا
ابو منصور محمد بن الحسین القزوینی سماعاً قال اخبرنا ابو طلحۃ
القاسم بن المنذر الخطیب قال اخبرنا ابو الحسن علی بن ابراهیم بن العطار
قال اخبرنا الامام ابو عبد اللہ محمد بن یزید القزوینی المعروف
بابن ماجہ۔

موطا امام مالک | یرویہ بن محمد المدعو بجار اللہ عن والدہ عز الدین
عبد العزیز عن شهاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن حجر قال اخبرنا
العلامہ برهان ابراهیم بن احمد بن الواحد قال أخبرنا المسند ابو عبد اللہ
محمد بن جابر بن محمد بن القاسم وادی آشی تونسی قال اخبرنا ابو محمد
..... عبد اللہ بن هارون القرطبی الطائی سماعاً قال اخبرنا القاضی ابو القاسم

احمد بن زید بن عبد الرحمٰن بن تقی قال اخبرنا ابو عبد اللہ بن فرخ الفقیہ
مولی محمد بن الطلاع قال اخبرنا ابو ولید یونس بن عبد اللہ بن مغیث
عن ابی عیسیٰ یحییٰ بن عبد اللہ عن ابیہ عبید اللہ بن یحییٰ عن ابیہ الامام
یحییٰ بن یحییٰ اللیثی عن الامام مالک،

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اُن کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچوں کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے، جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں قیمت :- ۱۲؍

ہندستان کی کہانی

ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان میں لکھا گیا ہے تاکہ ہمارے مکتبوں اور ابتدائی مدرسوں کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکیں، ضرورت ہے کہ رسالے چھوٹے بچوں کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ اُن کو معلوم ہو کہ وہ کون تھے، اور اب کیا ہیں،
ضخامت ۶۰ صفحے قیمت :- ۴؍

(از مولوی عبد السلام قدوائی ندوی)

"منیجر"

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

بسلسلہ ماہ مئی سنہ ۳۰ء

فارسٹر نے جس کتبہ میں اپنے زور تحریف سے حضرت ہود کا نام پڑھکر اس مین نصرانیت کے جراثیم دکھانے کی کوشش کی ہے، اس کا چربہ دیکھئے۔

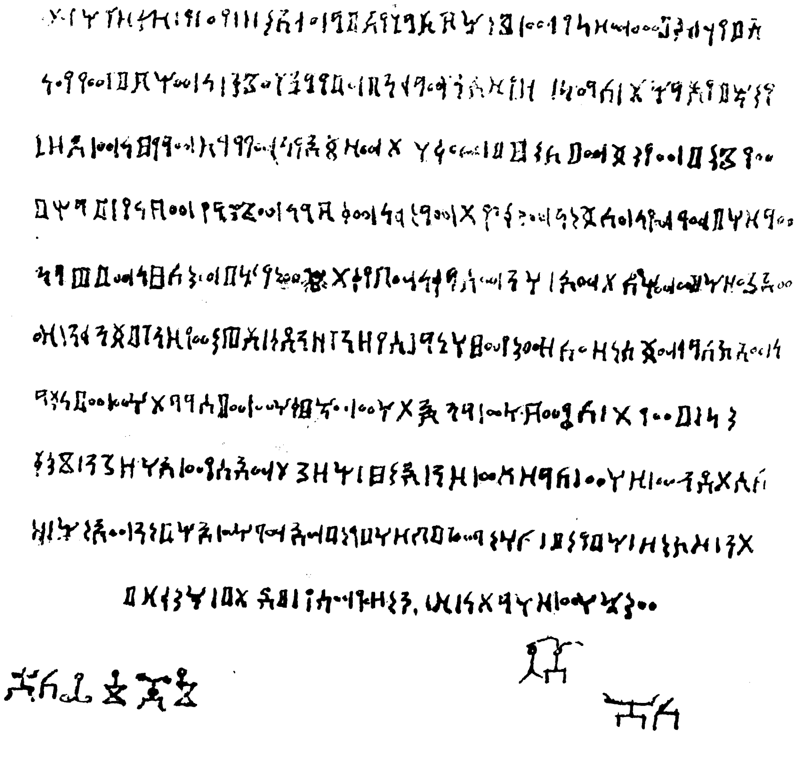

میری قرأت کے مطابق یہ ایک نظم[1] ہے جو حسب ذیل ہے،

سَمِیْق . السَّس ... وذْ یَمَن ...

وَشَرَح ذاکَلَةَ یُصْعِلا .

اَکَرْ ذَوِیَ .. قَراذْ نَذِ لْ

حَیت برَخُو سِیلُ ھِتّاَ کل

نَوَ .. ذِ یَتَ شَنَہِ .. لَدُ نْ مَا ... مَثْلَنَہْ ... شُرُ قْنَا .. حَبِ مَا .. یَمَن ..
لیَسْرَ مَا .. یرِ زّعُ .. مُکر ذمّا ...

تھتَا .. ذزشِیْنَاَ .. یلِلْ ذو ..

لِیمُنی .. یصذِ ءُ .. لِذْ حمیٓ ..

یَدُ .. یَنَاَ .. کُزُدْنَاَ .. رَمّیتا ..

لِرَدْ نا .. قذلْنَاَ .. شرلیا .. ذَنِی ولُحُو .. شَشْ .. ذَحَرَ .. وَ .. حلکتا .

شَلَھْنا .. سَلَقْنَاَ .. ذْ یُقَتِہْ ..

دَیحِمَا .. دَکَفْنَاَ .. مِطَلَنِ نَاّ

سکا کَلنا .. زکُرُدا .. کَذَ .. دا ..

مھرلوس ینِ نون نَصقا سطر .

وذْ نام زَنَدُ نوُ ذِ دَنا مُ ..

یتوکّت .. ذہ . ولِنُشّتِہْ ..

وخلقہ .. ومُسَلَّتِہ ..

---

[1] اسے نظم کی صورت دیکر پڑھنے میں کاتب حروف اپنی محترم دوست مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کے مشورون کا ممنون ہے ،

ومنقل.. کستۃ صبن.. وذۃ..

وکل ذک

وذ نوش رضا حبشنا بشیی

وشہ ذشن وذدق تنو ذکو ذ وخمیر ماکھرل،

وملث وخمیر ما.. شق..لہ.. وشح مرلو.. شرح ذو..رخت..

وتخل تنوذ وشر ذ .. یا..

ستام شتو وخرق تحر،

اس کو نظم کی صورت مین لکھنے کی غرض سے ہم نے سطر سطر کا اتباع نہین کیا، اصل کتبہ کی سطر جس لفظ سے شروع ہوتی ہے، اس پر نمبر لگا دیا گیا ہے، قرأت مین کوئی نقش محذوف نہین ہے، تشدید، تنوین اور تطویل حرکت کے علاوہ کوئی حرف زائد نہین ہے، فارسٹر اور روئید جرد دونون کی قرأت کے برخلاف یہ قرأت حذف و اضافہ سے پاک ہے،

وزن و قافیہ | یہ نظم ۲۸ مصرعون کا مجموعہ ہے جن مین سے ۲۷ مصرعے تو فعولن فعولن فعولن فعو کے وزن پر ہین، اکیسوان مصرعہ فعولن فعو کے وزن پر ہے، یہ حیرتناک امر ہے، قوافی کا عجب انداز ہے،

مصرعہ نمبرا و نمبر۲
مصرعہ نمبر۳ و نمبر۴
مصرعہ نمبر۷ و نمبر۹
مصرعہ نمبر۱۸ و نمبر۱۹ و نمبر۲۰
مصرعہ نمبر ۲۵ و نمبر۲۶،

} ہم قافیہ ہین، باقی مصرعون مین قافیہ کی پابندی نہین کی گئی ہے،

زبان کتبہ | اس کتبہ کے اکثر الفاظ متداول عربی کی کتب لغت مین ملین گے، اس لئے زبان کتبہ

عربی سمجھنا چاہئے، عبارت کو متداول عربی کے قواعد پر ڈھال کے ہم نے پڑھا ہے، مگر چند مقامات پر عربی نحو کے خلاف جانا پڑا،

(۱) ... ین مصرعہ مین لیمنا اور لن حما کے الفاظ مین عربی قاعدہ سے لیمن اور لن حمِ ہونا چاہئے، عربی کی نحو سے تطبیق کی غرض سے ہم نے ان دونون لفظون کے آخری الفون کو ی سے لکھا، عربی مین ایسے الفاظ کی بکثرت مثالین ہین،

(۲) گیارہوین مصرعہ مین ثمرلیا کا لفظ ہے، جسے قاعدہ سے ثمر لئے ہونا چاہئے لیکن ہمدانی نے اکلیل مین لکھا ہو کہ اہل حمیر خذ بعیر یک کی جگہ خذ بعیراک کہتے تھے،

(۳) مصرعہ دوم مین عربی قاعدہ سے اکملا ہنین تو یکملان ہونا چاہئے، مگر ضرورت شعری یا زمانہ کتبہ کے جواز نے اسے یکملا کر دیا،

لغات | کتبہ کے اکثر الفاظ لغت کی متداول کتابون مین ملتے ہین جن الفاظ کو عام ناظرین باسانی تلاش کر سکتے ہین، اُن کو چھوڑ کر باقی الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے،

مکرذما، ذحمی، ذحم، ذنی، ید نون اور ثمر ذ مین ذال کو دال بنا دینے پر یہ الفاظ لغت مین مل جائین گے، وَذہ کو ودہ پڑھکر استیدہ کا مرادف قرار دیا جا سکتا ہے، اسی طرح ذیل کے الفاظ کو بھی ذرا تغیر کے ساتھ ناظرین لغت مین پا سکتے ہین،

۱- حَیت = حوت (منڈلانا) سے فعل کے وزن پر

۲- ذیت شنہ = ذات سنتہ

۳- یضد = یصادی (مقابلہ کرتا ہے)

۴- ینآء = ونی (عربی کی مثال داوی عبری مین مثال یائی ہوتا ہے اور ہمزہ آخر بکثرت ی سے بدل جاتا ہے)

(۵) نصقاسطر = نسقاسطر = قاف کے پہلے کی سین عموماً صاد سے بدل جاتی ہے تاج العروس مین ہی کہ ابن عباد نے کہا

"نسقان فلکہ کے قریب دو ستارے ہین، ایک یمانی ہے ایک شامی (ن س ق) فلکہ چند دائرہ نما تارے ہین، سماک رامح کے پیچھے بنات النعش کے سامنے جن کو نبے تصعۃ المساکین کہتے ہین (ف ک ک)"

لفظ نسقا کی سطر کی طرف اضافت بتاتی ہے، سطر سے مراد ستارون کی وہ جھرنٹ مراد ہے جس مین نسقان واقع ہین،

(۶) ذکب = ذکی، ذہین، تیز فہم،

ذیل کے الفاظ کا ترجمہ عبرانی لغت کی مدد سے کیا گیا ہے

(۷) کلہ = تباہ کاری

(۸) کوز = سخت دلی

(۹) شلہنا = ہم نے نکال دیا،

(۱۰) نحل = فرمان روا ہوا،

(۱۱) کستہ = عرش

ذیل کے الفاظ نہ عربی لغت مین ملے، نہ عبرانی لغت مین، مگر اُن کے مطالب قرینہ سے معلوم ہوتے ہین

(۱۲) اکر = ذوی کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ لفظ نباتات سے متعلق ہے، ہوا کرت کے معنی ہین مزارعت' اکر بمعنی زراعت،

(۱۳) ہتا کل = اکال وصول کیا، عربی مین اس چیز کو اکال کہتے تھے، جو امرا، اور حکام کو رعایا سے ملتا تھا، عربی افتعل عبرانی مین تفعل اور ھتفعل ہی،

۱۴۔ ذذ: غالباً ایرانی فذ (قلعہ)

۱۵۔ لرونا: غالباً لرونیا (ہماری سنگ اندازی سے)

۱۶۔ شہرلیا: سابق لفظ قذن بتاتا ہے کہ یہ قذالین کا مرادف ہے، پشت سر کے یمین ویسا کو قذالین کہتے ہین،

۱۷۔ مطلق: م = من } محض قیاسا
طلن = دیار }

۱۸۔ سکاکل: دشمن محض قیاسا

۱۹۔ یتوکت: ؟؟؟

۲۰۔ شمس: خادم بن گیا، (مصری "حرشسو" کا ترجمہ کیا جاتا ہے (اتباع حور)

۲۱۔ ہرل: ؟؟؟

۲۲۔ ستام: غالباً مجرم

ترجمۂ نظم: ان الفاظ کے علاوہ اور جتنے الفاظ ہین، یا تو اسماء و القلاب ہین یا ذرا سی توجہ پر ناظرین ان کو کتب لغت مین تلاش کرلین گے، اس لئے اب ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے؛

سمیتی نے بنیاد ڈالی اور ذونین نے،

اور ذو شرح نے تباہ کاری کی حد کردی

کھیتی مرجھا گئی اور گاؤن بن گیا کینہ

منڈلانے والا گدھ لیسل محصول لینے کو

ارادہ کیا اوس نے ایک بھولی بھالی کا پانی کے پاس، اس کی ناک اور کان کاٹ لئے ہماری آفتاب

وشون نے، کیا... خوب ہے مین کا پانی،

یسار آفیتین ڈھانے لگا یکجا کر کے

قلعہ سینا کے نہات کو۔ یالل دو

یمن کی طرف سے مقابلہ کرنے لگا، مدافعت سے

ایک بازو عاجز ہو گیا، ہماری سنگ دلی بڑھ گئی

اپنی سنگ اندازی سے کمینہ کی پشتِ سر ہم نے زخمی کر دی، شاس اور حالکہ کے بافندہ نے

مدافعت کی،

ہم نے نکال دیا، اذیت دی، ذو یقنہ

ریاح کو ہم نے لاتین مار کر اپنے دیار سے بھگا دیا

ہمارے دشمن ہماری کے تھیلے بن گئے ایسا دیکھ کر

بہادر ہرہ نکہ کے دونوں ستارون تک پہنچے

اور ندنوذ کے مغنی نے ترانہ گایا،

...یہ شخص اور اپنی وُرّہ بازی

اور طور طریقہ اور شمشیر بازی

اور صین کی حکومت کے نکل جانے سے مغلوب ہو گیا،

اور عاجز ہو گیا تیز فہم

اور ذو نوش نے حبش کو راضی کیا، وہ خدمت گار بن گئے،

اور صورت بگڑ گئی، بدحال کرنے والے کی اور نیزے مارے گر ذکے تنوذ نے اور حمیر... جیسا ہو گیا،

اور بادشاہ اور حمیر کو اس کا دکھ ہوا

وشع سوت اور ذوشرح کمزور ہو گیا۔

اور تخو ذ حاکم ہوا، اور خدا نے پراگندہ کیا،

بد زبانی کے مجرم کو اور پاش پاش کر دیا، -

اماکن | اس نظم مین نام اماکن کے ہین جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

صین | عربی روایات مین کئی کہانیان ہین جن مین تبابعہ یمن کو صین پر حکمران بتایا گ

تبابعہ مین سے ایک شمر الصباح تھا جس کی بابت شاعر کہتا ہے کہ

من بعد ملک الصین اصبح ھالکا

اکرم بہ من ھالک محتاج

عام طور پر اس صین کو چین کا معرب سمجھا جاتا ہے، بعض کہانیان بھی اس کی تائید ک

ایک صین وہ ہے جس کی بابت شمردل بن شریک نے کہا،

حیث یقال للریاح اسفین	ہوا ؤن کو بہنے کا حکم ہوتا ہے، تو ز
ہوج یصبحن فلا ینبین،	زور سے بہنے لگتی ہین، اور ہر سمت بہ
وکل وجہہ للسری یسرین	لگتی ہین، یبرین اور حضرموت سے
بلغن اقصی الرمل من یبرین	کر ریگ زار کی حد اور صین تک
وحضرموت و بلغن الصین	پہونچتی ہین،

(جزیرۃ العرب ھمدانی ص ۳۰۲)

ان اشعار کے صین کو بھی چین ہی سمجھا جاتا ہے لیکن شاعر صریحًا اس ہوا کا ذکر کرتا ہے

اور حضرموت سے شمال کو روانہ ہوتی ، اور ریگ زار عرب کی آخری حد اور صین تک پہنچ جا

توراۃ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کوہ طور کے مشرق مین جو علاقہ ہے، توراۃ مین اس کا نام سین

ہے اور اس کے مغرب مین مصر سے ملا ہوا جو علاقہ ہے اس کا نام دشت سین ہے، اسی سین ک

سے ایک قصاص شاعر ایک تبع کی زبان سے یوں ذکر کرتا ہے کہ

وعلی بنی حام غدوت بطوہ بالصین حتی بددوا تبدیلا

صین میں بنو حام پر میں نے حملہ کیا، اور ان کو پراگندہ کر دیا، زبور میں ارض حام مصر کا نام ہے۔ تورات میں حام کو مصر و کنعان اور کوش و فوط کا مورث بتایا گیا، ہو اس کتبہ کے اندر صین کے نام سے اسی علاقہ بنو حام کا ذکر ہے جو طور و مصر کے درمیان ہو، اس کتبہ کے مطابق اس کے اندر مذکورہ واقعہ سے پہلے تک صین پر ملوک یمن کی حکومت تھی، مگر انہی دنوں وہ وہاں سے محروم اور بے دخل ہو گئے۔

شیا | مراد سینا طور سے مشرق کا علاقہ

حاکہ | معجم البلدان میں ہے کہ حاکہ بلاد عذرہ کی ایک وادی کا نام ہے، بنو عذرہ کی شان میں نابغہ نے کہا،

عظام اللھی ابناء عذرۃ انھم لھامیم یستلھونھا فی الحناجر

ھم منعوا وادی القری من عدوھم بجمع شدید للعدو والمکابر

(یعنی)

"بنو عذرہ بڑے کھاؤ پیر ہیں، انھوں نے اپنے دشمن سے وادی القریٰ کی حفاظت کی تھی"

"بلاد عذرہ وادی القریٰ میں تھے، اس لئے حاکہ بھی وادی القریٰ کے اندر واقع تھا"

شش | شش سے مراد ایک مقام شاس ہے، ابن موسیٰ نے کہا کہ یہ مدینہ اور خیبر کے درمیان ایک راستہ کا نام ہے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خیبر کو چلے، تو شاس کی راہ چھوڑ کر مرحب کی راہ سے چلے (معجم البلدان)

یمن | مدینہ منورہ سے ایک برید کے فاصلہ پر صاحک اور صویحک نام دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی کا نام یمن ہے، حضرت اہبانؓ الاسلمی یمن کے باشندہ تھے، یہاں بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم رہتی تھی

سیرت ابن ہشام میں جو بائیس کا ذکر آیا ہے، غزوۂ بدر کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تربان، ملل، غمیس الحمام اور مرین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے اور غزوۂ بنو لحیان کے سفر میں غراب جبل محیض، البتراء پھر ینین ہوتے ہوتے صخیرات الیمام سے گذرے،

یمنی | یمن کے مقام میں یسیل نام ایک سرکاری محصل کی توہین کی گئی، یسار نام ایک حاکم نہات کی فوج لے کر سینا سے انتقام کو چلا جس کا مقابلہ حاکہ اور شاس والوں نے کیا، یمن کی طرف سے ذوبائیل نے یمن پر چڑھائی کی، اس لئے سینا، حاکہ اور شاس کے ساتھ کتبہ میں یمن کا ذکر بھی آیا ہے،

حبش | اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ یمن والے غالب رہے، یسارا اور ذوبائیل کی فوجوں نے شکست کھائی، مجبوراً ذونوش نے جو غالباً ان دنوں یمن کا بادشاہ ہوگا، اہل حبش کو خوشامد کرکے اپنی فوج میں داخل کیا، اس حیثیت سے کتبہ کے اندر حبش کا ذکر آیا ہے، (باقی)

دار المصنفین کی دوسری نئی کتاب

تاریخ اندلس

اندلس پر اردو میں بکثرت مضامین اور کتابیں لکھی گئیں، اور بکثرت عربی و انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا لیکن پھر بھی ایک محققانہ اور مستند کتاب کی ضرورت باقی تھی، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جو درحقیقت دار المصنفین کے پیش نظر سلسلۂ تاریخ اسلام کی ایک اہم کڑی ہے، اس کی متعدد جلدیں ہیں، جو بتدریج شائع ہونگی، اس جلد میں شروع میں اندلس کے طبعی و تاریخی جغرافیہ اسکی قدیم تاریخ، وہاں کے باشندوں اور مختلف حکومتوں کی تفصیل، پھر فاتح اندلس طارق بن زیاد (۹۲ھ / ۷۱۱ء سے ۹۳ھ / ۷۱۲ء) سے لیکر عبدالرحمٰن اوسط ۲۰۶ھ – ۲۳۸ھ تک وہاں کی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ قلم بند کی گئی ہے،

(مرتبہ سید ریاست علی صاحب ندوی) "منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو آج کل ہمارے جمہوریۂ ہند کے صدر ہیں، ۱۹۴۷ء عیسوی میں ایک کتاب "India Divided" لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب تک اس کے تین اڈیشن نکل چکے ہیں، اس کے ابتدائی حصہ میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی، سیاسی اور علمی روا داری پر بھی تبصرہ ہے جس کے خاص خاص حصے ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں، آج جب کہ ایک خاص حلقہ میں یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت بہت ہی جابرانہ اور متعصبانہ تھی، ذیل کی تحریر پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ اس قسم کی باتیں عدم واقفیت اور محض تعصب کا نتیجہ ہیں،

ڈاکٹر راجندر پرشاد رقمطراز ہیں:-

"عملی طور پر ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ مسلمان بادشاہوں نے مندروں اور مٹھوں کیلئے جائدادیں وقف کیں، اور عبادت گذار اور صاحب علم و کمال پنڈتوں کو جاگیریں دیں، یہ بہت کچھ دکھایا جا چکا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کے کتنے مندروں اور عبادت گاہوں کو مسمار کیا، لیکن اگر کوئی محقق ان کثیر التعداد اوقاف اور جاگیروں کی فہرست تیار کر دے، جو مسلمان حکمرانوں

کی طرف سے ہندوؤن کی عبادت گاہون کو دی گئی ہین، تو یہ بڑا مفید کام ہوگا جنوبی ہند کی تاریخ کے طلبہ کو ایسی مثالین بہت ملین گی کہ عادل شاہی، قطب شاہی اور آصف شاہی بادشاہون نے برہمنون کے لئے بہت سی جاگیرین وقف کین، بودھ گیا کے مہنت کی زمینداری کی سالانہ آمدنی لاکھون روپیے ہے، یہ زمینداری دہلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ کا عطیہ ہے، جسے اُس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے مہنت لال گیر کو ستی پورتاراڈیہہ کا پورا علاقہ عطا کیا، مہاراجہ دربھنگہ کا علاقہ ہندوستان کی سب سے بڑی زمینداری ہے، یہ اکبر نے موجودہ مہاراجہ دربھنگہ کے مورث اعلیٰ کو دی تھی، جو زہد و فضل مین نمایان حیثیت رکھتے تھے، شیر شاہ نے ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے جاگیرین وقف کین، ان جاگیرون کا انتظام خود ہندو ہی آزادانہ طریقہ پر کرتے تھے، شیر شاہ اپنی رواداری کی وجہ سے ہر فرقہ مین مقبول تھا، کشمیر کا حکمران سلطان زین العابدین امر ناتھ اور شاردا دیوی کے مندرون مین گیا، تو وہان کے زائرین کے آرام و آسایش کے لئے مکانات تعمیر کرائے، ۱۸۰۱ء مین ہردوار نجیب آباد کے پٹھانون کے زیر نگین تھا، نجیب آباد کے نواب نے ہردوار کے جاترون کے لئے بڑے بڑے مکانات بنوائے، جو آج تک موجود اور ہندوؤن کے قبضہ مین ہین،

عالمگیر کے عہد کا مورخ منشی سجان رائے خلاصۃ التواریخ مین لکھتا ہے کہ "دیپالپور مین جو کالا نور کے پاس واقع ہے شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے، ہندوؤن اور مسلمانون دونون کو اُن سے بڑی عقیدت تھی لیکن ایک ہندو کی عقیدت اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد اسی ہندو کو مسلمانون اور ہندوؤن نے مل کر اُن کے مزار کا متولی بنایا، چند سال کے بعد کچھ مسلمانون نے شورش کرکے مذہبی بہانے سے ہندو کو تولیت سے محروم کر دینا چاہا، لیکن عالمگیری حکومت نے اس شورش کو کامیاب نہین ہونے دیا، اور جب کہ یہ کتاب (یعنی خلاصۃ التواریخ) لکھی جارہی ہے، عالمگیر کی حکومت کا تیسرا سال ہے لیکن اس مزار کی تولیت بدستور ہندوؤن ہی کے ہاتھ مین ہے"۔

حیدرآباد دکن مین ایک مشہور درگاہ کی تولیت کا سلسلہ ایک برہمن خاندان مین چلا آتا ہے، نظام

حیدرآباد نے اس درگاہ کے لئے ایک بڑی جاگیر وقف کی ہے بعض مسلمانون نے ہندو متولی کو علٰحدہ کرنا چاہا، مگر نظام نے نہین ہونے دیا، حیدرآباد شہر کے اندر سیتارام کا ایک مندر ہے ایک اور مندر ماہور (عادل آباد) مین ہے ان دونون مندرون کے لئے حکومتِ نظام کی طرف سے جائداد وقف ہے جس کی سالانہ آمدنی پچاس ساٹھ ہزار ہے، ناندیر مین سکھون کے ایک گوردوارے کے لئے بھی نظام نے ایک جاگیر عطا کی ہے جسکی سالانہ آمدنی بیس ہزار ہے،

۱۱۶۷ھ مین احمد شاہ بہادر غازی نے ایک سند عطا کی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے:-

ضلع اکبرآباد کے قصبہ اچنیرا کے زمیندارون اور کاشتکارون کو معلوم ہو کہ شتیل داس بیراگی کو پنیارتھ کے طور پر شری ٹھاکرجی کے بھوگ اور نوید کے لئے سترہ بگھے کھیت کی معافی دیجاتی ہے تاکہ اُن کی آمدنی سے شری ٹھاکرجی کے اخراجات پورے ہوسکین اور پوجا پاٹ ہوتا رہے، اچنیرا کے بازار کے چودھری کو معلوم ہو کہ وہ شری ٹھاکرجی کے لئے بیس بھر غلہ ادا کرے، بیراگی کو اس حق سے محروم نہ کیا جائے، تاریخ ۴ رمضان ۱۱۳۹ھ ف

ایک اور سند شہاب الدین خان کی ہے جو اُس نے چنچواد کے مشہور گنیش مندر کے اخراجات کے لئے عطا کی تھی اس سند کے لئے قول نامہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ یہ ہے:-

"یہ قول نامہ چنچواد وسندریہ گوشائین کے لئے پرگنہ پونا کے بارہ مین ہے جس کے لئے خان حکمت نہاد خان نے اطلاع دے کر جاگیر کے ایک قول کی درخواست کی ہے، اس لئے یہ تحریر دیجاتی ہے کہ وہ اس گاؤن کے لوگون کے ساتھ رہے، اور اسکی زمین کو زرخیز اور بہتر بنائے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کو کوئی ضرر یا دیب اٹھانی پڑے، اس تولیت نامہ کی تاریخ ۱۱ ذیقعدہ ۱۱۲۶ھ ہے"،

الہ آباد مین اسی طرح کے دو فرامین ہین، ایک مشہور مندر مہیشور ناتھ کے پجاریون کے نام ہے جسکو اورنگزیب نے   کیا تھا

اورنگزیب نے جگجیون کے لڑکے گردھر ساکن موضع بستی، ضلع بنارس جدو مشرا ساکن ہیش پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلبھدر مصرا، کو بھی جاگیریں دیں، یہ سب کے سب مندروں کے پجاری تھے، اورنگزیب نے ملتان کے مندر توت لامی کے لئے مشرا کلیان داس کو سو روپیہ کا وظیفہ عطا کیا، یہ مندر اب تک موجود ہے،

سلطان محمد مراد بخش نے ۱۰۶۵ھ میں حکم دیا کہ اوجین کے گدام سے مہاکل کے مندر کی روشنی کے لئے چار سیر گھی روزانہ دیا جائے،

بہت سے مسلمان حکمران علوم و فنون کے سرپرست رہے ہیں جنھوں نے صرف فارسی اور عربی زبان کو فروغ دیا، بلکہ سنسکرت زبان اور ہندوستان کے لٹریچر اور سائنس کی بھی سرپرستی کی، انھوں نے ہندوستان میں علوم و فنون کو جو ترقی دی، اُن کو یہاں مختصراً بھی لکھنا ممکن نہیں، شاہانہ سرپرستی میں سنسکرت کی متعدد کتابیں فارسی اور عربی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں، بہت سے مسلمان حکمرانوں نے خود سنسکرت زبان کی تحصیل اور اُن میں سے بعض نے سنسکرت کی کتابوں کو ترجمہ بھی اس غرض سے کیا کہ ہندوؤں کے علوم کے خزانے مسلمانوں تک بھی پہنچ جائیں، انھوں نے دوسروں کو اس زبان کی تحصیل کی ترغیب دی، ہندو طلبہ کے تعلیمی نصاب میں سنسکرت زبان بھی ہوتی تھی، غرض سنسکرت زبان کی سرپرستی ہر ممکن طریقہ سے کی گئی، ڈاکٹر جیمز ایچ کربنس نے اسلامی ہند میں تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے، کہ

مسلمان بادشاہ اور شہزادے ہندو کلچر کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے تھے، مسلمانوں کی تعلیم میں ہندی ادب کا اختلاط اسی طرح ہو گیا تھا جس طرح مغل مصوری راجپوتوں کی مصوری سے مل جل گئی تھی ہندوؤں کے ادب العالیہ کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، اور رفتہ رفتہ فارسی کلچر سے ہندو کلچر متاثر ہوتا گیا،

پرتگالی مورخ فاریا سوزا لکھتا ہے کہ

"ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے تھے مسلمان بادشاہ ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں

پر مامور کرتے اور ان کو اعلیٰ منصب عطا کرتے تھے" اس کے یہ معنی ہین کہ ہندوؤن کے ساتھ مسلمانون کے مقابلہ مین کوئی تفریق نہین کی جاتی تھی، ہندو اپنے مذہبی فرائض اور مراسم کو ادا کرنے مین بالکل آزاد تھے اور مسلمان ہندوؤن کے مذہبی جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے،

سر الفرڈ لائل ایشیاٹک اسٹڈیز مین رقمطراز ہین کہ مسلمان حکمران ہندوستان کو اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے تخیل سے اتنے دور تھے کہ کبھی مسلمانون نے بھی اسکی کوشش نہین کی کہ ملکی نظم و نسق کے بڑے بڑے عہدے صرف مسلمانون ہی کے لئے مخصوص رہین،

اورنگزیب نے بہت سے لائق ہندوؤن کی ملازمت کے لئے شاہجہان کے پاس سفارش لکھی، جلپور کے دیوان کی جگہ خالی ہوئی، تو اورنگزیب نے ایک راجپوت عہدیدار رام کرن کی سفارش کی بعض اسباب کی بنا پر شاہجہان نے اس سفارش کو قبول نہین کیا، تو اورنگزیب نے پھر شاہجہان کو لکھا کہ اس جگہ کے لئے کوئی اس سے بہتر آدمی مل نہین سکتا، اورنگزیب کی سفارشون کی اور مثالین بھی رقعات عالمگیری اور آداب عالمگیری مین مل سکتی ہین،

عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے ہندوؤن سے زبردستی اسلام قبول کرایا لیکن ہم یہان پر ایک عجیب و غریب واقعہ کا ذکر کرتے ہین جس سے اورنگزیب کے رجحانات کا اندازہ ہوگا، شاہجہان نے وندھیرا کے راجہ اندرامن کو عدول حکمی کی بنا پر قید کر دیا جب اورنگزیب دکن کا صوبیدار مقرر ہوا تو اُسنے راجہ کی رہائی کے لئے شاہجہان سے سفارش کی لیکن شاہجہان اندرامن سے بہت زیادہ برہم اور ناخوش تھا، اس لئے اورنگزیب کی سفارش قبول نہین کی اور اس کو لکھ بھیجا کہ اندرامن نے بار بار تکلیف پہنچائی ہے وہ صرف اس شرط پر رہا کیا جا سکتا ہے کہ اسلام قبول کرے، اس پر اورنگزیب نے سخت احتجاج کیا اور شاہجہان کو لکھا کہ اس شرط پر عمل نہین کیا جا سکتا، یہ بہت ہی غیر مدبرانہ اور کوتاہ اندیشانہ فعل ہوگا، اسکی رہائی خود اسی کے شرائط کے مطابق ہونی چاہئے اس سلسلہ مین اس نے شاہجہان کے وزیر اعظم کو ایک رقعہ لکھا جو آداب عالمگیری مین موجود ہے،

"ص ع"

ادبیات

فطرت اور مومن

از

جناب شہ زور کاشمیری

لحد کے خواب کا ہے سلسلہ اسکی گران خوابی ۔ جو فطرت کے تقاضون سے کرے دانستہ سرتابی
ہے فطرت ایک مجموعہ قوانینِ الٰہی کا ۔ ازل سے جن کا پیرو ہے جہانِ خاکی و آبی
بصارت ہے تو فطرت کا صحیفہ پڑھ کبھی تو بھی ۔ بصیرت کے لئے کافی ہے اک جگنو کی شبتابی
صلاحیت ہے ہر ذرہ مین صحراؤن پہ چھانے کی ۔ ہر اک قطرے کی فطرت مین ہے طغیانی و سیلابی
دلِ ظلمت مین پوشیدہ ہین صد ہا چاند اور سورج ۔ نہان ہر خار کے دامن مین ہے جنت کی شادابی
کتابِ فطرتِ رنگین کے اوراق پریشان ہین ۔ دلِ رومی، دماغِ طوسی و چشمانِ فارابی
ہے فطرت ایک دستور العمل مردِ مجاہد کا ۔ ہے جس کا مقصدِ ہستی جہانبانی جہانتابی
ہے فطرت کی سی گیرائی نگاہِ مردِ مومن مین ۔ ملی ہے اُس کے دل کو فطرۃً تقدیرِ سیمابی
ہے گر نغمات سے معمور اک سازِ ازل فطرت ۔ تو مومن کی نظر اُس کے لئے ہے ضربِ مضرابی
ہے مومن ایک بحرِ بیکرانِ رحمتِ یزدان ۔ مسلمانی ہے صلح و امن کے تشنون کی سیرابی
بجز علم الیقین ممکن نہین ادراک فطرت کا ۔ اُنھی انوار کی ہو تیرہ دل مین بھی ضیاتابی

بجھانے دے یقین کو عقل کی افسردہ شمعیں سب — طلوع مہر کا مژدہ ہے تاروں کی تنک تابی

تری تخئیل پر ہو باز در اسرار فطرت کا
عطا تجھکو کرے خالقِ دلِ مومن کی بے تابی

غزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن ولی ڈپٹی کلکٹر آرہ

عقل الجھ کے رہ گئی وہم کے تار و پود مین — حسن کی دیکھ لی جھلک عشق نے ہر وجود مین

کعبہ ہو یا کہ بتکدہ جھک گئی خود جبینِ شوق — کس کو دماغِ امتیاز بیخودیِ سجود مین

ڈھونڈھ چکا ہون جو بجو دشت بدشت کو بکو — ایک بھی ہم نفس نہین کارگہِ وجود مین

جن کے ہین دل جنون بدوش کان ہین جن کے حق نیوش — پاتے ہین کیف سرمدی نغمۂ چنگ و عود مین

کافرِ عشق کے لئے عین حرم ہے دیر بھی — گو ہے در بتان پہ سر محو ہے دل درود مین

کاکلِ عطر بیز کی دوش پہ چھا گئی گھٹا — ڈوب گئی فضائے جان نکہتِ مشک و عود مین

جان ہو وقفِ جستجو دل ہو شہیدِ آرزو — امن و سکون نہ کر تلاش معرکۂ وجود مین

کعبۂ آرزو ہوا ہر نفسِ حیاتِ عشق — مل گیا نافۂ مراد کاکلِ مشک سود مین

مرگ بھی عین زیست ہے گرم سفر ہے گر حیات — زیست بھی عین مرگ ہے منزلِ نت و بود مین

عشق ہے حسن کا جواب حسن ہے عشق کا جواب — حسن ازل کی ہے نمود عشق کی ہر نمود مین

مسلکِ عشق مین ولی یاس و امید ہے حرام
دل کو رہین غم نہ کر فکرِ زیان و سود مین

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے علیگ رفیق دار المصنفین

(۲)

اب ایک علحدہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام تذکرہ نویسوں کے لکھنے کے بموجب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے تو اس وقت ان کا سن شریف کیا تھا؟

معین الارواح کے فاضل مولف نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۰ھ قرار دیا ہے لیکن اس سنہ کو صحیح تسلیم کرنے مین کچھ تامل اس لئے ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسون نے حضرت خواجہ کے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا سال ولادت ۵۲۶ھ لکھا ہے، (خزینۃ الاصفیا ص ۲۵۷ جلد اول)

گمان ہوتا ہے کہ مرشد و مرید مین سن و سال کا تفاوت کچھ اور زیادہ ہوگا، فاضل مولف لکھتے ہین کہ اکثر مورخین نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۷ھ لکھا ہے (ص ۵) اگر حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی تاریخ ولادت ۵۲۶ھ صحیح تسلیم کر لی جائے، تو ان کے مرید حضرت خواجہ کا سال ولادت

۵۳۷ھ تسلیم کرنے میں زیادہ تامل نہیں ہوتا ہے اب اگر ہم حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ قرار دیتے ہیں، تو ۵۶۱ھ میں ہندوستان آنے کے وقت اُن کی عمر اکتیس سال کی ہوتی ہے اور اور اگر ۵۳۷ھ کو صحیح سمجھتے ہیں، تو ہندوستان میں اُن کے ورود مسعود کے وقت ان کی عمر چوبیس سال کی ہوتی ہے، قیاس کہتا ہے کہ اکتیس یا چوبیس سال کی اتنی کم عمری میں ہندوستان آکر مستقل سکونت اختیار نہ فرمائی ہو، خصوصًا جب یہ معلوم ہو کہ مرشد کی خدمت اور پھر سیاحت میں کافی مدت گذاری، ایک اور چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ اگر ۵۶۱ھ میں اجمیر آئے، تو گویا اجمیر کے ہندو حکمران سے ۵۸۸ھ یعنی شہاب الدین غوری کے حملہ تک متصادم رہے، بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہو کہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آئے تو پرتھوی راج کو اجمیر میں اُن کا قیام گراں گذرا، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ تاریخوں میں پرتھوی راج کی تخت نشینی کی تاریخ ۵۷۱ھ ہے،[1] اور تھوڑی دیر کیلئے اگر تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت خواجہ کے اجمیر میں آنے کے دس برس کے بعد پرتھوی راج گدی پر بیٹھا اور اپنی تخت نشینی کے بعد سے حضرت خواجہ کے قیام میں مزاحمت شروع کی، تو اس کی مطلق العنانی سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ ۵۷۱ھ سے ۵۸۸ھ یعنی سترہ برس تک اُن کے تصادم کو اپنی راجدھانی میں برداشت کرتا رہا

---

[1] عاجز راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم صوفیہ میں تذکرہ نویسوں پر بھروسہ کرکے یہ لکھدیا ہے کہ

"دہلی سے اجمیر گئے، جہاں دسوین محرم ۵۶۱ھ میں نزول اجلال فرمایا، اور یہین آخر وقت تک قیام رہا۔ اس زمانہ میں اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجپوت راجہ پتھورا تھا"

اب مزید تحقیقات کے بعد یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہو گیا ہے، بزم صوفیہ میں ایک اور تسامح ہو گیا ہے، ص ۱۱۰، پر محمد یادگار کو اصفہان کا حاکم لکھدیا گیا ہے، اس سلسلہ میں بھی تذکرہ نویسوں میں کچھ اختلاف ہے، خزینۃ الاصفیاء (جلد ا ص ۲۵۵) میں ہے کہ محمد یادگار ہرات کا حاکم تھا لیکن زیادہ تر تذکرہ نویسوں نے اسکو سبزوار کا حاکم بتایا ہے اور یہی صحیح ہے،

اب یا تو ہم یہ تسلیم کر لیں کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آکر پھر لوٹ گئے لیکن جب اس کے لئے کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ۵۶۱ھ کی تاریخ غلط لکھی ہے، انھوں نے شہاب الدین غوری کے حملہ سے کچھ ہی پہلے یعنی ۵۸۶ھ میں اجمیر میں نزول اجلال فرمایا ہو، پرتھوی راج نے اُن کو تکلیف پہنچائی تو اُن کی دعاؤں سے شہاب الدین غوری ۵۸۸ھ میں حملہ آور ہوا، اس خیال کو تقویت اس سے بھی پہنچتی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی تاریخ خود معین الارواح کے فاضل مؤلف نے ۵۸۶ھ بتائی ہے، ابھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین اپنے مرشد کے ساتھ اجمیر آئے۔

اب یہ مان لیا جائے کہ حضرت خواجہ اجمیر پہلی دفعہ ۵۸۶ھ میں آئے تو اُن کے ۵۳۶ھ کے سنہ پیدائش کے مطابق ان کی عمر اس وقت پچاس سال کی ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نویس لکھتے ہیں، حضرت خواجہ کو جب اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی سے خرقۂ خلافت ملا تو اس وقت ان کا سن شریف باون برس کا تھا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵۸۸ھ میں اجمیر آکر پھر اپنے مرشد کے پاس گئے، لیکن ابھی بحث ہو چکی ہے کہ یہ ایک متنازعہ فیہ واقعہ ہے، اب اگر حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ میں مان لیں تو ۵۸۶ھ میں اجمیر آنے کے وقت اُن کی عمر ستاون برس کی ہوتی ہے، یعنی وہ اپنے مرشد سے خرقۂ خلافت لے کر اجمیر تشریف لائے۔

لیکن یہ ساری بحث کنجلک ہوتی جارہی ہے، اور ہم کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں، حضرت خواجہ کے حالات قلمبند کرنے میں تذکرہ نویسوں نے کچھ ایسی مبہم، غیر واضح، مختلف اور متضاد باتیں لکھی ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے، تو ایک لامتناہی بحث چھڑ جاتی ہے، اور کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا ہے

ایک آدھ مثال اور ملاحظہ ہو، سلطان شمس الدین التمش کو کسی تذکرہ نویس نے حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین کا اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے

ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین میں سلطان التمش کا ذکر بار بار آتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان کو حضرت بختیار کاکی سے ارادت تھی، چنانچہ ایک موقع پر حضرت بختیار کاکی فرماتے ہیں :-

"ایک رات وہ یعنی التمش میرے پاس آیا اور میرا پاؤں پکڑ لیا، میں نے کہا کہ مجھکو کب تک تکلیف پہنچاتے رہوگے، جو ضرورت ہو بیان کرو، اُس نے کہا رب العزت مجھ کو مملکت تو دی ہو لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے اُس کی باز پرس ہوگی اور اُس کا حساب دینا ہوگا، تو اُس وقت بھی آپ مجھے نہ چھوڑیں، وہ اُس وقت تک واپس نہ گیا جب تک کہ میں نے اُس کی بات قبول نہ کرلی۔ (فوائد السالکین ص ۲۹)

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سلطان التمش حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید تھا تو چشتیہ سلسلہ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ سلطان التمش کو اپنے مرشد کے مرید سے والہانہ عقیدت ہوگئی تھی، خزینۃ الاصفیا کے مؤلف نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ

"بادشاہ یعنی سلطان التمش رحم دل و عادل وسلطان کامل و مکمل از خلفائے نامدار و مریدان باوقار خواجہ قطب الدین بختیار است" (جلد اوّل ص ۲۷۶)

لیکن ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین کی ایک تصنیف گنج اسرار کی سند پر سلطان التمش کو حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید بتایا ہے (ص ۷۰) مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا گنج اسرار یا اور دوسری کتابیں جن کو فاضل مؤلف نے حضرت خواجہ کی طرف منسوب کیا ہے، اُن کی تصانیف تسلیم بھی کی جاسکتی ہیں ؟

خواجگان چشت کی تصانیف کے متعلق حضرت خواجہ نصیر الدین کا بیان خیر المجالس میں اس طرح ہے :-

"میرے حضرت پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس سرہٗ العزیز فرماتے تھے میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی، اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فریدالدین اور شیخ الاسلام حضرت مولینا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرہ میں ہیں کسی نے کوئی تصنیف نہیں کی ہے میں (یعنی مرتب خیرالمجالس) نے عرض کی کہ فوائد الفواد میں ہے کہ ایک شخص نے جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز کی خدمت میں عرض کی میں نے ایک معتبر سے سُنا ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی تصنیف سے ایک کتاب دیکھی ہے، حضرت سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس نے غلطی کی، میں نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے اس واسطے کہ ہمارے خواجگان نے کوئی تصنیف نہیں کی یہ سن کر حضرت خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ بالخیر نے ارشاد کیا کہ واقعی ہمارے حضرت سلطان الاولیاء نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی پھر میں (یعنی مرتب خیرالمجالس) نے عرض کی کہ یہ جو رسالے اس وقت میں دستیاب ہوئے ہیں ملفوظات حضرت شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ملفوظات حضرت شیخ عثمان ہرونی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت کے وقت میں ظاہر نہ ہوئے تھے، خواجہ ذکرہٗ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ تھے اگر ان حضرات کی تصنیف سے ہوتے، تو بڑے حضرت ذکر اُن کا فرماتے، اور دستیاب ہوتے"

(اردو ترجمہ سیرالمجالس ص ۳۶-۳۵، ترجمہ کی عبارت ہو بہو نقل کردی گئی ہے)

خیرالمجالس کی مذکورۂ بالا روایت ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن صاحب زبیری کی نظر سے گذری ہے لیکن ان کو اس بیان کے صحیح تسلیم کرنے میں تامّل ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"ہر چند کہ ان ملفوظات سے مولانا حمید قلندر نے انکار کیا ہے، اور خیرالمجالس (ملفوظات حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی مرتبہ مولانا حمید قلندر) میں صاف لکھا ہے کہ یہ ملفوظات آنحضرت کے نہیں ہیں، کیونکہ اُن میں بہت سی ایسی باتیں ہیں، جو آنحضرت کے علم دارشاد

کے مناسب نہین ہین، نیز ان حضرات کی کوئی تصنیف نہین، مگر افضل الفوائد (جس مین حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات مرتبہ حضرت امیر خسرو ہیں مرقوم ہو کہ خواجہ بزرگ اور حضرت سلطان المشائخ جو کچھ اپنے پیر و مرشد سے سنتے تھے، وہ لکھ لیتے تھے، ان دونون روایات کے اختلاف مین اس طرح تطبیق ہو جاتی ہے کہ سلطان المشائخ کے زمانہ تک یہ رسالے بہ شکل رسالہ جات ظاہر نہین ہوئے تھے، بلکہ تبرکاً شجرہ کے ساتھ تھے، اور جزو شجرہ سمجھے جاتے تھے، نہ کہ رسالہ جات، علاوہ ازین کسی دوسرے شخص کو ان حضرات کے ملفوظات مرتب کرنے کی کوئی خاص وجہ نہین معلوم ہوئی، غیر متعلق شخص اتنی محنت کرکے یہ رسالے کیون مرتب کرتا، نیز حضرت امیر خسرو کے بیان کو کسی طرح غیر معتبر نہین کہا جا سکتا، (صفحہ ۲۴)

عاجز راقم کے سامنے اس وقت افضل الفوائد نہین، فاضل مؤلف اگر امیر خسرو کی وہ فارسی عبارت نقل کر دیتے جس مین انھون نے ظاہر کیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ اپنے مرشد کے ملفوظات لکھ لیتے تھے، تو بہتر ہوتا، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ حضرت سلطان المشائخ کے جانشین تھے، اس نے انکے قول کو بھی نظر انداز نہین کیا جا سکتا، اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو کی رائے تو صرف اپنے مرشد کے متعلق ہے، اُس سے یہ کہان ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے مرشد اور دوسرے خواجگان چشت نے کتابین لکھین اور ان کی جو متعدد تصانیف بازارون مین بکتی ہین، وہ انہی کی ہین،

فاضل مؤلف نے کنج اسرار کے علاوہ حضرت خواجہ کی تصانیف مین حدیث المعارف اور رسالہ موجودیہ (شاید رسالہ وجودیہ مراد ہو) کا ذکر کیا ہے، یہ دونون کتابین کسی کی نظر سے نہین گذرین، صرف اُن کے نام سے منسوب ہین، علمی دنیا مین ایسی مثالین سینکڑون ملین گی کہ ایک تصنیف مالی فوائد اور دنیاوی اغراض کی خاطر دوسرے کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے، حضرت خواجہ کی عظیم المرتبت شخصیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مجاورون نے کوئی تصنیف اُن کے نام سے منسوب کر دی ہو تو

کوئی تعجب انگیز بات نہیں،"

فاضل مؤلف کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوان معین جو عام طور سے بازاروں میں بکتا ہے، وہ حضرت خواجہ ہی کا دیوان ہے، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہرچند کہ ایک گروہ دیوان معین کو معین الدین کاشفی کی تصنیف کہتا ہے آپ کا نتیجۂ فکر نہیں مانتا، مگر شوکتِ کلام زبانِ حال سے کہہ رہی ہے یہ معمولی عارف کا کلام نہیں، بلکہ اس میں جن اعلیٰ مقامات معرفت نکات تصوف اور فنائے تامہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ آپ ہی جیسے عالی مرتبت اہل اللہ فرما سکتے ہیں" (ص ۹۵)

آگے چل کر پھر رقمطراز ہیں :-

"ہماری رائے میں موجودہ دیوان آپ ہی کے جذباتِ صادقہ، فکرِ بلند اور اعلیٰ ترین سیر جبروتی و ملکوتی اور لاہوتی کا نتیجہ مبارکہ ہے، منکرینِ دیوان نے بلا کسی دلیل کے صرف آپ کا ہمنام ہونے کی وجہ سے اس دیوان کو معین الدین کاشفی کا دیوان بتایا ہے، مگر اسکی تائید میں کوئی قابلِ قبول ثبوت کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گذرا، اس لئے ہم اس دیوان کو غریب نواز کی نسبت سے محروم نہیں کر سکتے" (صفحہ ۹۵)

شاید فاضل مؤلف کی نظر سے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا مقالہ "دیوان حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری" جو رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا نہیں گذرا۔ اگر یہ محققانہ اور مدلل مضمون اُن کی نظر سے گذرا ہوتا، تو وہ ہرگز یہ تحریر نہ فرماتے کہ کوئی قابلِ قبول ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا، ابھی چند سال پہلے پروفیسر عبدالغنی کی ایک انگریزی کتاب "پری مغل پرشین اِن ہندوستان" شائع ہوئی ہے، اس میں پروفیسر موصوف نے غالباً حضرت خواجہ معین الدین کی ذات سے غایت عقیدتمندی کے اظہار میں دیوان معین کو انہی کا دیوان سمجھ کر اُن کو حافظ سے زیادہ بہتر اور

زیادہ شیرین کلام شاعر ثابت کیا تھا، پروفیسر موصوف کی اس کتاب پر پروفیسر شیرانی مرحوم نے رسالہ اردو کے شمارہ جنوری ۱۹۲۳ء میں بڑی سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تمام دنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ہی ثابت کر دیا، بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کو حافظ سے بھی بڑھا دیا ؎

آرزو خوب است اما این قدر ہا خوب نیست

پروفیسر عبدالغنی نے اس تنقید کا جواب دینے کی کوشش کی، اور اپنا جواب ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، جس کے ٹائٹل پر انھوں نے بعض غلط فہمیوں کی بنا پر "ضمیمہ رسالہ معارف" لکھدیا ہے حالانکہ ان کا یہ لکھنا بالکل درست نہ تھا، اس رسالہ میں انھوں نے حضرت خواجہ کو بعض تذکرہ نویسوں کے حوالہ سے شاعر تو ثابت کر دیا، لیکن اُن کے صاحبِ دیوان ہونے پر اصرار نہیں کیا ہے، اس رسالہ کا جواب بحواب اورینٹل کالج میگزین کے ۱۹۲۹ء و ۱۹۳۰ء کے مختلف شماروں میں پروفیسر ابراہیم ڈار اسماعیل کالج بمبئی نے دیا، اور ابھی اگست ۱۹۵۰ء کے رسالہ اردو میں بھی ان کا ایک مقالہ دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عنوان سے شائع ہوا ہے، پروفیسر محمود شیرانی مرحوم اور پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا معین الدین فراہی (کاشفی نہیں) کی تصانیف معارج النبوۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ میں بہت سی ایسی غزلیں ہیں، جو دیوان معین میں پائی جاتی ہیں، اس لئے دیوان معین درحاصل مولانا معین الدین فراہی کے کلام کا انتخاب ہے، معین الارواح کے فاضل مؤلف اگر ان تحقیقات سے باخبر ہوتے تو دیوان معین کو حضرت خواجہ کا دیوان تسلیم کرنے پر اصرار نہ کرتے، اور یہ اصرار اس لئے بھی بے جا ہے کہ حضرت خواجہ کا صاحب دیوان ہونا ان کا کوئی وصف یا کمال نہیں، اور نہ اُن کی شاعری اُن کے لئے وجہ امتیاز ہے،

معین الارواح کے حصۂ دوم میں سیرۃ مقدسہ کے عنوان سے حضرت خواجہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تعلیمات حضرت خواجہ کے ملفوظات سے مرتب کی گئی ہیں، لیکن فاضل مؤلف نے جس تلاش و جستجو سے اپنی کتاب لکھی ہے، اسی محنت و کاوش

کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے کہ ان ملفوظات میں سے کون صحیح اور کون الحاقی ہے تو یہ ان کا بڑا علمی کارنامہ ہوتا، کیونکہ خواجگان چشت کے ملفوظات کے مجموعوں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ بعض ملفوظات ان بزرگان دین کے ہرگز نہیں ہو سکتے، مثال کے طور پر حسب ذیل ملفوظ ملاحظہ ہو جس کو فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کیا ہے،

"حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر تھا، اور اہل صفہ بھی موجود تھے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہو رہا تھا، اس درمیان میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر خدمت ہوا، اور آپ کے قدموں پر سر رکھا، غریب نواز نے فرمایا بیٹھو، اس نے کہا میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ اس وقت اپنے حال میں تھے، فرمایا اس شرط پر مرید ہو سکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ، چونکہ وہ راسخ العقیدہ تھا، اس نے فوراً اس طرح کہا، غریب نواز نے اس کو مرید کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، اور خلعت خاص سے سرفراز فرمایا،

یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین سے لی گئی ہے، لیکن یہ روایت کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، گو فاضل مؤلف نے اس کی مدافعت میں یہ تاویل کی ہے، کہ

"اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے میں مذکورۂ بالا الفاظ شرعاً قابل اعتراض معلوم ہوتے ہیں، مگر لغوی معنی کے پیش نظر ہرگز قابل اعتراض نہیں، نیز صاحبان حال نے اس قسم کے کلمات اکثر فرمائے ہیں، چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید البغدادی اور حضرت بایزید بسطامی وغیرہ کے حالات میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں، بلکہ خود سرور عالم ﷺ نے بھی طواف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سرگوشی کرنے کے موقعہ پر ارشاد فرمایا، "میں نے ان سے سرگوشی نہیں کی، بلکہ خدا نے کی"، نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کو دیکھا"

اس تاویل کی حیثیت عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں، اگر ہم مذکورۂ بالا ملفوظات کو الحاقی سمجھ لین، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہین رہتی، اسی قسم کے ملفوظات کے متعلق سیر العارفین میں ہے:

ایک شخص نے حضرت نصیر الدین محمود دہلی سے عرض کیا کہ مین نے خواجہ قطب الحق والدین قدس سرہٗ کے ملفوظات مین ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے، آپنے جواب مین فرمایا کہ بالکل غلط ہے، مین نے بچشم خود دیکھا ہے، حاشا للہ یہ کلام ان کا نہین ہے، اکثر غلط غلط کلمات الحاقی ہین جو مجاوروں نے بڑھا دئے ہین کسی طرح قطب صاحب قدس سرہٗ کے حال و اعمال کے موافق نہین ہین، (جلد ۲ ص ۶۲)

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے بعض ملفوظات الحاقی ہین، جو اُن کی علمی اور نظری تعلیمات کے بالکل منافی ہین،

کتاب کے حصہ سوم مین حضرت خواجہ کی درگاہ اور اُن کے عُرس کے مراسم کی تفصیلات درج ہین، حصۂ چہارم مین حلقۂ ارادت کے عنوان سے گذشتہ اور موجودہ عہد کے ان اکابر کا ذکر ہے جن کو حضرت خواجہ سے عقیدت رہی، حصۂ پنجم مین حضرت خواجہ کی درگاہ شریف کے گذشتہ اور موجودہ درباریون کا ذکر ہے حصۂ ششم مین اجمیر کی مختصر تاریخ ہے، کتاب کے آخری تین حصے اجمیر شریف کے زائرین کے مطالعہ کے لئے مفید ہین

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے کہ اس مین حضرت خواجہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ لٹریچر اکٹھا کر دیا گیا ہے، اور آیندہ جب کوئی اہلِ قلم حضرت خواجہ کی سوانحعمری سلیقہ سے مرتب کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ کتاب بلاشبہہ بہت مفید اور معاون ہوگی،

تصوف اسلام

اسلامی تصوف کا عطر، قدما صوفیہ کی تعلیمات کا لُبِ لباب، اور اُن کی تصانیف پر تبصرہ،

قیمت :- ۸ عہ

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

یادِ ایام از نواب سر حافظ محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت چار روپیہ، پتہ غالباً راحت منزل علی گڈھ سے ملے گی،

ہمارے صوبہ کے رؤسا میں خاندانی امارت و وجاہت، ذاتی قابلیت و صلاحیت، تدبر و ہوشمندی، اخلاق و سیرت اور دینداری میں نواب سر محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری کا ممتاز درجہ ہے، اُن کی صلاحیت و سلامت روی کی بدولت کونسل کی ممبری سے لے کر وزارت، ہوم ممبری، گورنری اور ریاست حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ تک کے اعزاز ان کو حاصل ہوئے، قومی اور سیاسی کاموں میں بھی ان کا حصہ رہا ہے، جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، زیرِ نظر کتاب سے اُن کی نئی تصنیفی صلاحیت کا علم ہوا، آپ بیتی بہت زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہے، لیکن اردو میں خود نوشت سوانح عمریوں کا بالکل رواج نہیں ہے، اور سر سید رضا علی مرحوم کے اعمال نامہ کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر خود نوشت سوانح عمری موجود نہیں ہے، یادِ ایام اردو میں دوسری کتاب ہے، اس کے دو حصے ہیں، ایک صاحبِ سوانح کے نجی اور ذاتی حالات دوسرا اُن کی قومی و سیاسی زندگی، ذاتی حالات میں خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت، انتظامِ ریاست اور خدام کے تعلقات وغیرہ کے حالات ہیں، جو اگرچہ مختصر ہیں لیکن دلچسپی سے خالی نہیں، اور اُن سے اس دور کے رؤسا کی سوسائٹی اور اُن کے مذاق و مشاغل پر روشنی پڑتی ہے، کتاب کا اصل حصہ مصنف کی سیاسی و قومی زندگی کا ہے، اُن کی سیاسی زندگی چیمسفورڈ اصلاحات کے زمانہ یعنی

سنہ ۱۹۱۹ء سے شروع ہوتی ہے اور کانگریس کی وزارتوں کے قیام کے زمانہ سنہ ۱۹۳۶ء تک قائم رہتی ہے، اس درمیان میں کونسل کے ممبر، صوبے کے وزیر، ہوم ممبر اور گورنر ہوئے، اور وقتاً فوقتاً قومی معاملات میں بھی حصہ لیتے رہے، اس لیے حکومت و ملکی سیاست دونوں سے ان کا واسطہ رہا، یہی زمانہ ہندوستانی سیاست کے طوفان کا تھا، ہماری قومی، ملکی اور سیاسی مسائل اسی زمانہ میں پیدا ہوئے، نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریکیں شروع اور ختم ہوئیں، گورنمنٹ کے ساتھ آئینی اور غیر آئینی معرکے ہوئے، سائمن کمیشن آیا، کانگریس اور لیگ کے اختلافات شروع ہوئے، ہندو مسلم مسائل نے شدت اختیار کی، زمینداروں اور کاشتکاروں میں کشمکش پیدا ہوئی، غرض ایوان حکومت کے اندر اور باہر دونوں جگہ بہت سے معاملات و مسائل چھڑے، مصنف کو چونکہ حکومت اور قومی سیاست دونوں سے تعلق تھا، اس لیے ان کو ان تمام معاملات سے سابقہ رہا، اس لیے اس کتاب میں مصنف کے سوانح کے سلسلہ میں اس دور کی عموماً اور صوبہ متحدہ کی خصوصاً پندرہ سالہ سیاسی سرگذشت آگئی ہے، یہ سارے واقعات ہم میں سے اکثروں کی نگاہوں کے سامنے گذرے ہیں، اس لیے اس کتاب کے مطالعہ سے وہ دور نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والا ان کو لطف و دلچسپی سے پڑھتا ہے، اس تاریخی سرگذشت کے ضمن میں اس دور کے ارکان حکومت اور قومی رہنماؤں کے حالات اور مختلف النوع دلچسپ واقعات بھی معرض تحریر میں آگئے ہیں، غرض کتاب گوناگوں [illegible]ات اور دلچسپیوں کا مجموعہ ہے، انداز تحریر دلکش اور شگفتہ ہے، کتاب بلکہ مصنف کا نمایاں وصف جو اس کے صفحہ صفحہ سے نمایاں ہے، ان کی متانت و سنجیدگی، اعتدال و میانہ روی، اور تحریر کی شائستگی ہے، جس دور کے یہ حالات ہیں وہ حکومت اور عوام کی کشمکش اور اور ہندو مسلم اختلاف کا دور تھا، اور بہت سے معاملات میں مصنف کی حیثیت فریق کی تھی، اس لیے اس کتاب میں جا بجا اختلافی مسائل بھی آگئے ہیں، لیکن ان کا قلم کہیں بھی اعتدال و متانت کے جادہ سے نہیں ہٹا ہے، اور مصنف کی شگفتگی تحریر، اور لطائف کی آمیزش نے ان خشک واقعات میں خاصی ادبی چاشنی پیدا کردی ہے، اس کے مطالعہ سے پہلے یہ خیال میں بھی نہ تھا کہ مصنف کا ادبی مذاق اتنا ستھرا ہے، اور وہ ایسی اچھی کتاب لکھ سکتے ہیں، یہ کتاب اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے لحاظ سے نہایت قابل قدر اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ

کے لائق ہے۔

دیار عرب میں چند ماہ از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت للعہ، پتہ مکتبہ چراغ راہ، نمبر ۹ لوٹیا بلڈنگ رام باغ روڈ، کراچی۔

مصنف نے اسلامی جماعت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے گذشتہ سال عراق و نجد و حجاز کا سفر کیا تھا، اور اس سلسلہ میں ان ملکوں کے تمام بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی، اور حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے مذکورہ بالا کتاب اس سفر کی علمی سوغات ہے، یہ سفرنامہ عام سفرناموں سے کسی قدر مختلف ہے، مصنف کا ذوق خالص دینی اور علمی ہے، اور انھوں نے ایک مذہبی مقصد کے لیے سفر کیا تھا، اس لیے سیر و تفریح کے بجائے خصوصیت کے ساتھ وہ ہر مقام کے علما، اور دینی حلقہ سے زیادہ ملے، ان سے مذہبی معاملات و مسائل پر تبادلہ خیال کیا، مذہبی اور علمی اداروں کو دیکھا، مذہبی نقطہ نظر سے عقائد و خیالات و اعمال کا جائزہ لیا، اسی لیے اس سفرنامہ میں زیادہ تر ان ملکوں کے علمی و مذہبی حالات ہیں، اور مصنف نے بڑے درد لیکن بڑی سچائی اور جرأت کے ساتھ ان اسلامی ممالک کے مذہبی تساہل و تفریح پر تنقید کی ہے، اور جلالۃ الملک ملک الحجاز کی شریعت پناہی کی حقیقت بھی پوری طرح واضح کی ہے، یہ اس سفرنامہ کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو ہے، اس سے ان ملکوں کی مذہبی و علمی حالات کی تفصیل معلوم ہو جاتی ہے، ضمناً ان مقامات کے دوسرے حالات اور سفر کے مشاہدات و تجربات بھی آگئے ہیں، مصنف کا سنجیدہ علمی و مذہبی ذوق اور قلم کی پختگی پورے سفرنامہ میں نمایاں ہے، البتہ ان کے قدر شناسوں اور ہوا خواہوں میں انہی کے بقول ان کی "خشک وہابیت" ہمیشہ کھٹکی ہے، جو اس سفرنامہ میں بھی موجود ہے، لیکن ان میں دین کا سچا جذبہ ہے، اس لیے ان کا دل باطنی کیفیتوں سے خالی نہیں ہے، اور اس کے اثرات اس سفرنامے میں بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں، مثلاً مدینہ طیبہ کی حاضری کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "وہابیت کی خشکی کے باوجود دل بے چین رہتا ہے" (ص ۳۰۵) اسی

سلسلہ مین آگے چل کر قصیدہ بردہ کے متعلق لکھتے ہین" بلاشبہ اس مین کہین کہین مقام نبوت سے تجاوز ہوگیا ہے لیکن اس کا ہر شعر درد و سوز مین ڈوبا ہے، راقم اپنی وہابیت کے باوجود اسے پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا رہا" (ص ۱۵۴) مصنف مین دین کی سچی تڑپ ہے، اس لیے یقین ہے کہ انشاء اللہ آیندہ چلکر ان کی وہابیت کی خشکی مین محبت و روحانیت کی تری بھی پیدا ہو جائے گی، سفرنامہ اپنے مفید علمی و مذہبی معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

ملفوظات حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ | از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت: عہ، پتہ: کتب خانہ الفرقان گوین روڈ، لکھنؤ،

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ہر لمحہ تبلیغ دین کے لیے وقف تھا، انکے تمام افکار و تصورات اور اعمال و اقوال کا مرکز تبلیغ تھا، ان کی کوئی مجلس اور کوئی گفتگو اس مقصد سے خالی نہ ہوتی تھی، اور انکی زبان فیض ترجمان سے ہر وقت مسلمانون مین دینی روح کی تجدید اور اس کے احکام کی تبلیغ اس کے علمی و عملی طریقون اور اس کے جملہ متعلقات کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا، مولانا منظور صاحب نعمانی مولانا مرحوم کی زندگی ہی مین ان کی دینی دعوت کے سرگرم مبلغ تھے، اور اس سلسلہ مین ان کو وقتاً فوقتاً مولانا کی خدمت مین حاضری اور قیام کا اتفاق ہوتا تھا، اور وہ مسلمانون کی دینی تجدید اور دعوت و تبلیغ کے متعلق مولاناؒ کے ملفوظات قلم بند کرتے جاتے تھے، اب ان کو انھون نے افادۂ عام کی غرض سے شائع کر دیا ہے، ان ملفوظات مین اسلامی تعلیمات، اور اسلامی زندگی کے حصول کی پوری روح آگئی ہے، اور وہ اپنے گوناگون مذہبی و روحانی فوائد کے اعتبار سے مسلمانون کے ہر طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہین،

تردید حاضر و ناظر از مولانا عبد الرؤف خان صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ

کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۶ پتہ: مدرسہ جھنڈے نگر، بادست گنج ضلع بستی،

بریلوی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاطلاق حاضر و ناظر اور عالم الغیب مانتی ہے، مولوی عتیق الرحمن صاحب بریلوی نے اسکے اثبات میں کوئی رسالہ خیر الانبیاء لکھا تھا، مذکورہ بالا کتاب اس کی تردید میں لکھی گئی ہے، اس میں خیر الانبیاء کے تمام دلائل کا رد کیا گیا ہے، یہ جھگڑا بہت پرانا ہے، اس پر دونوں جانب سے ہزاروں صفحات لکھے جا چکے ہیں، اور اب اسکا کوئی پہلو تشنہ باقی نہیں ہے، اور اس پر کوئی نیا اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اس لیے ان مسائل پر لکھنا محض اضاعت وقت ہے، اسکے علاوہ اب زمانہ کا مذاق بدل چکا ہے، نئے نئے سیاسی و معاشی کلامی مسائل درپیش ہیں، ہر طرف الحاد و دہریت کا طوفان بپا ہے، کفر و اسلام کا معرکہ چھڑا ہوا ہے، نام کے مسلمانوں کا ایک طبقہ سرے سے اسلام ہی سے منحرف ہو رہا ہے، ایسی حالت میں اسکو چھوڑ کر پرانے دقیانوسی مسائل میں اپنی قوت اور وقت ضایع کرنا اسلام کی کوئی مفید خدمت نہیں ہے، افسوس ہے کہ ہمارے علماء کا ایک طبقہ خواہ بریلوی ہوں یا اہل حدیث، وقت کے ضروری اور اہم مسائل کو چھوڑ کر انہی غیر ضروری مسائل میں الجھا ہوا ہے، جنکی جانب اس زمانہ میں کسی کو توجہ کرنے کی بھی فرصت نہیں ہے، اس وقت ضرورت اسکی ہے کہ انکو چھوڑ کر سارا زور کفر و الحاد کے مقابلہ میں اسلام کی نصرت و حمایت میں صرف کیا جائے، تاہم مصنف کی نیت نیک اور انکا مقصد صحیح ہے، اسلیے انکا دینی جذبہ قابل قدر ہے، اور اس کا اجر انشاء اللہ ان کو ملے گا،

آسان قرآنی کورس کے بیس سبق | از جناب مولوی عبد السبحان صاحب عظیمی ربانی منشی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۹ر پتہ: بزم قرآن مسجد سعیدیہ کوچہ معروف اسپاری کنٹھ، ہونٹ روڈ، مدراس۔

خاص قرآن مجید کی تعلیم اور اس کا ترجمہ سمجھنے کیلیے اردو میں عربی قواعد کے متعدد قرآنی نصاب مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور و مفید ادارہ تعلیمات اسلامی لکھنؤ کا نصاب ہے، مصنف نے بھی اسی مقصد کے لیے یہ نیا رسالہ لکھا ہے، اس میں ادارہ تعلیمات اسلامی کی کتابوں سے بھی انھوں نے فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنے تجربہ سے نئے اضافے بھی کیے ہیں، اس رسالہ میں بیس سبق ہیں، اور قرآن مجید کے ترجمہ کی مشق کے لیے مفید ہیں،

"م"

جلد ٦٦ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ نومبر سنہ ۱۹۵۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۲۲-۳۲۴

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت	مولانا عبد السلام ندوی	۳۲۵-۳۳۶
مسلمانون کی حکومت مین غیر مسلم اقوام	مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۳۳۷-۳۶۰
خدمتِ حدیث مین خواتین کا حصہ	حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین	۳۶۱-۳۷۵
تاریخ یمن کا ایک ورق،	مولانا ابو الجلال ندوی	۳۷۶-۳۸۸

باب التقریظ والانتقاد

نیا ادب	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۸۹-۳۹۹
مطبوعاتِ جدیدہ	" م "	۴۰۰

خلفاے راشدین جلد اول

اس مین خلفاے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل مذہبی اور سیاسی کارنامون اور فتوحات کا مفصل بیان ہے، قیمت:- ہے

منیجر

شذرات

ہندوستان کے فرقہ پرستون کی تنگ دلی اور تنگ نظری اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کے دشمن بن گئے ہین جس کو مسلمانون کے ساتھ کسی قسم کی نسبت ہو، وہ اُن کی کسی یادگار کو دیکھنا گوارا نہین کرتے اور ہندوستان مین اُن کی ہزار سالہ تاریخ کا ایک ایک نشان مٹا دینا چاہتے ہین، جو ایک متمدن قوم کی شان سے فروتر ہے، اُس کا فرض تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ علم و فن کی ہر متاع اور تہذیب و تمدن کے ہر نقش کو خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ یا قوم سے ہو باقی رکھکر اپنی تعمیر و ترقی مین اُس سے مدد لے، اور جدید ہندوستان اور ہندو مسلمانون کی مشترکہ قومیت کی تعمیر کے لئے تو یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے،

اس بارہ مین ہم کو یورپ کی قومون سے سبق حاصل کرنا چاہئے، عیسائی دنیا مسلمانون کی پُرانی حریف ہے، ان دونون مین بڑے سخت مذہبی اختلافات اور سیاسی معرکے برپا رہ چکے ہین، مسلمانون نے اُن کے مذہبی مرکز بیت المقدس پر جو مسلمانون کا بھی مقدس شہر اور اُن کا قبلہ رہ چکا تھا حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ مین قبضہ کر لیا تھا، پھر ایک صدی کے اندر اُن کے سارے مشرقی مقبوضات چھین لئے، اور خود یورپ کے ملکون مین آسپین، سسلی، یونان، قسطنطنیہ، بلقانی ریاستون بحر روم کے بڑے بڑے جزیرون، اور فرانس، پرتگال اور اٹلی کے بعض حصون پر قبضہ کر لیا، اور صدیون یہان کے حکمران رہے، دونون مین مدتون جنگ صلیبی کا خونریز سلسلہ جاری رہا جس مین سارا یورپ مسلمانون کے خلاف صف آرا تھا غرض مذہبی و سیاسی دونون حیثیتون سے مخالفت اور دشمنی کا کوئی دقیقہ باقی نہین رہا، لیکن مسلمانون نے اپنے دورِ حکومت مین اپنے تمام مقبوضہ ملکون کو تہذیب و تمدن کے زیور سے آراستہ کیا

علم و فن کی روشنی سے منور کیا تھا، یورپین قومین اپنے دورِ جہالت تک تو اُن کی دشمنی پر قائم رہین لیکن علم کی روشنی پھیلنے کے بعد جب اُن کی آنکھون سے تعصب کا پردہ ہٹا اور اُن کو مشرقی دنیا اور خود اپنے ملکون مین مسلمانون کے علمی، تمدنی اور اخلاقی کارنامے نظر آئے تو انھون نے اُس کا پورا اعتراف اور احسان شناسی کا حق ادا کیا گو استعماری اغراض کی بنا پر ان کا ایک طبقہ مسلمانون کے خلاف زہر بھی اگلتا رہا لیکن اُس کے مقابلہ مین مسلمانون کے مداحون اور حامیون کی جماعت ہر دور مین زیادہ رہی اور یورپ کے ہر ملک کے علما و محققین نے مسلمانون کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامون پر سیکڑون کتابین لکھین، چنانچہ آج یورپ کی کوئی علمی اور بڑی زبان اس قسم کی تصانیف سے خالی نہین ہے اس کے ساتھ انھون نے اسلامی علوم و فنون کو زندہ کیا اور عربی و فارسی کی ہر فن کی سیکڑون نادر و نایاب کتابون کو تلاش کر کے بڑی محنت و قابلیت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا، اور اپنی اپنی زبانون مین بہت سی اہم کتابون کے ترجمے کئے اور آج مسلمانون کے قدیم علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ انھی کے بدولت زندہ ہے اس کے علاوہ طب، طبعیات، نباتات، حساب، ہندسہ، ہیئت و جغرافیہ وغیرہ کی مسلمان مصنفین کی کتابین اور ان کے لاطینی ترجمے کئی صدی تک یورپ کی یونیورسٹیون کے نصاب مین داخل رہے، یورپ کے قرونِ مظلمہ مین ان کے ہاتھون مسلمانون کے جو آثار مٹ چکے تھے وہ مٹ چکے تھے لیکن جو باقی رہ گئے تھے، اُن کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جس کا مشاہدہ آج بھی اسپین مین کیا جا سکتا ہے غرض یورپین قومون نے علم و روشنی کے دور مین مذہبی و سیاسی اختلاف کی بنا پر مسلمانون کے آثار کو مٹایا نہین بلکہ اُن کو زندہ رکھکر اُن سے فائدہ اٹھایا، ورنہ وہ آج تک جہالت کی تاریکی مین بھٹکتی رہتین، یا کم از کم ترقی کی منزلین اتنی جلد طے نہ کرتین،

———:———

اس کے مقابلہ مین ہندو مسلمانون مین ہمیشہ اتحاد و یگانگت کا تعلق رہا، گو مسلمان ہندوستان کے حاکم تھے لیکن وہ اجنبی حکمرانون کی طرح نہین رہے، بلکہ انھون نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا، اور یہین شادی بیاہ کر کے رہ بس گئے، یہان کی بہتیری رسمین تک اختیار کر لین، اور مسلمانون اور یورپین قومون کے مقابلہ مین ہندو مسلمان مختلف حیثیتون سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہین، دونون مشرقی ہین، ہندوستانی مسلمانون کی بڑی تعداد نسلاً بھی ایک ہی، انہین

بہت سے تہذیبی اور کلچرل پہلو مشترک ہیں، ہندوستان کی ترقی میں دونوں کا حصہ ہے چنانچہ اسلامی ہند کے بہت سے علمی و تمدنی کارنامے دونوں کے مشترکہ ہیں لیکن اس کے باوجود محض اس جرم میں کہ وہ اسلامی دور کی یادگار ہیں، فرقہ پرست ان کو برداشت نہیں کر سکتے، اور ان کا نام و نشان مٹا کر ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی عہد کا باب ہی خارج کر دینا چاہتے ہیں جو ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کی شان سے بعید ہے، اسے تو ان یادگاروں کو نہ صرف زندہ رکھنا چاہئے بلکہ ان کے جو نقش دھندلے ہوگئے ہوں، انکو اجاگر کرنا چاہئے کہ درحقیقت وہ دونوں کے مشترک کارنامے دونوں کے لئے باعثِ فخر اور ہندوستان کی تمدنی عظمت کا نشان ہیں، ع :- یہ ٹوٹے آئینے ہیں زیب و زینت ان کی محفل کے

اس لئے ان کا جو نقش بھی مٹے گا اس سے تنہا اسلامی عہد کا نہیں بلکہ ہندوستان کی عظمت کا ایک نشان مٹ جائے گا،

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما ۔۔۔ گلستان میرد اگر میریم ما

ان حالات میں یہ سن کر حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی کہ نولکشور پریس نے جس نے اسلامی علوم و فنون اور عربی فارسی اور اردو زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے، اپنی پرانی روایات و خصوصیات کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور اس مطبع سے حسبِ دستور تینوں زبانوں کی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا، فرقہ پرستی کے اس دور میں یہ فیصلہ قابلِ ستائش اور یہ نمونہ قابلِ تقلید ہے، درحقیقت علم و فن کی خدمت کو مذہب و فرقہ کی قید سے بلند رکھنا چاہئے ورنہ ساری ترقیاں مسدود ہو جائیں گی، اگر مطبع کے کارکن اودھ اخبار کو بھی دوبارہ جاری کر دیتے تو ایک پرانی یادگار زندہ ہو جاتی،

مسلمانوں میں زبانی تو اردو زبان کی محبت کا بڑا دعویٰ اور ہندوستان میں اسکے زوال کا بڑا ماتم ہے، لیکن اسکی جانب سے ان کی غفلت و بے توجہی کا حال یہ ہے کہ وہ اردو کے اہم اور ضروری اخباروں اور رسالوں کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتے، یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ صدق جیسا اہم اور مفید اخبار جس کی قیمت بھی بہت کم ہے، مالی دقتوں کی بنا پر چند دنوں سے بند ہو گیا تھا، اس کے فاضل اڈیٹر مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ نے دوبارہ اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور آئندہ مہینہ سے وہ نکلنے لگے گا، اگر مسلمانوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو ان کو صدق کا خریدار بن کر اس کی زندگی کا سامان فراہم کرنا چاہئے،

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیّت

از

مولانا عبدالسلام ندوی

(۲)

گذشتہ نمبر مین معجزۂ قرآنی کی جو خصوصیات بیان کی گئین اُن سے ثابت ہوگیا کہ وہ کوئی دنیوی احسان یا مادی طاقت نہین ہے، بلکہ خالص روحانی طاقت ہے، جو جن وانس دونون کو نیک کامون کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اب اس نمبر مین یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ روحانی طاقت کوئی وقتی چیز نہین تھی، بلکہ ایک ابدی دولت ہے جو مسلمانون کے دینی خزانے مین ہمیشہ محفوظ رہیگی اور ان پر قیامت تک اپنا اثر ڈالتی رہیگی کیونکہ

معجزات کی دو قسمین ہین حسّی اور عقلی، حسّی معجزات کا اثر محدود ہوتا ہے، کیونکہ وہ آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جو لوگ اُن کو دیکھتے ہین، صرف انہی پر ان کا اثر پڑتا ہے، اور جب انکا زمانہ ختم ہوجاتا ہے، تو یہ معجزات بھی ختم ہوجاتے ہین، اور ان کا اثر بھی زائل ہوجاتا ہے لیکن عقلی معجزات کی حالت اُن سے مختلف ہوتی ہے، وہ دل کی آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جب تک دنیا مین صاحب عقل وصاحبِ بصیرت لوگ موجود ہین، اُن کا معجزانہ اثر باقی رہتا ہے اور وہ ہر زمانہ مین پیغمبر کی صداقت

کی شہادت دیتے ہیں، انبیاء بنی اسرائیل کے اکثر معجزے حسّی ہوتے تھے جن کا اثر اُن کے زمانہ تک محدود تھا، اور اب ان معجزات کا نہ وجود ہے، اور نہ اُن کا اثر باقی ہے، اب عصائے موسیٰ، لحنِ داؤد، دمِ عیسیٰ اور ناقۂ صالح کا نہ وجود ہے، اور نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں، اس کے علاوہ اس قسم کے معجزے ان انبیاء کے لئے موزوں ہوتے ہیں جن کی شریعت خود دائمی اور ابدی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق ایک محدود زمانے کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے جو پیغمبر اس قسم کی محدود الوقت شریعت کو لے کر آتے ہیں، اُن کو اسی قسم کے محدود الوقت معجزے بھی عطا کئے جاتے ہیں،

لیکن اسلام ایک ابدی مذہب تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی صورت میں ایک عقلی معجزہ عطا کیا گیا، جو اب تک موجود ہے، اور ہر صاحبِ عقل و بصیرت کو اسلام کی دعوت دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من	ہر پیغمبر کو ایسے معجزات دیئے گئے جن
الآیات ما مثلہ آمن علیہ	پر لوگ ایمان لائے لیکن مجھ کو جو
البشر وانما کان الذی اوتیتہ	معجزہ دیا گیا وہ وحی ہے، اس لئے
وحیا اوحاہ اللہ الی فارجو ان اکون	مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن
اکثرھم تابعا یوم القیامۃ،	میرے پیرو اور پیغمبروں سے زیادہ
(صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن	ہوں گے،
باب کیف نزل الوحی واول ما نزل)	

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے زمانہ کے ساتھ ختم ہو گئے، اور ان کو انہی لوگوں نے دیکھا جو اس وقت موجود تھے، لیکن قرآن مجید کا معجزہ قیامت تک موجود رہے گا، اور اسلوب بیان، بلاغت، اور غیبی خبروں کے دینے کی وجہ سے اس کی

معجزانہ حیثیت قائم رہے گی، اس لئے کوئی زمانہ ایسا نہین آئے گا جس مین کوئی واقعہ جس کے ہونے کی خبر قرآن مجید نے دی ہے ظاہر نہ ہو، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی صحت کی دلیل نہ ہو، اس حدیث کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہین کہ گذشتہ پیغمبرون کے معجزات حسی ہوتے تھے، جو آنکھون سے دیکھے جاتے تھے، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، لیکن قرآن مجید کا معجزہ چشم بصیرت سے نظر آتا ہے، اس لئے آپ کے پیرو اور پیغمبرون سے زیادہ ہون گے، کیونکہ جو معجزہ آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ دیکھنے والون کے فنا ہونے کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے، اور جو معجزہ عقل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، اور یکے بادیگرے اس کو لوگ ہمیشہ دیکھتے رہتے ہین،

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے،

افلا یتدبرون القرآن، (نساء - ۱۱)	تو کیا پھر لوگ قرآن مین غور نہین کرتے،

اور یہی وجہ ہے کہ دور نبوت مین جو لوگ صاحب فہم و بصیرت تھے، قرآن مجید کا اثر ان پر سب سے زیادہ پڑتا تھا، اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت جبیر بن مطعم نے جب سورہ طور کی یہ آیتین ام خلقوا من غیر شیئ سنین تو ان کا دل اڑنے لگا، لیکن یہ اثر صرف ان کے فہم و بصیرت کا نتیجہ تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح مین لکھتے ہین،

قال الخطابی کانہ انزعج عند سماع هذه الآية لفهمه معناها و معرفته بما تضمنته ففهم الحجة	خطابی کہتے ہین کہ چونکہ وہ اس آیت کے معنی اور مفہوم کو سمجھ گئے، اس لئے اس کو سن کر بیساختہ متاثر ہو گئے، غرض انھون نے اس دلیل کو سمجھ لیا

فاستدرکھا بلطیف طبعہ اور اپنی طبیعت کی لطافت کی وجہ سے اس کو پا گئے،

حضرت انیسؓ خود شاعر تھے، وہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور واپس جاکر اپنے بھائی حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس کی اطلاع دی، تو انھوں نے پوچھا کہ لوگ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں"؟ انھوں نے جواب دیا "کہ لوگ آپ کو شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہیں"؟ لیکن میں نے کاہنوں کی باتیں سنی ہیں، لیکن محمد جو کچھ کہتے ہیں وہ کاہنوں کی بولی نہیں، میں نے اُن کی باتوں کو اوزان واصناف شعر کے مقابلہ میں رکھا تو وہ شعر بھی نہیں، خدا کی قسم آپ سچے اور لوگ جھوٹے ہیں"[۵]

اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات احادیث وسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں، جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کو گذشتہ انبیاء کے مادی معجزات پر ہر حیثیت سے تفوق اور فضیلت حاصل ہے، لیکن اس موقع پر سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں توراۃ وانجیل کا کیا درجہ ہے؟ ہمارے علماء نے چونکہ قرآن مجید کو فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ مانا ہے اور تورات وانجیل میں یہ فصاحت وبلاغت موجود نہیں ہے، اس لئے وہ ان دونوں کتابوں کو معجزہ تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ تمہید ابو شکور سالمی میں جہاں اعجاز قرآنی پر بحث کی ہے، لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید صرف اپنے الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے، اور بعض لوگ اس کو معنی کی بنا پر معجزہ کہتے ہیں لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ لفظ ومعنی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، کیونکہ اگر ہم اس کو صرف معنی کی وجہ سے معجزہ تسلیم کریں تو اس سے گذشتہ انبیاء کی کتابوں کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ صحیح نہیں ہے، اور اگر صرف لفظ کی وجہ سے معجزہ تسلیم کریں تو ایسی حالت میں اگر الفاظ معنی سے

---

[۵] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب اسلام ابی ذرؓ

خالی ہوں، تو وہ ایک لغو کلام ٹھہرے گا اور یہ محال ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید لفظاً اور معنیً دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، آگے چل کر ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے کہ گذشتہ کتابیں معجزہ تھیں یا نہیں ؟ اور اس عنوان کے تحت میں لکھا ہے کہ گذشتہ کتابیں اس معنی میں معجزہ تھیں کہ وہ خدا کا کلام ہیں، اور قرآن مجید بھی خدا کا کلام ہے، تو جب اس حیثیت سے قرآن مجید معجزہ ہے، تو اور کتابیں اور صحیفے بھی لازمی طور پر معجزہ قرار پائیں گے، لیکن صحیح یہ ہے کہ تمام گذشتہ کتابیں اور صحیفے بھی اگرچہ خدا ہی کا کلام تھے لیکن وہ معجزہ نہیں تھے، کیونکہ خود خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لوگ ان کتابوں اور صحیفوں میں تحریف کیا کرتے تھے لیکن اگر وہ معجزہ ہوتیں، تو اُن میں تحریف نہیں کی جا سکتی تھی، اور تمام کتابیں خدا کا کلام تو ضرور ہیں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانہ میں اور ایک شخص کے لئے تو معجزہ ہو لیکن دوسرے زمانہ اور دوسرے شخص کے لئے معجزہ نہ ہو، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کے ہاتھ اور اُن کے زمانہ میں تو معجزہ تھا لیکن اُن کے زمانہ کے بعد معجزہ نہیں رہا، یہی حالت اُن کی کتابوں کی بھی ہے[۵]،

قاضی ابو بکر باقلانی اعجاز القرآن میں لکھتے ہیں، "اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کے علاوہ کیا خداوند تعالیٰ کا دوسرا کلام مثلاً توراۃ انجیل اور صحیفے بھی تمھارے نزدیک معجزے ہیں ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ان میں جو غیبی خبریں ہیں، ان کے لحاظ سے وہ بھی قرآن مجید کی طرح معجزے ہیں لیکن نظم و تالیف کے لحاظ سے ان میں کوئی کتاب معجزہ نہیں، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ان میں کسی کتاب کے وہ اوصاف نہیں بیان کئے، جو قرآن مجید کے بیان کئے ہیں، نیز یہ کہ اُن کے متعلق تحدی نہیں کی گئی ہے جیسا کہ قرآن مجید کے متعلق کی گئی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کتابوں کی زبان میں فصاحت کے ایسے وجوہ نہیں پائے جاتے، جن کی وجہ سے کلام میں مقابلۃً ایسے محاسن پیدا ہو جائیں، جو حدِ اعجاز

---

[۵] تمہید ابو شکور سالمی ص۶۶، ۶۷،

تک پہنچ جائین، ان زبانون مین جو کلام موجود ہے، وہ تقریباً یکسان ہے، ہمارے اصحاب تمام زبانون کی یہی خصوصیت بیان کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ ان مین باہم وہ فرق و امتیاز نہین پیدا ہو سکتا جو عجیب و غریب طریقہ پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدے، اس کو یون بیان کیا جا سکتا ہے کہ جہان تک ہم کو ان زبانون کا علم ہے ان مین ایک چیز کے اس قدر متعدد نام نہین پائے جاتے جس قدر عربی زبان مین پائے جاتے ہین (یعنی ان مین مترادف الفاظ موجود نہین) اس طرح ان مین ایک لفظ بہت سے معانی پر دلالت نہین کرتا، جس طرح عربی زبان مین ایک ہی لفظ بہت سے معانی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ان زبانون مین مشترک الفاظ موجود نہین) استعارات، اشارات اور استعمالات کے نادر طریقے بھی ان زبانون مین نہین پائے جاتے ؛

اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ عربی مبین کی زبان مین ہے، اس کی یہ خصوصیت بہت سے مقامات مین بیان کی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید کا درجہ اس سے بلند ہے کہ اس کو عجمی زبان مین نازل کیا جائے، اس لئے اگر اہل عجم کی زبان مین اسی قسم کی فصاحت پیدا ہو سکتی، تو خداوند تعالیٰ قرآن مجید کو اس سے بالاتر نہ سمجھتا اگرچہ عربی زبان مین قرآن مجید کے نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اہل عرب اس کو خود سمجھ سکین، اور اس کی تفسیر مین دوسرون کے محتاج نہ ہون، تاہم ہم نے جو فائدہ بیان کیا ہے وہ بھی ممکن ہے ؛

بہت سے مسلمان جو عربی زبان کے ساتھ ان زبانون کے بھی ماہر ہین، اُن کے نزدیک ان زبانون مین وہ فرق و امتیاز اور وہ فصاحت نہین پائی جاتی جو عربی زبان مین پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ وہ نہ تو خود توراۃ و انجیل کے ماننے والے اور نہ خود مسلمان ان کتابون کے معجز ہونے کا دعویٰ کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ اعجاز قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے،[1]

---

[1] اعجاز القرآن بر حاشیہ اتقان جلد اول ص ۴۸، ۴۹،

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ قوموں کے جو واقعات قرآن مجید مین مذکور ہین، وہ بالمعنی بیان کئے گئے ہین یعنی خداوند تعالیٰ نے اُن کے معانی کو عربی زبان مین بیان کر دیا ہے، کیونکہ عجمی زبانون مین یہ فصاحت نہین پیدا ہو سکتی تھی،[۵]

لیکن خداوند تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کو کہین قرآن مجید کا وصف نہین قرار دیا ہے بلکہ اس کے یہ اوصاف بتائے ہین،

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ،	وہ رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا
(بقرہ ۱۲-)	ہے، ایمان والون کو،
يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ	اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا	پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی
مُّبِيْنًا،	ہے، اور ہم نے تمھارے پاس ایک صاف
(نساء -۲۴)	نور بھیجا ہے،
فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ	سو اب تمھارے پاس تمھارے رب کے
هُدًى وَّرَحْمَةٌ،	پاس سے ایک کتاب واضح اور رہنمائی
(الانعام -۲۰)	کا ذریعہ اور رحمت آچکی ہے،

اور قرآن مجید مین بعینہٖ یہی اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی بیان کئے گئے ہین، مثلاً:-

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ	اور اسی طرح بھیجا تھا توریت و انجیل کو
هُدًى لِّلنَّاسِ، (آل عمران -۱)	اسکے قبل کے لوگون کی ہدایت کے واسطے

---

[۵] اتقان جلد دوم صفحہ ۱۲۵،

انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور۔ (مائدہ ۔۔۔)

ہم نے توراۃ نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا،

وقفینا علی آثارھم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ وآتینہ الانجیل فیہ ھدی ونور ومصدقا لما بین یدیہ من التوریۃ وھدی وموعظۃ للمتقین (مائدہ ۔ ۷)

اور ہم نے اُن کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اس حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توراۃ کی تصدیق فرماتے تھے، اور ہم نے اُن کو انجیل دی تھی جن میں ہدایت تھی اور وضوح تھا، اور وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتی تھی اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لئے،

قل من انزل الکتب الذی جاء بہ موسی نوراً وھدی (الانعام ۔ ۱۱)

آپ کہئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نور ہے اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے،

ثم آتینا موسی الکتب تماما علی الذی احسن وتفصیلا لکل شیٔ وھدی ورحمۃ، (الانعام ۔ ۲۰)

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہو، اور سب احکام کی تفصیل ہو جائے اور رہنمائی ہو اور رحمت ہو،

ومن قبلہ کتب موسی اماما ورحمۃ (ھود ۔ ۲)

اور ایک اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے، جو کہ (احکام بتلانے کے اعتبار سے) رہنما اور رحمت تھی

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ	اور ہم نے موسیٰ کو اگلی امتوں کے ہلاک کئے
بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَى	پیچھے کتاب دی تھی، جو لوگوں کے لئے دانشمندی
بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً	کا سبب اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ نصیحت
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ، (قصص - ۵)	حاصل کریں،
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَى وَ	اور ہم موسیٰ کو ہدایت نامہ دیکھے ہیں، اور
أَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ (مومن)	ہم نے وہ کتاب بنو اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ
هُدًى وَذِكْرَى لِأُولِي الْأَلْبَابِ،	وہ ہدایت اور نصیحت تھی اہل عقل کے لئے،

غرض قرآن مجید کے جس قدر اوصاف قرآن مجید میں مذکور ہیں، بعینہ وہی اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی مذکور ہیں، اس لئے اگر ان اوصاف کی بنا پر جیسا کہ آگے تفصیل کے ساتھ آئے گا، قرآن مجید کو معجزہ تسلیم کیا جائے تو توراۃ و انجیل کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا، اور بعض محققین نے اس حیثیت سے ان کو معجزہ تسلیم بھی کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ توراۃ یا انجیل یا زبور اس لئے معجزہ ہیں کہ ان میں علوم غیبی خبریں اور امر و نہی وغیرہ موجود ہیں، تو اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ یہ ان پیغمبروں کی نبوت کی اور اس پیغمبر کی نبوت کی جس کی نبوت کی انھوں نے خبر دی ہے، دلیل ہے لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ کتابیں معجزہ نہیں ہیں، اگر ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرح لفظا و نظما کی وجہ سے معجزہ نہیں ہیں، تو یہ ممکن ہے اور اس کا تعلق عبرانی زبان کے جاننے والوں سے ہے لیکن معانی یعنی غیبی خبروں اور امر و نہی کی وجہ سے توراۃ کے معجزہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، اور انبیاء کی کتابوں کے معجزہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی آپ کی بعثت سے بہت پہلے خبر دیگئی ہے، اور بغیر خداوند تعالیٰ کی اطلاع دینے کے اس کا علم نہیں ہو سکتا، [۵]

---

[۵] کتاب النبوات ص ۱۱۳،

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ

"قرآن مجید کے معانی مین اُس کے الفاظ سے زیادہ اعجاز ہے، اور توراۃ وانجیل مین جو معانی ہین، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ قرآن مجید کے مثل ہین، تو اُس سے مقصد مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا، کیونکہ وہ بھی خداوند تعالیٰ کی کتاب ہین، اور اگر ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کے معجزہ کے مثل کوئی معجزہ لائے تو یہ ناممکن نہین ہے[۱۵۱]"

توراۃ وانجیل کے ساتھ قرآن مجید کی طرح بے شبہہ تحدی نہین کی گئی، لیکن معجزات کے لئے تحدی کوئی ضروری چیز نہین ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ دلائل نبوت کے لئے یہ شرط ضروری نہین ہے کہ وہ دعوی نبوت کے ساتھ ساتھ ہون، اُن کو بطور تحجب کے پیش کیا جائے، ان کے مثل لانے کی تحدی کیجائے، اور اس پر مخالفین کو آمادہ کیا جائے، اس قسم کی باتین بعض معجزات کے ساتھ تو ضرور پیش آتی ہین لیکن یہ ضروری نہین کہ جن معجزات کے ساتھ یہ باتین پیش نہ آئین، وہ معجزہ ہی نہ ہون، بلکہ اس سے انبیاء کے اکثر معجزات باطل ہو جائین گے، کیونکہ اُن مین یہ شرط موجود نہیں ہے، اور یہ ایک ایسی شرط ہے جس کی کوئی دلیل نہین ہے، کیونکہ دلیل کے معنی یہ ہین کہ اس کے ساتھ مدلول علیہ کا وجود لازمی طور پر پایا جائے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کوئی مساوی یا راجح دلیل اُس کی معارض نہ ہو، لیکن اگر کوئی دلیل ایسی موجود ہے، جس کی معارض کوئی مساوی اور راجح دلیل نہین ہے، تو اس کو دلیل ماننا پڑے گا، چاہے مستدل یہ کہے کہ اُس کے مثل پیش کرو "تم لوگ اُس کے مثل پیش کرنے کی قدرت نہین رکھتے" یا نہ کہے، کیونکہ جب وہ دلیل فی نفسہ ایسی ہے جس کے مثل لانے پر لوگ قادر نہین ہین، تو مستدل کا یہ کہنا، اور نہ کہنا برابر ہے، نہ اس کے کہنے سے وہ دلیل بن سکتی، اور نہ اُس کے نہ کہنے سے اس کی دلالت باطل ہوتی، دلیل بہرحال دلیل ہے، خواہ

---

۱۵۱ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۱۰۰

مستدل اس کے ساتھ استدلال کرے، یا نہ کرے، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نبوت کی دلیل اس وقت تک دلیل نہیں ہوسکتی، جب تک دعویٰ نبوت کے ساتھ پیغمبر اس کے ساتھ استدلال نہ کرے یعنی جو لوگ دعویٰ نبوت، پیغمبر کے استدلال اور معارضہ کے مطالبہ سب کو دلیل کا جزو قرار دیتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں، بلکہ ان باتوں سے سکوت اختیار کرنا بہتر ہے، اور ان باتوں سے دلیل میں کوئی قوت نہیں پیدا ہوتی خداوند تعالیٰ نے

فلیاتوا بحدیث مثلہ، تو وہ لوگ بھی اس کے مثل ایسی ہی ایک بات بھی لائیں،

اس وقت کہا جب کفار نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن مجید ایک بنائی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس قول کو دلیل کی شرط قرار نہیں دیا، بلکہ جب وہ اس کے معارضہ سے عاجز ہو گئے، تو اس سے یہ دلیل مکمل ہوگئی،[۱]

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام معجزات کے ساتھ تحدی نہیں کی گئی، آپ نے قرآن مجید کے ساتھ بھی ابتداءً تحدی نہیں کی، بلکہ اس وقت تحدی کی جب کفار نے کہا کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے"[۲]

اس بناء پر اگر توراۃ و انجیل کے ساتھ تحدی نہیں کی گئی تو اس سے اُن کے معجزہ ہونے میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا لیکن اگر تحدی ضروری سمجھی جائے، تو گو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراۃ کے ساتھ تحدی نہیں کی تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ساتھ توراۃ کو بھی تحدی میں شامل کر لیا ہے،

---

[۱] کتاب النبوات ص ۱۴۲ [۲] ایضاً ص ۱۹۶،

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ (قصص - ۵)

آپ کہدیجئے اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ وانجیل بھی معجزہ ہیں، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہاں بھی موجود ہے، توراۃ وانجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہیں لیکن قرآن مجید لفظی ومعنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ وانجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

"توراۃ وانجیل میں جو معنی ہیں، وہ حقیقت، کیفیت اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہیں ہیں، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابوں میں غور کیا ہے اس کو دونوں میں فرق نظر آئے گا، اور اہل علم و معرفت میں جس کو یہ باتیں معلوم ہو جائیں گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکیں، اس کے لئے صرف ظاہری باتیں کافی ہیں، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدایش کی یہ چیزیں ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہیں، اور بعض اہل علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، مثلاً علم تشریح کی باریک باتیں ستاروں کی مقدار اور ان کی حرکات وغیرہ کہ اس سے صرف اہل علم واقف ہو سکتے ہیں[۱]۔

غرض قرآن مجید عالم و جاہل دونوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے، صرف

بزنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

---

[۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۷۵۔

مسلمانون کی حکومت مین غیر مسلم اقوام

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون سنہ ۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم مین مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانون کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک مین دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہین" (احیاء العلوم، ج ۱ ص ۱۱۱)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت، لیکن ہم جب یہ سوچتے ہین کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت مین بسر [ہو]ا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر مین وہ مدتون گھومتے رہے ہین، [تو] یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی [ہج]ری کے امام ہین یہ وہ زمانہ ہے جس مین سارے علوم و فنون جو غیر قومون سے منتقل ہو کر مسلمانون مین [ر]ائج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ مین بڑی [بڑی] نامور ہستیان چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھین، اس لیے نہین کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے

---

[۱] بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل سنہ ۱۹۵۰ء ہی مین اس مضمون کی ایک قسط لکھ کر دفتر معارف مین بھیجدی تھی، [لیکن جگہ] نہ [ملنے کی وجہ سے] پیش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون سنہ ۵۰ء مین شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر فوری تاثر پر [پڑ]ا، تاہم جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھ کر دفتر مین روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک مین ضائع ہو گیا دل بیٹھ گیا، [مع]ارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ ذرا [دشو]ار کام کچھ نہین کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ آپ کہدیجئے کہ اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لاؤ

هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ (قصص - ۵) جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ وانجیل بھی معجزہ ہیں، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہاں بھی موجود ہے، توراۃ وانجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہیں، لیکن قرآن مجید لفظی ومعنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ وانجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

"توراۃ وانجیل میں جو معنی ہیں، وہ حقیقت، کیفیت اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہیں ہیں، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابوں میں غور کیا ہے اس کو دونوں میں فرق نظر آئے گا، اور اہل علم و معرفت میں جس کو یہ باتیں معلوم ہو جائیں گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکیں، اس کے لئے صرف ظاہری باتیں کافی ہیں، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہیں مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدائش کی یہ چیزیں ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہیں، اور بعض اہل علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، مثلاً علم تشریح کی باریک باتیں ستاروں کی مقدار اور ان کی حرکات وغیرہ کہ اُس سے صرف اہل علم واقف ہو سکتے ہیں[۱]"

غرض قرآن مجید عالم و جاہل دونوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے، صرف

بزنگ اصحاب صورت رابہ وارباب معنی را

---

[۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ...

مسلمانون کی حکومت مین غیر مسلم اقوام[1]

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۱۹۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم مین مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانون کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک مین دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہین" (احیاء العلوم، ج ۱ ص ۱۱)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت، لیکن ہم جب یہ سوچتے ہین کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت مین بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر مین وہ مدتون گھومتے رہے ہین، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہین یہ وہ زمانہ ہے جس مین سارے علوم و فنون جو غیر قومون سے منتقل ہو کر مسلمانون مین رواج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ مین بڑی بڑی نامور ہستیان چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھین، اس لیے نہین کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے

---

[1] بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل ۱۹۵۰ء ہی مین اس مضمون کی ایک قسط لکھکر دفتر معارف مین بھیجدی تھی، لیکن گنجایش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون ۱۹۵۰ء مین شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر فوری تاثر پر بھی پڑا، تاہم جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھکر دفتر مین روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک مین ضائع ہو گیا دل بیٹھ گیا، مدیر معارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ ذرا مشکل کام کچھ نہین کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

مسلمان غیر مسلم اقوام کی طبی امداد کے محتاج اور دست نگر تھے، گویا یہ صورت حال اضطرار یا مجبوری کی رہین منت تھی، یقیناً یہ دعویٰ غلط ہوگا،

باقی یہ وسوسہ کہ مسلمانوں کے دینی احساسات میں رفتہ رفتہ اضمحلال اور سستی کی جو کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی، سو اس کا نتیجہ بھی اس کو قرار دینا مشکل ہے

آخر میں پوچھتا ہوں کہ غزالی تاکہ چھٹی صدی ہجری کے آدمی ہیں لیکن میں تو دیکھتا ہوں کہ غزالی سے سینکڑوں سال پہلے یعنی اسلام کی دوسری صدی کے زمانہ میں پیدا ہونے والے امام حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی کتابوں میں یہ شہادت منسوب کی گئی ہے یعنی علم طب جسے امام شافعی علم کے تہائی حصوں میں ایک مستقل حصہ قرار دیتے تھے، اسی علم طب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے،

ثلث العلم وکلوہ الی الیھود و النصاری (توالی التاسیس لابن حجر عسقلانی) علم کے تہائی حصہ کو مسلمانوں نے یہود و نصاریٰ کے سپرد کر رکھا ہے،

مان لیا جائے کہ چھٹی صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے مسلمانوں میں اپنے دین کے متعلق وہ جوش و خروش باقی نہ رہا ہو جو ان میں پہلے پایا جاتا تھا لیکن دوسری صدی ہجری میں بھی اگر اس سے وہ خالی ہی تھے تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جن دینی گرم جوشیوں کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ نرے ایک افسانے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، ما لکم کیف تحکمون۔

لہ بظاہر اس کا مطلب اس زمانہ کے مذاق کے مطابق جس میں امام شافعی تھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم الادیان، علم الابدان، علم اللسان یعنی ادب و لغت، ان ہی تین علوم کو اہمیت دی جاتی تھی، خود امام شافعیؒ نے علم کی ان تینوں قسموں میں کمال پیدا کیا تھا، علم الادیان اور علم اللسان میں ان کا جو پایہ تھا اس سے تو دنیا واقف ہے، لیکن طب کے ساتھ امام کے تعلق کا گو عام شہرت نہیں ہے، مگر لکھا ہے کہ اس علم میں بھی ان کی غیر معمولی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ مصر جب پہنچے تو بتدریج کی کتابیں مصر کے بعض اطبا نے ان سے پڑھنے کی خواہش کی، (دیکھو توالی التاسیس ص۶۶)

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمانون کے جس دین کی طرف تنگ نظریون، کوتاہ فکریون کو منسوب کرنے لیے آج منسوب کر رہے ہین، کاش واقعات کا صحیح علم ان کو ہوتا، تو برعکس اس کے شاید وہ اس یقین پر مجبور ہوتے کہ غیر قومون کے ساتھ ساری فراخ چشمیان اور رواداریاں جن کا ذکر مسلمانون کی تاریخ مین کیا جاتا ہے، ان کی ضمانت خود مسلمانون کے دین اور دین کے عطا کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیع طرز عمل مین پوشیدہ ہے،

اس قسم کے چھوٹے موٹے، ناقابل توجہ واقعات مثلاً جب مشہور ایرانی بزرگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور ایرانی نژاد ہونے کیوجہ سے عربی زبان مین جیسی کہ چاہیے گفتگو نہین کر سکتے تھے، تو تاریخ خمیس وغیرہ مین لکھا ہے کہ

طلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تلاش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک
ترجمانا وکان فی المدینۃ یہودی	ترجمان کو مدینہ مین ایک یہودی تھا، جو عربی
عارفا بالعربی والفارسی (ج ۱ ص ۳۵۲ خمیس)	اور فارسی زبان سے واقف تھا،

غرض اسی یہودی کو بلایا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجمانی کا کام اسی یہودی سے لیا، [1]

---

[1] غیر قومون کے ساتھ میل جول کے ان ہی نمونون کا نتیجہ تھا کہ صحابۂ کرام جب عرب سے باہر نکلے تو اس علاقے کی زبانون کو بھی انھون نے سیکھا، اور ان کے مفید رسم و رواج کو اختیار کیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو صحابہؓ مین امام المحدثین سمجھے جاتے ہین، خطیب نے تاریخ بغداد مین مشہور محدث ابراہیم حربی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ کان ابوھریرۃ یکلم صبیانہ واھلہ بالنبطیہ (ص ۲۰۶ ج ۵) یعنی ابوہریرۃ اپنے بچون اور اپنے گھر کے لوگون سے نبطی زبان مین گفتگو کرتے تھے، عراق کے سواد دیہاتی علاقہ مین جو زبان بولی جاتی تھی اور فارسی و عربی کی کچھ ملی جلی شکل تھی، اس زبان کا نام نبطی تھا، اس سلسلہ مین صحابہ کے متعلق دلچسپ معلومات کتابون مین ملتے ہین، بلکہ تاریخ خمیس کی مندرجۂ بالا روایت مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریلؑ نے فارسی زبان سکھائی ۱۲

اور بھی اسی نوعیت کے غیر اہم واقعات کے سوا کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر مبارک کا سب سے بڑا واقعہ جس نے سچ پوچھیے تو عرب یا مشرق ہی نہیں بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانیت کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا، یعنی سفر ہجرت میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالکل پروا نہ کی کہ اس اہم ترین دینی اقدام میں راستہ دکھانے کے لیے ایک غیر مسلم آدمی کی امداد کیوں حاصل کی جائے؟ بخاری وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ

استاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے
وابوبکر رجلا من بنی الدیل ھادیا	قبیلہ بنی الدیل کے ایک شخص کو ملازم رکھا کہ (مدینہ کا)
خریتا وھو علی دین قریش	راستہ بتائے گا، اور یہ شخص قریش کے دین پر تھا (یعنی
(بخاری ج ۱ ص ۳۰۱)	مسلمان نہ تھا۔

اور بقول امام بخاری غیر مسلم آدمی کے خدمات سے استفادہ کا یہ واقعہ کوئی استثنائی یا انفرادی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہی لکھتے ہیں

عامل النبی صلی اللہ علیہ وسلم	خیبر کے یہودیوں سے (بٹائی) کا معاملہ رسول اللہ
یھود خیبر	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ظاہر ہے کہ خیبر کے جن یہودیوں سے معاملہ کیا گیا تھا، ان کی تعداد ایک دو میں محدود نہ تھی، دراصل یہ اور اسی کی قوم کے نبوی نمونوں کو پیش نظر رکھ کر جیسا کہ شارح بخاری ابن بطال کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ

الفقہاء یجیزون استیجارھم	علمائے اسلام نے غیر مسلم لوگوں کے خدمات سے معاوضہ
عند الضرورۃ وغیرھا	دے کر کام لینے کی عام اجازت دی ہے، خواہ
(حاشیہ بخاری)	ضرورت ہو یا نہ ہو۔

ضرورت ہو یا نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے مسلمان آدمی مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو، ہر حال میں مسلمانوں کو اجازت ہے کہ غیر مسلم اقوام کے افراد سے اس قسم کا معاملہ کر سکتے ہیں،

اور یہ تو خیر عام معاملات کے قصے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم طبیبوں سے طبی امداد حاصل کرنے کا براہ راست نمونہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھا،

میرا مطلب یہ ہے کہ عرب کا مشہور طبیب جس کا نام حارث بن کلدہ تھا، طائف کا رہنے والا تھا، ظہور اسلام سے پہلے اپنے وطن طائف سے وہ یمن پہنچا، جہاں اس زمانہ میں ایرانیوں کی حکومت قائم تھی، لکھا ہے کہ کچھ دستگاہ علم طب میں حارث نے یمن ہی میں حاصل کی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو خود ایرانی علاقہ کی مشہور طبی درسگاہ جند سابور میں باضابطہ علاج و معالجہ میں مہارت پیدا کرنے کا موقع مل گیا، طبی معلومات اور کمالات کے ساتھ وطن واپس ہوا، اور عرب ہی میں عوام و خواص کے علاج و معالجہ کا مرکز و مرجع بن گیا،

عمر اس نے کافی طویل پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھا لیکن جیسا کہ ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں نقل کیا ہے،

لا یصح اسلامہ (ص ۲۰۲ ج ۱) حارث کا مسلمان ہونا درست نہیں ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس نے اسلام قبول نہیں کیا، ورنہ جیسا کہ طبقات الاطباء میں لکھا ہے:

حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھا، اور آئندہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی و معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک زندہ رہا (ص ۱۱۰ ج ۱)

اس نے چاروں راشدین خلفا اور امیر معاویہؓ کی حکومت کا زمانہ بھی پایا، مگر آزادی کے ساتھ باوجود غیر مسلم ہونے کے عرب کی مقدس سرزمین اور اس کے شہر طائف میں بلکہ ایام حج میں مکہ معظمہ پہنچکر علاج و

معالجہ کا کام اس نے جاری رکھا، اور کیوں جاری نہ رکھتا معمولی تاریخی کتابوں میں نہیں بلکہ حدیث کی مستند کتابوں میں ہم پڑھتے ہیں کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آئے، اتفاقاً بیمار ہو گئے، تو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سعد کو مشورہ دیا،

ایت الحارث بن کلدۃ اخا ثقیف — ثقیف قبیلہ والے حارث بن کلدہ کیطرف

فانہ متطبب (ابوداؤد) — رجوع کرو کیونکہ وہ معالج ہے،

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

عالج سعدا اما بہ (اصابہ ج ۱ ص ۳۰) — سعد جس مرض میں مبتلا ہیں تم اسکا علاج کرو،

کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج و معالجہ کا جو تعلق مسلمانوں نے آیندہ مسلسل قائم رکھا، ان میں خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا، جو حارث کے ساتھ قائم کرکے صحابہؓ کو آپ نے دکھلایا تھا،

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو مسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے، خصوصاً جب مکہ معظمہ اس کا وطن بھی نہ تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً عرب کے اس مرکزی شہر میں بھی وہ آتا جاتا رہتا تھا لیکن بجائے اس کے اپنے عزیز صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم دینا کہ حارث سے علاج کراؤ، اور حارث سے فرمانا کہ تم میرے صحابی کا علاج کرو، کیا اس کے بعد اب بھی شک کی گنجایش اس مسئلہ میں باقی رہتی ہے کہ آیندہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ مسلمانوں کے جو تعلقات قائم ہوئے ان کا منشا خود مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا براہ راست طرز عمل اور آپ کا عملی نمونہ تھا،

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل کی بنیاد پر اسی عمارت کو جو مواقع خلافت راشدہ اور حضرت امیر معاویہ رض کے عہد حکومت میں حاصل ہوئے، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ عادت سے بسا اوقات طبی مسائل میں گفتگو بھی فرماتے، اور یہی طریقہ امیر معاویہ رض کا بھی تھا، سوچا جا سکتا ہے کہ قدرۃً ان واقعات کا مسلمانوں پر کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا،

سچی بات تو یہ ہے کہ عرب سے باہر نکلنے کے بعد مصر و شام، عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مسلمان جب پہنچے، اور ان کے سامنے پیغمبر کے براہ راست صحبت یافتوں کی طرف سے ایسے نمونے پیش ہوتے رہے کہ مثلاً کہتے ہیں کہ عمرو بن عاص رض صحابی جب حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی طرف سے مصر کے والی مقرر ہوئے تو مصر پہنچکر عمرو بن عاص کو خبر ملی کہ مشہور عیسائی طبیب جس کا اصلی نام اتوشیوس یا تامسطیوس[ل] تھا، لیکن مسلمانوں میں یحیی نحوی کے نام سے مشہور ہوا، علاوہ طب و فلسفہ وادب کے دین مسیحی میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، قسطنطنیہ کے عیسائی دربار میں بڑا رسوخ اسے حاصل تھا، اور زمانہ تک اس مسیحی پایہ تخت میں رہا تھا، قیصر کے دربار سے جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے، اس کو فیلونیوس کا علمی و دینی خطاب بھی ملا تھا، لکھا ہے کہ رومی زبان میں فیلونیوس مجتہد کو کہتے ہیں، خالکدونیہ نامی مقام میں صلیبی دین کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے علماے دین مسیحی کی جو مجلسیں ہوتی رہیں، تو بیان کیا جاتا ہے کہ چوتھی مجلس جسمیں (۶۳۰) اسقف یعنی پادریوں نے نمایندگی کی تھی، اس مجلس کا ایک ممتاز رکن اتوشیوس بھی تھا،

مگر باوجود ان تمام باتوں کے حضرت عمرو بن عاص رض کے کان تک اس کے علم و فضل کی شہرت جب پہنچی تو جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت عمرو بن عاص رض نے بلایا،

واکرمہ ورای لہ موضعا اور اس کی عزت کی اور خاص حیثیت اسکی

[ل] ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں پہلے نام کو اور تاریخ الحکما میں قفطی نے دوسرے نام کا ذکر کیا ہے، غیر عربی ناموں کے متعلق عربوں میں اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جانا محل تعجب نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کے نام کو آج یورپ والے کن کن شکلوں میں بگاڑ رہے ہیں اسی پر قیاس کر لیجیے۔

ان کی نظر میں قائم ہوگئی، (ص ۱۰۴)

تفطی نے اسی واقعہ کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ

فلازمه وکان لا یکاد یفارقه — اور اسکو عمرو بن عاصؓ نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے، (ص ۲۳۳)

پھر دونوں کے تعلقات کی تفصیل کی ہے،

اور عمرو بن عاصؓ تو پھر بھی ایک ملک کے والی اور گورنر تھے، امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو وقت کے سب سے بڑے حکمران اور ان کے زمانہ میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے وہی مرکز وحید تھے اور اسی کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی رکھتے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے دوسرے صیغوں اور محکموں کے سوا ان کے دربار میں بھی طبی سررشتہ کا تعلق عیسائیوں یعنی غیر مسلم اطبار کے ہاتھوں میں ہے جن میں ابن آثال اور دوسرے عیسائی طبیب جس کا اصلی نام معلوم نہیں، مگر مسلمانوں میں ابوالحکم کے نام سے مشہور ہے، ان دونوں کے تذکروں اور ان کے قصوں سے کتابیں معمور ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن آثال تو علاج و معالجہ میں مشہور تھا، اور ابوالحکم دوا سازی میں امتیاز رکھتا تھا، طبقات الاطباء میں ابن آثال کے متعلق لکھا ہے کہ

جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت کا اعلان دمشق میں کیا تو ابن آثال کو اپنا معالج خاص مقرر کیا، اس کے ساتھ وہ بہت سلوک کرتے تھے، اور اس کے بہت معتقد تھے، صبح و شام اس سے گفتگو کرتے؛ (ص ۱۱۶ ج ۱)

اسی طرح ابوالحکم کے متعلق یہ لکھکر کہ کان طبیبا نصرانیا یعنی وہ ایک عیسائی طبیب تھا لکھا ہے کہ

طبی امور امیر معاویہؓ اس سے بھی حاصل کرتے تھے، اور دواؤں کی ترکیب میں اس پر بھروسہ کرتے تھے (ص ۱۱۹)

جب گورنروں اور گورنروں سے بھی آگے بڑھکر خود وقت کے حکمران کے درباروں میں غیر مسلم اطبار کی اہلام

کے عہد آغاز یعنی عہد صحابہ ہی مین یہ آؤ بھگت ہو رہی تھی تو عام مسلمانون مین ان غیر مسلم طبیبون کی مقبولیت کی کوئی حد ہو سکتی تھی ،

دوسری صدی کے امام ، امام شافعی سے لیکر عہد غزالی تک تقریباً پانچ ساڑھے پانچ صدیون کی اجمالی شہادت آپ کے سامنے جو گذری کہ مسلمانون کے عام علاقے غیر مسلم طبیبون سے بھرے ہوئے تھے ، کیا مذکورہ بالا معلومات کے بعد بھی کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ دین سے بُعد یا طول امد کی قدرتی افسردگی کا یہ نتیجہ تھا ،

مین تو کہتا ہون کہ تاریخون مین یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے دربار کا یہی عیسائی طبیب یا دواساز ابوالحکم ان کے حکم سے یزید کے ساتھ حج کے موسم مین مکہ معظمہ آیا ، اور ساتھ ساتھ رہا ، یا عباسیون کے زمانہ مین اسی ابوالحکم کو جس نے کافی عمر پائی تھی ، کہ کے عباسی گورنر عبد الصمد بن علی نے اپنے علاج کیلیے کہ بلوایا[1] ، اور مسلمانون کی طرف سے کوئی اعتراض اس پر نہین ہوا ، تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین حارث بن کلدہ مکہ معظمہ مین مسلمانون کے علاج و معالجہ کا کام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انجام دے چکا تھا ،

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ پہلی صدی ہجری کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ابن سعد نے اپنی طبقات مین کیا ہے ، یعنی شام کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام عبد الرحمن تھا ، لکھا ہے کہ کسی وجہ سے شام چھوڑ کر وہ مکہ معظمہ پہنچا اور وہین اس نے مطب قائم کیا ، طبقات کے الفاظ یہ ہین کہ

كان عبد الرحمن ابو داود نصرانيا	عبد الرحمن جس کی کنیت ابو داؤد تھی ایک عیسائی تھا ،
وكان رجلا من اهل الشام وكان	شام کا باشندہ تھا اور طبابت کرتا تھا ، پھر مکہ
يتطبب فقدم مكة فنزلها (طبقات ج ۵ ص ۳۶۵)	آیا ، اور وہین رہ پڑا ،

قابل توجہ اور خاص طور پر جو چیز عبد الرحمن الطبیب النصرانی کے تذکرہ مین اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے

---

[1] دیکھیے طبقات الاطباء ج ا ص ۱۱۹

کہ مکہ معظمہ مین اپنا مطب اس عیسائی طبیب نے کہان قائم کیا تھا، ابن سعد کا بیان ہے کہ

عبد الرحمن یجلس فی اصل منارۃ المسجد الحرام من قبل الصفا (۲)	کوہ صفا کی طرف مسجد حرام یعنی کعبہ کا جو منارہ تھا عبد الرحمن اسی منارہ کے نیچے بیٹھا کرتا تھا،

جیسا کہ مین نے عرض کیا یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے، ذرا اندازہ کیجئے مسلمانون کی دینی فراخ دلی کا کہ ایک غیر مسلم طبیب ان کے اس شہر مین آکر قیام کرتا ہے، جہان ان کی نماز دن کا قبلہ اور بیت اللہ ہے جس کا وہ حج کرتے ہین، اور اسی بیت اللہ کی مسجد کے منارے کے پایہ کے پاس مطب کھولتا ہے، لیکن کسی کو اس پر اعتراض تو کیا ہوتا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ شرفائے قریش مین آل جبیر کا جو ممتاز خاندان تھا، اسی خاندان کی سرپرستی اس عیسائی طبیب کو حاصل تھی، ابن سعد ہی مین ہے

ووالی آل جبیر بن مطعم بن عدی	موالات کا تعلق جبیر بن مطعم بن عدی کے خاندان والون سے عبد الرحمن نے قائم کیا تھا،

آج دنیا مین ایسے کتنے ممالک اور علاقے ہین، جہان اس لیے کہ مسلمانون کی آبادی اتفاقاً قلت کے داغ سے داغدار ہوگئی ہے، اکثریت والون نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا رکھا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد اقتدار مین غیر قومون کے ساتھ موجودہ مسلمانون کے باپ دادون نے جو سلوک کیا تھا، یہ اسی کا انتقام ہے۔

اس بے بنیاد دعوے کے مقابلہ مین تاریخ کی شہادتین کیا ہین؟ یا جرم کی سزا ان لوگون کو دینی جنھون نے خود کوئی جرم نہین کیا ہے، مگر یہ الزام لگا کر کہ تم نے نہ سہی تمھارے باپ دادون نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا، قانوناً وعقلاً کس حد تک غیر مجرمون سے بدلہ لینا درست ہو سکتا ہے، ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے مین صرف اسی ایک جزئی واقعہ کو پیش کرتا ہون، اور پوچھتا ہون کہ مسلمانون کے ان ہی باپ دادون کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، جو اپنے مقدس ترین شہر مین بھی اپنی سب سے

بڑی مرکزی مسجد کے زیر سایہ غیر مسلم آدمی کو پناہ دینے سے بھی دل میں تنگی نہیں محسوس کرتے تھے،

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے گذشتہ آباء و اجداد جن پر تنگ نظری اور قومی و ملی عصبیت کے مریض طبائع کی طرف سے طرح طرح کے الزام تراشے جاتے ہیں، کاش! اپنی کوتاہ بینی کے عوارض سے پاک ہو کر مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے، تو ان کو شاید یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا، کہ جن گذرے ہوئے بزرگوں کو طعن و تشنیع کا آج نشانہ بنایا جارہا ہے، ان کے سینے اتنے کشادہ اور نگاہیں اتنی وسیع تھیں، اور اسی بنا پر ایسی باتیں وہ کر گذرتے تھے، کہ جن کو کرنا تو کرنا شاید عہد جدید کے مسلمان اس کے سننے کی تاب بھی نہیں لا سکتے،

دور کیوں جایئے، اسی طب و طبابت کے قصہ میں ابن ابی اصیبعہ نے مشہور غیر مسلم عیسائی طبیب جبیر بن بختیشوع کے تذکرے میں یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ ایک دن ہارون عباسی خلیفہ دربار میں بیٹھا ہوا تھا، جبرئیل بھی حاضر تھا، ہارون نے جبرئیل کی طرف خطاب کرکے کہا کہ

"تم جانتے ہو میرے دل میں تمھاری کتنی جگہ ہے"

پھر خود ہی ہارون نے مسلمانوں سے بھرے ہوئے دربار میں کہنا شروع کیا کہ

"خدا کی قسم موقف (یعنی میدان عرفات جہاں کے قیام کے بغیر حاجی کا حج پورا نہیں ہوتا اسی موقف میں) ہے، جبرئیل میں نے تیرے لیے دعائیں کیں، اور بہت زیادہ دعائیں کیں" (طبقات الاطبار ج ۱ ص ۱۲۰)

موقف یعنی عرفات کے میدان کی دینی اہمیت مسلمانوں میں جتنی ہے، جو اس سے ناواقف ہیں، وہ شاید صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہارون اس وقت کیا کہہ رہا تھا، اور غیر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری کی کتنی غیر معمولی مثال پیش کر رہا تھا، جذبۂ احسان شناسی کی یہ ایک تاریخی نظیر ہے، جسے عمل کرکے ہارون نے دکھایا، مسلمانوں پر جنھوں نے احسان کیا ان کو وہ کبھی نہیں

بھولتے، حرم میں جگہ دیتے ہیں، حرم کی مسجد کے نیچے اسے خود بٹھاتے ہیں، اور حد یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ جس کے لیے دعائیں کر رہا ہوں وہ مسلمان نہیں ہے، وہ اس خاص مقام پر دعا کرتے ہیں، جس کے متعلق کم از کم ان کا یہ دینی اذعان، اور ایمانی ایقان ہے کہ وہاں کی دعا نامقبول نہیں ہوتی، دربار سے بعضوں نے ہارون سے پوچھا بھی، جواب میں اس نے کہا تھا کہ

"میں مسلمانوں کے حقوق کا محافظ ہوں اور جبرئیل میری جسمانی صحت کا محافظ ہے،

اس لیے دراصل جبرئیل کا وجود مسلمانوں کا محافظ ہے"

راوی کا بیان ہے کہ ہارون کے اس جواب کو سن کر دربار والوں نے کہا

صدقت یا امیر المومنین (ص ۲۸) آپ نے سچ فرمایا اے مسلمانوں کے امیر

میں نہیں جانتا کہ اس صدقت (سچ کہا آپ نے) کی تصدیق پر اس زمانے کے مسلمان آمادہ بھی ہوں گے یا نہیں ؟ مگر اتنی بات کے لیے تو کسی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت نہیں، آپ کے سامنے زمین کے اسی کرہ پر حبشہ (ابی سینیا) کی عیسائی حکومت تیرہ سو سال سے قائم ہے، اپنے جغرافی محل وقوع کے لحاظ سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر چاہا جاتا تو اپنے محروسہ مقبوضہ علاقہ میں بآسانی اس علاقے کو بھی شریک کر سکتے تھے، مگر اسی جذبۂ امتنان و تشکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کشورکشائیوں کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے دور دراز علاقوں میں گھستے چلے گئے، لیکن حبشہ والوں نے بڑے نازک وقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی مختصر تعداد کو چونکہ پناہ دی تھی، اس لیے نگاہ غلط انداز بھی ان کی حبشیوں کی اس سرزمین پر نہیں پڑی، حالانکہ جس وقت حبشہ والوں نے ان صحابیوں کو پناہ دی تھی اس وقت بھی ان کی اکثریت دین مسیحی ہی پر قائم ہے،

کچھ بھی ہو، میرا تو جیز خیال یہی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے غیر مسلم اطباء کے مقامات سے استفادہ کے سلسلہ کو زندہ و جاری رکھا، اس کی حوصلہ افزائی عہد نبوت

و خلافت راشدہ کے روایات ہی سے ہو رہی تھی،

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ الخلیفہ نے بھی اپنے زمانہ میں اطبا کے ساتھ مروانی حکمرانوں کے جو تعلقات تھے، ان میں صرف یہی نہیں کہ کسی قسم کی ترمیم و اصلاح نہ فرمائی، بلکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اہرن بن اعین القس کی کتاب کناشہ (یا قرابادین) کا ترجمہ سریانی زبان سے بنی امیہ کے عہد کے یہودی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان میں جو کیا تھا، اور علاوہ شرح کے مزید دو مقالوں کا بھی اضافہ اس کتاب میں اس کی طرف سے عمل میں آیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے چالیس دن تک اس کتاب کو اپنی عبادت گاہ کے کمرہ میں رکھا، اور اس کے بعد حکم دیا کہ عام مسلمانوں میں یہ کتاب پھیلا دی جائے، (طبقات الاطبا ص ۱۶۳ ج ۱)

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جس اصلاحی خدمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر اس زمانے میں یہودی اور عیسائی اطبا تریاق کے نام سے جو چیز تیار کرتے تھے، اس میں سانپ بھی نسخہ کا ایک جز تھا، ابن سعد نے طبقات میں ابن لہیعہ محدث کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے صوبہ کے عامل کو لکھا تھا کہ تریاق میں بجائے مردہ سانپ کے نہ ڈالا جائے،

الاحیۃ ذکیۃ (ص ۲۸۵ ج ۵) مگر ذبح کیا ہوا سانپ،

حالانکہ سانپ خواہ میتۃ (مردہ) ہو، یا ذکیہ (ذبح کیا ہوا) ہر حال میں حرام ہے، مگر طبی ضرورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا خیال بھی وہی تھا، جو بہت سے دوسرے ائمۂ اسلام کا ہے کہ دواءً حرام چیزوں کا استعمال بھی جائز ہوتا ہے[۵]، میں خود طبیب نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں ہے کہ تریاق میں

---

[۵] حرام چیزوں سے دواءً استفادہ یا ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اس باب میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ جب تک اطبا صحت کو اسی دوا کے استعمال کے ساتھ محدود نہ کریں، اس وقت تک ان کا استعمال

سانپ کو لوگ کس طرح شریک کرتے تھے، آج کل کے اطباء کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، عہد جدید کی ڈاکٹری دواؤن مین مسلمانون کے لیے عام ابتلاکی جو صورت پیش آگئی ہے، ارباب علم و فتوی چاہین تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اس "اثر" سے سہولت کی راہ پا سکتے ہین،

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، مین کہنا یہ چاہتا تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنی امیہ کے ہاتھون مین سیاسی اقتدار آیا، تو ایک طرف جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہین، قدیم عربی حمیت کے بجھے ہوے شعلے اُن زمانہ مین بھڑک اُٹھے تھے، جس اسلامی نظام مین ایران کا نو مسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کا رکن بن جاتا تھا، خالص قریشی نژاد خلیفہ عمر فاروقؓ اپنی صاحبزادی کو اس کے عقد ازدواج مین دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہین،[۵]

حبشی بلالؓ اُن ہی عمر فاروقؓ کا سیدنا بن جاتا ہے، اسی اسلامی نظام مین بنی امیہ کے فرمانرواؤن نے عربی و عجمی موالی و غیر موالی کے سوال کو اٹھایا، اور جہان تک ان کے امکان مین تھا، اس کلمۂ منتنہ (بدبودار)[۶] سے نفع اٹھانے مین کمی نہ کی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) جائز نہ ہوگا، یعنی اس حرام کا بدل حلال دوا اگر مل سکتی ہے، تو اس وقت تک حرام دوا کو استعمال نہ کرنا چاہئے، لیکن دوسرے ائمہ کا فتوی ہے کہ بدل ملے یا نہ ملے، دوائے حرام چیزون کا استعمال حرام ہی نہین ہے، تفصیل کے لئے فقہ کے مطولات کا مطالعہ کیا جائے، عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی کا نام بھی ثانی الذکر طبقہ مین لیا جاتا ہے یعنی دوائے حرام چیزون کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، مگر دمیری نے حیات الحیوان مین نقل کیا ہے کہ جس تریاق مین سانپ ملا لیا گیا ہو، امام شافعی اس کے کھانے کی اجازت اس وقت تک نہین دیتے تھے، جب تک کہ اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے، جس مین قرآن نے مردار کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے (ج ۱ ص ۲۴۵ حیات الحیوان دمیری) ۱۲) [۵] میرا اشارہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالی عنہ کی طرف ہے، ۱۲۔

[۶] عہد نبوت و رسالت مین نسلی و وطنی سوالات کوئی اگر اٹھاتا تو آواز بلند ہوتی تھی، دعوھا فانھا کلمۃ منتنۃ (اسکو چھوڑو یہ بھی بدبو بات ہے)

مگر باوجود اس کے ہم اطبا کے لباس مین ان ہی اموی فرمانرداؤن کی شاہی خوابگاہون مین یہودی اور عیسائی طبیبون کو پاتے ہین، ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے کہ یہاں مروانی حکمران عبد الملک جب مرض الموت مین مبتلا ہوا، تو وہی عیسائی طبیب جس کی کنیت مسلمانون نے ابو الحکم رکھدی تھی، پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ یزید کے ساتھ بطور اتالیق کے موسم حج مین امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو حجاز بھیجا تھا، اسی ابو الحکم کا بیان ہو کہ عبد الملک نے اس کو اپنے زمانہ مین بلالیا، اسکی روایت کے الفاظ ہین :-

فانی مجالس وعندہ بناتہ — مین عبد الملک کے بستر علالت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور عبد الملک کی لڑکیان بھی وہان

(ج ا ص ۱۱۶)

واللہ اعلم درمیان مین کوئی پردہ تھا، یا برقع اوڑھکر باپکے پاس عبدالملک کی یہ شہزادیان آئی تھین میری غرض یہ ہے کہ قرب اور نزدیکی کا جو مقام غیر مسلم طبیبون کو مروانی حکومت مین دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد بھی کوئی مرتبہ سوچا جا سکتا ہے، [۵۲]

---

[۵۱] آگے جو قصہ ابو الحکم نے بیان کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے، لکھا ہے کہ اسی عرصہ مین عبد الملک کا ولی عہد ولید بھی اسی کمرے مین داخل ہوا، اور باپ سے حال پوچھنے لگا، مگر جس انداز سے مزاج پرسی کر رہا تھا، عبد الملک نے تاڑ لیا، یعنی اپنی بادشاہی کا خواب اس کے مرنے کے بعد دیکھ رہا ہے، عبد الملک کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہو کہ

"ایک شخص میرا حال دریافت کر رہا ہے، اور چاہ رہا ہے کہ میں مرجاؤن، دوسری طرف کچھ عورتین (لڑکیان) مزاج پرسی کر رہی ہین، اور اُن کی آنکھون سے آنسو جاری ہین"

[۵۲] صرف قیاس سے مین یہ نہین کہہ رہا ہون، طبقات الاطبا ہی مین ابوسہل نوبخت ایرانی طبیب کے ذکر مین لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس پہلی دفعہ جب ابوسہل پیش ہوا، تو نام پوچھنے پر اُس نے اپنا اصل ایرانی نام بتاتے ہوئے کہا کہ میرا نام "خرخشاذ ماہ طیماذاہ مابازار باد خسرو ابہمشاذ" ہے اس طویل لمبے نام کو سنکر منصور مسکرایا پھر کہا کہ تمھارے باپ نے تو عجب تماشا کیا ہو اب دو ہی صورت ہو ان تمام الفاظ مین سے "طیماذاہ" کے لفظ کو مین چن لیتا ہون اسی نام سے تم کو موسوم کیا جائیگا اور چاہو تو کنیت "ابوسہل"

حیرت ہوتی ہے کہ عربیت کے سب سے بڑے علمبردار اموی حکومت کے تاج کا جوہر تابدار اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ظالم تھا، حجاج بن یوسف ثقفی جیسے آدمی کو بھی طبی کاروبار میں ہم کافی وسیع النظر پاتے ہیں جو اس کی جو کچھ بھی ہو، مان بھی لیا جائے کہ پرخوری کی عادت بد سے مجبور ہوکر وہ طبیبوں کا دست نگر ہوگیا تھا لیکن جس نے سارے ایرانی ممالک کے فارسی دفاتر کو عربی زبان میں بہ یک اشارۂ چشم بدل دیا تھا، اس کے لئے کیا دشوار تھا کہ عربی النسل اطباء کو اپنے اردگرد جمع کرلیتا خصوصاً بنی ثقیف جس سے حجاج کا خاندانی تعلق تھا، اسی قبیلہ میں پشتہا پشت سے عربی طبیبوں کا ایک سلسلہ اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا، اور بعد کو بھی اس خاندان کے اطباء کا ذکر لوگوں نے کیا ہے یعنی وہی حارث بن کلدہ جو عہد نبوت میں حجاز کا سب سے بڑا طبیب شمار ہوتا تھا، اور اس کو بھی جانے دیجئے، حجاج کے لئے کیا دشوار تھا کہ اپنے علاقہ جند سابور کی طبی درس گاہ میں عرب نوجوانوں کو بھیج کر اپنے لئے عربی النسل اطباء کا اسٹاف مہیا کرلیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دربار کا بھی سب سے زیادہ دسترس رکھنے والا اور اس کا محبوب ترین چہیتا طبیب بھی عیسائی ہی تھا، نام اس کا لوگ تیاذوق بتاتے ہیں، نشنا کی صورت بتاتی ہے کہ کسی غیر معمولی عربی لفظ کی یہ عربی شکل ہے، واللہ اعلم بالصواب، ابن ابی اصیبعہ جس کی نظر سے ابراہیم بن القاسم الکاتب کی کتاب "اخبار الحجاج" گذر چکی تھی جس میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ حجاج کے حالات درج کئے گئے ہیں، اسی کتاب کے حوالہ سے بھی اور دوسری کتابوں سے بھی اخذ کرکے تیاذوق کے بڑے دلچسپ قصے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ

کان یعتمد علیہ ویثق بمداواتہ	حجاج تیاذوق پر بھروسہ کرتا تھا، اور
وکان لہ منہ الجامکیۃ	اس کے علاج پر اعتماد کرتا تھا حجاج

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۱) رکھ لو، ابوسہل نے دوسری صورت کو سہل قرار دیا، اور بعد کو "ابوسہل" کے نام سے مشہور ہوا جس سے معلوم ہوا کہ عربی کنیت ان عیسائی یا یہودی طبیبوں کی مسلمانوں کی طرف سے رکھی جاتی تھی، ۱۲

الوافرة، والاقتصاد الكثير	کے ان سے غیر معمولی تنخواہ بھی تیاذوق کو ملتی تھی، اور یوں بھی اس کی بہت زیادہ
(ص ۱۲۱ ج ۱)	خبر گیری کرتا تھا،

یہ بھی لکھا ہے کہ جب تیاذوق مرض موت میں مبتلا ہوا تو حجاج عیادت کے لئے براہ راست اس کے گھر گیا خود کہتا تھا کہ

لما حضرته الوفاة دخلت عليه	جب تیاذوق مرض الموت میں مبتلا ہوا تو
اعوده، (ص ۱۲۳)	میں اس کے گھر گیا عیادت کرنے کے لئے،

آج ان الفاظ کے وزن کو ہم محسوس نہیں کر سکتے تھے لیکن حجاج جو اموی حکومت کے سارے ایشیائی علاقہ کا مطلق العنان والی و حاکم تھا، اور نخوت و کبر میں اس کا جو حال تھا، ان امور سے جو واقف ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، ممکن ہے کہ اس میں تیاذوق کی غیر معمولی حذاقت کو بھی دخل ہو، حجاج اپنے لڑکے محمد سے بیان کیا کرتا تھا کہ

"بقائے صحت کے متعلق تیاذوق کے طبی مشوروں کو میں نے اپنے تجربہ میں بالکل درست پایا، اور ہمیشہ ان پر عمل کرنے سے مجھے نفع پہنچا"[۱]

یا تیاذوق کی غیر معمولی حاضر جوابیوں سے حجاج کے دل میں غیر معمولی اثر اس کا جو قائم کر دیا تھا، اس کا نتیجہ ہو، حجاج اپنے بے پناہ مظالم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ مشکلات میں گھرا پاتا تھا، تیاذوق جب آجاتا، تو اس کی گفتگو سے تھوڑی دیر کے لئے اس کا غم غلط ہو جاتا تھا، اس سلسلہ میں لوگوں نے تیاذوق کے متعدد لطیفوں کا ذکر کیا ہے جن میں اس کے ذہنی انتقال کی بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ حجاج کے سر

---

[۱] اگر یہ واقعہ ہو جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں نقل کیا ہے کہ بعضوں نے حجاج کو دسترخوان پر کھاتے ہوئے پایا جتنے لقمے اٹھاتا تھا، انھیں وہ گن رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ مسلم ایک روٹی میں ایک کف دست

میں درد تھا، تیاذوق بلایا گیا، اُس نے حکم دیا کہ امیر کے پاؤں پر گرم پانی ڈالا جائے اور تیل کی مالش کی جائے، ایک خواجہ سرا جو عموماً مسخرے ہوتے تھے، حجاج کے سامنے کھڑا تھا، بے ساختہ بول اٹھا کہ درد تو امیر کے سر میں ہے اور یہ عجیب طبیب ہے مشورہ دے رہا ہے کہ امیر کا پاؤں دھویا جائے، تیاذوق نے کہا کہ میرے دعوی کی دلیل تو تیرے چہرے پر ہے، خواجہ سرا نے کہا کہ وہ کیا، بولا کہ جو چیز تمھارے اندر سے نکالی گئی، وہ کہاں تھی؟ داڑھی تمھارے چہرے سے غائب ہوگئی، خواجہ سرا شرمندہ ہوگیا،

بہرحال عبدالملک اور حجاج جو غربت کی زندگی سے امارت و دولت تک پہونچے تھے، بداوت کے یا دہقانیت سے زیادہ دور نہیں ہوئے تھے، جب اُن کے درباروں میں غیر مسلم اطبا کو عزت و جاہ کی اُن بلندیوں پر ہم پا رہے ہیں، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیندہ ان مروانی حکمرانوں کے تعلقات کی نوعیت ان طبیبوں کے ساتھ ترقی کے کس نقطہ تک پہونچ گئی ہوگی، جنھوں نے شاہی خانوادہ میں پرورش پائی تھی اور پیدا ہونے کے ساتھ ناز و نعمت کی زندگی کے عادی تھے، ان ہی حکمرانوں میں جب اس قسم کے لوگ پیدا ہو چکے تھے، جو فخر کرتے تھے کہ میں کسریٰ کا بیٹا ہوں، اور مروان میرا باپ ہے، میرا نانا قیصر بھی ہے اور

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳) کھن بھرتا اور نگلتا جاتا تھا، اس طرح (۴۰) تھے میں نے اس کے گنے غالباً تیاذوق کی دوا نے اس کے معدے میں ہضم کی یہ غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی، (دیکھو ابن عساکر ج ۵ ص ۲، طبقات الاطبا میں ایک لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ تیاذوق سے حجاج نے کچھ ضعف معدہ کی شکایت کی، اس نے مشورہ دیا کہ بھنے ہوئے پستے سامنے رکھ لیجئے، اور ایک ایک دانہ توڑ توڑ کر بطور نقل کے استعمال کیجئے، حجاج نے درباریوں سے کہا کہ بھنے ہوئے پستوں کے استعمال کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے، کہتے ہیں کہ مختلف درباریوں کے گھر سے بھنے ہوئے پستوں کے خوان کے خوان نازل ہونے لگے، حجاج نے بھی مٹھیوں میں بھر بھر کر پھانکنا شروع کیا، اور اتنا کھا گیا کہ بدہضمی ہوگئی، تیاذوق بلایا گیا، حجاج نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ بولا کہ اے امیر! میں نے تو عرض کیا تھا کہ دانہ دانہ کر کے اسے چکھئے گا، آپ نے تو پھانکنا شروع کیا، حجاج شرمندہ ہوگیا، پھر علاج معالجہ سے طبیعت درست ہوگئی

خاقان بھی ہے[۵]

سوچا جا سکتا ہے کہ اپنی ہمرشتہ قومون کے افراد کے ساتھ حسن سلوک مین اگر اسے خالص عربی نژاد بزرگون سے وہ آگے بڑھ گئے ہون، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے،

افسوس ہو کہ مروانیون کے اسّی سال کے دورِ حکومت مین دربار سے جن جن اطباء کا تعلق رہا، لوگون نے تفصیلی تذکرہ اپنی کتابون مین نہین کیا ہے مگر تیاذوق ہی کے متعلق ہم ان ہی مین پاتے ہین کہ اس کا بیٹا بھی طبیب تھا، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اسی بیٹے کے لئے تیاذوق نے "کناش کبیر" بھی لکھی تھی، اور کتاب الادویہ بھی جس مین بیان کیا ہے کہ

کیفیۃ دقہا وایقاعہا واذابتہا	دواؤن کے کوٹنے اور اُن کے ڈالنے
وشی من تفسیر الادویۃ،	گھلانے وغیرہ کے طریقے بھی بیان کئے گئے تھے، اور بعض دواؤن کے نام کی
(صفحہ ۱۳۲)	بھی تشریح کی تھی،

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بعد تیاذوق نے شاگردون کی بھی معقول تعداد چھوڑی تھی جن مین ایک یہودی طبیب فرات بن شحاثا کے متعلق طبقات الاطبار مین لکھا ہے کہ

کان تیاذوق المتطبب یقدمہ	تیاذوق طبیب اس کو (یعنی فرات بن
علی جمیع تلامذتہ،	شحاثا) کو اپنے تمام دوسرے شاگردون

---

[۵] عام تاریخون مین یزید بن الولید مروانی فرمانروا کی طرف عربی کا یہ شعر منسوب کیا گیا ہے، وہ کہا کرتا تھا،

انا ابن کسریٰ وابی مروان وقیصر جدی وجدی خاقان

مسعودی ص ۳، ابن کامل اسی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، کہتے ہین کہ یزید بن الولید کی مان جس کا نام سارینبت فیروز تھا، کہتے ہین کہ اس مین واقعی ایران کے کسریٰ روم کے قیصر ترکون کے خاقان کا خون شریک تھا، ۱۲،

(جلد ۱ صفحہ ۱۶۰) پر ترجیح دیتا تھا،

اسی فرات بن شحاثا یہودی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

خدم الحجاج بن یوسف و هو حدث — اس نے حجاج بن یوسف کی بھی اس زمانہ میں خدمت کی تھی، جب یہ یہودی

(ج ۱ ص ۱۶۱) طبیب جوان تھا،

فرات نے لمبی عمر پائی، مروانیوں کا دور جب ختم ہوگیا، اور ان کے جانشین عباسی ہوئے تو ان کے دربار میں فرات داخل ہوگیا، کوفہ کے عباسی گورنر عیسیٰ بن موسیٰ نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، عیسیٰ کا وہ صرف طبیب ہی نہیں تھا، بلکہ سیاسی مشیر بھی، بعض سیاسی مشورے فرات نے جو اس کو دیئے تھے، فرات کی وفات کے بعد جب واقعات اسی کی سیاسی بصیرت کے مطابق پیش آتے، تو عیسیٰ کہا کرتا تھا کہ

فرات بن شحاثا صائب الرائے آدمی تھا، جو بات بھی تو کہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے گویا بے نقاب ہو کر تیرے سامنے آجاتی تھی، جو واقعات آج میرے سامنے پیش آرہے ہیں، تو ان کو گویا دیکھ رہا تھا، (صفحہ ۱۶۳)

ابن ابی اصیبعہ نے فرات کے بعض سیاسی مشوروں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہیں افسوس ہے کہ ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، ان کے پڑھنے سے ایک طرف جہاں اس کا پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ان طبیبوں پر کتنا غیر معمولی اعتماد مسلمانوں کے سلاطین و امراء کرتے تھے، تو دوسری طرف اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اپنے قدرشناسوں کے ساتھ ان کے تعلقات بھی کتنے مخلصانہ اور سچی بہی خواہیوں پر مبنی تھے،

جیسا کہ میں نے عرض کیا، مروانی حکمرانوں کے دربار کے ان طبیبوں کا تفصیلی تذکرہ کتابوں میں

نہین پایا جاتا، لیکن جب عباسیون نے اپنے ہاتھ مین مسلمانون کی حکومت کی باگ لی، اس وقت جو تماشا اس سلسلہ مین پیش آیا، وہ دیکھنے کے قابل ہے،

عباسیون نے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین زیادہ تر کامیابی غیر عربی عناصر کی امداد و معاونت سے حاصل کی تھی، قدرۃً ان کا دربار عجمیون سے بھر گیا، عموماً مالی کاروبار کا عباسیون کے زمانہ مین یہودی جھبذون یا موجودہ اصطلاح مین یہودی بنیک کارون سے تعلق تھا،

عباسیون کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم باب ہے، میرے سامنے اس وقت صرف اطبار اور معالجین کا قصہ ہے، آیئے پہلے اس کو سُن لیجئے، پھر اگر توفیق رفیق ہوئی تو عہد عباسی کے "جہابذہ" کی داستان بھی سُنائی جائیگی اگر اجل مسمیٰ نے فرصت نہ دی تو مین دوسرے ارباب علم وقلم سے درخواست کرتا ہون کہ آیندہ اس مضمون کی تکمیل فرمادین گے،

سچ پوچھئے تو غیر مسلم اطبار کے عروج و اقبال کا حقیقی زمانہ عباسیون ہی کا عہد ہے، ان کے دربار مین یہودی عیسائی، مجوسی، صابی اطبار کے سوا نیا عنصر ہندوستانی طبیبون کا بھی داخل ہو گیا تھا کہتے ہین کہ عباسیون کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور ضعف معدہ مین مبتلا تھا اچھا نہ ہوتا تھا ایک ہندوستانی طبیب نے پھنکی بنا کر دی جس سے صحت حاصل ہوئی، اور اُس کے دل مین ہندی طریقۂ علاج کا وزن پیدا ہوا نیز خالد برمکی کو ہند اور ہندی علوم سے جو تعلق تھا، اس کو بھی عباسیون کے دربار مین "ہندی طب" بلکہ دوسرے ہندی علوم وفنون کی روشناسی مین بہت دخل ہے، اب خواہ اسباب کچھ بھی ہون ہندوستانی اطبار کی کافی تعداد مختلف زمانہ مین بغداد پہنچی ہے، ہندی طب کی بے شمار کتابون کا ترجمہ عربی زبان مین کیا گیا، اردو زبان مین کافی مواد اس مسئلہ مین جمع ہو چکا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے ہندی اطباء اور ہندی طب کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین ان کی فہرست درج کی ہے، جس مین دلچسپ بات یہ ہے، کہ منجملہ اور

کتابوں کے ایک کتاب ہندوستان سے بغداد پہنچی جس کا نام علاجات النساء تھا، یا اسی عنوان پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، بہرحال دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ

کتاب روسی الهندیه فی علاجات النساء، (ج ۲ صفحہ ۳۲)	روسی ہندی خاتون کی کتاب عورتوں کے علاج کے متعلق ہے،

میں نہیں جانتا کہ اس ہندوستانی مصنفہ کی اس خدمت کا جو اپنے جنس کی اس نے انجام دی تھی، دوسروں نے بھی تذکرہ کیا ہے یا نہیں، اور اس زمانے میں اس کے متعلق لوگوں کی تحقیق کیا ہے، کچھ بھی ہو طب جیسے اہم فن پر ہندوستان کی کسی خاتون نے کتاب لکھی ہے، اس کا پتہ تو اس تاریخی شہادت سے چلتا ہے، کاش اس فن سے تعلق رکھنے والوں کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو، مسلمانوں کی طب کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے حوالہ کرکے میں اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں،

سب سے پہلے تو اس سلسلہ میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دربار خلافت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اطباء کی تعداد کیا ہوگی، جب ہم دیکھتے ہیں کہ عباسی عہد کے امراء بھی اپنے ہاں طبیبوں کی ٹولیوں کو ملازم رکھتے تھے طبقات الاطباء میں مشہور عباسی امیر ابو دلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

کان مجلس ابی دلف مجمعا للمتطببین،	ابو دلف کی مجلس میں طبیبوں کا مجمع رہتا تھا،

طبیبوں کے اس مجمع میں جو لوگ شریک تھے، ان میں بعضوں کا نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان معه من المرتزقة جماعة منهم یوسف بن صلیبا وسلیمان بن داؤد بن بابان ویوسف القصیر ویونس بن حنون، (ج ۱ ص ۱۶۸)	امیر ابو دلف کے ساتھ تنخواہ یاب اطباء کا ایک گروہ تھا جن میں یوسف بن صلیبا، سلیمان بن داؤد بن بابان، یوسف القصیر (کوتاہ قد) اور یونس بن حنون بھی تھے،

نام ونسب سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان نہین تھے، اسی کے بعد بیان کیا ہے، کہ مرتزقہ کے سوا

ربما اجتمعوا فی مجلسه منهو	بسا اوقات (غیر تنخواہ دار اطبا تک)
عشرون رجلاً	بیس بیس آدمی اس کی مجلس مین جمع ہو جاتے تھے،

افسوس ہے کہ لوگون نے مفصل فہرست ان طبیبون کی نہین دی ہے، جو مختلف عباسی خلفاء کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اتفاقی طور پر دوسرے واقعات کے تذکرے کے ذیل مین ایسی چیزین مل جاتی ہین، مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے مشہور عیسائی طبیب حنین بن اسحاق کے اس رسالہ کو نقل کیا ہے جس مین اس نے اپنی اور بختیشوع طبیب کی باہمی کش مکش اور سازش کی داستان بیان کی ہے، اسی رسالہ مین حنین نے خلیفہ متوکل کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ہمارے مخالف اطبا جو ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہین، اور خلفاء کی خدمت کا شرف سب کو حاصل ہے، ان کی تعداد،

ستة وخمسون رجلاً کلّهو	چھپن ہے، اور سب ہمارے ہم
من اهل المذهب، (ص۱۹۲)	مذہب ہین،

ظاہر ہے کہ دربار خلافت کے یہ چھپن طبیب اسی درجہ کے لوگ ہون گے، جو حنین سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، نہین کہا جا سکتا کہ اُن کے مددگارون، دوا سازون وغیرہ کی تعداد کیا ہو گی،

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتون کی بنا پر یہ میرا خیال ہے کہ طب اور علاج ومعالجہ کی راہ سے عباسی دور مین غیر مسلم اقوام سے تعلق رکھنے والون نے اقتدار و اثر حاصل کیا تھا، ان کی تعداد معمولی نہ ہو گی، ذرا ممالک محروسہ عباسیہ کی وسعت و فراخی کا تصور کیجئے، اور سوچئے کہ اس وسیع علاقے کے باشندون

کی طبی ضرورتون کی تکمیل کے لیے کتنے آدمیون کی ضرورت تھی، چونکہ اس پیشہ کو مسلمانون نے غیر مسلم اقوام ہی کے سپرد کر رکھا تھا، اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر عباسیون کے زمانہ مین طبابت کی راہ سے معاش حاصل کرنے والون کی تعداد لاکھون سے متجاوز ہو، یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ اپنی قومی اور دینی خصوصیتون کو ترک کرکے یا ان سے لاپروائی اختیار کرکے مسلمانون کے دلون مین ان لوگون نے جگہ پیدا کی تھی،

(باقی)

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس مین ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح کی گئی ہے جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہین، ان کے لیے یہ کتاب مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے، (مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت :- ۳ روپیہ،

رقعات عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے بادشاہ ہونے تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہین، اس جلد مین جمع کیے گئے ہین، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیون حقایق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت للعہ (جامع پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی)

"منیجر"

خدمتِ حدیث مین خواتین کا حصہ

از

حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

اسلام سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبون کی طرح علم و فن کے شعبہ مین بھی خواتین کے کارنامون کا بہت کم سراغ ملتا ہے، خاص طور سے عرب مین تو اس صنف کی حالت اور زار و زبون تھی، پورے ملک مین مشکل سے دو چار عورتین پڑھی لکھی مل سکتی تھین لیکن یہ اسلام کی علم پروری کا فیض تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ مین مردون کی طرح عورتون مین بھی اُس نے ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ ان کی دنیا بدل گئی، اور زندگی کے مختلف شعبون کے ساتھ علم و فن مین بھی انھون نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا، اور اسلام کا یہ چشمۂ فیض عرب ہی تک محدود نہین رہا بلکہ ساری دنیا اس سے سیراب ہوئی،

لیکن سوء اتفاق سے عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا گیا ہے کہ گذشتہ زمانہ مین پردہ کی وجہ سے مسلم خواتین زندگی کے کسی شعبہ اور خاص طور سے علم و فن مین کوئی خاص حصہ نہین لے سکین، اور نہ انھون نے کوئی قابلِ ذکر یادگار چھوڑی، اور اس زمانہ مین بھی اُن کی دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود ہے، پھر اسی وہمِ خیال کے ماتحت یہ نتیجہ نکالا جاتا ہو کہ پردہ مین رہ کر مسلم خواتین کی ترقی ممکن نہین ہو، اس لئے ضرورت ہو کہ ان کو اس قید سے آزاد کر کے میدانِ عمل مین آنے کی اجازت دیجائے، کہ وہ بھی مردون کے دوش بدوش زندگی کی جد و جہد مین حصہ لے سکین، اس وقت اس پر بحث کرنا مقصود نہین ہے کہ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر اور مسلم خواتین کی واقعی ترقی پردہ میں رہ کر ہو سکتی ہے، یا اس قید سے آزاد ہو کر، لیکن تاریخ سے مذکورۂ بالا خیال کی تائید نہین ہوتی

بلکہ اس کے برعکس یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک سیکڑوں ہزاروں پردہ نشین مسلم خواتین نے حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے گوشۂ علم و فن سے لیکر میدانِ جہاد تک ہر شعبۂ زندگی میں حصہ لیا، اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں اپنا پورا حق ادا کیا، اس مضمون میں صرف اُن کی علمی کوششوں کے ایک گوشہ یعنی علمِ حدیث کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے،

خواتین نے علمِ حدیث کی جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کی سب سے پہلی نمایندگی صحابیات سے شروع ہوتی ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے انہی کے کارناموں کا اجمالی نقشہ پیش کیا جاتا ہے،

صحابہ کی طرح صحابیات بھی اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے ایک درجہ اور مرتبہ کی نہیں تھیں، اور نہ سب کو یکساں طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی، اس لئے اُن کی خدمات بھی اسی اعتبار سے کم و بیش ہوں گی، کیونکہ حدیث کی خدمت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت صحبت اور فہم و فراست ہی کی تھی، صحابیات میں ازواجِ مطہرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر لحاظ سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی اس لیے اس سلسلہ میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ہیں، اُن میں بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمِ سلمہؓ کے کارنامے سب سے زیادہ ہیں،

حضرت عائشہؓ مکثرین رواۃ صحابہ (یعنی وہ صحابہ جن کی روایات .... کثرت سے موجود ہیں) میں ہیں، ان کی مرویات کی تعداد (۲۲۱۰) ہے جن میں ۲۸۶ حدیثیں بخاری و مسلم میں موجود ہیں، مرویات کی کثرت کے لحاظ سے صحابہ میں ان کا چھٹا نمبر ہے،

مرویات کی کثرت کے ساتھ احادیث سے استدلال اور استنباطِ مسائل اُن کے علل و اسباب کی تلاش و تحقیق میں بھی اُن کو خاص امتیاز حاصل تھا اور انکی اس صفت میں بہت کم صحابہ اُن کے شریک تھے، کتبِ حدیث میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک روایت متعدد صحابہ سے مروی ہوتی ہے، اور حضرت عائشہؓ بھی وہی روایت کرتی ہیں، لیکن وہ اپنی روایت میں اس کی علت و حکمت کا بھی تذکرہ کر دیتی ہیں

جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات وہ عمل کے لئے زیادتی شوق کا سبب بن جاتی ہے، مثلاً غسل جمعہ کے سلسلہ میں حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اس دن غسل کرنا چاہئے، اوّل الذکر دو صحابی صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کا غسل ضروری ہے، مگر حضرت عائشہؓ نے اپنی روایت میں اس کی علت و حکمت بھی بیان کر دی ہے، فرماتی ہیں،

كان الناس ينتابون من منازلهم	لوگ اپنے گھروں اور مدینہ کے باہر
والعوالى فيأتون فى الغبار تصيبهم	کی آبادیوں سے نماز کے لئے آتے تھے، ان پر
الغبار والعرق فيخرج منهم العرق	گرد و غبار اور پسینہ میں تر ہو جاتے تھے
فاتى رسول الله صلى الله عليه وسلم انسان	ایک دفعہ ایک صاحب آپ کے پاس آئے
منهم وهو عندى فقال النبى صلى الله	وہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے، آپ نے ان
عليه وسلم لو انكم تطهرتم ليومكم هذا	سے فرمایا کہ اگر تم آج کے دن غسل کر لیتے
(بخاری کتاب الجمعہ)	تو کیا بہتر ہوتا،

ایک سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھایا جائے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو سعید خدریؓ نے اسے دائمی حکم سمجھا، حضرت عائشہؓ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا، کہ یہ حکم واجب اور دائمی نہیں، بلکہ مستحب ہے، اس حکم سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ قربانی کا گوشت لوگ جمع نہ کریں، بلکہ دوسروں کو کھلا پلا دیا کریں،[1]

بعض مرتبہ راوی کو پوری حدیث محفوظ نہیں ہوتی تھی، صرف حدیث کا ایک ٹکڑا یاد رہ جاتا تھا، یا راوایت کے مغز سخن تک نہ پہنچنے کی وجہ سے جب وہ حدیث روایت کی جاتی تھی تو روایت کا پورا مفہوم سامنے نہیں آتا تھا، بلکہ بسا اوقات معنی بھی بدل جاتے تھے، حضرت عائشہؓ جب بھی ایسی حدیث سنتی تھیں، تو اُن کی تصحیح

[1] سیرت عائشہ ص ۱۴۲،

تردید کر دیتی تھیں، اس سلسلہ میں انھوں نے اکابر صحابہ تک سے اختلاف یا ان کی روایات پر استدراک کیا ہے، تقریباً ایسی چالیس احادیث ہیں جن میں انھوں نے صحابہ پر استدراک کیا ہے، امام سیوطیؒ نے ان روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس رسالہ کا نام عین الاصابہ ہے، اس کے دیکھنے سے احادیث میں ان کی دقت نظر اور نکتہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے، توضیح کے لیے دو ایک مسئلے پیش کیے جاتے ہیں، ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ تین چیزوں میں بدشگونی ہے، عورت میں، سواری میں، اور گھر میں، حضرت عائشہؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ ابوہریرہ نے پوری حدیث نہیں سنی، پوری حدیث یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے وہ کہتے ہیں کہ بدشگونی تین چیزوں میں ہے، عورت میں، گھوڑے میں اور گھر میں، ابوہریرہ نے حدیث کا آخری ٹکڑا تو سنا اور پہلا نہیں سنا[۱]،

بعض صحابہ سے روایت ہے کہ "مردہ پر اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہؓ نے جب یہ روایت سنی تو فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے کبھی یہ نہیں فرمایا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک دن ایک یہود کے جنازہ پر سے گذرے، اس کے گھر والے اس کا ماتم کر رہے تھے آپ نے فرمایا یہ روتے ہیں اور اس پر عذاب ہو رہا ہے" یعنی مقصود یہ ہے کہ یہ تو رو رہے ہیں، اور مردہ اپنے اعمال کی سزا میں مبتلا ہے، پھر فرمایا کہ ہر شخص اپنے فعل کا جواب دہ ہے، اور استدلال میں یہ آیت تلاوت کی،

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ اُخْرٰى — اور کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائیگا،

عین الاصابہ میں اس کی اور بہت سی مثالیں ہیں، حضرت عائشہؓ سے جن بزرگوں نے حدیث میں استفادہ کیا ہے، ان میں بہت سے صحابہ اور کبار تابعین ہیں مثلاً عروہ بن زبیر، سعید بن المسیب، عبداللہ ابن عامر، مسروق بن اجدع، عکرمہ، علقمہ، صفیہ بنت شیبہ، عطا بن یسار، یہ چند نام لکھ دیے گئے ہیں، ورنہ ان

[۱] عین الاصابہ

روایت کرنے والوں کی تعداد سو سے متجاوز ہے،

ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد ام سلمہؓ ممتاز نظر آتی ہیں، محمود بن لبید کا قول ہے،

کان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ازواج مطہرات کو کثرت سے احادیث یاد تھیں،
یحفظن من حدیث النبی صلی اللہ علیہ	لیکن حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سب سے زیادہ
وسلم کثیرا ولا مثلا لعائشۃ وام سلمۃ[1]	ممتاز تھیں،

انھیں حدیث سننے کا بیحد شوق تھا، ایک مرتبہ گھر میں بال گندھوا رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے زبان مبارک سے جوں ہی ایھا الناس (اے لوگو) نکلا آپ نے مشاطہ سے کہا کہ بال باندھ دو، اس نے کہا جلدی کیا ہے، ابھی تو آپ نے ایھا الناس ہی کہا ہے، بولیں کیا خوب ہم آدمیوں میں نہیں ہیں؟ اس کے بعد خود بال باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، اور پورا خطبہ سنا[2]،

حضرت عائشہؓ حدیث میں گو خود بلند درجہ رکھتی تھیں لیکن بعض مرتبہ انھیں بھی ام سلمہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، حضرت عبد اللہ بن زبیر عصر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے بعض لوگوں نے اعتراض کیا، تو انھوں نے حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، حضرت عائشہؓ کے پاس تصدیق کے لیے آدمی بھیجا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ حدیث ام سلمہؓ سے پہنچی ہے، حضرت ام سلمہؓ کے پاس آدمی گیا، اور قول نقل کیا، تو فرمایا کہ "اللہ تعالی عائشہ کی مغفرت کرے، انھوں نے بات نہیں سمجھی، کیا میں نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]"۔

حضرت ام سلمہؓ کی مرویات کی تعداد (۳۷۸) ہے، ان کے فتاوے بھی کثرت سے ہیں، علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر ان کے فتاوے جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے (ص ۱۳ ج ۱)

ان کا شمار محدثین کے تیسرے طبقہ میں ہے، حضرت ام سلمہؓ کے تلامذۂ حدیث میں بے شمار تابعین اور بعض

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۶ [2] مسند ج ۲ ص ۳۰۲ [3] بخاری ج ۲ ص ۶۲۷

صحابہ شامل ہیں، چند مشاہیر کے نام یہ ہیں:-

اسامہ بن زید، سلیمان بن یسار، سعید بن مسیب، عبداللہ بن رافعؓ، نافع مولیٰ ابن عمر، عروہ بن زبیر، عکرمہ، ابو سلمہ، ابو عثمان النہدی، ہند بنت الحارث، خیرہ والدہ حسن بصری، زینب آپ کی صاحبزادی وغیرہ

حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات نے بھی حدیث کی روایت اور اشاعت میں حصہ لیا، حضرت حفصہؓ سے مسند میں (۶۰) حدیثیں مروی ہیں، حدیث میں ان سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ روایت کرتے ہیں، حضرت ام حبیبہؓ سے ۶۵ حدیثیں مروی ہیں اور انکے تلامذۂ حدیث بھی کچھ کم نہیں ہیں، مثلاً عروہ بن زبیر، زینب بنت ام سلمہ، ابو صالح السمان وغیرہ، حضرت میمونہؓ سے (۴۶) حدیثیں منقول ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبدالرحمن بن سائب، یزید بن عاصم، عطاء ابن یسار وغیرہ ہیں، آنحضرت صلعم کی صاحبزادیوں میں حضرت فاطمہؓ سے بھی متعدد روایتیں مروی ہیں،

عام صحابیات میں مشکل ہی سے کوئی صحابیہ ایسی ہونگی جن سے کوئی نہ کوئی روایت موجود نہ ہو، جن سے متعدد روایتیں موجود ہیں، ان کے نام مع تعداد حدیث یہ ہیں،

حضرت ام الفضلؓ ان سے (۳۰) حدیثیں مروی ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں، حضرت ام رومانؓ اور ام سلیمؓ سے بھی چند حدیثیں مروی ہیں، ام سلیمؓ سے بڑے بڑے صحابہ مسائل دریافت کرتے تھے، ایک بار کسی مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت زید بن ثابت میں اختلاف ہوا، تو دونوں بزرگوں نے ان ہی کو حکم مانا،[1] ان دونوں بزرگوں کے علاوہ متعدد صحابہ و تابعین نے ان سے روایت کی ہے، حضرت ام عمارہؓ اور حضرت ام عطیہؓ سے بھی متعدد روایتیں منقول ہیں، حضرت ام عطیہؓ سے متعدد صحابہ و تابعین مثلاً حضرت انسؓ، محمد بن سیرین، حفصہ بنت سیرین وغیرہ نے روایت کی ہے، صحابہ و تابعین ان سے میت کے نہلانے کا طریقہ سیکھتے تھے،[2] حضرت ربیع بنت مسعوذ

---

[1] مسند ج ۶ ص ۴۳۰ [2] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۵

سے (۱۱۰) حدیثیں مسند میں مروی ہیں، علمی اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند ہے، حضرت عبد اللہؓ بن عباسؓ اور امام زین العابدین ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان بزرگوں کے علاوہ عائشہ بنت انس، سلیمان ابن یسار، ابو سلمہ، نافع مولی ابن عمرؓ وغیرہ ان کے رواۃ میں ہیں[۱]۔ حضرت ام ہانیؓ گو قدیم الاسلام نہیں تھیں، لیکن ان کی روایت سے (۴۶) حدیثیں مسند میں موجود ہیں، ان کے رواۃ کی تعداد ۲۰ بیس کے قریب ہے، ان میں عبد اللہ بن عباسؓ کے علاوہ متعدد کبار تابعین مثلاً امام شعبی، عروہ بن زبیر، مجاہد، ابن ابی لیلیٰ، عطا بن یسار، کریب، محمد بن عقبہ وغیرہ ہیں،

خانوادۂ صدیقی میں حضرت اسماءؓ بنت عمیس حضرت صدیقؓ کی زوجۂ مکرمہ، اور حضرت اسماءؓ آپ کی صاحبزادی روایت حدیث میں ممتاز تھیں، بلکہ عام صحابیات میں کثرت روایت کے اعتبار سے ان کو سب پر فوقیت حاصل ہے، اسماءؓ بنت عمیس سے (۶۰) حدیثیں اور حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے (۵۸) حدیثیں مروی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے، جن میں حضرت عمرؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہؓ بن زبیر جیسے صحابہ اور سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر فاطمہ بنت علی، ام عون، عبد اللہ بن کیسان، صفیہ بنت شیبہ جیسے تابعین اور تابعیات شامل ہیں، ان کے علاوہ فاطمہ بنت قیس، شفاء بنت عبد اللہ، زینب بنت ابی معاویہ، اسماء بنت یزید، زینب بنت ابی سلمہؓ و سبیعہ بنت الحارث وغیرہ بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہیں،

مسانید صحابیات | صحابیات کی کثرت روایت اور ان کی خدمت حدیث کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے امام احمد بن حنبل نے ایک سو تیس (۱۳۰) صحابیات کی مسانید جمع کی ہیں، جن کی مجموعی ضخامت ۴۰۴ صفحات ہیں ان میں کئی ہزار حدیثیں ہیں، حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں ۳۰۹ صحابیات کا تذکرہ لکھا ہے، اسی طرح اسد الغابہ اور اصابہ میں ۵۰۰ سے زائد صحابیات کے تراجم موجود ہیں، اور مشکل ہی سے کوئی صحابیہ

---

[۱] اصابہ و مسند ج ۶، اسد الغابہ ج ۵ اور تہذیب ج ۱۲

ہون گی جن سے کوئی روایت نہ موجود ہو، تہذیب میں ۳۳۳ عورتون کا تذکرہ ہے، جن میں بیشتر صحابیات ہیں، اگر ان تمام صحابیات کی روایتیں جمع کی جائیں تو ان کی مسانید کے لیے کئی جلدیں درکار ہونگی، کاش اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی توفیق دیتا کہ وہ ان کی مسانید کتب احادیث سے چھانٹ کر ایک جگہ جمع کر دیتا تو بڑا مبارک اور مفید کام انجام پا جاتا،

تابعات | صحابیات کی صحبت میں جن خواتین نے پرورش پائی یا ان سے استفادہ کیا ان کو تابعات کہا جاتا ہے، صحابیات کی طرح تابعات نے بھی فن حدیث کی حفاظت و اشاعت اور اس کی روایت اور درس و تدریس میں کافی حصہ لیا، اور بعض نے تو اس فن میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ بہت سے کبار تابعین نے ان سے اکتساب فیض کیا، چند مشہور تابعات کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

حفصہ بنت سیرین، انھون نے متعدد صحابہ اور تابعین سے روایت کی ہے، جن میں انس بن مالک، ام عطیہؓ، ام الرائح، خیرہ ام الحسن البصری، ابو العالیہ، ربیع بن زیاد وغیرہ ہیں ان سے روایت کرنے والون میں ابن عون، خالد الحذاء، قتادہ، ہشام بن حسان وغیرہ تابعین شامل ہیں، جرح و تعدیل کے امام یحیی بن معین نے ان کو ثقۃ حجۃ فرمایا ہے ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں کہ ما ادرکت احدا افضلہ من حفصۃ میں نے حفصہ سے زیادہ فضل والا کسی کو نہیں پایا، ان کے اس فضل کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابن ابی داؤد فرماتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں انھون نے قرآن و حدیث پڑھ لیا تھا،[1] امام بخاری اور ابو داؤد نے ان کا تذکرہ کیا ہے، ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے،[2] سنہ ۱۰۱ھ میں انتقال کیا،[3] امام ذہبی نے انھیں حفاظ حدیث کے دوسرے طبقہ میں شامل کیا ہے،[4]

معاذہ بنت عبد اللہ۔ انھون نے حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ اور ام عمرو سے اور ان سے ابو قلابہ، قتادہ، یزید الرشک، ابو عاصم حسن بصری کی والدہ وغیرہ نے روایت کی ہے، یحیی بن معین نے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۹ [2] ایضاً ص ۴۱۰ [3] ایضاً [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰

ثقہ و حجت کہا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے، جن احادیث کا انھیں علم تھا ان پر سختی سے عمل بھی کرتی تھیں، ابو شبہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے پیٹ میں درد تھا، انھوں نے مجھ سے درد کا حال بتایا، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ کچے گھڑے میں رکھی ہوئی نبیذ ان کو استعمال کرائی جائے، اس میں نشہ آجاتا ہے، چنانچہ میں نے ایک پیالہ نبیذ لاکر ان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے نبیذ دیکھکر مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا، اللہ کی پناہ! تم کو معلوم نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے نبیذ جر سے منع فرمایا ہے، خیر تم نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ کافی ہے، خدا کی شان کہ وہ پیالہ الٹ گیا، اور نبیذ زمین پر گر پڑی اور ان کو افاقہ بھی ہو گیا[۱]۔

عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص۔ مشہور صحابی حضرت سعدؓ کی صاحبزادی تھیں، چھ امہات المومنین کو دیکھا تھا، اپنے والد حضرت سعدؓ اور ام ذرؓ سے روایت کی ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں تابعین ہیں، امام ذہبی نے ان کا شمار حفاظ حدیث میں کیا ہے، اور تابعین کے تیسرے طبقہ میں ان کو جگہ دی ہے[۲]، یہ تنہا خاتون ہیں جن سے امام مالک نے روایت کی ہے[۳]، ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔

عقیبہ بنت عبید۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی اہلیہ تھیں، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، قاسم بن محمد وغیرہ سے روایت کرتی ہیں، ان سے متعدد کبار تابعین مثلاً سالم بن عبد اللہ، نافع، عبد اللہ بن صفوان وغیرہ نے روایت کی ہے، عجلی نے ان کو تابعیہ ثقہ لکھا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے[۴]۔

عائشہ بنت طلحہ۔ حضرت ابو بکرؓ کی نواسی تھیں، اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں، ان سے اجلہ تابعین نے روایت کی ہے، ابن معین اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، عجلی مدنیہ تابعیہ ثقہ

---

[۱] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۷ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۹ [۳] ایضاً ج ۱ ص ۹۶ [۴] ایضاً ص ۴۳۰

ثقہ لکھتے ہیں، ابو زرعہ فرماتے ہیں کہ ان کے فضل کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے، اور اہل علم ان کا ادب کرتے تھے،[1]

عمرہ بنت عبدالرحمن - یہ حضرت عائشہؓ کی خاص تربیت یافتہ اور ان کی احادیث کی امین تھیں، ابن حبان کا قول ہے کہ کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ (حضرت عائشہؓ کی احادیث کی سب سے بڑی جاننے والی تھیں) ابن المدینی فرماتے ہیں، حضرت عائشہؓ کی حدیثوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث عمرہ، قاسم اور عروہ کی ہیں، عمرہ کے بھائی محمد بن عبدالرحمن فرماتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ ما بقی احد اعلم بحدیث عائشۃ (اس وقت حضرت عائشہؓ کی احادیث کا ان سے بڑا جاننے والا کوئی موجود نہیں ہے) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابن حزم کو خاص طور سے لکھا تھا کہ عمرہ کی تمام احادیث ان کے لیے لکھ لیں،[2] ابن سعد نے انکو "عالمۃ" لکھا ہے[3]، امام ذہبی نے ان کو تابعین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے[4] اور ان کو "فقیہۃ" لکھا ہے، ابن معین نے انکی شان میں ثقۃ حجۃ اور عجلی نے تابعیۃ ثقۃ اور ابن المدینی نے احد الثقات العلماء[5] کے الفاظ استعمال کیے ہیں،

حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی انھوں نے روایتیں کی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں بہت سے زیادہ کبار تابعین ہیں، ۱۰۳ھ یا ۱۰۶ھ میں وفات پائی،[6]

فاطمہ بنت المنذر حضرت زبیر بن العوامؓ کی پوتی مشہور تابعی ہشام بن عروہ کی بیوی تھیں، انھوں نے متعدد صحابیات و تابعات مثلاً حضرت اسماء، حضرت ام سلمہؓ ام المومنین، اور عمرہ بنت عبدالرحمن وغیرہ سے روایت کی ہے، اپنے علم و فضل کے باوجود ہشام بن عروہ نے ان سے روایت کی ہے، عجلی نے انکے بارے میں مدنیۃ تابعیۃ ثقۃ لکھا ہے، اور ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے،[7]

قمیر بنت عمرو مشہور محدث مسروق بن الاجدع کی بیوی ہیں، انھوں نے حضرت عائشہؓ اور اپنے شوہر مسروق سے روایات کی

---

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۷ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۹۴ [5] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۸ [6] ایضاً [7] ایضاً ص ۴۴۴

ان سے روایت کرنے والوں میں امام شعبی، محمد بن سیرین، مقدام بن شریح اور عبداللہ بن شبرمہ وغیرہ کبار تابعین ہیں، ابوداؤد اور نسائی میں ان کی روایات موجود ہیں عجلی نے تابعیہ ثقہ لکھا ہے[1]

ام الدرداء صغریٰ حضرت ابودرداؓ کی بیوی تھیں، اور عمر میں ان سے بہت چھوٹی تھیں، یہ یتیم تھیں حضرت ابودرداؓ نے ان کی پرورش کی تھی، اور وہ چھوٹی ہی عمر سے ہر وقت حضرت ابودرداؓ کے ساتھ رہتی تھیں، اور ان کے ساتھ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں، ان ہی کی تربیت کا فیض تھا کہ تابعین کے دوسرے طبقہ میں شمار کی جاتی ہیں، انھوں نے حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوہریرہؓ فضالہ بن عبیدؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے علاوہ ام الدرداء الکبریٰ صحابیہؓ سے کثرت سے روایت کرتی ہیں، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے،

وھی تروی عنھا الحدیث الکثیر[2] یام الدرداء کبریٰ سے بہت کثرت سے حدیثیں روایت کرتی ہیں

(تہذیب ج ۲ ص ۴۶۶)

ان سے روایت کرنے والوں میں تقریباً بیس تابعین ہیں جن میں زید بن اسلم، مکحول الشامی، مرثد الیمنی اور عون بن عبداللہ وغیرہ ہیں،

خیرۃ حضرت حسن بصری کی والدہ ہیں، یہ حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھیں، اور ان ہی سے استفادہ بیشتر بھی کیا تھا حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کرتی ہیں، ان سے ان کے دونوں صاحبزادے حسن اور سعید اور علی بن زید، حفصہ بنت سیرین وغیرہ روایت کرتے ہیں،

ان مذکورہ بالا تابعیات کے علاوہ بے شمار تابعیات ہیں، جنھوں نے اس فن کی ترقی و اشاعت میں حصہ لیا ہے، چند نام یہاں درج کیے جاتے ہیں،

جبلہ بنت مصفح، جسرہ بنت دجاجہ، جمیلہ بنت داثلہ، ہبابہ بنت عجلان، حلیہ بنت میسرہ،

---

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۴ [2] ایضاً

حفصہ مخزومیہ، زینب بنت ابوسعید خدریؓ، صفیہ بنت الحارث، صفیہ بنت شیبہ، الرباب، حفصہ بنت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ، زرقہ، رمیثہ، فاطمہ بنت حسین، فاطمہ بنت علی، ام بلال، کریمہ بنت الحسحاس وغیرہ، یہ وہ تابعات ہیں جنھون نے متعدد صحابہ سے روایتین کی ہین، اور ان سے صحاح میں روایات موجود ہین، اور ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے،

ہم نے زیادہ تر ان تابعات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تذکرہ تہذیب یا تذکرۃ الحفاظ مین ہے، ورنہ ان تابعات کی تعداد جنھون نے روایت حدیث مین حصہ لیا، اس سے بہت زیادہ ہے، صرف ابن سعد نے ۹۳ تابعات کا تذکرہ کیا ہے، اصابہ مین تیسری اور چوتھی قسم مین جن خواتین کا تذکرہ ہے تقریباً ان سب کا شمار تابعات مین ہے، اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زیادہ ہے،

تابعات کے بعد دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی مین بھی بے شمار خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اس کی ترقی واشاعت مین حصہ لیا، لیکن افسوس ہے کہ ان صدیون مین خواتین کے کارنامون کے سلسلہ مین جو کتابین لکھی گئین وہ سب ناپید ہین، مثلاً ابن مندہ متوفی ۲۹۵ھ، ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ، ابوموسیٰ اصفہانی متوفی ۵۸۱ھ کی کتابین اور خصوصیت سے ابن اثیر جزری کی تاریخ النساء وغیرہ، تاہم جن کا تذکرہ متداول کتابون مین ملتا ہے ان کا ذکر کیا جاتا ہے،

دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی مین بھی جن خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اسکی ترویج واشاعت مین حصہ لیا ان کے نام اور کارنامے حسب ذیل ہین،

ام عمر۔ حسان بن زید تابعی کی صاحبزادی تھین، انھون نے اپنے والد اور اپنے شوہر یحییٰ بن سعید سے متعدد روایتین کی ہین، اور ان سے روایت کرنے والون مین امام احمد بن حنبل، ابوابراہیم محمد بن الصباح، ابراہیم بن عبداللہ، علی بن مسلم وغیرہ ہین، ان کے والد نے حضرت علیؓ کو دیکھا تھا، چنانچہ اس سلسلہ مین انھون نے اپنے والد کی روایت سے حضرت علیؓ کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ ایک

آپ خطبہ دے رہے تھے، اور بلند آواز سے لوگوں کو مخاطب کرکے کہہ رہے تھے کہ لوگو! تم نے میرے اور عثمان بن عفانؓ کے بارے مین عجیب عجیب باتین مشہور کر رکھی ہین، لیکن ہمارا اور ان کا حال بالکل وہی ہے جو نقشہ قرآن نے اہلِ جنت کا کھینچا ہے، پھر یہ آیت پڑھی،

ونزعنا ما فی صدورھم من غلٍ اخواناً علیٰ سررٍ متقابلین[۵۱]	اور ان کے دلون مین جو کینہ تھا ہم وہ سب دور کردین گے، اور سب بھائی بھائی کی طرح تختون پر آمنے سامنے بیٹھے ہون گے،

امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین ام عمر کے بارے میں فرماتے ہین کہ دار معاذ مین مین نے اُن سے سماع کیا ہے، ان مین کوئی خاص بات نہین ہو، مگر میرے بہت سے اصحاب اُن سے روایت کرتے ہین،[۵۲]

زینب بنت سلیمان الہاشمیہ: یہ اس خانوادہ کی چشم و چراغ تھین جس کے چشمۂ فیض سے ایک دنیا سیراب ہوئی، یعنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی پرپوتی تھین، اُن کے والد سلیمانؓ کا شمار حفاظ حدیث مین تھا، انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ زینب کو علم حدیث سے لگاؤ پیدا ہوا، ان سے متعدد اتباع تابعین نے روایت کی ہے، مثلاً قاضی جعفر بن عبداللہ، عاصم بن علی، احمد بن خلیل وغیرہ خطیب اُن کی روایت سے متعدد احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہین،

من افاضل النساء (جلد ۱۴ ص ۴۳۴)	خواتین مین نہایت فاضلہ تھین،

خلفاء تک ان کا احترام اور ان کی عظمت کرتے تھے، چنانچہ مامون جس کا معمول تھا کہ پردہ نشین خواتین کی اوٹ سے گفتگو کرتا تھا، لیکن جب زینب پہنچتی تھین تو پردہ ہٹا دیا جاتا تھا،[۵۳]

اُن کے علاوہ اسی خانوادہ کی انہی کی ہم نام ایک دوسری زینب بھی تھین جن سے کوئی مرفوع حدیث تو مروی نہین ہے، لیکن اپنے والد کی سند سے عبداللہ بن عباسؓ کے دو ایک اثر کی روایت کرتی ہین،

---

[۵۱] تاریخ بغداد جلد ۱۴ ص ۴۳۴ [۵۲] ایضاً ج ۱۴ ص ۴۳۴ [۵۳] ایضاً ص ۴۳۴،

عبدہ بنت خالد بن معدان حمص کی رہنے والی تھیں، خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں، یہ انہی کی صاحبزادی ہیں، اپنے والد سے روایت کرتی ہیں، افسوس ہے کہ اُن کے حالات متداول کتابوں میں نہیں ملتے، تہذیب میں اُن کے والد کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ امام اوزاعی خالد بن معدان کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے تلامذہ سے دریافت کیا کہ ان کی اولاد میں کوئی ہے؟ لوگوں نے عبدہ کا نام لیا، انھوں نے کہا کہ جاکر ان سے خالد کے حالات دریافت کرو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[۱]

عبدہ بنت عبدالرحمن بغدادیہ، ان کا نسبی تعلق ابو قتادہ انصاریؓ کے خانوادہ سے تھا، یہ حضرت ابو قتادہ کی پر پوتی ہیں، اپنے والد عبدالرحمن سے روایت کرتی ہیں، اُن سے روایت کرنے والوں میں محمد بن مخلد سلیمان بن احمد وغیرہ شامل ہیں، ابو القاسم طبرانی نے اُن سے چند مرفوع احادیث نقل کی ہیں، اُن کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ احادیث حضرت ابو قتادہؓ کی اولاد ہی سے مروی ہیں اور میں نے ان احادیث کو عبدہ کے علاوہ کسی سے نہیں سنا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:-

وکانت امرأة عاقلة فصیحة متسل بینه (بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۴)	یہ ایک عاقل، فصیح البیان اور حدیث کی روایت میں متدین تھیں،

خدیجہ ام محمد، انھوں نے امام احمد بن حنبل سے سماع کیا تھا، اور ان سے روایت بھی کرتی ہیں، امام احمد کے علاوہ یزید بن ہارون، اسحاق بن یوسف اور ہاشم بن القاسم سے روایت کرتی ہیں، امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ اُن سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

کانت تجی الی ابی تسمع	میرے والد (امام احمد) کے پاس سماع کے لئے آتی تھیں،

خطیب نے ام محمد کی سند سے ام درداء کا ایک اثر نقل کیا ہے جس کے ایک راوی عبداللہ ہیں، وہ اثر یہ ہے،

---

[۱] تہذیب ج ۳ ص ۱۱۲،

حدثنا عبد اللہ بن احمد قال حدثتنی خدیجۃ ام محمد سنۃ ست وعشرین

ومائتین قالت حدثنا اسحاق الازرق حدثنا المسعودی عن عون بن

عبد اللہ، قال کنا نجلس الی ام الدرداء فنذکر اللہ عندھا فقالوا لعلنا قد

امللناک؟ قالت تزعمون انکم قد امللتمونی فقد طلبت العبادۃ فی کل

شیئ فما وجدت شیئا اشفی لصدری ولا احری ان اصیب بہ الذی ارید

من مجالس الذکر، (تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۳۶)

سنہ ۲۲۶ھ کے بعد تک زندہ ہین،

یہ ذوق صرف آزاد خواتین ہی تک محدود نہین تھا، بلکہ اس مین لونڈیان اور باندیان بھی شریک تھین

امام محمد کے پاس متعدد لونڈیان، رات کے وقت آکر تحصیل حدیث کرتی تھین ابراہیم بن سعد ایک حافظ

حدیث گذرے ہین، اُن سے ایک بار مسند ابوبکر کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھون نے اپنی لونڈی سے فرمایا، کہ

مسند ابوبکر کی ۲۳ وین جلد نکال لاؤ، اس سے ان کے علم حدیث کی واقفیت اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے،

سمانہ بنت حمدان! تیسری صدی کے اخیر مین وضاح بن حسان ایک محدث گذرے ہین، جنھون نے

حدیث مین ایک تحریری یادگار بھی چھوڑی ہے، سمانہ انہی کی نواسی ہین، وہ اپنے نانا سے روایت کرتی ہین

اُن سے روایت کرنے والون مین ابوبکر الشافعی اور ابو القاسم طبرانی ہین خطیب نے اُن سے متعدد روایتین

نقل کی ہین،[1]

اسی صدی کے آخر مین ایک خاتون فاطمہ بنت محمد بھی تھین جنھون نے حدیث کی خدمت مین حصّہ

لیا، اُن کی زندگی نہایت ہی زاہدانہ تھی، وہ مصلے ہی پر سوتی تھین، سنہ ۳۱۲ھ مین وفات پائی،

(باقی)

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۴،

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال ندوی

(۲)

اقوام | یہ عجیب بات ہو کہ یہ کتبہ اگرچہ حضرموت میں ملا لیکن اطراف حضرموت کے اماکن میں سے ایک مقام کا بھی ذکر اس میں نہیں ہو، یہ تحریر یقینی طور پر یمن کے باشندوں اور ان کے حلفا اور اقربا میں سے کسی ایک کی ہے اس میں جن قوموں کے نام ہیں، وہ یہ ہیں،

حمیر | حمیر ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے، کتبہ کے ایام تحریر میں اسی قبیلہ کی حکومت تھی، کتبہ اس قوم کے مخالفین کا ہو،

قہات | بنو اسرائیل کے ایک سبط کا نام لاوی ہے، اس سبط کی ایک شاخ کا نام قہات ہے، حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اسی خاندان کے افراد تھے، اس کتبہ میں قہات کا ذکر سینا کے باشندوں، یسار کے معاونوں اور باشندگان یمن کے دشمنوں کی حیثیت سے آیا ہو،

نہرہ | بنو قضاعہ کی ایک شاخ کا نام جو یمن میں رہتی تھی، اس قوم کو اس کتبہ کے اندر مذکور جنگ کے انجام سے بہت خوشی ہوئی تھی، خاکہ کی تشریح سے ظاہر ہے کہ وہاں کے باشندے بنو عذرہ تھے، یہ نہرہ کی طرح بنو قضاعہ کی ایک شاخ ہیں، نہرہ کو جنگ کے انجام کی جو خوشی ہوئی تھی، اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ بنو عذرہ کے ہم خاندان تھے،

زنز و ذو | زنزنو ذو ناموں کا مجموعہ ہے نوذ سے مراد وہی ارض نود ہو جس کا ذکر فرزندان آدم کے توراتی

نقشہ میں آیا ہے، نیز تورات کے مطابق بنوقین کا علاقہ ہے ارض نود کے مقام کی تعیین طویل بحث کی مقتضی ہے لیکن مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ مدین کا علاقہ دراصل علاقۂ بنوقین تھا، یہود مدینہ میں سے ایک گروہ بنو قینقاع تھا یہ نام قاعہ قین کا مقلوب ہے، اس لئے نوذ کو یمن اور شام اور حائل کے علاقہ سے تطبیق دینا بے جا نہ ہوگا،

زند نوذ اسی علاقہ میں بسنے والی ایک قوم کا نام ہے، عدنان کے نسب نامہ میں ایک نام زند بن مری بن اعراق الثریٰ کا نام آتا ہے (تاج العروس) زند نود سے مراد اطراف یمن میں بسنے والے بنو عدنان ہیں جن کو اس کتبہ کے اندر مذکورہ جنگ کے انجام سے خوشی ہوئی،

کرذا کرذ کو کرد سمجھنا چاہئیے، اس کتبہ کے بیان کے مطابق یمن والوں نے شاہی نوکر یسل کی ناک اور اس کے کان کاٹ لئے جس کے انتقام کے لئے سینا سے یسار اور یمن سے ذو یا لیل فوج لے کر بڑھے، لیکن ان دونوں فوجوں نے شکست کھائی، تب شاہ یمن نے اہل حبش کو خوش کیا اور حبش والوں نے شاہ یمن کی نوکری کرلی لیکن کرذ نے جن کے سردار کا نام توذ تھا، نیز بنو داشح نے جنگ کی، اور اہل حبش کی امداد سے ذو نوش، اور ذو شرح کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، حکومت یمن پر توذ نے قبضہ کرلیا،

کرد ایک عجمی قوم کا نام ہے جن کے کچھ افراد یمن میں بستے تھے، انہی کردوں کی بابت نشوان نے لکھا ہے، کہ

یقال انهم من الازد، قال	کہتے ہیں کہ وہ بنو ازد میں سے ہیں شاعر
لعمرك ما كرد من ابناء فارس	نے کہا قسم ہے کرد فارس کے بیٹے نہیں
ولكنه كرد بن عمرو بن عامر	بلکہ عمرو بن عامر کی اولاد ہیں نیز کہا شاعر نے
وقال لعمرك ما كرد بن عمرو بن عامر	قسم ہے عمرو بن عامر کا بیٹا کرد عجمی نہیں تھا،
بعجم ولكن خالط العجم واعجم	البتہ اہل عجم کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے عجمی ہو گیا تھا،

نسبتھم الشعراء الی الیمن ثم الی الازد، شعراء ان کو یمن پھر ازد کی طرف منسوب کرتے ہین،

یمنی کردتھے تو نمیر غیر عرب مگر بنو ازد مین شمار ہوتے تھے، جبلی ہونے کی حیثیت سے یہ انصار مدینہ کو نیز بنو خزاعہ کو جن کی ایک شاخ یمن مین بستی تھی، اپنا ہم نسب بتاتے ہونگے،

داشح | بنو داشح بن الحرث، یہ بنو ازد کی ایک شاخ تھے،

رجال کتبہ | اماکن و اقوام کے بعد ایک نظر رجال کتبہ پر بھی ڈال لینا مناسب ہوگا، اس کے بعد کتبہ کا مضمون آئینہ ہوجائے گا،

سمیق | پہلا نام اس کتبہ مین سمیق کا ہے، اس کی بابت ہم صرف اتنا جانتے ہین کہ سموق درخت اور نبات کے طویل ہونے کو کہتے ہین، سمیق کا مفہوم طویل ہے، یہ شخص کون تھا اس کا عہد کیا تھا، اس کے متعلق ہم کچھ نہین کہہ سکتے،

ذو نین | حصن غراب کے سہ سطری مختصر کتبہ کے نیچے اس شخص کا سماتی دستخط موجود ہے، معارف مئی ۵۰ء میں ہم بتا چکے ہین کہ یہ شخص ذو شرح کا چچا تھا، ذو کے معنی ہین صاحب اور نن ایک مصری لفظ ہے جس کا مطلب پانی دینا ہے، لفظی مفہوم اس لقب کا ہے "رئیس محکمۂ آب رسانی" اس لقب کے اور معانی بھی ہو سکتے ہین مثلاً ذو نن (مچھلی والا) ذو نون (صاحب السیف) ذو نون (صاحب الدواۃ) لیکن کتبہ کے اندر چونکہ زراعت کے مرجھانے کی ذمہ داری سمیق، ذو نین اور ذو شرح کی تباہ کاری پر عائد کی گئی ہے اس لئے اس لقب کا مناسب تر مفہوم رئیس محکمۂ آب رسانی ہی ہو سکتا ہے،

شرح ذو | یہ نام کتبہ مین دو بار آیا ہے، یہی عربی روایات کا ذو شرح ہے سیف بن ذو یزن سے امیہ بن ابی الصلت نے غمدان کی بابت کہا،

تھیر نباہ ابوک القیل ذو شرح

اس مصرع مین ذو شرح کو "اقیل" کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ یمن نہین تھا البتہ کسی تبع کے ماتحت امیرون مین سے ایک امیر تھا، عربی مین ذو شرح مشہور ہے، اس کتبہ مین ذو کا لفظ شرح سے موخر ہے تاج العروس مین ہو کہ

قال ابو عمرو الشارح الحافظ وهو	ابو عمرو نے کہا شارح حافظ کو کہتے ہین، اہل
فی کلام اهل الیمن حافظ الزرع	یمن کی بولی مین شارح وہ ہے جو کھیتون
من الطیور،	سے چڑیون کو اڑاتا ہے،

شرح کے معنی ہین اس نے زراعت کی رکھوالی کی، "ذو شرح کے معنی ہین، محکمہ زراعت کا رئیس اعلیٰ" اس لقب کے بہتیرے افراد گذرے ہون گے، عربی روایات کے مطابق یہ ملکہ بلقیس کے باپ دادا کا یا اس کے دادا کا لقب تھا، اس کتبہ کا سنہ تحریر پچھلے مضمون مین ۳۳۰ء بتایا جاچکا ہے، یہ سنہ ہم کو بتاتا ہو کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہمعصر ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا سے اس ذو شرح کو تطبیق دینا چاہئے،

یسل | اس کتبہ کی اہم ترین شخصیت کا نام ہے تاج العروس مین ہے،

الیسل اهمله الجوهری وصاحب	جوہری صاحب صحاح اور صاحب لسان
اللسان وقال الزبیر بن بکار هو	نے یسل کا ذکر نہین کیا، مگر زبیر بن بکار
ید من قریش الظواهر قال و	کا کہنا ہے کہ یسل اور بسل قریش ظواہر کے
بالباء الموحدۃ الید الاخری	دو بازو تھے، بنو عامر بن لوی کو بسل کہتے
اعنی بنی عامر بن لوی هکذا	کہا جاتا تھا، اس کی خبر مجھے (زبیر کو)
حدثنی محمد بن الحسن کما فی العباب	محمد بن حسن نے دی جیسا کہ العباب مین ہے،
وقد تقدم ذکر البسل فی موضعه،	

ج ۷ ص ۲۰۲

البسل لقب بني عامر بن لؤي
هكذا يدعون وكانوا ايدا يتين
واليد الاخرى اليسل بالمثناة
تحت قاله الزبير بن بكار عن
محمد بن الحسن بكذا اخبرني الذبا
ونقله الحافظ في التبصير ولكنه
عكس القضية، (ب س ل) نقل
اليسل بالتحتية بنو عامر بن لؤي
والباقون بموحدة، (ي س ل)

بسل بنو عامر بن لوی کا لقب ہے، ان کا یہی
دعوی ہے وہ دو بازو تھے، دوسرے بازو
کو یسل (ی ت) کہتے تھے، زبیر بن بکار نے
محمد بن الحسن سے اس کی روایت کی، العباب
مین یونہی وارد ہے، حافظ نے تبصیر مین یہ قول
نقل کرتے ہوئے بات الٹ دی ہے یسل
کو بنو عامر اور ان کے غیر کو بسل بنا دیا،

اس سے معلوم ہوا کہ بنو عامر بن لوی یا اُن کے ہم جد کسی خاندان قریش اور اس کے مورث کو یسل کہا جاتا تھا، اس کتبہ مین اسی قرشی کا ذکر ہے، جو یسل کہلاتا تھا،

یسار اس کتبہ مین یسل پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اُس نے یمن کے مقام مین ایک پاکباز بھولی بھالی لڑکی کی آبرو لینی چاہی جس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ یمن کی عورتون نے اس کی ناک اور کان کاٹ لئے اور اس پر برہم ہو کر یمن کی سمت سے ذو یا لیل نے اور حبشہ اور سینا سے ایک شخص یسرما نے یمن دونون پر چڑھائی کردی، یسرما کے نام مین جو ما لگا ہوا ہے اس کی حقیقت براندما کے تذکرہ (معارف مئی ۱۹۵۰ء) مین بتائی جا چکی ہے، اصلی نام یسر رہ گیا جسے یاسر اور یسار کا مخفف قرار دیا جا سکتا ہے ہم نے اسے یاسر کے بجائے یسار سے تطبیق دی جس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگون نے یسل کی توہین کا انتقام لینے والون سے جنگ کی، ان مین بنو مرہ اور باشندگان حاکہ بھی تھے جو کہ بنو قضاعہ مین سے تھے، بنو قضاعہ کا ایک گروہ اپنے کو قریش کا ہم خاندان یعنی بنو عدنان مین خیال کرتا تھا، ایک گروہ قضاعہ کو بنو حمیر مین گنتا تھا، دوکو حمیری بتانے والے بنو قضاعہ

پر ایک دوسرا قتبانی شاعر اعتراض کرتا ہے،

ازنّيتم عجوزكم وخانت قديمًا لا يثمّر لها خمار

کیا اپنی مورثہ کو بدکار بتاتے ہو جس کی اوڑھنی سوکھی نہین جاتی تھی،

عجوز لو دنا منها يمان للاقى مثل ما لاقى يسار

ایسی بڑھیا کہ اگر کوئی یمنی اس کے پاس جاتا تو اس کا انجام یسار کا سا ہوتا

اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتبہ جو الزام یسل پر لگاتا ہے اور اس کا جو مآل بتاتا ہے تقریبًا وہی الزام روایت یسل کی بجائے اس کے معین و مددگار یسر ما پر لگا کر اس کا وہی انجام بتاتی تھی جو کتبہ مین مذکور ہے

ذو یایل | جوہری نے لکھا ہے کہ یایل ایک شخص کا نام ہے سید مرتضیٰ زبیدی صاحب تاج العروس کہتے ہین کہ یہ غلط ہے، یایل ایک بت کا نام تھا، جیسا کہ عبد یایل کے نام سے ظاہر ہے، ذو یایل ایک مذہبی لقب معلوم ہوتا ہے، یایل نام کے دیوتا کے مندر کا محافظ ذو یایل تھا،

یمن والون پر یسل کی توہین کا بدلا لینے کے لئے دو شخصون نے چڑھائی کی، ایک نے جنوب سے ایک نے شمال سے، جنوبی حملہ آور ذو یایل کا نام بتاتا ہے کہ یہ ایک بت پرست رئیس تھا، شمال کی فوج کا رئیس علی یسرما تھا، اور اسکی فوج مین قہات یعنی یہود کا مذہبی گروہ شامل تھا، گویا یمن والون کے برخلاف موحدین اور مشرکین کے دو گروہ متحد ہو گئے، خود یمن والون کا مذہب ان دنون کیا تھا، اس کا اس کتبہ سے پتہ نہین چلتا،

ریاح | ذو یایل کے بعد ایک نام ریحا ملتا ہے حمیرما اور یسرما کے نامون کی طرح ما کے حذف کے بعد یہ نام ریح رہ جاتا ہے جو عربی کے متداول لہجہ مین بنو ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ ابن تمیم کے مورث یا ان کے ہم نام کسی شخص کا علم ہو، ایک یربوعی شاعر کہتا ہے

ولكن لي علياتٍ تدبو مجد وعالي مفخر صعب السلوك

بیریبوع وغلب بنیہ لھم کانت ردافات الملوک

یعنی یریبوع اور اس کے فرزندوں کی بدولت یمن کو ردافتِ ملوک کا شرف حاصل تھا، مجھے تجھ پر بزرگی حاصل ہوا، اس کتبہ میں بنو یریبوع ہی جیسی عظمت رکھنے والے ایک ریاح کا ذکر ہے،

الردف جلیس الملک عن یمینہ	ردف بادشاہ کے ہمنشین راست کو کہتے
اذا شرب یشرب بعدہ قبل	تھے، بادشاہ جب شراب پیتا تو بادشاہ
الناس ویخلفہ علی الناس اذا	کے بعد اور سب سے پہلے ردف پیتا، اور
غزا ویقعد موضع الملک حتی	بادشاہ جب غزوہ پر جاتا تو وہ اس
یتصرف واذا عادت کتیبۃ الملک	کی جگہ قائم مقامی کرتا یہاں تک بادشاہ
اخذ الردف المرباع،	واپس آجاتا تھا، بادشاہ کی فوج جب واپس
	آجاتی تو ردف چوتھ وصول کرتا تھا،

ردف کا جو کام تھا وہی اس کتبہ میں ریاح کا نظر آتا ہے جس کا لقب ہے ذو ویقتہ، یہ لفظ دو لفظون سے مرکب ہے (۱) ذو بمعنی وہ شخص (۲) یقتہ بمعنی یقتو الملوک یعنی بادشاہون کی خدمت کرتا ہے،

اس کتبہ کے اندر مذکور ہ ریاح کو کتبہ نویس کی قوم نے اس وقت نہایت ذلیل کرکے اپنے علاقہ سے نکال دیا، جب کہ حاکہ، شاس اور یمن میں یسار اور ذو یلیل کی فوجون نے شکست کھائی اور ریاح کے اس انجام کو دیکھ کر قوم جہرہ اور زندنود کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی،

ذونوش سمیق، ذو نمین، ذو شرح، ذو یالیل، یسار اور یسل میں سے کوئی بھی یمن کا بادشاہ نظر نہین آتا، یہ سب کے سب بادشاہ کے ماتحت امرا نظر آتے ہین، کتبہ کے بیان کے مطابق جب یمن کے باشندون اور اُن کے معاونون نے بغاوت کردی تو اس وقت ایک ذو ویقتہ جس کا نام ریاح تھا حضر موت میں بادشاہ وقت کی نیابت یا بالفاظ قدیم ردافت کے فرائض انجام دے رہا تھا، یمن یعنی مدینہ منورہ کے پاس جب

شاہی فوجون نے شکست کھائی، تو حضرموت والون نے بھی شاہ وقت کے رویف یا قدیم تلفظون مین ذویقنہ ریاح کے اپنے علاقہ سے نکال دیا، ذویقنہ ریاح جس بادشاہ کا ردیف تھا، غالبًا اسی کا ذکر ذونوش کے لقب سے آیا ہے، یعنی ذونوش ذوشرح وغیرہ کا بھی بادشاہ ہوگا، جہان تک میرے علم کی رسائی ہے، ذونوش لقب رکھنے والے کسی شاہ یمن کا عربی لٹریچر مین ذکر نہین ملتا، البتہ بلقیس بنت ہادبن (ذو) شرح بن شرحبیل بن ذوسحر کے خاندان مین ایک بادشاہ ذوبوس بن ذوسحر کا نشوان نے ذکر کیا ہے، مگر اس کا زمانہ اس کتبہ کے زمانہ سے بہت پیشتر گذرا ہے لیکن ہو سکتا ہے ذوبوس دراصل ذونوش ہی کی تصحیف ہو، اور اس کتبہ مین ذوبوس اول کے کسی جانشین کا ذکر ہو، بہرحال ریاح جس کا ذکر اس کتبہ مین ہے، ذونوش ہی کا ذویقنہ یعنی روف اور قائم مقام نظر آتا ہے، ذونوش نے جب دیکھا کہ یمن کا راج جاتا رہا، یمن والون کی بغاوت نے حجاز کو بھی آزاد کرا دیا، حضرموت والون نے ریاح کو لات مار کر اپنے علاقہ سے نکال دیا، تو

ذونوش رضا حبشتا شدسی

ذونوش نے اہل حبش کو راضی کیا اور وہ خادم ہو گیا

تنوذ | آخری نام اس کتبہ مین ایک شخص تنوذ کا ہے جو اس قوم کرد کا ایک فرد تھا، جو ازد کے خاندان بنوعمرو بن عامر مین دخیل ہو گئے تھے، اس سے زیادہ اس شخص کا حال معلوم نہین، اس کتبہ کے مطابق ذونوش نے حبشیون کی امداد حاصل کی تیسری بھی بغاوت فرد نہین ہوئی، بلکہ کرد اور بنوشارح نے مقابلہ کیا جس مین کردون اور بنوشارح کو فتح حاصل ہوئی،

مضمون کتبہ | اماکن، اقوام، اور رجال سب کو پہچان لینے کے بعد اب ایک بار پھر کتبہ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ۳۳ء کے ایام مین جب کہ شاہ یمن حضرموت سے لے کر یمن یعنی سرحد مصر تک حکومت کرتا تھا، بادشاہ وقت کہین غائب تھا، اسکی جگہ ریاح اس کے فرائض انجام دیتا تھا، سمیتق، ذونین، ادر

ذوشرح کی بدانتظامی کی بدولت زراعت مرجھا گئی تھی، ان دنون یثیل نام ایک امیر جو کہ قریش ظواہر کی ایک شاخ کا مورث تھا، اکال وصول کرنیکے لئے مدینہ کے پاس مین نام ایک وادی مین پہنچا، یہان اُس نے ایک عورت کی آبروریزی کرنی چاہی، عورتون نے اُس کی ناک اور کان کاٹ لئے، اس پر برہم ہو کر سینا سے یہودیون کی ایک فوج لیکر ریپارنے اور مین کی طرف سے ذوئیل نے مین والون پر حملہ کر دیا، لیکن باغیون کو کامیابی ہوئی، صین کے علاقہ اور حجاز سے اہل مین کی حکومت اٹھ گئی، حضرموت والون نے بھی ریاح کو اپنے دیار سے نکال دیا، ذونوش نے جو ان دنون شاہ مین تھا، اہل حبش کو راضی کر کے ان کو نوکر رکھا تا کہ کھوئی ہوئی حکومت حاصل ہو، مگر نبو واشح، نبو صرہ، اور کردون نے اُن کا مقابلہ کیا، اور یہ کامیاب رہے، اور تنو ذکر ذحا کم مین ہوا،

نقوش زیرین اس کتبہ کے نیچے داہین طرف دو نقوش ہین، ان کے نیچے دو اور نقوش ہین، جن کے بالمقابل بائین طرف چھ نقوش ہین، ان پر بھی غور کر لینا ضروری ہے، نقوش کی کشش اور گہرائی شاہد ہے کہ نقوش زیرین دو مختلف شخصون نے کندہ کئے، جو دہ سطری نقوش کے کندہ کار نہین تھے،

فارسٹر کی ادعا فارسٹر کے نزدیک داہین طرف کے نقوش لایعنی ہین، بائین طرف کے چھ نقوش کو طغراء قرار دے کر انھین گیارہ نقوش مین تحلیل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے۔

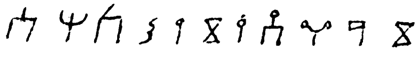

س ب س ی ا ہ ا س د ہ

تشریح کتبہ کے محل (ج ۲ ص ۱۸۱ ۳) پر ان نقوش مین سے کسی کی آواز نہین بتائی ہے لیکن (ج ۲ ص۲۰۲ وص ۲۰۳ سے ہم نے دس نقوش کی آوازین نقل کی ہین، ۴۹ کی آواز نہین معلوم پادری صاحب کے ذہن مین کیا تھی، اس نقش کو ج ۲ ص ۱۸۱ ۳ کے حاشیہ پر حبشی نقش بتایا ہے، اور اس سے اس تحریر کے زمانہ پر استدلال

کیا ہے کہ اصل کتبہ سے عرصہ بعد کی ہے، خود اپنی بتائی ہوئی آواز ان کے مطابق انھین پڑھنا چاہئے تھا،

ھر × سا ہ ای سبس

لیکن ان نقوش کو انھون نے پڑھا ہے،

Harelh or Hare Ikah the Sabean

ع بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

صحیح قرات ہمدانی نے اکلیل مین سین کی ایک صورت [illegible] ایسی بتائی ہے، دائین طرف کے نقش اول اور بائین طرف کا نقش دوم اسی کی بدلی ہوئی صورتین ہین، دائین طرف کا نقش دوم اور بائین طرف کا نقش چہارم نشانی [illegible] کی بدلی ہوئی صورت ہے، دائین طرف کے نقش سوم اور بائین طرف کے نقش پنجم کو فارسٹر کے علاوہ سب علماے مندسہ کا ت خیال کیا ہے،

دائین طرف کے چوتھے اور بائین طرف کے چھٹے نقش کو پادری صاحب نے س اور ہ مین تحلیل کیا ہے، درحقیقت یہ نقش [illegible] ایک ٹیکلی پر رکھے ہوئے تین چراغون کے فتیلہ سوز کی صورت [illegible] ہے، جو روشنی کا مفہوم اور شین کی آواز دیتا ہے، بائین طرف کے پہلے اور تیسرے نقش کو ایک بار پادری صاحب نے [illegible] کی صورت مین اور دوسری بار [illegible] کی صورت مین حل کیا ہے، دراصل [illegible] ایک عاذور (نقش زاید) کے اضافہ کیا گیا [illegible] ہے، جس کی آواز زاے ہوز کی سی ہے، میرے نزدیک تحریر کی صحیح قرات حسب ذیل ہے،

سَطَ کُش

زُشُ زَطُ لَوش

سوط کے معنی ہین کوڑا، اس سے سواط مشتق ہے، صاحب لسان نے لکھا ہے کہ "حدیث مین ہے کہ جہنم مین سب سے پہلے سواط داخل ہون گے، سواط سے مراد وہ سرہنگ ہین جو لوگون کو کوڑے مارتے ہین"،

کوش ایک قوم کا نام ہے جس کا ذکر بائبل مین کثرت سے آیا ہے، انگریزی بائبل مین اس نام کو عموماً

ایتھوپیا (حبش) سے بدل دیا گیا ہے، کیونکہ جن دنون یونانی مین بائبل کا ترجمہ ہوا، صرف اہلِ حبش خود کو کوش کہتے تھے، اس تحریر مین کوش کو اہلِ حبش کا مرادف سمجھنا چاہئے،

پچھلے مضمون مین بتایا گیا ہے کہ یہ تحریر ۳۳۰ء کی ہے، ۳۲۵ء سے ۳۷۰ء تک یمن اور حضر موت پر اہلِ حبش نے حکومت کی، اہلِ حبش کو ذونوش نے اپنی امداد کے لئے نوکر رکھا تھا، مگر بعد مین وہ خود حاکم بن بیٹھے، ۳۳۰ء اور ۳۷۵ء کے درمیان کسی نے دو سطری کتبہ کے اس مصرعہ کی بنا پر کہ

ذونوش رضا حبشا شسی

ذونوش نے اہلِ حبش کو راضی کیا انھون نے نوکری کر لی۔

دائین طرف کا دو لفظی فقرہ لکھ کر بتایا کہ

کوش نے باغیون کو کوڑے مارے،

زوش عربی مین ذلیل غلام کا مرادف تھا، زیاط کے معنی ہین شور مچانا جھگڑا کرنا، بائین طرف کے تین لفظ دو سطری کتبہ لکھنے والی قوم کے کسی فرد نے اہلِ حبش کی توہین کے لئے بعد مین کندہ کئے اس کا مطلب یہ ہے،

کوش ایک جھگڑالو ذلیل غلام ہے

ایک قدیم کتبہ اس کتبہ کی تشریح پر اب مزید لکھنے کی ضرورت نہین رہی، لیکن اس سے ایک قدیم روایتی کتبہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کا بھی اسی جگہ ذکر کر دیا جائے،

تیجان اور اکلیل مین ہے کہ مشہور ہود علیہ السلام کے پاس سے عمرو ذوالاذعار کے زمانہ مین ایک لوح برآمد ہوئی تھی جس پہ منقوش تھا،

لمن ملک ذمار ؟ — ملک ذمار کس کا

لحمیر الاخیار — نیک نفس حمیر کا

لمن ملک ذمار — ملک ذمار کس کا

للحبشۃ الاشرار — شریر الطبع اہل حبش کا

لمن ملک ذمار — ملک ذمار کس کا

للفارس الاحرار — شریف طینت اہل فارس کا

لمن ملک ذمار — ملک ذمار کس کا

لقریش التجار — تجارت پیشہ قریش کا۔

یہ تجان اور اکلیل کی روایتیں یہیں ختم ہو جاتی ہیں، یاقوت نے معجم البلدان ذکر ذمار میں اس تحریر کی بابت لکھا ہے کہ جس سال قریش نے کعبہ کی عمارت کو (سنہ ۶ ئہ مین) ڈھایا، اس کی بنیاد سے ایک پتھر نکلا جس پر یہی عبارت منقوش تھی آخر میں یہ بھی تھا کہ

ثم حار محار — پھر اپنی جگہ لوٹ گیا،

ظفار کے تذکرہ میں اسی کو ذکر قریش کے حذف اور ذمار کی بجائے ظفار کی بابت نقل کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ عبارت ظفار کی ایک دیوار پر لکھی تھی، اور (ثم حار محار) کی بجائے یہ منقوش تھا کہ

لحمیر ستحار — عنقریب حمیر کے پاس لوٹے گا،

یہ تینوں روایتیں کچھ نہ کچھ اصلیت رکھتی ہیں، ظفار کا کتبہ خانہ کعبہ والے پتھر سے قدیم تھا، جیسا (ستحار) اور (ثم حار) کے فرق سے ظاہر ہے، منبر ہود والے کتبہ کی روایت میں صرف اتنی بات درست ہے کہ اس تحریر کا تعلق عمرو ذوالاذعار کے زمانہ سے ہے جو کہ ابرہہ ذوالمنار کی نسل سے اور بلقیس بنت ہدہاد کا حریف تھا، جو کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہم عصر تھی، عمرو ذوالاذعار غالباً انہی حبشیوں ...ن... جن کی خدامت ذونوش نے بغاوتیں فرو کرنے کے لئے حاصل کی تھیں،

اس قدیم کتبہ سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں ملک ذمار پر قبضہ کرنے کی جد و جہد چار قومیں کر رہی تھیں

(۱) حمیر اخیار یعنی خود یمن کا قدیم شاہی گھرانا،

(۲) حبشہ اشرار جن کی بابت زیر بحث کتبہ میں ہے کہ ذونواس نے حبش والون کو راضی کیا، اور وہ خادم ہو گئے، اور نقوش زبرین کے کندہ کارنے جن کا ذکر کوشش کے نام سے کیا ہے، اور ان کو ذلیل جھگرالو غلام بتایا اور اب تک کی معلومات کے مطابق اہل حبش نے ۳۲۵ء تا ۳۷۵ء اور ۵۲۵ء تا ۵۷۲ء یمن میں پر حکومت کی قدیم کتبہ کی روایت میں پہلی بار کے قبضہ اہل حبش کا ذکر ہونا چاہیے، کیونکہ سنہ ۶۰۰ء میں جو کتبہ خانہ کعبہ کے پاس ملا تھا، اس میں مذکور تھا کہ ملک ذمار اپنی جگہ لوٹ گیا، یعنی حمیر نے اس پر حکومت قائم کرلی، ملک ذمار ملک یمن ہی کا ایک نام ہے،

(۳) فارس احرار زیر بحث کتبہ کی تشریح سے پہلے تک کے معلومات کے مطابق فارس والون نے یمن پر ۵۷۲ء یا ۶۰۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک حکومت کی تھی، اس لئے سمجھا جاتا تھا کہ قدیم کتبہ مین فارس احرار کے ذکر سے یہی دور مراد ہے، جب کہ یمن مرزبان ہرزو (وہرز) کے ورثا حکومت کرتے تھے لیکن اس پر یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ ۶۰۰ء مین خانۂ کعبہ مین جو کتبہ ملا تھا، اس کے مطابق تو اس زمانہ سے پہلے حمیر، فارس اور قریش کی جو لکھی تھی، ختم ہو کر حکومت ذمار اپنے اصلی محور پر لوٹ گئی تھی اور حمیری حکومت قائم ہو گئی تھی، زیر بحث کتبہ مین تو ذکر ذکے تذکرہ نے مل کر دشواری حل کر دی، اسی زمانہ (۳۲۳ء تا ۳۲۵ء) مین حمیر اخیار، حبشہ اشرار اور فارس احرار تینون گروہ حکومت یمن کے حصول کی کوشش کرتے تھے، (باقی)

رحمتِ عالمؐ

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت،

ضخامت:- ۲۰۰ صفحے، قیمت: مجلد:- عہ غیر مجلد ۱۲ر (طبع پنجم) "منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

نیا ادب

شاہ معین الدین احمد ندوی

مولفہ جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت للعہ رتبہ :۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی،

نئے اور ترقی پسند ادب کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن اب تک کسی صاحب نظر ادیب نے اس کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا، اور غیر جانبدارانہ محاکمہ نہیں کیا تھا، اس کام کو اردو کے نامور ادیب پنڈت کشن پرشاد کول نے انجام دیا ہے، اور اس کتاب میں انھوں نے نئے ادب کے ہر پہلو کا تفصیلی تجزیہ کرکے اس کے محاسن و معائب ظاہر کئے ہیں، ابتدا میں ترقی پسند ادب کی حقیقت، اس کی غرض و غایت اور اس کے خیالات و نظریوں پر تبصرہ ہے، پھر اس کے افسانوں پر اجمالی، اس کے بعد مشہور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں اور ناولوں پر تفصیلی تنقید کرکے ان کی خوبیاں اور نقائص دکھائے ہیں، اور آخر میں مشہور ترقی پسند شعراء کے کلام پر نقد و تبصرہ ہے، اردو میں اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع اور بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، لائق مصنف نے بڑے اعتدال و توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ ترقی پسند ادب کے محاسن و معائب دونوں دکھائے ہیں جس سے اس کا ہر رخ، سارے خط و خال اور عیب و ہنر سامنے آجاتے ہیں، پوری کتاب مصنف کے بلند ادبی ذوق، نکتہ سنجی، دقت نظر اور صحیح تنقیدی نگاہ کی آئینہ دار اور تنقیدی و ادبی حیثیت سے اصحاب ذوق خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کے مطالعہ

کے لائق ہے،

درحقیقت ترقی پسند ادب کے بارہ مین اس کے حامی اور مخالف دونون تنگ نظری اور افراط و تفریط مین مبتلا ہین، سویٹ زدہ ترقی پسندون کے نزدیک محض اشتراکی خیالات اور روسی ادب کی نقالی ترقی پسندی کی معراج ہے، انھون نے محض بھوک، پیٹ، روٹی، کسان، مزدور، غریب، سرمایہ دار، انقلاب، آگ اور خون کے الفاظ اور فرائیڈ کے جنسی نظریات کی تبلیغ و اشاعت، فحاشی، و عریان نگاری اور شعر و ادب مین بے لگام آزادی کا نام ترقی پسند ادب رکھا ہے، اس کے علاوہ ہر ادب اُن کے نزدیک غیر صحت مند، اور مجموعۂ خرافات ہے، ان کے مقابلہ مین پرانے ادب کے پرستارون کا طبقہ جو اب بہت کم باقی رہ گیا ہے، پرانے ڈھرے سے ذرا بھی الگ ہونا بارگاہِ ادب مین سوءِ ادب سمجھتا ہے، یہ دونون نقطۂ نظر غلط ہین،

ترقی پسندی اور نیا ادب اگرچہ اصطلاحاً نئی ہین، لیکن نیا ادب اس زمانہ کی پیداوار نہین ہے، بلکہ ہر زمانہ کے حالات اور ذوق و رجحان کے تغیر کا فطری نتیجہ ہے جس سے کسی زبان و ادب کی بھی تاریخ خالی نہین ہے، اگر اردو کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو تحسین کی دہ مجلس، میر شیر علی افسوس کی آرایش محفل، اور میر امن کے قصہ چہار درویش سے لیکر موجودہ ترقی پسند ادب تک، ہر زمانہ مین ترقی پسندی اور نئے ادب کا ایک سلسلہ نظر آئے گا، اس کے ابتدائی دور مین ادب محض مقفی و مسجع عبارت آرائی اور خیالی افسانہ طرازی تک محدود تھا، اس کے بعد جب ترقی کا قدم آگے بڑھا تو افسانہ طرازی باقی رہی لیکن عبارت مین سلاست و سادگی آنے لگی، جس کا نمونہ چہار درویش ہے، اور کم و بیش ۵۷ء کے انقلاب تک یہ طرز قائم رہا، اس کے بعد جب حکومت کے ساتھ پرانی تہذیب کی بساط الٹی اور جدید تعلیم و تہذیب سے مذاق و خیالات مین تغیر پیدا ہوا، تو اس کے ساتھ ادب بھی بدلنا شروع ہوا، اور خیالی افسانہ طرازی کی جگہ حقیقت پسندی، ذہنی تفریحی ادب کے بجائے مفید سنجیدہ علمی و اصلاحی لٹریچر اور عبارت آرائی کے بجائے سادگی شروع ہو گئی، اور ادب محض ذہنی تفریح کے بجائے زندگی کے تقاضون کی تکمیل کا کام لیا جانے لگا، سرسید، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد اور مولوی

چراغ علی وغیرہ کی تصانیف اس کا ثبوت ہین، بلکہ خالص ادب یا افسانون مین بھی واقعیت و مقصدیت پیدا ہو گئی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی راشد الخیری کے اصلاحی افسانے اُس کے شاہد ہین، اور ترقی پسندی کی یہ رفتار برابر قائم رہی، اور حالات و ضروریات کے مطابق اردو ادب کا رنگ بدلتا اور ہر قسم کا لٹریچر پیدا ہوتا گیا، ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے بعد سے اس وقت تک اردو مین اچھا خاصہ سیاسی لٹریچر بھی پیدا ہو گیا ہی،

اسی قسم کے تغیرات نظم مین بھی ہوئے، غدر کے بعد ہی سے اردو شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا، سب سے پہلے غالب نے نیا رنگ چھیڑا، اور خیالات اور طرز ادا دونون مین وسعت و تغیر پیدا کیا، اُن کے بعد محمد حسین آزاد اور حالی نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا، انھون نے اردو شاعری کو اُس کے قدیم تنگ کوچہ سے نکال کر نئے خیالات و تصورات سے آشنا کیا، مولانا حالی نے اس سے پسماندہ کاروانِ ملت کے لئے حدی کا کام لیا، جس کا نمونہ مسدس حالی اور اُن کی دوسری نظمین ہین، اور پرانی شاعری کی عام اصلاح کے لئے مقدمۂ شعر و شاعری لکھا، اُن کے بعد اکبر الٰہ آبادی نے شاعری کے مقاصد مین اور زیادہ وسعت پیدا کی، اور اس سے گوناگون اصلاحی و تنقیدی کام لئے، اور اقبال نے اس کو محشرستانِ حیات کا صور اور جہاد زندگی کی تکبیر بنا دیا، قومون کے عروج و زوال ترقی و تنزل اور موت و حیات کا وہ کون سا اصول و فلسفہ ہے، جو اُس مین نہین ہی، اور بعد کے سارے واقعی ترقی پسند شعراء درحقیقت اُنہی کے خوشہ چین ہین، غرض غدر کے بعد اردو نظم و نثر کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے اس مین ترقی پذیری، حقیقت پسندی اور مقصدیت نظر آئے گی، اسلئے یہ سمجھنا کہ ترقی پسندی موجودہ دور کے ترقی پسند شعراء اور ادیبون کا کارنامہ ہے سراسر غلط ہے، البتہ زمانہ کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ترقی پسندی کا رُخ بدلتا رہتا ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ مین سیاسی و معاشی و سماجی مسائل کے متعلق بھی اردو لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، ترقی پسندی کو محض اشتراکی ادب کی نقالی پیٹ کی آگ اور جنسی بھوک مین محدود کر دینا درحقیقت ترقی پسندی نہین بلکہ تنزل ہے، اس کے علاوہ

بھی زندگی کے بہت سے مسائل ہیں، جو اُن سے کم اہم نہیں،

پرانے ادب پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی زندگی سے دور ہے، اس میں ان کی زندگی کی عکاسی اور اُن کے مذاق کی چیزیں نہیں ہیں، اور وہ محض ذہنی و دماغی تفریح کا ذریعہ ہے، اس میں زندگی کے مشکلات و مسائل کا حل نہیں ہے، ان اعتراضات کے جوابات کے لئے ان پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، یہ صحیح ہے کہ پرانا ادب عوام کی زندگی سے دور ہے، اس کا سبب یہ ہو کہ اس زمانہ میں عوام کی اتنی اہمیت ہی نہیں تھی، اور نہ عوامی مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کا بڑا حصہ تعلیم سے بے گانہ تھا، اور وہ زیادہ تر خواص تک محدود تھی، اس لئے پرانا ادب خواص کے طبقہ میں محدود رہا۔ اور انہی کے اثرات بھی اس میں آئے لیکن اس سے مراد اردو ادب ہے، اردو زبان نہیں،

لیکن اس کے باوجود کہ اردو ادب عوام کی زندگی سے دور رہا، اس میں ان کے ذوق اور اُن کی ذہنی تفریح کا پورا سامان موجود تھا، خصوصاً شہری عوام کے لطف و تفریح کا بڑا ذخیرہ ہے، قصّہ چہار درویش، آرایش محفل، الف لیلہ، قصّہ لیلیٰ مجنون، نل دمن، گل بکاولی، نورتن، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی قصّہ مادھول، اور اندر سبھا امانت وغیرہ بیسیوں کتابیں موجود تھیں جن سے عوام ایسی ہی لطف و تفریح حاصل کرتے تھے جیسی موجودہ زمانہ کا ایک تعلیم یافتہ شخص اچھے سے اچھے ناول کے مطالعہ سے حاصل کرتا ہے، فرصت کے اوقات میں چند ہم سن و ہم مذاق ایک جگہ جمع ہو جاتے، حقہ کا دور چلتا، ایک خواندہ شخص ان میں سے کوئی کتاب پڑھتا، اور تمام سامعین اس سے لطف اندوز ہوتے، آج بھی لکھنؤ کے زردوزوں، سادہ کاروں اور دوسرے اہلِ حرفہ میں اس قسم کے ادبی اجتماع عام ہیں، بلکہ ان مجلسوں میں فسانۂ آزاد اور داستان امیر حمزہ تک کا دور چلتا ہے، شہروں کے علاوہ بڑے قصبات تک میں اس قسم کے تفریحی اجتماع ہوتے ہیں،

البتہ خالص دیہاتی اور ان پڑھ کسانوں کی تفریح کا سامان اردو ادب میں موجود نہیں ہے، یہ طبقہ اردو کی ادبی زبان ہی نہیں سمجھ سکتا تھا تو اس کے لئے لٹریچر کہاں سے پیدا ہوتا، لیکن اُن کے ذوق و دلچسپی اور لطف و تفریح

کے لئے برج بھاشا مین بہت سی کتابین قصّے اور کہانیان موجود تھین اور جن کتابون کے نام لکھے گئے ہین ان مین نورتن، سنگاسن بتیسی، بیتال پچیسی، قصہ نل ودمن وغیرہ اور دوسری بہت سی کتابین برج بھاشا مین بھی ہین اُن کے علاوہ ہنس جواہر، اسلام کھنڈ، آلھا اودل کا قصہ، بارہ ماسے اور بہت سی داستانین اور حکایات موجود ہین، جو آج بھی دیہاتون مین بڑے ذوق اور دلچسپی سے سُنی جاتی ہین،

ان کے مقابلہ مین آج بھی دیہاتی عوام عوامی یا نئے ادب کے فیض سے محروم بلکہ اس کے نام تک سے واقف نہین، پُرانے ادب کی تفریحی کتابون سے کم از کم وہ ذہنی تفریح تو حاصل کر لیتے تھے، نئے ادب نے تو اُن کو اس سے بھی محروم رکھا ہے، اور وہ محض شہری تعلیم یافتہ نوجوانون کی مشق سخن اور تفریح کا ذریعہ ہے، البتہ زبانون پر عوامی ادب کی فیض بخشی کا شور ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے ادب مین دیہاتی زندگی کی عکاسی نہین ہے اسکی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دور مین اُن کی اتنی اہمیت نہین تھی، دیہاتون مین تعلیم نہ تھی لکھنے والے سب شہری تھے، مختصر افسانون کا رواج نہ ہوا تھا، اور اس زمانہ مین اردو کی عمر ہی کیا تھی، کہ اس مین ہر قسم کا لٹریچر موجود ہوتا، اس قسم کے مختصر افسانے تو مغربی زبانون مین بھی ان کے انتہائی عروج، بلکہ زمانۂ حال مین پیدا ہوئے، ایسی حالت مین اردو مین ان کا وجود کہان سے ہو سکتا تھا، لیکن اسکی ترقی کے ساتھ سب چیزین رفتہ رفتہ آرہی ہین، اس کے علاوہ ان معترضین سے یہ سوال ہے کہ اُن کے عوامی ادب اور عوامی زندگی کی عکاسی سے ان غریب دیہاتی عوام کو کیا فائدہ پہنچا، وہ اس کے علمی و عملی دونون فوائد سے محروم ہین، ان مین اتنی استعداد صلاحیت نہین کہ وہ کم سے کم انھین پڑھکر ذہنی تفریح ہی حاصل کر سکین، اُن کی پرانی زندگی جیسے پہلے تھی اب بھی ہے، ان کو جو فائدہ پہنچا بھی ہے، وہ سیاسی حالات نے پہنچایا ہے، عوامی یا نئے ادب کو اس مین کوئی دخل نہین، وہ ویسے ہی محض تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنی تفریح کا ذریعہ ہے، جیسے پرانا ادب ہے، روس مین عوامی ادب اس وقت پیدا ہوا جب عوام کا بڑا حصہ تعلیم یافتہ یا کم سے کم خواندہ ہو گیا، یہان حال یہ ہے کہ دیہاتی آبادی کا بڑا حصہ بلکہ تقریبًا کل کا کل جاہل مطلق ہے، اور اس کی ضیافت کے لئے عوامی ادب کا خوان موجود ہے،

جس کی خبر بھی ان بیچاروں کو نہیں ہے، یہ تو ویسی ہی ستم ظریفی ہے کہ غریب کسانوں کو آج بھی پیٹ بھر کھانا اور تن کا کپڑا میسر نہیں، لیکن اُن کی ترقی کے لئے دیہاتوں میں بجلی اور ریڈیو رائج کرنے کی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں، اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عوامی ادب سے عوام کو عملاً کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا، ایسی حالت میں اس کا نام محض عوامی ادب رکھ دینے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا،

ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا بھی نہایت مہمل ہے، یہ دونوں قسمیں ہر زمانہ اور ہر زبان میں موجود رہی ہیں، گو یہ اصطلاحیں نہ رہی ہوں، البتہ اب ادب برائے زندگی کا تصور محدود ہو گیا ہے پہلے زندگی نام تھا اس کے مادی، اخلاقی اور روحانی تمام پہلوؤں کا اور اب وہ سمٹ کر محض پیٹ اور جنسی بھوک میں محدود ہو گئی ہے، زندگی کے صحیح اور جامع تصور کے مطابق اس کے ہر پہلو کی ہدایت و رہنمائی کے لئے عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی وغیرہ ہندوستان کی تمام رائج زبانوں میں حکیمانہ و فلسفیانہ کتابیں سبق آموز حکایات، حکیمانہ مقولے، اور ضرب الامثال موجود ہیں، اردو ایک نئی زبان ہے، اس لئے اس موضوع پر اس میں کم کتابیں لکھی گئیں، لیکن دوسری زبانوں سے بہت سی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں، سنسکرت اور ہندی کے ترجموں کا راقم کو پورا علم نہیں ہے، لیکن انوار سہیلی یا کلیلہ دمنہ، گلستان سعدی، بہار دانش، اخوان الصفا، کیمیائے سعادت، مثنوی مولانا روم اور دوسری بہت سی حکیمانہ کتابوں کے جن سے زندگی کے ہر شعبہ میں سبق حاصل ہوتا ہے، ترجمے ہو چکے ہیں، اور یہ سب کتابیں تو ہمارے پرانے نصاب میں داخل تھیں یعنی زندگی کے جملہ مادی و روحانی و اخلاقی معاملات و مسائل کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی، ایسی حالت میں پرانے ادب کو محض ادب برائے ادب میں محدود سمجھنا ناواقفیت کا ثبوت ہے،

خالص ادب یعنی ادب برائے ادب بھی زندگی کی ضروریات میں اور تہذیب و کلچر کی ترقی کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ دیہاتی زندگی بھی اس سے خالی نہیں، انسان محض جانور یا مشین نہیں ہے، کہ وہ محض مادی ضروریات فراہم کرنے کا آلہ ہو، یا اس کی ضرورت محض پیٹ اور بھوک تک محدود ہو، بلکہ وہ مادی حوائج کے

ضروریات کے ساتھ کچھ لطیف جذبات و احساسات اور پاکیزہ تصورات بھی رکھتا ہے، زندگی کی مشقتون اور جد و جہد کے بعد اس کو سکون کے کچھ لمحات اور دماغی و ذہنی لطف و تفریح کا سامان بھی درکار ہے، عملی سے عملی آدمی کو بھی ایسے لمحات کی ضرورت ہوتی ہے، دیہات کے کسان بھی اس سے خالی نہین ہین، دن بھر کی محنت و مشقت کی تکان کے بعد اُن کو بھی ذہنی و دماغی سکون و تفریح کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ وہ بھی اپنی فرصت کے اوقات مین دیہاتی قصص و حکایات و افسانون کو سن کر لطف و تفریح حاصل کرتے ہین اور جس قدر تہذیب و کلچر بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر اس قسم کے لٹریچر کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے، دل و دماغ کی تفریح و جلا کے لئے ادب برائے ادب ضروری اور تھکے ہوئے دماغ کی غذا ہے جس سے دماغ تر و تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے، اس کے بغیر دماغ کند اور ذہن غبی ہو جاتا اور زندگی کی بہت سی لطافتین اور رعنائیان ختم ہو جاتی ہین، اس لئے انسانی زندگی کے لئے ادب برائے ادب بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ادب برائے زندگی، اگر ادب و شاعری کا حصہ زندگی سے خارج کر دیا جائے، تو وہ یکسر بے رنگ و بو ہو جائے،

نئے ادب کے بعض اصلاحی پہلوؤن کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہین، ترقی پسند ادیبون مین ایسے اصحابِ قلم بھی ہین جن کی کوششین، ادبی و اصلاحی دونون حیثیتون سے قابلِ قدر ہین، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، جمِ غفیر ان نوآموزون کا ہے جن کو قلم پکڑنے کا بھی سلیقہ نہین ہے، اور وہ ترقی پسند محض اس لئے کہلاتے ہین کہ الٹے سیدھے اشتراکی خیالات کی نقالی کرتے ہین، اُن کا سب سے بڑا عیب عریان نگاری ہے، بلکہ پختہ کار ترقی پسند افسانہ نگارون کے افسانے بھی اس سے یکسر پاک نہین، سماجی اصلاح کی ضرورت مسلم ہے، لیکن کیا اس کا طریقہ صرف عریان نگاری ہے، اگر بالفرض کسی خاص صورت مین کسی درجہ مین اس کی ضرورت تسلیم بھی کر لیجائے، تو اس کو مزے مزے لیکر بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس سے تو خود ان ادیبون کی جنسی بیماری کا پتہ چلتا ہے، انھون نے فحاشی اور عریان نگاری کو نوجوانون مین اپنی شہرت و مقبولیت اور تجارت کا ذریعہ بنا لیا ہے، ورنہ یہ کام شائستہ طریقہ سے بھی کیا جا سکتا ہے، بعض پرانے ادیبون نے بھی اس موضوع پر

پر لکھا ہی، مرزا رسوا اور قاری سرفراز حسین نے طوائفون تک کی سرگذشت بیان کی ہے، لیکن کس شائستگی کے ساتھ، خود قاضی عبد الغفار صاحب جو پرانے اور نئے دونون ادب کے مجمع البحرین، پرانے ادب کے نامور ادیب اور ترقی پسند ادیبون کے مقتدا ہین، ان کی کتابین لیلیٰ کے خطوط اور مجنون کی ڈائری اصلاحی ترقی پسند ادب کا اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ ہین، لیکن اس کے لئے بڑے سلیقہ، حسن مذاق اور اس سے بھی بڑھ کر حسن نیت کی ضرورت ہی جس کا نئے ادیبون مین عموماً فقدان ہے،

یہ تو نئے اور پرانے ادب کے ایک حصہ یعنی نثر کا تجزیہ تھا، نظم کا حال بھی یہی ہے، نہ ترقی پسند شاعری سراسر خیر ہے، اور نہ پرانی شاعری محض دفتر پارینہ، شاعری ہی نے اردو جیسی نومولود بولی کو مستقل زبان بنایا، اور شعراء اور ادیبون کو زبان و بیان کے جوہر عطا کئے، ورنہ وہ ع

اک چیز لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اس سے انکار نہین کہ اردو کی قدیم شاعری کا بڑا حصہ عشق و عاشقی کے جذبات اور ہجر و وصال و گل و بلبل کی داستان پر مشتمل ہے، لیکن حسن مذاق اور لطافت کے ساتھ یہ چیزین شاعری کا عیب نہین، بلکہ ہنر ہین، کس زبان کی شاعری اس سے خالی ہے، بلکہ شاعری کا آغاز ہی عشق و محبت کے جذبات سے ہوا، اسکو خارج کر دینے کے بعد شاعری مین رہ کیا جاتا ہی، البتہ اعتدال و سلامت مذاق ضروری شرط ہے، یہ صحیح ہے کہ آخری دور کے شعراء خصوصاً لکھنؤ کے شعراء نے شاعری مین بڑا ابتذال و رکاکت پیدا کر دی اور اس کو سفلہ جذبات کا چٹکلہ اور الفاظ کا کھیل بنا دیا، لیکن یہ اس دور کی زوال پذیر سوسائٹی کا قصور ہے، تاہم کوئی دور بھی بلند پایہ شعراء سے خالی نہین رہا، ان مین میر، مومن، ذوق، غالب، آتش اور انیس و دبیر بھی تھے جن کا کلام اردو شاعری کا لائق فخر سرمایہ ہے، خصوصاً انیس و دبیر نے اردو شاعری کا دامن نہایت وسیع کر دیا، انیس نے بالکل صحیح کہا ہے،

سبک ہو چلی تھی ترازوے شعر　　مگر مین نے پلہ گران کر دیا

یہ صحیح ہے کہ شاعری کا دامن محض عشق و محبت کی واردات سے زیادہ وسیع ہونا چاہئے اس کا

سے بلا شبہ اردو شاعری کا گلہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن وہ دوسرے جذبات وخیالات سے یکسر خالی نہین ہے خود غزل مین بھی جو اس حیثیت سے سب سے زیادہ مطعون سمجھی جاتی ہے، بہت سے اخلاقی وحکیمانہ خیالات پائے جاتے ہین، بلکہ رباعی کے بعد غزل کے فرد اشعار ہی اس کے لئے موزون ہین جس سے کسی غزل گو کا کلام بھی خالی نہین ہے رباعی اور قطعات حکیمانہ خیالات کے لئے مخصوص ہین جن کا بڑا ذخیرہ اردو مین ملیگا، نظم کے لئے مثنوی ہے جس مین ہر قسم کے واقعات اور خیالات وجذبات نظم کئے جا سکتے ہین، اور اردو مثنویون مین اس کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہین اس لحاظ سے مرثیہ کا دامن بھی جن کا موضوع اگرچہ محدود ہے ہر قسم کے جذبات وخیالات، مناظر اور واقعہ نگاری کے لئے نہایت وسیع ہے اور اس کی بہتر سے بہتر مثالین انیس و دبیر کے مراثی مین موجود ہین جن کی نظیر جدید اردو شاعری مین اب تک نہین مل سکتی، یہ تو پرانی شاعری کا حال ہے جدید دور کی شاعری مین ہر قسم کی نظمین اس کثرت سے ہو گئی ہین کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے البتہ موجودہ نقطۂ نظر سے قدیم شاعری زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضون کی تکمیل سے خالی ہے لیکن ایسے دور انحطاط کی شاعری مین جس کا نشو و نما حکومت کی تباہی سوسائٹی کے فساد اور لکھنؤ کے گہوارۂ تعیش مین ہوا ہو زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضون کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے بہادر شاہ کی زنگ خوردہ تلوار مین ہمایون اور بابر کی تلوار کے جوہر اور رجا نعالم پیا کے رنگ محل مین خون جگر تلاش کرنا لیکن جب سے اردو شاعری کا قدیم رنگ بدلا ہے، اس مین قومی ملی، معاشی اور سیاسی مضمون کا بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے،

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جدید شاعری کے سرگروہ حالی، آزاد، شبلی، ظفر علی خان، اکبر اور اقبال سب کے سب پرانے مکتب شاعری کی پیداوار تھے، انھی نے جدید شاعری کا آغاز کیا، اور اس کو کمال کے اس درجہ تک پہنچا دیا کہ اب اس مین مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے خود ترقی پسند شعراء کے امام جوش ملیح آبادی بھی شاعری کے پرانے اسکول کی پیداوار ہین، اگرچہ انھون نے اپنے کلام مین ترقی پسندی کے رائج الوقت سکہ کا ٹھپہ لگا دیا ہے لیکن وہ اسی پرانی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ہے اسی لئے اس مین کھوٹ نہین ہے اور کمال فن اور محاسن شاعری کے اعتبار سے استادانہ ہے اس لئے پرانی شاعری کا دفتر بالکل پارینہ نہین ہے البتہ اس کے بعض پہلو قابل اصلاح ضرور ہین جنکی اصلاح ہوتی جا رہی ہے،

اس کے مقابلہ مین ترقی پسند شاعری کی ابھی کوئی حیثیت ہی قائم نہین ہوئی ہے اور ترقی پسند شعرا مین جوش، مجاز، علی جواد زیدی، فراق اور اس قسم کے دو چار شعرا، کو چھوڑ کر جن کی شاعری کا قالب وہی پرانا ہے، اور جو درحقیقت شاعری کہی جا سکتی ہے، باقی نظم منثور لکھنے والے کسی شمار مین نہین ہین، اور اُن کی حیثیت اشتراکی ادب کے بھونڈے نقال سے زیادہ نہین، اگر پُرانی شاعری محض عشق و محبت، گل و بلبل اور ہجر و وصال کے افسانون تک محدود تھی تو جدید ترقی پسند شاعری محض پیٹ، روٹی، انقلاب، مزدور، سرمایہ دار اور فرائڈ کی جنسیات تک محدود ہے،

ترقی پسند نثر اور نظم دونون کے عیوب و نقائص قریب قریب یکسان ہین، نظم مین دو عیب مزید ہین، ایک شاعری کے قواعد سے آزادی، دوسرے ابہامیت یا رمز و کنایہ، قواعد سے آزادی کے لئے یہ عذر کیا جاتا ہے کہ وہ خیالات کے تنوع اور وسعت کا ساتھ نہین دے سکتے، اور اردو شاعری کی ترقی کے لئے اُن کا توڑنا ضروری ہے لیکن یہ محض عذر لنگ اور عجز بیان کا ثبوت ہے، رامائن، مہابھارت، شاہنامہ، مثنوی مولانا روم وغیرہ دنیا کی بہت سی غیر فانی کتابین پابند نظم مین لکھی گئی ہین، اور ان مین مختلف النوع جذبات و خیالات، افکار و تصورات، واقعات و حالات، فلسفہ و حکمت، اخلاق و روحانیات وغیرہ کا ایک عالم موجود ہے، اور اُن کے نظم کرنے مین شاعری کی پابندیان حائل نہ ہوسکین، خود اردو جیسی نوعمر زبان مین غالب، انیس و دبیر اور اقبال کے کلام مین کیا کچھ نہین ہے، اقبال سے زیادہ بلند و دقیق کس کے خیالات ہونگے لیکن اُن کو کبھی قواعد شاعری کے دائرے سے باہر نکلنے کی ضرورت نہین پڑی، خود ترقی پسند شعرا مین جوش، مجاز، فراق، علی جواد زیدی، جان نثار اختر کہ جن کا کلام درحقیقت شاعری کہلانے کا مستحق ہے، شاعری کے قواعد کی تنگ دامانی کا شکوہ کبھی نہین ہوا، خصوصاً جوش کا کلام تو قادر الکلامی کا نمونہ ہے، اور اسی لئے اُن کے کلام مین جان ہے کہ اس کا قالب پرانا ہے،

بحر، ردیف اور قافیے کی پابندیان محض لایعنی نہین ہین، بلکہ اُن سے کلام مین حسن و اثر پیدا ہوتا ہے، ایک ڈھلا ہوا شعر سامعہ اور ذوق دونون کو متاثر کرتا ہے، قوت حافظہ بھی اسے جلد اور آسانی کے ساتھ محفوظ کرلیتی ہے، اس لئے تبلیغی مقصد کے لئے بھی پابند شاعری زیادہ مفید ہے، اس حد تک تو تسلیم ہے کہ ان تمام

قوانین کی پابندی کی ضرورت نہین جن سے شاعری محض صنعت گری بن جائے لیکن موٹی موٹی باتون مثلاً بحر و وزن اور قوافی کا لحاظ جن سے شعر کا قالب بنتا ہے ضروری ہے، ورنہ وہ شعر شعر نہین رہ جائے گا، ایسا تو نہ ہو کہ ایک نظم کا ہر مصرع دوسرے سے مختلف ہو، اور نثر و نظم مین امتیاز کرنا دشوار ہو جائے، بلکہ نظم منثور کے فقرے بھی ایک دوسرے سے مربوط نہ ہون، انگریزی کے بلینک ورس کی شوق سے تقلید کی جائے لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ، ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو دوسری زبانون کی بجنسہٖ نقل و تقلید کا متحمل نہین ہو سکتا، ایک ماہر و مبصر ادیب کا یہ کام ہے کہ دوسری زبانون کے ادب کی نقل و ترجمہ کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لے، ورنہ ایک کی روح دوسرے کے قالب مین بالکل اجنبی نظر آئے گی، اس قسم کے تصرفات خود عربی فارسی اور اردو کی بحرون مین جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہین کئے گئے ہین، اس لئے کہ بجنسہٖ ایک زبان کے قوانین شاعری دوسری زبان کی شاعری کیلئے موزون نہین تھے، ایسی حالت مین انگریزی جیسی اجنبی زبان کی شاعری کی نقل و تقلید مین تو ترمیم اور تصرف بھی زیادہ ضروری ہے،

دوسرا عیب ابہامیت یا رمز و کنایہ ہے، اردو شاعری مین بھی استعارہ و کنایہ ہے لیکن اس کا استعمال خاص خاص مواقع پر اس خوبصورتی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ کلام کے حسن و اثر دونون مین اضافہ ہو جاتا ہے، اور شاعر کا مفہوم و مقصد، تصریح سے زیادہ بلیغ طریقہ سے ادا ہو جاتا ہے، الکنایۃ ابلغ من التصریح مشہور مقولہ ہے، لیکن جدید شاعری کی ابہامیت ع

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا

کی مصداق ہے اور اس کا مفہوم و مقصد سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، ترقی پسند شاعری کا بڑا مقصد خاص خیالات کی تبلیغ و اشاعت ہے، اور اس قسم کی ابہامیت اس کے بالکل منافی ہے، اس لئے سنجیدہ ترقی پسندون کو ان نقائص کے اصلاح کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ترقی پسند ادب کا اصل منشا پورا نہین ہو سکتا اور اس کی زندگی بھی بہت تھوڑی ہوگی،

مطبوعات جدیدہ

مسدس بے نظیر مصنفہ جان صاحب، مرتبہ جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری، تقطیع چھوٹی،

ضخامت ۱۶۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ :- خسرو باغ روڈ ریاست رامپور،

نواب کلب علی خان والی رامپور بڑے علم دوست، علمار نواز اور علم و فن کے بڑے قدردان و سرپرست تھے اُس دور کے بہت سے نامور علمار و شعرار اور ادبا، دربار رامپور سے وابستہ تھے، نواب موصوف کے زمانہ مین بعض تمدنی کام بھی انجام پائے، اس سلسلہ مین انھون نے اپنی تخت نشینی کی یادگار مین ۱۸۶۶ء مین ایک میلہ قائم کیا تھا، یہ رامپور کا تاریخی میلہ تھا، سرکاری انتظام مین باغ بے نظیر مین لگتا تھا، نواب ممدوح خود بہ نفس نفیس اس مین شریک ہوتے اور ہر فن کے باکمال اس میلہ مین اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے، شعر و ادب کی محفل بھی جمتی تھی، چنانچہ دربار رامپور کے بہت سے متوسل شعرا نے میلہ اور باغ بے نظیر کی تعریف مین اشعار کہے تھے، مشہور ریختی گو جان صاحب نے ایک مستقل مسدس مسدس بے نظیر تصنیف کیا تھا، جو اب تک نہین چھپا ہے، اس کا قلمی نسخہ ریاست کے کتبخانہ مین موجود تھا، جناب اثر رامپوری نے اسکو مبسوط مقدمہ کیساتھ شائع کیا ہے، مسدس تو کل ۳۲ صفحون کا ہے لیکن مقدمہ کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے، اس مین لائق مصنف نے بڑی تلاش و جستجو سے تاریخی و ادبی ماخذون شعرار کے دواوین اور رامپور کے پرانے بزرگون کی معتبر زبانی روایات سے میلہ اور باغ بے نظیر کے مفصل حالات تحریر کئے ہین، اور جان صاحب کے مسدس اور دوسرے شعرار کے کلام مین جن لوگون کے نام یا جو اشارات آئے ہین اُن کے مختصر حالات اور اُن کی تشریحات تحریر کی ہین، اس طرح اس مقدمہ مین اس دور کے رامپور کی نہایت دلچسپ تمدنی تصویر آگئی ہے جس کا اب صرف تاریخون مین ذکر ملے گا،

"م"

جلد ۶۶ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۵ء عیسوی عدد ۶

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۲ -

مقالات

آہ مولانا شروانی!	سید سلیمان ندوی	۴۰۳ - ۴۰۴
مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران،	جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۴۰۵ - ۴۲۲
نفثۃ المصدور	جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	۴۲۳ - ۴۳۸
اعتراف	جناب سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری مترجم نپولین اعظم وغیرہ،	۴۳۹ - ۴۵۶
مولانا شروانی کی تصویر اُن کی تحریر کے آئینہ میں،	شاہ معین الدین احمد ندوی،	۴۵۷ - ۴۷۷
صدر یار جنگ	جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی	۴۷۸ - ۴۸۶
مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے خاندانی اور ذاتی حالات	جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے،	۴۸۷ - ۴۹۸

ادبیات

ماتم حبیب شبلی	جناب یحییٰ اعظمی	۴۹۹ - ۵۰۰

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکتوبِ شروانی		۵۰۰
مطبوعاتِ جدیدہ	"م"	۵۰۱ - ۵۰۴

شذرات

معارف نے ہمیشہ مذاقِ عام سے اپنا دامن بچایا اس لئے آج تک اس کا کوئی خاص نمبر نہیں نکلا لیکن بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ پرانی روش سے ہٹنا ضروری ہو جاتا ہے، انہی میں مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات بھی ہے، مرحوم کی ذاتِ گرامی ایسے گوناگون اوصاف و خصوصیات کی جامع تھی کہ ایسے نمونے اب دیکھنے میں نہ آئیں گے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں بھی ان اوصاف میں منفرد تھے، اُن کی وفات سے فضل و کمال، علم دوستی و علماء نوازی، تقویٰ و دیانت، تہذیب و شرافت، سیرت کی استواری و وضعداری کی جامعیت کا خاتمہ ہو گیا، اس لئے اُن کی یادگار درحقیقت ان اوصاف و کمالات اور علم و فن کی یادگار ہے،

اس عمومی حیثیت کے علاوہ مرحوم کو دارالمصنفین سے خاص تعلق تھا، وہ مولانا شبلی مرحوم کے بڑے گہرے اور مخلص دوست تھے، اُن کی وفات کے بعد یہ ربط و تعلق اُن کی یادگار دارالمصنفین کی جانب منتقل ہو گیا، چنانچہ مرحوم اس کے بڑے قدردان، ہوا خواہ، مجلس دارالمصنفین کے رکن رکین اور اُس کے صدر نشین تھے، اسلئے دارالمصنفین پر اُن کا بڑا حق تھا جس کو وہ اُن کی علمی یادگار ہی کی شکل میں ادا کر سکتا تھا،

اس نمبر میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کی زندگی کے تمام اہم پہلو اور اُن کی نمایاں خصوصیات سامنے آجائیں، چنانچہ متعدد مضامین ایسے اصحابِ علم و قلم کے ہیں جن کو برسوں مرحوم کے ساتھ رہنے یا اُن کو زیادہ قریب سے مسلسل دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر اُن کی زندگی کا نہایت مستند مرقع ہے، حضرۃ الاستاذ مدظلہ کا مضمون ایسے وقت ملا جب معارف کا ابتدائی حصہ چھپ چکا تھا، لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے اُس کو سرِ مقالہ رکھنا ضروری تھا، اس سے صرف چند ابتدائی صفحون کے ہندسے مکرر ہو گئے ہیں، باقی اور کوئی فرق نہیں آیا ہے، ان گذارشات کے ساتھ مولانا شروانی مرحوم کی زندگی کا یہ مرقع اور ان کی علمی یادگار ناظرینِ معارف کی خدمت میں پیش ہے،

مقالات

آہ! مولانا شروانی

از

سید سلیمان ندوی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار مین سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا، اور اپنی دوری، مجبوری، اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، مین نے مرحوم کی زندگی ہی مین اُن کے واقعات اور خاندانِ شروانی کے بعض احوال لکھواکر دار المصنفین مین رکھ لئے تھے، اب جب اُن کا سانحہ پیش آیا، تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی،

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر مین بتاریخ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہا، اور سلف صالحین سے جا ملے، مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگون تھے کہ نہین کہا جا سکتا کہ اس کو کہان سے شروع کیا جائے، اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، مین نے موصوف کو سب سے پہلے ۱۹۰۶ء مین نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حسن و جمال، سپید رنگ، سیاہ خوبصورت داڑھی، اور سر پر زلفین، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، جلسہ کے ہر اجلاس مین نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے آنکھین اٹھ جاتین انگلیان اشارہ کرتین، لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح مین نے دیکھا، اور بتایا گیا کہ یہ علی گڈھ

کے ایک رئیس عالم ہیں،

۱۹۱۰ء میں جب میں ندوہ آیا، تو مدرسہ اُن کے ذکر جمیل سے پُرشور تھا، انتظامی جلسے سال میں چند بار ہوتے، اور وہ اُن میں جب آتے تو جلسہ کی اہمیت بڑھ جاتی، ۱۹۱۲ء میں جب الندوہ نکلا، اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے، اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے تو تعارف بڑھا، اور جب وہ آتے، تو میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے ۱۹۱۰ء میں جب میری جماعت کی دستاربندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہو کر اپنے سر سے دستار اُتار کر میرے سر پر رکھی تو اُس جلسہ میں مولانا شروانی شریک تھے تاہم حضرت الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر اُن کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط مکاتیب شبلی میں درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولینا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی،

۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا، تو اُستاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی، کہ اُن کے پاس شبلی کے خطوط ہوں تو سید سلیمان کو دیئے جائیں ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ الاستاذ کے حسب ایما انگریزی مدارس کے نصاب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں جب حضرۃ الاستاذ بیمار ہوئے، اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا، سب سے پہلے میں نے اس شدتِ تعلق کی بنا پر جو اُن دونوں دوستوں میں تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ اُن کو بھیجا "افسوس کہ الفاروق کا مصنف اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے" ۱۸ نومبر کو مولانا نے وفات پائی، اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو اُن سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا، تو آج سے دو برس پہلے تک اُس وقت تک برابر قائم رہا جب تک اُن کی قوتِ حافظہ اور عام قوت جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ اُن سے ملا، میں نے دیکھا کہ اُن کا تیر سا قد خمیدہ کمان بن چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا پژمردہ

اور مرجھایا تھا، اوسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے،

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستون سے بزرگداشت کا تعلق رکھون اور ہمیشہ اُن کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھون، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور اُن کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، مین انھین مخدوم لکھتا وہ عزیز لکھتے، دار المصنفین کی تاسیس مین مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دار المصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا کیا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگون کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انھی کے تھے، مین نے جب انھین اس کی اطلاع دی، تو اُس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس مین تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا،

وہ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی و عربی تعلیم گھر پر حاصل کی، عربی کی اونچی کتابین حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے درس مین پڑھین، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول آگرہ مین پائی، اُن کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقوی کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے، اور ہر ایک سے حسبِ استعداد کسبِ فیض کیا، شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سندِ حدیث حاصل کی، قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے،

اُن کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگون سے خراجِ تحسین وصول کیا، وہ بابر پر ہے، جو رسالہ حسن حیدرآباد مین چھپا تھا، اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر اُن کا تبصرہ اُن کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۶ء مین شوق قدوائی کے اخبار آزاد مین چھپا تھا، اُن کے رسائل مین دو بہترین تاریخی رسائل ہین، یہ دونون ندوہ کے سالانہ جلسون مین پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام علمائے سلف ہے،

اور دوسرے کا نام نابینا علما، یہ دونون انیسوین صدی کی یادگار ہین، ۱۹۰۱ء مین لاہور سے جب مخزن نکلا، تو اس کی محفل مین بھی یہ شریک تھے، حضرت خسرو کے غزلیات پر اس مین اُن کا مضمون چھپا تھا، ۱۹۰۲ء مین الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوے، تو اخلاق پر اُن کے مضامین نکلے،

علی گڈھ کی مجلسون مین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات مین الصدیق لکھ کر پیش کی، حیدرآباد کی میلاد کی مجلسون کے وہ بانی تھے، اُن مین سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے، جو چھپے اور پھیلے، معارف مین اُن کے مضامین اور اُن کی غزلین اکثر زیب اوراق رہین،

شعر و شاعری کا ذوق اُن کو آغاز سے تھا، حسرت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونون مین مشق سخن کرتے تھے، اردو مین حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی مین مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے،

اُن کے اخلاقی فضائل مین وضعداری بڑی نمایان تھی، جس سے جتنا ملتے تھے، تمام عمر اسی طرح ملتے رہے، جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی مین ٹھہرتے تھے، اور تمام عمر مین کبھی اس وضع مین فرق نہین آیا، پھر اس قیام مین جن جن بزرگون اور دوستون سے ملنے کا دستور تھا، اسی طرح وہ جاکر ملتے، اور اتنی دیر بیٹھتے، لکھنؤ مین فرنگی محل اور وہان بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ مین ضرور حاضر ہوتے،

اُن کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا، یہ وہ مجلس تھی جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگون سے نسبت رکھتی تھی، یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونون ہی سے اُن کو قلبی تعلق تھا، اس لئے وہ ندوہ کے اُن اصلی ارکان مین تھے، جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۶ء مین ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے، اور یہین اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی، جس کے بعد اُن کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد مین قیام رہا، اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے افتتاح مین اُن کی مساعی مشکور رہین، حیدرآباد

کا حال وہان کے مقیم احباب سنائین گے،

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ مین بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ مین اور یاد آتا ہے کہ دوسری دفعہ لکھنؤ مین مرحوم کو قومی ادارون مین علی گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۱۵ء مین وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے، اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبد الحق صاحب کے نام نکلا، ان ادارون کے علاوہ دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگون سے بھی ارتباط رکھتے تھے، اور ان درسگاہون کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے،

عجیب اتفاق ہے کہ نادانستہ ۱۹۲۶ء مین سفر حج مین بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ موتمر اسلامی والا موقع تھا، یہان یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ مین مین نے ان کا تعارف شیخ ابراہیم خربوطی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرا دیا، یہ تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونون تھا، اس لئے بڑا سازگار آیا، اور اخیر اخیر وقت تک قائم رہا، حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے، مین نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ ان کو یاد رہا، اور نہ مین نے یاد دلایا،

ان کو نادر اور قلمی کتابون کا بڑا شوق تھا، اور اس شوق کی تاریخ خود انھون نے لکھ کر معارف مین چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور ان کی پسند سے کتابین خریدا کرتے، لکھنؤ مین عبد الحسین اور واجد حسین قلمی کتابون کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تو ان کے نوادر دیکھتے، اور چھانٹ کر لے جاتے، یون بھی کتابین ان کے پاس پہنچتی رہتی تھین، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ مین بھی بہت سی کتابین حاصل کین، مین جب ۱۹۲۰ء کے آخر مین یورپ سے واپس آیا، تو عزیزون اور بزرگون کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطون کی وصلیون کی

کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا،

پہلے تو اصل وطن علی گڈھ میں بھیکم پور میں تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اپنے نام سے حبیب گنج نام ایک گاؤن آباد کیا تھا، وہین زنانہ اور مردانہ مکانات مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی کتب خانہ اُن کی دلچسپی کا مرکز تھا،

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ میں ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ میں سیر کو نکل جاتے، اس وقت ان کے دوسرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے،

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک میں مقرر کیا، ہم نے عذر کرنا چاہا، تو جواب میں لکھا کہ کیا رمضان مسلمانون کے کام میں مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ میں وہ چائے کے بجائے اولٹین پیتے تھے، میں کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری میں یہ تینون شراب القانعین لائی جاتین، اور ہر ایک کا ایک ایک دور چلتا، اور بڑی خوشی سے پیتے، اور بعد کی ملاقاتون میں اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے،

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب فضل اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کی نگرانی اور انجینئرنگ میں بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجینئرنگ میں بنی، مرحوم دونون کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڈھ میں حبیب منزل بنوانے لگے، تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر اُن سے مشورہ کیا، انھون نے جو مشورہ دیا اس میں سے سامنے کی روکار، عمارت ہیز فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ بنتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی،

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتین عجیب تھین، ایک یہ کہ جس شخص سے جس جہت سے اُن کو تعلق ہوتا وہ

اس سے اوسی جہت سے ملتے، اور اسی کے متعلق باتین کرتے، اوسکی دوسری جہتون سے اُن کو کوئی تعلق نہ ہوتا، حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یکجہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے اذکار سے تھی، ان دونون کی ملاقاتون مین یہی تذکرے رہتے، کہین بیچ مین سیاست کا نام بھی نہین آتا، مولانا ابوالکلام سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے، سیاست کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دور گذرے ہین، جن مین سیاست بھی ہی، مگر کبھی کسی خط مین نہ مین نے اُس کے متعلق کچھ لکھا، اور نہ کبھی انھون نے پوچھا،

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی مجلس مین کبھی کسی کی بُرائی یا غیبت نہین ہوتی، کوئی کرتا بھی تو اوڑا دیتے، خطوط مین بھی یہی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا، تو اس طرح اشارہ و کنایہ مین کہتے کہ غیر اوس کے سمجھنے سے قاصر رہتے،

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگارون کا شوق تھا، بعض بادشاہون کے فرامین، تلوارین یا خنجر اُن کے پاس تھے، مین جب ۱۹۳۳ء مین کابل کے سفر سے واپس آیا، اوس کے بعد مرحوم دار المصنفین آئے تو قالینون کا تذکرہ نکلا، مین نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے، ان کو دکھایا تو اُس کو پسند کیا، مُلا صاحب سے جو اُن کے رفیق خاص تھے، اور ہمیشہ سفر مین ساتھ رہتے تھے، فرمایا مُلا جی یہ تو پٹھانون کا مال ہے، ساتھ باندھ لو، چنانچہ وہ قالین اُن کے نذر کردیا کہ شاہان بشاہان می زیبند، فقیرون کے یہان اس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ معصود کی نقیر کے پاس ہے،

مرحوم بزرگون کے قصے لطیفے، حالات اور حکایتین اس قدر ذوق و شوق و لطف سے مجلس مین بیان فرمایا کرتے تھے کہ اوس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، اُن کی تقریرون کا بھی یہی رنگ تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالون سے پرتاثیر ہوتی تھی، اُن کی انشا پردازی کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ، تکلف سے بری، تصنع سے خالی، اور آورد سے پاک بزرگون

کے تذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوتی تھی، لہجہ مین سختی اور آواز مین کرختگی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعون پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہین رکھتے تھے،

بظاہر وہ اخلاق مین بڑے نرم، مرنج و مرنجان تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے، تو پھر اُس سے نہ ٹلتے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علٰحدگی کا سبب یہی پیش آیا، اس پر ایک شعر انھون نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا،

شاہباز ہمتم، ربطے بدست شاہ داشت

دست دیگر ترک گ[illegible] و در ہوا پرواز کرد

یہ بھی اُن کی سیرت کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابن رئیس ہونے کے اور حکام ضلع سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ اُن کو شمس العلماء کا خطاب ملنے والا تھا، اُن کو خبر ہوئی تو بڑی کوشش کی کہ اس خطاب سے اُن کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولتِ اسلامیہ کی نشانی تھی،

مرحوم کو ملتِ اسلامیہ سے بڑی محبت تھی، اُس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکرون سے خوش ہوتے تھے، اور اس کے نفاق و اختلاف کی باتون سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، ندوہ کے باہمی اختلافات کے زمانہ مین باوجود اس کے کہ طرفین دوست تھے، دونون سے بیگانہ رہے، اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب کے آگے تھے،

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہین رکھتے تھے، تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا، مگر ضابط اور متحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہین آیا، اور ان کے قوی مین سب سے پہلے اُن کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر بات بھول جاتے، جب کاروانِ خیال نکلا تو اس مین مولانا ابوالکلام کے جواب مین اُن کا یہ بیان پڑھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ ہان مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفر عراق کو نکلے تھے

تفصیلات اب معلوم ہوئیں، میں نے انھیں لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۸ء میں) دو نوجوان عراق کے سفر کو نکلے تھے، جن میں سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابو الکلام کے بڑے بھائی) تھے، مگر دوسرے ابو الکلام نہیں بلکہ حافظ عبد الرحمن امرتسری تھے، اور اس وقت مولانا ابو الکلام امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق میں انتقال کیا، ہندوستان خبر آئی، تو مولانا ابو الکلام نے وکیل میں اپنے حزن وغم کا اظہار فرمایا، اخیر میں میں نے لکھا کہ آپ کی اس طرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی،

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی، اور کچھ جواب نہیں دیا، یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے، اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے اُن کے ادا شناس اُن کے مطلب کو سمجھ جاتے،

مرحوم کو بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں غالباً حاجی شاہ منور علی دربھنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ میں دستار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ میں ایک ایسا پر عظمت جوش علماء، مشائخ، صلحاء اور عامۂ مسلمین پر طاری ہوا کہ جو جس کے پاس تھا، وہ ندوہ کے نذر کر دیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اُتار کر پھینک دی، وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت کو فروخت ہوئی، وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی، اور اس کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا، نوجوان حبیب الرحمن خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے"

اُن کے اخیر دور کی یادگاروں میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری، اور خطیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف میں چھپے ہیں، اور الگ بھی شائع ہوئے انھوں نے

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اوسی زمانہ مین فقیر کی تصنیف عرب و ہند کے تعلقات چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اس پر ایک تبصرہ شائع ہوتا، تو مصنف کو فخر و مباہات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو مین نے اس طرح ادا کیا، المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم اور شعر العجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے، کیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتون مین سے راقم کو بھی اس سنت دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا جو معارف مین شائع ہوا،

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڈھ مین مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیامگاہ مین اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی، جب وہ علی گڈھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم مین اور ہمیشہ رہی، اس وقت دلچسپ اور علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبد اللطیف کی قیامگاہ پر اوسی وقت اور اسی حیثیت سے مجلس جاری رہی،

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے مین نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ مین ہوائین اور سمت کی چل رہی ہین، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا،

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سیرۃ عائشہ

اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالاتِ زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل و اخلاق اور ان کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنفِ نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیان اور معترضین کے جوابات، قیمت :- صر

منیجر

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنون مین اس مبارک و مسعود نام کو پہلی دفعہ دار العلوم ندوۃ العلمار کے ارگن اور مجلہ شہریہ الندوہ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا، مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقفیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوۃ کی ترتیب وادارت مین مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہین، راجپوتانہ کی دورافتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک مین قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لئے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی، اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش و ہم قدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ مین نکل جاتا تھا،

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دیکھا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ قرب و نزدیکی کا ایسا مقام زندگی مین میسر آئے گا، جسے اب بھی جب سوچتا ہون تو "ظلِ پدر" یا "پدری شفقت" کے سوا تشبیہ کے لئے کوئی دوسری چیز سمجھ مین نہین آتی، آہ! سہ

ع قفا نبك من ذکری حبیب ومنزل

مقادیر کی گردشون نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدرآباد پہنچایا، ٹھیک ان ہی دنون مین پہنچا یا جب مرحوم ہی کے محاورے مین ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی، نواب فضیلت جنگ مولنا انوار اللہ خان استاذ السلطان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی وجہ سے حکومتِ آصفیہ کی جدّ

قائم کردہ وزارت (معین المہامی) مذہبی کی جگہ خالی ہو گئی، ملک کے طول و عرض پر نظریں دوڑائی گئیں اور طے کیا گیا کہ اس عہدے کے شایانِ شان بہمہ صفت موصوف ہی کی ذات والا صفات ہے جو بھیکم پور ضلع علی گڈھ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے، اور سیدنا استاذ العلیا، مولانا لطف اللہ علی گڑھی سابق مفتی عدالت عالیہ حیدر آباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے، قلم بھی اُن کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی گل افشانیون، دُرباریون میں اپنی آپ نظیر تھی، پیکر شاہانہ۔ دل فقیرانہ،

الغرض حکومتِ آصفیہ کے وزیر مذہبی کے لئے جن خصوصیتون کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ

ع جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

ابا عن جدٍ پشتہا پشت سے جسکے یہان نوکر رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے تلغرافی پیام حیدر آباد سے اُن کے نام وصول ہوا، فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے لی جائے، اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہین جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے تار مین غالباً ناظم امور مذہبی کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا: ناظم کا حیدر آباد کی سرکاری زبان مین کیا ترجمہ ہے، کس قسم کی ذمہ داریان اُس کے سپرد ہوتی ہین، اور اختیارات جو ملتے ہین، ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے، سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے "نوکری" کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے قطعاً منافی ہین، ضرورت بھی بحمد اللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریون کو اپنے سر کیون لون؟ ہجوم خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ آتا تھا اور جاتا تھا، دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمین ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیون کی جائے، اچانک فرماتے تھے کہ اپنے خیال کی آنکھون کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے لوگ بلائے جا رہے ہین

میری باری بھی آئی ہے، پوچھا جاتا ہے کہ

"میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہے کہ اس موقع سے

تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لئے اعراض کیا"،

اسی کے بعد جو مقدر تھا وہ فیصلہ بن کر سینے میں جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا گیا، اور حسب وعدہ حیدرآباد پہنچ گئے، لفظ ناظم کی وجہ سے شروع میں مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی، مگر بارگاہ خسروی سے جب تصریح ہوگئی، کہ "صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی" اس منصب کا سرکاری نام ہوگا جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، چھٹ کر صاف ہوگیا" ناظم امور مذہبی کا عہدہ اُن کے تحت کر دیا گیا، جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختر یار جنگ مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم اُن کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہوگئے،

نواب معین الملک سر علی امام مرحوم نے جب "باب حکومت" کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو باب حکومت کے صدر کا نام صدر اعظم اور اراکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے بعد کیا ہوئی، اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم بھی ہوگیا،[ل]

ل قیام باب حکومت کے بعد زیادہ منتظم شکل میں اور اس سے پہلے بھی حکومت آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائرکٹر) اور ناظم کے اوپر معتمد (سکریٹری) ہوتا تھا جو کسی معتمدی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک باب حکومت قائم نہ ہوا تھا، وزیر اعظم کا نام مدار المہام اور اس کے رفقائے کار وزرار کو معین المہام کہتے تھے، باب حکومت جب قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدر المہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی میں صدر الصدور کی حیثیت کیا ہوگی، سر علی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا، کہ صدر الصدور کی حیثیت شیخ الاسلام کی رہے گی جس کا رتبہ صدر اعظم اور وزراء کابینہ سے بھی بلند تر ہے، اسی لئے شروانی صاحب کو باب حکومت کا رکن نہیں بنایا گیا، اور محکمہ مذہبی کی نمایندگی کے لئے باب حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغوں کے ساتھ

خیر میں کن باتوں میں مشغول ہو گیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدرآباد جب پہنچایا، تو اس وقت حیدرآباد کی دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والاصفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنوں میں چونکہ شروع نہیں ہوئی تھی، اس لئے سن و سال وضع و قطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حقیقت نہ تھی، تھوڑی دیر کے لئے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا لیکن در اصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے، جب دوسری دفعہ در دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا، ایک انگریزی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی، اسی میں مقیم تھے، وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے میں تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی، باہر برآمدے میں کرسیوں پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں اونچے نیچے سرکاری غیر سرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے، ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھمیلے میں بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس میں صورت کی شناخت بھی دوسروں کے لئے دشوار ہوتی ہے، مگر سنئے ان کی نظر چلمن کی تیلیوں سے برآمدے پر جو بیٹھے ہوئے تھے، ان پر پڑتی ہے، اور ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں اندر سے آتی ہے:۔

"مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہیں ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجئے"

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام لے کر اس حیرت کا ازالہ فرما دیا گیا، اور آپ کا خاص خادم محبوب مرحوم باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں، حاضر ہو گیا، پاس

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷) اس صیغہ کی نمایندگی بھی ضم کر دی گئی، ابتدا میں اس عجیب و غریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا، لیکن شروانی صاحب کی حیدرآباد سے واپسی سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی جس کی تفصیل اب غیر ضروری ہے، "تلک امة قد خلت لها ما کسبت و لکم ما کسبتم یغفر اللہ لنا ولھم اجمعین"، ۱۲،

بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت و عطوفت کے ساتھ فرمانے لگے، کہ

"آپ کے لئے اجازت وغیرہ کے تکلفون کی ضرورت نہین، جب آنا ہو، بے تکلف چلمن اٹھا کر اندر چلے آیا کیجئے"،

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ مین حضرۃ الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی مین خاکسار اورنگ آباد اور خلد آباد کی سیر کے لئے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورنگ آباد کے کسی بڑے جاگیردار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لئے اورنگ آباد ہی مین قیام فرما تھے، خلد آباد بھی سیر کے لئے گئے ہوئے تھے، خلد آباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع مین استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مین وطن (اعظم گڈھ) جا رہا ہون خاکسار کا نام لیکر فرمایا کہ انکو بطور امانت آپکے سپرد کرتا ہون، مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپکی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہیگی، حضرۃ الاستاذ وہین سے اعظم گڈھ کے ارادے سے روانہ ہوگئے اور رفاقت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اُتر کر اورنگ آباد سب واپس ہوئے، اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دارالامارہ مین مقیم تھا، حکم دیا گیا، کہ شہر مین گھوم گھوم کر قلمی کتابون کا پتہ چلاؤن، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا، نواب صاحب کے منشا کو پاکر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہر ایک نے دی، اس سفر مین بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت مین حیدرآباد واپسی ہوئی، اورنگ آباد ہی مین فقیر بھی اُن سے مانوس ہو گیا، اور اُن کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارشون کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنون تک برستا ہی رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا، فرحمہ اللہ و نور ضریحہ،

کم و بیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت اُن کے زیر سایہ حیدرآباد کی زندگی گذری، اس عرصہ مین سرکاری غیر سرکاری شعبون مین اُن کے کارنامون کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہان سرسری طور پر بعض نمایان خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہین تذکرہ کرنا چاہتا ہون،

جس وقت نواب صاحب علیہ الرحمۃ والغفران حیدرآباد تشریف لائے تھے، میلادی مجلسون کا حیدرآباد مین جو رواج تھا، ان مین عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیان بنائے ہوئے تھے، میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیون مین سے کسی ٹولی کو دعوت دیدیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والون کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہونچ جاتی، اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے، ایک خاص لہجہ مین پڑھتے رہتے، تا آنکہ صبح ہو جاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانو کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع مین حیدرآباد کے مسلمانون کے گھرون سے میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانون تک پہونچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ کہین بھجن گایا جا رہا ہے، کچھ ایسے لب ولہجہ مین لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے، کہ الفاظ سمجھ مین نہین آتے تھے کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانون کی ان ٹولیون کے متعلق طرح طرح کی باتین منسوب کرتے ہین، واللہ اعلم بالصواب لیکن سنی سنائی باتون سے قطع نظر کر لینے کے بعد وہان کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسون کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور پر دلون مین تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا، لیکن اصلاحی اقدامات مین عملی شرکت کے لئے کوئی آمادہ نہین ہوتا تھا، نواب صاحب نے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے ہر اس شخص کے گھر پہنچ پر راضی ہو گئے جو ان سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو، سیرت طیبہ کے متعلق ان کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان وخطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین وسنجیدہ معلومات ان کے نکھرے ہوئے تحقیقی ہوتے تھے جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے "سیرت طیبہ" کے مختلف پہلوؤن پر مسلسل پر مغز، موثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگون کا مذاق بدلنے لگا، اور بجائے انفرادی مجلسون کے اجتماعی مجلسون کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ ہے کہ بھلا

نہین جاسکتے،

جلسہ مین شریک ہونے والون کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہونچ جاتی تھی، مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسون کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کرون، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ مین پہلا نمونہ قائم کیا، پھر تو حیدرآباد کے مشہور محلون اور بستیون مین شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی بستی ایسی باقی رہ گئی، جس مین سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم وانتظام فرش نہ فردش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو، نواب صاحب اس عرصہ مین بیان کرنے سے کبھی تھکے

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُن کی تقریرون کے سننے والون مین مجھے اُکتا جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہین ہوئی، وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ اُن کی تقریرین موضوع جعلی حدیثون چھوٹے تراشیدہ افسانون، بلکہ شعر و نغمہ کی دلچسپیون سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھین، بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، روان ہوتا تھا، مگر قرآنی آیتون سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثون اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی مین اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہو جاتی تھی، کہ مشکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسرون کی تقریر یا وعظ سننے کے لئے آمادہ ہوتی تھی، رئیس آدمی تھے، راحت وآرام کی زندگی کے قدرتاً عادی تھے، لیکن میلادی مجلسون کے لئے نہ وقت کا سوال اُن کے لئے باقی رہتا تھا، اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بارہ بجے تک کبھی ایسی ہوتی لیکن مین نے کبھی ان کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہین پائی،[۵]

---

[۵] خاکسار بھی ان میلادی مجالس مین اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریباً لیا کرتا تھا، ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا، اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنون سے تو خون جاری نہین ہوا، اور آپکے دانت نہین توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے شرم سے گردن جھک گئی،

غلط عقائد بے بنیاد اوہام، جاہلی رسوم و رواج، ہر ایک چیز کی اصلاح بھی اُن کی عالمانہ تقریروں سے ہوتی چلی جاتی تھی، لیکن مجھے یاد نہیں ہو کہ کسی کو کسی زمانہ مین اُن کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ و فساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، سچ ہوتا تھا لیکن تلخی اُن کے بیان سے کبھی پیدا نہیں ہوئی، فہمایش کا طریقہ قطعاً غیر معمولی تھا جس کی نظیر اپنے تجربہ مین تو نہیں ملی، دیوبندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت و وہابیت وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ مین حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے، اور اپنے فیصلون پر اُن کو کافی اصرار تھا، تقریرون مین وہ اپنے فیصلون کے حدود سے سرمو متجاوز نہ ہوتے تھے، مگر یہ طرز بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والون مین بھی انکی باتون سے کسی قسم کی گرانی پیدا ہوتی تھی، اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانون کے ان مختلف جتھون کے افراد کے قلوب مین غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ اُن کے متعلق پایا جاتا تھا، اس راہ مین تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائرون مین بھی اُن کی ہر دلعزیزی کا کافی وزن تھا، "امورِ مذہبی" کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے احاطے مین مسلمانون کے مساجد و مقابر اور دوسرے مآثر کے ساتھ ہندوؤن، عیسائیون، پارسیون کے مذہبی و دینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے، اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمایندے اُن کی خدمت مین حاضر ہوتے، اپنے درد و دکھ کے قصے سُناتے، ہر ایک کی بات سنتے، اور حُسنِ سلوک کا ایسا نمونہ پیش فرماتے، کہ ہر ایک آپ کا مداح ہو کر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال مین مین نے تو کسی دین و ملت کے پیرو کو آپ سے شاکی نہ پایا، حالانکہ اپنی اسلامی و دینی زندگی مین اُن کا اصرار تصلب کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا، مگر اُن کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے اپنے حدود مین اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ غلط مبحث کی صورت ہی کبھی پیش نہ آتی تھی، شروانی صاحب اس باب مین غیر معمولی کردار کے حامل تھے، اُن کی زندگی کا یہ پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ سرہ

اور اُن کے خلفا روجانشینون کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحبدل درویشون مین ایک بڑے درویش وہ بھی ہین، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی و مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگون سے اُن کی راہ ورسم لوگون کے لئے باعث حیرت کبھی بن جاتی ہے مگر ان مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات کے نباہنے اور حسن وخوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ہر ایک مین فضل وکمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ اس کا اعتراف اُن کی عجیب وغریب خصوصیت تھی، ایک ہی مجلس مین اُن سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم دیوبند کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اُسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خان بریلوی مین جو علمی اور عملی خوبیان ان کے علم مین پائی جاتی تھین، اُن کا بھی ذکر فرماتے، ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے، اور اس آتشین مجلس کی پھبتی اڑانے والے مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو سے بھی اُن کی دوستی تھی،

حیدرآباد جس زمانہ مین فقیر پہونچایا گیا تھا عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہین ہوئی تھی چرچا البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سُنا ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آرہی تھی، کہتے ہین کہ جامعہ کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، اسکو دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی مین اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتون سے کوئی مدد نہین ملے گی بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائین گے، اور الحاد وبے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے عوام مین پھیل جائین گے، حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق مین بن گئی تھی، نیچے سے اوپر تک کسی مین نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، اُن کی وفات کے بعد جب شروانی صاحب اُن کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہون وہ صدر الصدور کے توسط اور معائنہ

کے مد پیش ہون،

شروانی صاحب نے اس سلسلہ مین بلیغ کوشش کی، اور مولانا انوار اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا اثر سرکار والا تبار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ مین کامیاب ہوئے، یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا، اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمانِ مبارک کی رو سے مقرر ہوئے،

ابتدا مین تو ان لوگون کو جو "جدید یونیورسٹی" کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیۃً مشرق مین مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہین، اس کھیل کی صرف اجازت ہی نہ دین گے، بلکہ ایکٹ مین حصہ بھی لین گے، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ،

چارٹر تو منظور ہو گیا، چارٹر ہی مین شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرا لیا کہ مغربی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشو و نما کا کام بھی اس "جامعہ" سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہین عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کرکے رکھ دیا جائے گا،

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ واری نصاب جب بننے لگا تو لوگون کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب شروانی صاحب نے علاوہ شعبۂ دینیات کے (جو مرحوم دار العلوم کالج) کا جانشین، اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی اُن کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب العلم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون "دینیات" کا بھی لزوماً لینا پڑے گا، ان کو مغالطہ دیا جاتا تھا کہ "مضمون" کی حیثیت سے نصاب مین دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا، مطالعہ کے لئے کچھ کتابون کی سفارش بھی کر دی جائے گی، لیکن یونیورسٹی کے کلاسون مین اس کی تعلیم نہین دی جا سکتی، خدا خدا کرکے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون مین طلبہ کا امتحان نہ ہوگا، مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے، کہ تعلیم بھی ہوگی اور امتحان بھی ہوگا، وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا، لیکن ظاہر ہے کہ ایک "جبری عنصر" جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب مین باہر سے بزور داخل کرا دیا

گیا تھا، اسی لئے دباؤ کے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا جو نہیں جانتے ہیں وہ اس کو حکومت کے سکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا جس کا ظہور اب ہوا ہے،

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے تصور میں جو پیش آیا، وہ شعبۂ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے پڑھانے والوں کی جو قیمت ہے، اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی انکی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کر کے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے،

اس کا ل ایک جگ یا قرن میں اور کیا کیا قصے پیش آئے، انھیں کہاں تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر نہایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے، جو ہر موقع پر ان کے قدم کا رخ بدل دینا چاہتی تھی،

بعض دفعہ دلچسپ لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے، ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے التزامون کے ضروری ہے کہ نشست دو جنسی ہو یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشستگاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کر دیتے، مگر شریک ہو جانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابوحنیفہ "ابتلیت بہ فصبرت" انھوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے، کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر ان کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں؟ "نہیں" کا جواب سن کر میم صاحبہ نے پر لطف فقرہ یہ فرمایا کہ

"اپنی بیویوں کو آپ لوگ کیا اپنی ذات کے لئے مختص سمجھتے ہیں"

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے مگر عجیب ہوتا ہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے اور مسکراتے کہ میم صاحبہ نے عجیب بات پوچھی،

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصًا اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لئے بھی بھیج دیئے جاتے تھے ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالم امت کی مداحی میں ایک مقالہ ایک خاص نقطۂ نظر کے پروفیسر صاحب کی نگرانی میں کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی، اور مذہبی نہیں بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے اُن کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دل چسپ تھے،

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقوں کے متعلق اس قسم کی خبریں مجھ تک بسا اوقات پہنچائی جاتی ہیں کہ "نیرو مائنڈ" کا عیب اس شخص میں پایا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند میں تو اسی کو سمجھتا ہوں مگر ایک پہلو ان کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہیں بیسیوں مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویوں کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے، لیکن اُن کے اصرار سے قطعًا متاثر نہ ہوتے، اور اپنے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی، اسی پر عمل کرتے، جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبۂ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا، قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ میں بھی انگریزی ادب کی تعلیم طلبہ کے لئے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ میں معیار اُن کے نصاب کا پست تھا، نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے میں شعبۂ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا، لیکن انگریزی زبان سے جیسی کہ چاہئے مناسبت بھی پیدا نہیں ہوتی تھی، نیز سرکاری دفاتر میں بھی یہ کہتے ہوئے کہ انگریزی آپ لوگوں کو نہیں آتی اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے، خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی، کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی فنون و سائنس کے مساوی کر دیجائے، بلکہ انگریزی اور کی تعلیم و امتحان تینوں شعبوں کی چاہئے کہ مشترک ہو، قدیم طرز کے علمار جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف میں غالب تھی، اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی کے دو نالاں تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کر سکتی تھی، ظاہر ہے، مگر نواب صاحب مرحوم نے اول سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبوں کے مساوی کر دی جائے، بالآخر اسی کو طے کرا کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے،

قدامت و جدت کا امتزاج اُن کے اندر کچھ عجیب غریب طریقہ سے ہوا تھا، ایک طرف کوٹھی کے پائین باغ مین ورد و ظائف و تلاوت مین بھی مشغول پائے جاتے، اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے کی میز پر بالالتزام کسی انگریزی روزنامہ کے مطالعہ مین مشغولیت بھی اُن کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ نہین تھے لیکن کریم النفس، فیاض، امیر اور باذل ہونے مین بھی شک نہ تھا، حیدرآباد مین اُن کو دو ہزار ماہوار کے ساتھ الاؤنس کی بھی کافی رقم ملتی تھی لیکن جہان تک فقیر جانتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی تکمیل کے لئے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، اُن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی ضرورت مند اُن کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتون کا سلسلہ موسم سرما مین مہینون جاری رہتا، ہر شب مین ایک ایک ٹولی ہم مذاقون کی مدعو ہوتی، آج بھی اُن کی شب دیگی دعوتون کا ذکر کام و دہن مین یارون کے ہلچل پیدا کر دیتا ہے،

مین اس سلسلہ مین دوسرون کا ذکر کیا کرون ملازمت کے ابتدائی سالون مین مجھ پر ایک سخت مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی مین تھا، مین تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ نے شروانی صاحب کو صرف میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی، اس سے مطلع کیا، جواب مین صرف استمزاج کا خط ہی نہین آیا، بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی گئی خط مین میرے بھائی کو انھون نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج مین مصارف کا خیال نہ کرنا، جتنے روپیے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمداللہ نہ ہوئی لیکن اُن کے مشفقانہ برتاؤ کی یاد دل مین جب کبھی آجاتی ہے چشم پرآب ہو جاتا ہون، اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے بزرگون کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہان پائین گے،

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے اُن کی صحبت و رفاقت مین خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ مین رچ گئے، انھون نے انسانی زندگی

کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگاموں سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے، یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والوں کی بے قدریوں کا عام دکھڑا اُن کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ میں دستور ہے رو رہا تھا، سنتے رہے، پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپکے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے، آپکے امام ابو حنیفہ جیل میں کب گئے تھے، اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلاوطنی کی سزا کیا ان ہی دنوں میں بھگتنی نہیں پڑی تھی، جب دنیا پر مسلمانوں ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا، سمجھاتے کہ آپ کے بزرگوں نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہیں رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہولے، مولویوں کے لئے بڑے بڑے عہدوں اور مناصب کے دروازے کھل جائیں، تب کام کریں گے، اس دن کچھ ایسے انداز میں تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں میں نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا، مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین و علم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا، اس کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا،

حیدرآباد کی مسجد چوک میں حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، شروانی صاحب نے اس جلسہ میں تقریر کی، واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجددؒ کے خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا، مجدد سے پہلے مغلوں کے تخت پر اکبر و جہانگیر، اور مجددؒ کے بعد شاہ جہان و عالمگیرؒ ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر میں کیا بتاؤں کہ اس سلسلہ میں انھوں نے معلومات کے کن خزینوں کو وقف عام فرمایا، بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطۂ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا، تو اس مقالے کے لکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا،

ان کی خانگی مجلس بھی علم و ادب کی مجلسیں تھیں، معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ اُن کے سینے میں محفوظ تھا، مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا، گو یا میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو اُن سے مجھے نہیں ملا لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہیں، مجھے اس پر فخر ہے

اُن سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے، تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے،

وہ بڑے صاف ستھرے اعلیٰ زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی مین مشکل ہی سے حیدرآباد مین کوئی دوسرا آدمی اُن کا مقابل بن سکتا تھا، ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی، کوٹھی بھی ان کی سول لائن سوا جی گوڑہ کی کوٹھیون مین ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبون مین ان کا یہی حال تھا، بعضون مین اُن کے اس طرز عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی، مگر یہ جو کچھ تھا، صرف ظاہر مین تھا، باطن مین اُن کے کچھ نہ تھا، خیال آتا ہے کہ سفر حج کا عزم جب فرمالیا گیا، تو فقیر کو علی گڈھ طلب کیا گیا، پہونچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگون سے بھی ملنا چاہتا ہون، اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر مین تو تم میرے ساتھ رہو، بسر و چشم قبول کیا گیا، منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہونچے، یہان حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا، جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان مین تھا جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہین، اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا اشارہ بھی فرمایا، بے تکلف مین نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شیروانی کے ساتھ بیٹھ گئے، پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب و غریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظے کے نہان خانہ مین گونج رہے ہین، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا، اُن کے ساتھ ہم لوگون کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے:-

"بارالٰہا! یہ حبیب الرحمن خان شیروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

"بارالٰہا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اُکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے،

"بارالٰہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلین تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال، الٰہی

گور کے خلوت خانہ میں حبیب الرحمن خان کو لوگ رکھ کر واپس آجائیں اور غریب وہاں تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال وجواب میں یہ بیچارہ ثابت قدم رہے۔"

بارالہا! جب حشر کا میدان قائم ہو، اور بڑے چھوٹے پتنگوں کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے ہوں، تو اس بیچارے حبیب الرحمن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہوں کو بخش دے، بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لیجائیں۔"

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے، یہ دعویٰ تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہ اُن کے الفاظ تھے، لیکن بہت سے الفاظ اُن کی زبان سے نکلے ہوئے اس میں محفوظ ہیں، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہیں، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، سارا مجمع مجسم گریہ وبکا بنا ہوا تھا، آخر میں فرمایا کہ

اے اللہ اس غریب پر اس کے حج وزیارت کے سفر کو آسان فرما۔"

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن ضرورتوں کی تصویر مراقبت بین کے سامنے تھی، وہ ہم سب کے سامنے بھی آجائے گی، اُن پر اُن کا ناگزیر وقت آگیا، اب وہ تنہا اس عالم میں ہیں جہاں نہ اُن کے اعزہ ہیں، نہ اقربا، نہ احباب ہیں، اور نہ دوست، نئی دنیا ہے، نئے رفقا ہوں گے، نئے حالات ہوں گے، آدمی خواب میں بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا، اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے، کون کہہ سکتا ہے، اپنے حقیقی مرقد (خوابگاہ) میں کچھ یہی صورت اُن لوگوں کے سامنے پیش آتی ہے، جو اس دنیا والوں سے تو الگ ہو جاتے ہیں، لیکن نئی دنیا میں نئی ولادت اُن کی ہوتی ہے۔

اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ، کن اللّٰھم انیسہ واجعل لہ من الملائکۃ والانبیاء والاولیاء رفیقا،

قلم ہاتھ میں آگیا ہے قصداً اس کو اگر نہیں روکتا ہوں تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرؤ القیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر ؎

قفانبک من ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لئے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس شاعر سے کہلوایا گیا تھا، آخر میں اُن ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہوں،

"مجلس مذاکراتِ علمیہ" ان ہی کی سرپرستی میں ایک علمی مجلس قائم تھی جس میں شہر کے ممتاز اہل علم و ادب جن کا علوم کے مختلف شعبوں سے تعلق تھا، اس مجلس کے ارکان تھے، اسی مجلس میں اپنی زبان مبارک سے اردو کی یہ غزل سُنائی تھی، اس کا کیف واثر دل پر اس وقت تک باقی ہے، "تیری" کی خطابی ضمیر کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انھوں نے لکھی تھی، دل اس خطاب کے رُخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی طرف کرکے بسا اوقات گنگناتا ہے، فرمایا تھا،

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس میں بو تیری — خوشا وہ دشت کہ ہو جس میں جستجو تیری

رہین صحن گلستان نہیں دل افزائی — شمیم لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

"کو بکو" سے ذہن اُس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہاں آج کل یہ فقیر کچھ دنوں سے مقیم ہے، انھوں نے بہار کے اس دور افتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا تھا، اسی کا خیال آجاتا ہے، اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے،

ہنوز دشتِ ختن نافہ زار عالم ہے

کبھی کھلی تھی ادھر زلف مشکبو تیری

آخر کے دو شعر یہ تھے :-

فرشتۂ اجل آئے پری کے قالب مین

بوقت مرگ جو صورت[1] ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہو گی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا،

خیال لطف سے حسرت ہے باغ رضوان مین

سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

اب اُن کا "شنیدہ" انشاء اللہ الملک الکریم الجواد "دیدہ" بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ وطاب ثراہ،

[1] بخاری شریف کی روایت ہے کہ مرنے والون سے پہلی بات پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی ھذہ الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو،) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، حسرت کا سارا ساز و سامان اسی بشارت مین پوشیدہ ہے،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

نفثۃ المصدور

از جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

حکم ہوا ہے کہ جو تعلقات میرے اور مولانا شروانی مرحوم کے درمیان تھے، ان کی بنیاد پر مین معارف کے صدر یار جنگ نمبر کے لیے ان کی علمی زندگی کے کسی پہلو پر کچھ لکھ کر دون، اس کی تعمیل ناگزیر ہے، اوّل تو جو خلوص مجکو خود ان کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر، دوسرے وہ نظر شفقت و کرم جو ان کی میرے حال پر تھی دونون ہی اس کی متقاضی ہین، تیسری چیز یہ بھی ہے کہ کرم فرماؤن کی بات رد نہین کی جاسکتی، چنانچہ جو کچھ ہوسکتا ہے مختصرًا حاضر کرتا ہون، مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے جذبات کا تاثر میری تحریر مین بہت نمایان ہوگا، اور بجائے مخصوص پہلو کے میری تحریر مین عموم نظر آئے گا، امید ہے کہ یہ دونون بے اعتدالیان بنظر درگذر دیکھی جاینگی، کیونکہ مین اپنی افتاد طبیعت سے مجبور ہون، اور اسی وجہ سے عنوان تحریر وہ ہے جو اوپر نظر آرہا ہے،

آغاز واقفیت جن دنون مین استاذ العلما، رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین پڑھتا تھا، مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی حضرت کے آستانے پر حاضر ہوتے رہا کرتے تھے، اول اول میرا سبق حضرت کی خدمت مین ظہر کی نماز کے بعد مقرر ہوا تھا، لیکن چندہی روز بعد مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم کے دو سبقون مین سے ایک مین مجھے شرکت کا حکم ملکر صبح کے وقت بھی میری حاضری لازمی قرار پاگئی، شروانی صاحب استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین کبھی کبھی ایسے وقت آتے کہ میرا سبق ہو رہا ہوتا یا فورًا ہوچکا ہوتا، الغرض مجکو ان کے متعلق اس طور پر معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ایک رئیس ہین اور میرے استاد کے عقیدتمند شاگرد، وہ مجھکو اس سے زیادہ نہ

جانتے ہون گے کہ کوئی طالب علم ہے، جو استفادہ کر رہا ہے، اور استاد ایسے شفیق ہین کہ معذوری کی حالت مین بھی اس کو پڑھا رہے ہین، اس دور ان مین کبھی ایسا بھی ہوا کہ حضرت نے میرے قلم سے کوئی خط مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب کو لکھوایا، کیونکہ جیسا کہ مین کلام لطف کے مقدمہ مین لکھ چکا ہون، یہ سعادت مجھکو حاصل تھی کہ حضرت اپنے خطوط اکثر میرے ہی قلم سے لکھوایا کرتے، اس دور کے خاتمے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، کہ استاذ العلماء رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد جب شروانی صاحب پہلی بار استاذ کے آستانے پر حاضر ہوئے تو مین نے خود دیکھا کہ جس مکان مین حضرتؒ کا قیام تھا، اس کی ڈیوڑھی مین کھڑے ہو کر بیساختہ رونے لگے، اور اس قدر بے قابو ہو گئے کہ رونے مین آواز بلند ہو گئی، اس دور کے بعد کوئی خاص تعلق ملاقات یا خط وکتابت کا نواب صاحب مرحوم کے اور میرے درمیان نہ تھا، تا آنکہ میرا تعلق لائبریری اور یونیورسٹی سے پیدا ہوا، اور کسی علمی ضرورت سے کبھی مین نے کوئی خط لکھا یا کسی بات پر توجہ دلائی تو اس کے جواب سے مجھکو مشرف کیا، عرصہ کے بعد ایک بسیط مقالہ استاذ العلماء کے سوانح حیات کا معارف مین شائع فرمایا جو بعد مین بصورت رسالہ علیحدہ بھی نکلا ہے، اس مین میرا ذکر اس خصوصیت کے ساتھ آیا کہ حضرت نے علمی شغف کی وجہ سے معذوری کی حالت مین مجھکو تعلیم دی، اور اس سلسلے مین ایک مخصوص جملہ میرے متعلق فرمایا، جسکو مین اسی رسالے سے کلام لطف کے مقدمہ مین نقل کر چکا ہون، اور اپنی سعادت کے لیے پھر دہراتا ہون،

"میان مولوی بدر الدین جب پڑھنے آجاتے ہین تو مین اپنی تکلیفین بھول جاتا ہون اور جبتک ان کو پڑھاتا رہتا ہون ہائے ہائے سے نجات مل جاتی ہے"

میری پہلی ملاقات شروانی صاحب سے علی گڈھ مین ان کے جائے قیام پر اس وقت ہوئی جب مین شرح المختار پر کام کر رہا تھا، جس وقت مین پہنچا، سر راس مسعود مرحوم تشریف رکھتے تھے، ان کو رخصت کر کے میرا کام دیکھا اور بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، میری یہ ملاقات بے غرض تھی، اس لیے خلوص کا اثر ظاہر ہوا، گو کہ میرا سلسلۂ آمد ورفت قائم نہین ہوا، تاہم جب اور جہان ملاقات ہوتی، بہت شفقت

فرماتے، اسی زمانہ مین اوریئنٹل کانفرنس کا جلسہ لاہور مین تھا، نواب صاحب بحیثیت صدر شعبۂ اردو تشریف لے گئے تھے، اور مین انٹرمیڈیٹ کالج کے نمایندے کے طور پر شریک ہوا تھا، کانفرنس کے عصرانہ مین بھی ملاقات ہوئی، دیر تک متوجہ ہوکر مجھسے باتین کرتے رہے، اور مغرب کا وقت ہوجانے پر مجھے آگے بڑھاکر نماز پڑھ

تعلقات مین استحکام | غرض خلوص اپنا اثر دکھاتا رہا، مین جب شہر کی سکونت چھوڑکر یونیورسٹی کے احاطے مین قیام پذیر ہوا، تو اس کی اطلاع پانے پر مجھکو تحریر فرمایا "یونیورسٹی مین قیام مبارک ہو" اس احاطے مین مقیم ہوکر مین نے اپنے مذاق کی صرف ایک ہی جگہ پائی جو مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی قیام گاہ تھی، مولوی صاحب میرے والد مرحوم کے استاد بھائی تھے، یونیورسٹی سے میرا تعلق ہوجانے کے بعد اکثر میری آمد ورفت ان کے یہان ہونے لگی تھی، اب پڑوس مین آکر روزانہ عصر و مغرب کے درمیان مین نے وہان حاضری کا معمول مقرر کرلیا، یہ سلسلہ بھی بے غرض او رخلوص سے تھا، پختہ ہوتا چلاگیا، مولوی صاحب میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے جیسا ایک بزرگ خورد کے ساتھ کرتا ہے، آمدم برسرِ مطلب۔ نواب صدریار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن بھی علی گڈھ مین قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہان تشریف لاتے، علمی و دینی مسائل، بزرگون کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوعِ سخن رہتے، مولوی سلیمان اشرف صاحب نے نشست کی یہ ترتیب قائم کی تھی کہ ایک جانب خود، بیچ مین نواب صاحب اور دوسرے پہلو پر مین، بعد مین یہی ترتیب مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہان اور حبیب منزل مین بھی قائم رہی کہ وسط مین نواب صاحب ایک پہلو پر مفتی صاحب اور دوسرے پہلو پر مین،

استاد سے عشق | نواب صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف کا آغاز مین اس عنوان سے کر رہا ہون جو مجھکو بھی بہت محبوب ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو جس مین استاد کا ذکر نہ ہو، استاذ العلماء کی شاگردی پر ناز تھا، درس کے واقعات، تلامذہ کے تذکرے استاد کے علمی کمالات بہت لطف سے بیان فرماتے، میرے متعلق حضرت کا فرمایا ہوا جملہ جو اوپر نقل ہوچکا، حرف بحرف یاد تھا، مجھکو دیکھکر حاضرین مجلس کے سامنے

اکثر اس جملہ کا اعادہ فرماتے، سنتا تھا کہ میری غیبت مین بھی استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر مین یہ جملہ زبان پہ لاتے۔ حبیب گنج اور علی گڈھ کے درمیان ایک ایسی جگہ پڑتی ہے جہان سے پلکھنہ کو راہ جاتی ہے، پلکھنہ استاذ العلماء کا مولد اور آبائی وطن تھا جب ادھر سے گذر ہوتا فرماتے تھے کہ استادسے تعلق پلکھنہ کی طرف جاذب توجہ ہوجاتا، وہان تقریبات مین شریک ہونا اور علماء کے مجمعون کا سمان نگاہ کے سامنے آجاتا، ادھر آخر مین کئی بار اس مقام پہ پہنچکر ایک ایک دو دو شعر بھی برجستہ موزون ہوجاتے تھے، جو کبھی حبیب گنج سے بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیجدیتے کبھی بروقت ملاقات زبانی سناتے یا کسی پرچہ پہ لکھ کر مجھے دیتے، اس وقت میرے پاس چار تحریرین موجود ہین، جنکو مین یہان نقل کرنا موزون سمجھتا ہون،

(۱) ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ اثنائے سفر علی گڈھ محاذی پلکھنہ

پلکھنہ وہ ہے نور شمس معارف — کیا جس نے پر نور عالم سراسر

پلکھنہ دیا فیض دنیا کو جس نے — لکھا نام اس کا ہے اوج فلک پر

"دنیا" پر نشان لگا کر نیچے یہ عبارت تحریر ہے،" مبالغہ نہین، ایک بار جناب مولانا مرحوم کے یہان تقریب شادی مین علماء کا مجمع حسب معمول تھا، ذکر چلا سرحدی درسگاہوں کا، ایک عالم سرحد نے کہا کہ ایک بار ایک اہل علم کے جلسے مین صوبہ سرحد کے ان مدارس کو شمار کیا جو مولانا کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے جاری تھے، تو تین سو شمار مین آئے، اگر فی مدرسہ پچاس طالب علم اقلاً رکھے جائین تو پندرہ ہزار ہوئے، اب مبالغہ کی گنجائش کہان ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ فیض کب سے جاری تھا اب بھی بفضلہ تعالیٰ جاری ہوگا،

(۲) بذریعہ پوسٹ کارڈ" ابھی علی گڈھ سے آکر اترا ہون، فیض پلکھنہ فی البداہتہ

پلکھنے کا ہو وصف، کب ہے یہ امکان — یہان گرم تھی بزم ارباب عرفان

وہ ارباب عرفان جو تھے جان عالم — وہ محبوب عالم وہ جانان عالم

۲ر نومبر ۱۹۴۷ء

(۳) پاکھنہ وہ معمور لطفِ لدنی منور ہے عالم تجلی سے جس کی

(۴) پاکھنے میں برسے ہیں انوار حکمت درخشان وہان پر ہے نور تجلی

مرشد سے عقیدت | مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت تھی پورے خاندان کے اندر یہ سعادت صرف نواب صاحب مرحوم کو اور ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمٰن خان صاحب کو حاصل ہوئی، ورنہ خاندان کے تمام زن و مرد شاہ جہانپور کے شاہ عبد الغفور صاحب سے بیعت تھے، بہت عقیدت سے فرماتے کہ خاندان میں کبھی کسی کا نام رحمان پر نہیں ہوا تھا، مولانا کی یہ کشش نام رکھتے وقت ہی ظاہر ہوئی کہ ہم دونون ان سے بیعت ہونے والے حبیب الرحمٰن اور خلیل الرحمٰن کے نامون سے موسوم ہوئے، مولانا کے واقعات اور انکے ارشادات سے شاید ہی کوئی مجلس خالی ہوتی ہو، پہلی بار جب گنج مرادآباد کی حاضری ہوئی تو مولانا نے دریافت فرمایا "مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو"، عرض کیا "جانتا ہون"، فرمایا "خدمت کرتے ہو"، عرض کیا "بزرگ خدمت کرتے ہین"، اس واقعہ کا ذکر بہت خوبی کے ساتھ اکثر معمول تھا، فرماتے کہ خوش نصیبی تھی مولانا لطف اللہ صاحب سے پڑھا اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے بیعت کی، آخر مین استاد کی جو خدمت نصیب ہوئی اس کو بھی مرشد کے سوال کا نتیجہ خیال کرتے تھے،

میرے ساتھ شفقتِ بزرگانہ | جیسا کہ مین لکھ چکا ہون، میرے تعلق کا آغاز بہت معمولی طریقہ پر ہوا، مگر بعد مین اتنا مستحکم ہوگیا کہ احاطہ تحریر مین لانا ممکن نہین، استحکام کی دو وجہین معلوم ہوتی ہین، پہلی جو آغاز مین کارفرما تھی علمی اور ادبی یکجہتی اور ہمخیالی، اس مقام پر یہ بتا دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بڑے آدمیون اور حکام سے دور رہنا مجھ کو ہمیشہ سے محبوب رہا ہے، لیکن نواب صاحب مرحوم کی درویشانہ صفت، علم دوستی اور اور خود ان کی کشش نے مجھکو ان سے قریب کردیا، دوسری وجہ میرا خصوصی تعلق استاذ العلماء رحمۃ اللہ کی خدمت مین، اب تو نواب صاحب مرحوم کا تعلق میرے ساتھ مستحکم ہوجانے کا یہ عالم تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تمھاری کوئی بات ہوتی ہے تو مولانا کی صورت سامنے آجاتی ہے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان

کرتا ہوں، میرے یہاں تقریب تھی عین وقت پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب حبیب گنج جا رہے ہیں، شریک نہ ہوں گے، میں فوراً پہنچا، اور عرض کیا کہ شرکت کے بعد تشریف لے جائیں، تھوڑے سے تامل کے بعد فرمایا بہت اچھا، شرکت کی، پھر حبیب گنج گئے، دوسری بار جب تشریف لائے، تو مخصوص جلسہ میں تبلایا کہ جب میں روکنے کے لیے پہنچا تو مولانا کی صورت سامنے آگئی، پھر یہ تاب کہاں تھی کہ شرکت نہ کرتے، اپنی تالیفات بہت اہتمام کے ساتھ مجھکو عطا فرماتے، سال گذشتہ جب فارسی کا دیوان چھپ کر آیا تو اسکا ایک نسخہ اپنے دست مبارک سے حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھ کو دیا،

"ہدیہ مولف خدمت زبدۃ العلماء مولوی بدرالدین بدر سلمہ کمال مدفضلہ

حبیب الرحمن صدر یار جنگ، ۲۵ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ

اہل علم سے محبت اور علمی بنا پر تعلقات

اہل علم سے بہت رغبت تھی، محض علمی فضل کی بنا پر لوگوں سے تعلقات پیدا کرتے، اہل علم پر احسانات کرتے جس کے پس پردہ بجز علم پروری کے کوئی اور غایت نہ ہوتی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اچھے اچھے علما کو یونیورسٹی میں جمع کر دیا، اہل علم کے ساتھ نشست کا خاص ذوق تھا جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ مولوی سلیمان اشرف صاحب اور مفتی عبداللطیف صاحب کے یہاں روزانہ پابندی کے ساتھ تشریف لاکر گھنٹوں بیٹھتے، نواب صاحب مرحوم کی یہ مجلسیں بڑی پاکیزہ ہوتی تھیں، جن میں معلوم ہوتا تھا کہ اہل مجلس دنیا اور مافیہا سے بلند تر کسی اور عالم کے لوگ ہیں، خالص دینی، علمی اور تاریخی مضامین پر گفتگو رہتی تھی، یہاں یہ بتانا مناسب ہے کہ سارے ملک کے مشاہیر اہل علم و کمال سے پختہ تعلقات تھے جن کا ظہور خصوصیت سے سفر کے موقعوں پر ہوتا تھا، مثلاً ایک واقعہ لکھنؤ کے بابت بیان کرنا ہے، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی اور مولانا عین القضاۃ صاحب کے پاس جانا لکھنؤ پہنچکر لازم تھا، ایک بار وہاں کوئی دربار تھا، نواب فرزند اللہ خان صاحب کی رفاقت تھی، ایک ہی جگہ دونوں صاحب مقیم ہوئے، دوسرے روز صبح کو ضروریات سے فارغ ہوکر حسب معمول شروانی صاحب مولانا نعیم صاحب وغیرہ کے یہاں گئے

اور نواب مزمل اللہ خانصاحب حکام سے ملے، جائے قیام پر واپسی کے بعد جب ملاقات ہوئی، تو نواب مزمل اللہ خانصاحب نے جو میرے چچازاد بھائی اور عمر مین بڑے تھے، ذرا تیز ہوکر پوچھا "کہان چلے گئے تھے" جواب سننے پر انھون نے پھر تیز ہوکر کہا کہ "ان لوگون سے ملنے آئے ہو یا دربار کے لیے"، اس کا جواب یہ تھا، کیا کیا جائے ایک خبط ہے"۔ اسی طرح ایک بار مزمل اللہ خانصاحب نے گرم ہوکر کہا کہ "یہ کیا واہیات ہے کہ روزانہ جہان شام ہوئی مولوی سلیمان اشرف کے یہان"۔ اس کا بھی جواب یہی تھا کہ "خبط ہے"۔ یہان ایک واقعہ اور لکھنے کے قابل ہے، یونیورسٹی مین کوئی تقریب تھی، لائبریری مین ممبران کورٹ اور ممبران اسٹاف اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھتے جارہے تھے، اسٹاف کے سلسلہ مین مین بھی آکر ایک طرف بیٹھ گیا تھا کہ نواب صدیار جنگ مرحوم لائبریری کے دروازہ پر آکر رکے، ادھر ادھر نظر ڈالی اور مجھ کو دیکھکر میرے پاس تشریف لے آئے، اور اسکا کچھ خیال نہ فرمایا کہ وہان ان کی جگہ نہ تھی، جب تک لائبریری مین اجتماع رہا، میرے ہی پاس تشریف فرما رہے اور برابر باتین کرتے رہے،

درویشی اور تواضع | باوجود خاندانی خوش حال ہونے کے مزاج مین درویشی اور فروتنی تھی جس کے بکثرت مناظر ہر شخص نے دیکھے ہین، مین سمجھتا ہون کہ اہل علم سے بے تکلف محبت کرنا شانِ درویشی ہی کا نتیجہ تھا، اپنے خاص واقعات بیان فرماتے، مگر اس طور پر کہ ہرگز کبھی کبر و نخوت ظاہر نہ ہوتی، بلکہ فروتنی کے انداز سے بیان کرتے،

وضعداری اور پختگی | نہایت وضعدار تھے، جس سے جو رسم قائم ہوگئی بہت پختگی کے ساتھ اس پر عمل رکھا، اختلاف خیال اور اختلاف مذاق ہرگز اس رسم مین کمزوری پیدا نہ کرسکا، شاید ہی کوئی شخص شناساؤن مین ایسا ہو جس کے خیال مین اس کی مثالین نہ ہون، وضعداری کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب تک قوت رہی یہ بانئ قیام علی گڈھ روزانہ عصر کے بعد مفتی عبداللطیف صاحب کے یہان جو معمول آنے کا تھا اس مین کبھی ناغہ نہ ہوتا، اس مضبوطی کو دیکھئے کہ اگر مفتی صاحب علی گڈھ مین نہ ہوتے تو بھی حسب معمول تشریف لاتے، ان کی آمد

کی وجہ سے دوسرے اہل مجلس حاضر ہو جاتے، ایک بار ایسے ہی موقع پر مجھ سے فرمایا:

ومن مذہبی حب الدیار لاھلھا وللناس فیما یعشقون مذاہب

یہ بھی فرماتے کہ اس وقت کہیں اور کا خیال بھی نہیں آتا، آخر میں جب کمزور ہو گئے، تو یہ معمول قرار پایا کہ عصر کے بعد مفتی صاحب کو اور مجھ کو لینے کے لیے ہمارے قیام گاہوں پر گاڑی آتی، اگر کبھی مفتی صاحب کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو تنہا میں جاتا، بیشتر تشریف آوری کا معمول اسی پختگی کے ساتھ مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں مقرر تھا، غرض پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات تھی پتھر کی لکیر کے مانند کسی کی طاقت نہ تھی کہ ذرا سی بھی جنبش دے سکے،

دینداری اور ضبط اوقات | بھیکم پور عرصہ سے دینداری کا مرکز تھا، اور اسی ماحول کے اثر سے نواب صاحب مرحوم میں بھی دینداری بدرجۂ اتم تھی، دینداری کا ایک جز ضبط اوقات ہے، وہ بھی بہت نمایاں تھا، نماز باجماعت کے لیے مسجد میں جانا اور ورد و وظائف میں مشغول رہنا سفر تک میں نہ چھوٹتا، علی گڈھ کے قیام میں مغرب کی نماز لازمی طور پر جماعت سے ہوتی، پہلے مفتی صاحب کے مکان پر اور بعد میں حبیب منزل میں جماعت سے فارغ ہو کر بے ساختہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتے، نماز کی امامت مفتی صاحب کیا کرتے، مگر اب کئی سال سے یہ بار گراں مجھ کو سپرد ہو گیا تھا،

حیدر آباد کی صدر الصدوری دینی خدمت ہی کے خیال سے منظور کی تھی، فرماتے تھے کہ طبیعت گریزاں تھی، مگر بالآخر خدمتِ اسلام کا پہلو غالب آیا، چنانچہ وہاں کے دورانِ قیام میں بکثرت اصلاحیں کیں، بدعات کو توڑ کر صحیح اسلامی اور مسنون طریقے رائج کیے ــــــ یہی دینداری ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں غیبت کا گذر دور دور نہ تھا۔

علمی ذوق | نواب صاحب مرحوم کو علم کا بے حد ذوق تھا، تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک خوش حال گھر میں پیدا ہو کر پورے ماحول سے جداگانہ مذاق ان کے اندر پیدا ہوا، ان کے چچا عبد الشکور خان صاحب اپنے اور بھائیوں میں ضرور ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے کہ خود ذی علم اور درویشانہ زندگی بسر کرتے، لیکن

اس کے ساتھ ہی ایک اور نمونہ خود ان کے والد محمد تقی خانصاحب کا بالکل رئیسانہ تھا، نواب صاحب مرحوم نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے چچا کے حکم سے عربی پڑھی، اور اچھے اساتذہ کے فیض صحبت سے علم کی طرف مکمل رجحان پیدا کیا،

کتب خانہ | اسی رجحان کا نتیجہ دو صورتون مین ظاہر ہوا، جن مین سے ایک یہ ہے کہ نوادر کو فراہم کرکے کتبخانہ قائم کیا، کتب خانہ کے آغاز کا بیان جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے، بہت دلچسپ ہے، اور "مقالات شروانی" مین معارف سے منقول ہوکر درج ہے۔

"ان کے لڑکپن مین ایک کتب فروش بچون کی کتابین بیچنے آیا کرتے تھے، ان کو دیکھ کر کتابین فروخت کرنے کا شوق ہوا، رات کو زنانخانہ مین یہ کھیل ہوتا، کہ کسی چادر یا کپڑے کی گٹھری بناکر کتابین بیچا کرتے، بیویان اس کھیل کو دیکھ کر ہنستین اور تعجب کرتین، بچپن مین کتابین بیچنے کا شوق آئندہ کتابین خریدنے مین تبدیل ہوگیا، پہلے اردو دیوانون کے نسخے خریدے، جو صندوقون مین پلنگ کے پاس رکھے تھے، بعد کو الماری کا انتظام ہوا، انگریزی تعلیم کے لیے آگرہ گئے، وہان قلمی کتابین خریدنے کا شوق ہوا، جو علامہ شبلی سے تعلقات ہونے کے بعد شغف کے درجے پر پہنچ گیا، چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے سفرون مین قلمی کتابون کی فراہمی کا خاص خیال رہتا تھا، حیدرآباد مین بھی بڑا ذخیرہ نایاب کتابون کا فراہم ہوا، جن مین ایک نسخہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کا خود مصنف شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس طرح برابر کوشش کے ساتھ نایاب کتابون کی بلکہ نایاب چیزون کی فراہمی جاری رہی، شوق کی وجہ سے بعض اوقات خرچ بھی کافی کرنا پڑا، نتیجہ یہ ہے کہ محض کتابین ہی نہین بلکہ ہر قسم کے نوادر جمع کرلیے، جن کے دیکھنے کے لیے غیر ممالک کے لوگ بھی آتے ہین، کتبخانہ کی چند خاص باتین قابل ذکر ہین، کوئی نادر کتاب یا چیز ناجائز طریقہ پر حاصل نہین کی، جتنی کتابین فراہم کین سب سے استفادہ کیا، جو شخص کتبخانہ کو دیکھنے کے لیے حبیب گنج آیا خواہ وہ کوئی بھی ہو بہت خوش ہوکر اس کی غیر معمولی خاطر کی،

تصنیف وتالیف | علم کی طرف رجحان کی دوسری صورت کا ظہور تصنیف وتالیف سے ہوا، اس کا آغاز بھی

دلچسپ ہے، خود فرماتے تھے کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ مین حیدر آباد سے رسالہ "حسن" نکلتا تھا، جو اچھے مضامین پر ایک اشرفی انعام دیتا، چنانچہ بار بار ایک مضمون لکھ کر بھیجا، جواب علحدہ بھی چھپ چکا ہے، رسالہ نے اس پر ایک ایک اشرفی انعام دی، اس طریقہ پر لکھنے کا شوق بڑھتا گیا جس کی بدولت بکثرت تصانیف کین، مضامین لکھے، سارے ملک مین علمی شان کی دھوم مچ گئی، مضامین کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے حال مین شائع ہوچکا ہے جس کے ۸۰۰ صفحات ہین، افسوس یہ ہے کہ اس مجموعہ مین المامون پر ریویو نہین شامل ہوسکا، جو علامہ شبلی مرحوم سے تعلق کا باعث بنا تھا، تصانیف مین "سیرۃ الصدیق" انگریزی مین بھی ترجمہ ہوکر شائع ہوئی، چھوٹی بڑی مذہبی، تاریخی اور ادبی تصنیفات تیس ۳۰ سے متجاوز ہین،

ایثار اور وقار | ملک مین جتنے تعلیمی، علمی اور دینی ادارے قائم ہوئے یا پہلے سے تھے، سب کے ساتھ گہرے تعلقات رکھے، ہمیشہ انکی مالی اعانت کی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ۲۳ سال تک بالاتفاق منتخب ہوتے رہے، کانفرنس کے جلسون کے لیے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، اور اخراجات خود برداشت کیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑا زبردست وقار ملک مین حاصل ہوا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اور مشرقی علوم کے رُکنِ رکین سرسید کے زمانہ سے آخر تک رہے، بغیر خواہش یونیورسٹی کورٹ اور اکزیکیٹو کاؤنسل کے ممبر بھی ہوتے رہے،

ادبی ذوق | اب مین نواب صاحب مرحوم کے ادبی ذوق کے چند نمونے پیش کرتا ہون، جس زمانہ مین حبیب منزل زیر تعمیر تھی، میرس روڈ پر حبیب منزل کے سامنے ایک جگہ بہ تقریب شادی میرا اور نواب صاحب کا اجتماع ہوا، فراغت کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "آؤ ایک چیز تمھارے ذوق کی دکھلائین"، حبیب منزل لے گئے، اور ایک بڑے پتھر پر جلی اور خوشخط حروف مین امرء القیس کا مصرعہ نہایت بلیغ تصرف کے ساتھ یون کندہ کیا ہوا دکھلایا،

فیا حبذا ذکری حبیب منزل

اس تصرف کو مین نے بیحد پسند کیا، اور متاثر ہوکر بے ساختہ دیر تک پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا، مین ان دنون شہر مین رہتا تھا، تانگہ پر شہر سے آیا تھا، فرمایا "تانگہ رخصت کردو"، اور خود اپنے ساتھ مجھکو میرے قیامگاہ

کے قریب لاکر اتار گئے، پسندیدگی سے جو تاثر مجھے ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکان پہنچکر چند منٹوں کے غور کے بعد بے اختیارانہ تضمین ہوگئی، جو درج ذیل ہے۔

بناء عظیم للحبیب بکوئل عن النقص والاخلال صار بمعزل
فیبقی علی الایام ذکری کلیھما فیا حبذا ذکری حبیب و منزل

اسی دن، یا دوسرے دن مین نے اس تضمین کو خط کے ذریعہ خدمت مین پیش کردیا، جسکا جواب نیچے نقل کرتا ہون

"مصرعے بیع ہین، کوئل کا قافیہ غنیمت بارد ہے، امرؤالقیس کے مطلع پر اہل نظر نے یہ ایراد کیا تھا کہ مطلع کا دوسرا مصرعہ بسقط اللوی الخ مصرعہ اولیٰ کے پایہ کا نہین آپ کا تیسرا مصرعہ چوتھے سے خوب چسپان اور ہمپایہ ہے"

اسی خط مین مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب کی سفرِ حج سے واپسی کی عربی تاریخ لکھ کر عنایت فرمائی جو بغیر نام کے محض تاریخ پر مشتمل تھی، مین نے اس پر عربی مین مصرعے لگا کر ان کا نام اور یہ کہ ان کے والد ماجد نے یہ تاریخ کہی ہے نظم مین ظاہر کردیا، اس پر بھی خوشی کا اظہار مندرجہ ذیل کلمات مین فرمایا،

"عربی تاریخ پر مصرعے صاف اور برمحل لگ گئے کمی پوری ہوگئی، اہل کمال کے فیض سے نقص بھی کمال حاصل کرلیتا ہے"

بعض بعض جملے نواب صاحب مرحوم کی تحریرون مین انتہا درجے کے بلیغ ہین، مثلاً خزینۃ المعانی کے مقدمہ مین اپنی تعلیم اور اساتذہ کے مختصر ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہین" جو حاصل ہوا فیض استادوں سے جو رہ گیا اپنے قصور استعداد سے"۔ رسالہ استاذ العلماء مین مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم کا حال لکھ کر تحریر فرماتے ہین" باسٹھ برس کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہین، پڑھا اور پڑھایا"۔ مقدمۂ دیوان اردو مین لکھتے ہین" شہروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہے"۔ یہ تین نمونے اس وقت دماغ مین موجود تھے جن کو پیش کردیا، بیسیون جملے اسی قسم کے انکی تحریرون مین موجود ہین،

ان کا ادبی ذوق ایک ایسا بڑا عنوان ہے جس کو بہ تفصیل لکھنا بہت مشکل ہے، شاید ہی کوئی مجلس ایسی ہوتی ہو جس مین ادبی ذوق کے جوہر ظاہر نہ ہوتے ہون، جب مین حاضر ہوتا، اس قسم کی گفتگو مین، روے سخن میری طرف کر لیتے اردو اور فارسی دونون زبانون کے دیوان طبع ہو چکے ہین، کبھی خود اپنے اشعار سنا کر حاضرین کو لطف اندوزی کا موقع دیتے، اور کبھی استادون کا چیدہ چیدہ کلام پیش فرما کر کیفیت پیدا کرتے جو کیفیت اسوقت پیدا ہوتی اُسکو احاطہ تحریر مین لانا ممکن نہین، یہان مین اس تحریر مین جان ڈالنے کیلئے ان کے کچھ اردو فارسی کے اشعار نقل کرتا ہون

اردو

جلوہ فرما تو ہوا صحرا گلستان ہو گیا — تو چلا منہ پھیر کر گلشن بیابان ہو گیا

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلین آنکھین اپنی — بزم یاران جسے سمجھے تھے وہ زندان نکلا

پھول فرقت مین تری خار ہوئے جاتے ہین — ہلکے پھلکے ہین مگر بار ہوئے جاتے ہین

کیے دیتی ہے وحشت پارہ پارہ کسوت ہستی — کہان فرصت کہ بیٹھون چاک کرنے مین گریبان کو

حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل — تمھارے بھی ہین پاسبان کیسے کیسے

تاب نظارہ تو جب ہو کہ رہین ہوش بجا — پھر کہان ہوش جو ہو سامنے صورت تیری

فارسی

دل بری بردہ اگر پردہ ز من نیست عجب — اہرمن بردہ ز کف مہر سلیمانے را

ہمت ما سرتن آرد بہ مال و زر فرود — دولت ما بس بود آن شوخ سیم اندام ما

دلم بہ ساغر و مینا تہی کشد حسرت — کہ بردہ نرگس مستانہ ز خود ما را

فدائے زخم نگاہت ہزار مرہم باد — نثار درد تو سازم ہزار درمان را

در مقام مملکت عشق دیاریست غریب — کہ شہ غازی محمود غلام است اینجا

ہوائے باغ بہ ہجر تو سازگارم نیست — جدا ز کوے تو ذوقے بہ نوبہارم نیست

باد چمن علاج تپ دل نمی کند — عیسیٰ دمے ز گوشۂ دامانم آرزوست

از بن ہر موے حسرت نالہ سر می زند — نغمہ ہاے دلکشا در بند چوب تار نیست

از بدخشان لعل و از عمّان گہر — جوہرِ طبعم زکانے دیگر است

منتِ رائحۂ نافہ و غنچہ نہ کشند — سرخوشانے کہ بہ بوئے دہنے ساختہ اند

شاہبازِ ہمتم ربطے بدستِ شاہ داشت — خوش نہ کردہ بندِ دستِ دیگران پرواز کرد

ز چشمِ مستِ تو مستم شراب را چہ کنم — ز تابِ حسنِ تو سوزم کباب را چہ کنم

نکرد جلوہ بتِ شوخ باختم دل و دین — اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

درحریمِ وصلِ جانانم وطن خواہد شدن — شمعِ بزمِ انس آن ماہ ختن خواہد شدن

نگاہ شوخ بہ چشمِ سیہ بدان ماند — کہ مست ناز خرامد بتے بہ بت خانہ

اے کہ از غایتِ لطافتِ طبع — سحرِ نو بہار را مانی

ربودہ ہوش و قرارم غزالِ رعنائے — نگارِ مست خرامے بلند بالائے

مداوائے مریضِ عشق قانونِ دگر خواہد — طبیبِ دردِ دل آن نرگسِ بیمارِ ما بینے

مجموعی حیثیت سے ایک نظر — خلاصہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم سیدھے اور سچے آدمی تھے، ایچ پیچ سے پاک، نہایت مہذب اور شائستہ، ان کی ہر ادا اور ہر بات انتہائی شائستگی سے پُر تھی، اس زمانہ مین ان کی ذات قدیم تہذیب کا مجسم نمونہ تھی، پاکیزگی اور صفائی نظر پڑتے ہی نمایان ہوتی جس کے اندر وجاہت اور جمال صوری کی درخشانی بدرجۂ اتم تھی، گفتگو مین وہ لطف تھا کہ مجلس کے مقررہ وقت پر میری تو یہ حالت تھی کہ سب کامون کو چھوڑ اس مین شرکت کے لیے مستعد ہو جایا کرتا کبھی ناغہ کرنے کو جی نہ ہوتا، ان کی ذات ایسی بہت سی بے مثال صفات کا مجموعہ تھی جو اس زمانہ مین مفقود ہین، اللہ تعالیٰ ان کو بہشت برین مین بلند درجات پر فائز کرے۔ ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

اب مین اس تحریر کو متمم بن نویرہ کے دو حسب حال بیتون پر ختم کرتا ہون،

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ — من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کأنی ومالکا لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا

اردو کا ایک مشہور مصرعہ بھی یہاں موزون ہوگا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ضمیمہ | محترم جناب مفتی عبداللطیف صاحب سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس مخصوص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرمائیں کہ ان کی تحریر بہت قیمتی ہوتی، لیکن انھوں نے فرمایا کہ وہ لکھنے پر قادر ہی نہیں، اور یہ مصرع پڑھا،

حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

میرے اصرار سے اس پر راضی ہوئے کہ چند باتیں مجھے بتلادیں جنکو میں لکھکر بطور ضمیمہ اپنی تحریر میں شامل کردوں، چنانچہ جو کچھ موصوف نے فرمایا وہ درج ذیل ہے، لیکن قبل اس کے یہ عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدریار جنگ مرحوم، مفتی صاحب، اور میں تینوں ایک ایسے لازوال رشتے میں منسلک، ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا، اور جس کی طرف میں نے اپنی ایک عربی تحریر میں ان الفاظ اشارہ کیا تھا،

ولیعلم أننا أغصان شجر واحد و تلامیذ أستاذ ماجد

سنہ ۱۳۰۸ھ میں مفتی صاحب استاذ العلما رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے، اسی سال مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی مرحوم بھی درس میں شریک ہوئے، اور اس طرح کئی سال تک دونوں صاحب ہم سبق رہے، اس وقت سے اس وقت تک کہ اسٹھ سال کا زمانہ گذر گیا، باہم تعلقات میں شگفتگی ہی بڑھتی چلی گئی، طالبعلمی میں ساتھ رہا، ندوۃ العلما میں ساتھ رہا، حیدرآباد میں ساتھ رہا، اور آخر میں علی گڈھ میں ساتھ رہا، سفروں میں بھی بارہا رفاقت رہی غرض جو ارتباط قائم ہوا، ایسا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا، نواب صاحب مرحوم کو جو محبت مفتی صاحب کے ساتھ تھی اس کا ذکر میری تحریر میں اوپر گذر چکا ہے، مفتی صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اب اکثر یہ شعر انکے وردِ زبان رہتا ہے،

آتش اندر آشیان بے رحم صیادان زدند

در گلستان مشت خاشاکے و تشتم دگذاشتند

کہ لے دے کے ایک ہی ذات سے تعلق تھا، وہ بھی نہ رہی

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ شروانی صاحب مرحوم کی طالبعلمی کی شان یہ تھی کہ ٹھیک بارہ بجے دن کو ان کا سبق ہوتا، گھوڑے پر سوار ہو کر پڑھنے آتے، ایک سائیس گھوڑے کا اور ایک خدمتگار کتابیں ہاتھ میں لیے ساتھ ہوتا، کیسی ہی لو، دھوپ یا بارش ہوتی، ناغہ نہ کرتے، اور بہت پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت پر سبق کے لیے استاد کی خدمت میں پہنچ جاتے، جب مولانا کا کمرہ چالیس یا پچاس قدم رہ جاتا، گھوڑے سے اتر کر کتابیں اپنی بغل میں لیتے اور استاد کی خدمت میں ادب کے ساتھ حاضر ہو جاتے، یہ معمول چند روز نہ تھا، بلکہ مستقل تھا، ایک رئیس زادہ کو تحصیل علم کا اتنا شوق جس کے لیے کسی تکلیف کی پروا نہ کرنا لائق صد آفرین اور قابل تقلید ہے، جس سے اس زمانہ کے طلبہ کو سبق سیکھنا چاہیے، اس شان سے طالب علمی کا زمانہ گذرا اور بعد فراغت، مطالعہ اور تحریر و تقریر کے میدان میں قدم رکھا، استعداد پختہ تھی، نتیجہ یہ کہ تحریر میں وہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ہر شخص نے مدح سرائی کی، خاص خوبی یہ تھی کہ مطلب کی جامع ہوتی اور حشو و زوائد سے پاک بندش چست، تقریر میں وہ ملکہ حاصل کیا کہ کوئی علمی اور اسلامی مجلس ان کی تقریروں سے خالی نہ رہتی تھی خواہ نزدیک ہو یا دور، ایک بار پٹنہ میں ندوۃ العلماء کا جلسہ تھا، اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کا مجمع ہوگا، جس کے اندر اس زمانہ کے بڑے بڑے اشخاص مثلاً سر علی امام جسٹس شرف الدین حسن امام وغیرہ وغیرہ شریک تھے، شروانی صاحب کی تقریر جب ہوئی تو مجمع کا ہر شخص از خود رفتہ ہوگیا، خصوصیت کے ساتھ سر علی امام اور ان جیسے دیگر اشخاص بالکل بے قابو تھے،

تحریر اور تقریر کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کام انھوں نے انجام دیا وہ ان کا کتبخانہ ہے، شخصی محنت سے اتنا بڑا کتبخانہ جمع ہونے کی مثال اس صوبہ یوپی کے اندر نہیں، گویا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو انھوں نے پورے یوپی کی طرف سے ادا کیا، اس کتبخانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف نوادر اسمیں جمع کیے گئے ہیں،

علم کے ساتھ ساتھ خدا نے ان کو فہم سلیم عطا فرمائی تھی، مفتی صاحب سے انکی گفتگو ہر قسم کے علمی مسائل پر ہوتی رہتی تھی جس سے اس بات کا مفتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مرحوم صحیح بات ہمیشہ فوراً سمجھ لیتے تھے، مزاج میں کجروی بالکل نہ تھی اور غلط بات ہرگز نہ مانتے تھے، مفتی صاحب سے استادبھائی ہونے کے علاوہ پیربھائی کا بھی رشتہ تھا، مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت اس طریق پر ہوئی کہ ملاقات کے بعد تمام رات بےچینی میں کٹی جس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے تمام گناہ پیش نظر تھے صبح کو مرید ہونے کے بعد وہ کیفیت زائل ہو گئی، مولانا نے دعا دی کہ خدا قرض سے بچائے جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عبدالشکور خانصاحب کے انتقال کے بعد جائداد پر تین لاکھ کا قرضہ تھا، اسکو ادا کیا، خود کبھی قرضہ نہیں لیا، آمدنی میں خدا نے ایسی برکت دی کہ امورِ خیر بھی جاری رہے اور لاکھوں روپیے کی جائداد خریدی، برادری میں اس طور پر لوگوں کی امداد کی کہ جو کوئی مقروض ہو جاتا وہ اپنی جائداد ان کے ہاتھ میں دیدیتا، یہ اس کا قرض ادا کر کے جائداد واپس کر دیتے،

سرکاری خطابات اور کونسلوں کی ممبری سے باوجود اتنی بڑی ریاست کے سخت نفرت تھی، ایک بار خطاب کی سفارش گورنمنٹ میں گئی، خطاب آنے سے پہلے شروانی صاحب کو پتہ لگ گیا سخت وحشت ہوئی، اور کوشش کر کے خطاب کو رکوا دیا، اگر وہ چاہتے تو بہت سے خطابات، کونسلوں کی ممبری ان کو بہت آسانی کے ساتھ مل جاتی، مگر ان کی زندگی تو دوسرے ہی مقصد کے لیے تھی، تمام زندگی کا کارنامہ دو باتیں ہیں، علم حاصل کیا اور اسلام کی خدمت کی، مختصر یہ ہے کہ شروانی صاحب مرحوم اپنی صفات میں بےنظیر تھے

آخر میں یہ شعر پڑھا،

اندکے با تو بگفتم و بہ دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اعتراف

از جناب سید معین الدین صاحب مرحوم مترجم نپولین اعظم وغیرہ

ہمہ شہر پر ز خوبان منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبین نکند بہ کس نگاہے

سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری اپنے زمانہ کے مشہور مترجم اور صاحب قلم تھے، جیساکہ اس مضمون سے ظاہر ہوگا، یہ اعتراف انھون نے آج سے ۲۳ سال پہلے بطور وصیت نامہ کے لکھا تھا، جسے بعد مین معارف مین اشاعت کے لیے بھیجدیا تھا لیکن شاید اسکی نوبت اسی لیے نہین آسکی کہ وہ مولانا شروانی کی یادگار مین کام آئے، اسلیے مضمون نگار کی وصیت کی تکمیل کے لیے اس کو اس نمبر مین شائع کیا جاتا ہے، جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزون ہے۔ "م"

۲۶ نومبر ۱۹۲۷ء کو یہ مضمون "اعتراف" کی سرخی سے میں نے اس وقت لکھا تھا جب کہ چھ سال متصل حیدرآباد دکن کے عہدہ منتظمی دفتر پیشی صدر الصدوری امور مذہبی پر کام کر چکنے کے بعد مین اپنے وطن شاہجہانپور واپس آیا تھا، منشا صرف یہ تھا کہ اپنی عینی شہادت بطور وصیت تحریر کے ذریعہ سے اپنے پیچھے چھوڑ جاؤن، جس ذات گرامی کے متعلق یہ اعتراف مین نے لکھا تھا وہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے اور مجھکو یہ درد انگیز خیال تھا کہ قاعدۂ قدرت کے موافق وہ ذات گرامی ایک دن اس دار فانی سے اٹھ جائیگی، اور مین بھی نہ رہون گا، پس اس ذات گرامی کی اگر کبھی سیرۃ لکھی جائے تو میرا یہ "اعتراف" اس سیرۃ کا ایسا ایک باب بن سکے جس سے

زیادہ سچا دوسرا کوئی واقعہ اس سیرۃ مین دکھایا نہ جاسکے، مین نے اس اعتراف کی تمہید مین لکھا تھا "میری سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اب جبکہ مین یہ اعتراف لکھ رہا ہون نہ اس ذات گرامی سے میرے کوئی دنیاوی نفع کا واسطہ باقی ہے، نہ مجھ پر کوئی دباؤ ہے، پس جو کچھ یہان لکھا جاتا ہے وہ آلودگی اور ہر قسم کی لوث سے انشاء اللہ پاک ہو"

لیکن ان پچھلے چار سال مین حالات نے کچھ ایسے پلٹے لیے کہ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد مجھے پھر معلوم نہ ہوا کہ وہان کیا ہورہا ہے، تین برس تک اس ذات گرامی سے جس کے ساتھ پورے چھ سال مین ایک ہی کوٹھی مین رہ چکا تھا! مدجس کا مین سب سے بڑا سرشتہ دار تھا کسی قسم کی خط وکتابت بھی نہ ہوئی کہ اب یکایک معلوم ہوا کہ استعفیٰ کے ذریعہ سے اس ذات گرامی نے حیدرآباد سے تعلق قطع کرلیا، چونکہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جبکہ مین زندہ ہون، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "معارف" کے ذریعہ سے اپنا یہ اعتراف ناظرین کے سامنے پیش کردون، میرا مدعاے اصلی اس طرح پورا ہوجائے گا، یعنی جب سیرۃ لکھی جائے گی تو معارف ہی سے سیرۃ نگار یہ سطور چن سکے گا،

وہ ذاتِ گرامی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کی ہے، جس سے اس اعتراف مین مجھے بحث کرنی ہے، مین اس طولانی داستان سے بات کو طول نہ دون گا، کہ شروانی صاحب سے کب اور کس طرح میری ملاقات ہوئی اور اس تیس برس مین باہمی ربط و قدردانیون نے کیا منزلین طے کین، اسلئے اصل مدعا کی طرف آتا ہون،

انتیس ۲۹ برس سررشتۂ تعلیمات مین کام کرنے کے بعد مین نے سلطانپور سے گورنمنٹ کی ملازمت سے استعفیٰ دیا، اور ہز ہائی نس نواب صاحب باؤنی کا پرائیویٹ سکریٹری ہوا، "دیلی کالج اندور" مین نواب صاحب ممدوح کا گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے حکم سے مین پہلے اتالیق رہ چکا تھا، اسی زمانہ مین شروانی صاحب حیدرآباد دکن کے صدر الصدور امور مذہبی ہوئے، مین باؤنی مین دو برس کام کرنے پایا تھا کہ شروانی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا، اور حیدرآباد مین اپنے دفتر پیشی کا، سرکار آصفیہ

کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد، منتظم کر دیا، یہ تقرر ۱۶ رجون ۱۹۲۰ء مطابق ۸ ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو ہوا، اب مین اس منزل پر پہنچ گیا کہ شروانی صاحب سے میرا ہر وقت کا ساتھ ہے اور مجھکو موقع ملتا ہے کہ انکو اتنے قریب سے دیکھون جتنے قریب سے دیکھنا ممکن ہے، غالباً میرا خیال صحیح ہے کہ کسی دوسرے کو متصل چھ سال ایسے نہ ملے ہون گے کہ اس نے ایک جاسوس کی طرح شروانی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو، میرے جیسے مشاہدے کی نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اپنے نہایت باقاعدہ روزنامچہ کی جلدون مین یہ پہلو برابر قلمبند کیے ہون،

اب مین چھ برس کا تجربہ اور مشاہدہ اس اعتراف مین نہایت دیانت اور راستی سے لکھتا ہون کہ مین نے شروانی صاحب کو کس عالی رتبہ کا باعمل مسلم پایا، لیکن اتنا پھر لکھنا ضروری سمجھتا ہون کہ چونکہ مین شروانی صاحب کو اچھی طرح جانتا ہون اور یہ اعتراف اب ان کی نظر سے بھی گذرے گا، اگر خلاف واقعہ مین نے کوئی بات لکھی ہو تو میرے حق مین سب سے زیادہ سخت جج وہی ہون گے، اور مجھ پر سب سے زیادہ نفرین وہی کرین گے، چنانچہ جو کچھ شروانی صاحب کے متعلق مین آگے لکھتا ہون مین ان کو ایسا ہی جانتا ہون، اس کے بعد اصل علم خدا کو ہے اور صحیح اور بہتر جاننے والا وہی ہے،

وضع شکل وصورت | صحیح مسلمانہ وضع قطع مشرقی حسن صورت ہزارون مین ایک، حیدرآباد کے عظیم الشان جلسون مین مین نے یہی پایا کہ سب سے پہلے نظر انھین کی طرف بے ساختہ اٹھتی تھی، جمال صورت کے ساتھ مسلمانہ عبا، عمامہ اور لباس، سبحان اللہ، حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی کسی سرکاری تقریب مین بھی شروانی صاحب نے مغلی دستار کبھی سر پر نہ رکھی، اگرچہ ان کی پیشی مین مجھکو پچھلے تین سال پیشی کے وقت مغلئی دستار استعمال کرنی پڑی،

انشا | شروانی صاحب کی انشا مین ایک چاشنی اور وہ ذائقہ ہے کہ صاحب ذوق ہی وہ لذت جان سکتا ہے، وجہ اس چاشنی اور لذت کی یہ ہے کہ چونکہ وہ فارسی اور اردو کے ایک گران پایہ شاعر ہین،

اگرچہ وہ شاعری کی مشق نہیں کرتے، اس لیے نثر میں شاعرانہ تخئیل داخل ہو کر نثر کا پایہ نہایت بلند کر دیتی ہے، جملے چھوٹے چھوٹے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ و لغات سے پاک لیکن آمد مضامین کی رَو میں کبھی توالی کا واقعہ ہو جاتا یا کہیں پر خفیف عرقِ ظرافت کی جھلک ناوک و نشتر کی گویا چھیڑ ہوتی ہے، میں نے چونکہ ان کے ہر قسم کے مسودات کثرت سے صاف کیے ہیں، ان کی نثر کا اسلوب میں جانتا ہوں، منصف مزاج ایسے کہ زبان کے متعلق کسی لفظ کے استعمال کے متعلق جب کبھی میں نے اپنا کوئی خطرہ یا شبہہ ظاہر کیا، انھوں نے کبھی برا نہ مانا، فوراً تحقیقات کی، اگر میرا خطرہ یا شبہہ صحیح ہوا تو نہایت مسرت سے انھوں نے قبول کر لیا، اگر میں غلطی پر ہوا تو خود میری غلطی کی اصلاح ہو گئی، ان کے انشا میں بیکار اور زائد باتوں کا دخل نہیں،

تقریر میں نے شروانی صاحب کی قریب قریب ہر ایک تقریر حیدرآباد میں سنی ہے، تقریر عام فہم، تقریر کا ایک خاص مرکز و مقصد، پیرایہ دلوں سے استغاثہ کرنے والا، مذہبی تقریریں رطب و یابس روایات سے قطعی پاک، تقریر مسلسل، برجستہ اور آخر میں اپنے مرکز و مقصد پر پہنچ جانے والی، اور تقریر کا منتہائے کمال یہی ہے، اعلیٰحضرت سلطانِ دکن مدظلہ العالی کی موجودگی میں بھی میں نے دیکھا ہے کہ بال برابر بھی لہجہ یا تقریر کے تیور میں فرق نہیں آتا،

وقت کی قدر اور تقسیم اوقات روزانہ واجبات اشغال میں اپنے نفس کے رجحان سے کبھی وقت ضائع کرتے میں نے شروانی صاحب کو نہ دیکھا، حبیب گنج میں فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے تھے کہ رخصت ہونے والے پردیسیوں اور مسافروں کو رخصت دیتے، پھر اپنے باغ کی سیدھی طولانی روش پہ تسبیح لیے ہوئے متصل ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے، ایک مضبوط عموماً مرزاپوری بانس کی چھڑی ان کے ہاتھ میں ضرور رہتی، چھڑی کبھی ترک نہ کی جاتی حتیٰ کہ جب مسجد کو جاتے تب بھی چھڑی ہاتھ میں لے جاتے، حیدرآباد میں بھی فجر کی نماز کے بعد ٹہلنے اور وظیفہ کا یہی دستور تھا لیکن یہاں مسافروں اور پردیسیوں کی جگہ اطراف کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کی تعداد کبھی ایک سو سے زیادہ ہو جاتی تھی،

شروانی صاحب کو گھیر لیتے تھے، اور شروانی صاحب ہر ایک بچہ کو ایک ایک پیسہ دیتے اور مسکراتے جاتے اور کسی بچہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی پھیرتے تھے، وظیفہ سے فارغ ہو کر چائے پیتے اور خطوط لکھنے شروع کر دیتے، دس بجے عموماً اجلاس پر آجاتے اور اسوقت تک کام کرتے کہ آج کا سب کام ختم ہو جاتا، ہر ایک مسل خود پڑھتے اور ہر ایک حکم اپنے قلم سے لکھتے، ظہر اور عصر کے درمیان کوٹھی کی بالائی منزل پر اتنی بلند آواز سے روزمرہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے کہ آواز نیچے صاف سنائی دیتی، نماز ظہر کے بعد بھی ہمیشہ چائے پیتے تھے، حیدر آباد مین نماز عصر کے بعد وہ بالاخانہ سے نیچے اترتے، مغرب تک یا تو ملاقاتیون سے ملاقات ہوتی یا موٹر مین سوار ہو کر ہوا خوری کو جاتے، عموماً مین ساتھ ہوتا اور اس وقت مزاج کی شگفتگی رنی بہار پر ہوتی، واپسی پر نماز مغرب عموماً خود پڑھاتے لیکن اگر کوئی اور صاحب عبا و عمامہ موجود ہوتے تو انہین کو امام بنا دیتے، خود نماز پڑھاتے تو اس نماز مین اور اُس نماز مین جو وہ سنت یا نفل کی صورت مین تنہا پڑھتے تھے، بڑا فرق ہوتا، یعنی جب امام ہوتے تو قرأت مختصر اور ارکان نہایت معتدل ہوتے، مقتدیون پر وہ نماز کبھی بار نہ ہوتی، لیکن جب تنہا پڑھتے تو ارکان طولانی ہوتے صحت ارکان کا یہ حال دیکھا ہے کہ کبھی سجدے سے وہ جانماز پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے، بس اگر صحیح نماز پڑھنی ہو تو شروانی صاحب کو نماز پڑھتے ہوے غور سے دیکھ لینا کافی ہے، مغرب کی نماز کے بعد وہ جانماز پر دیر تک بیٹھتے، پھر ایک لمبی دعا مانگتے، فجر کی نماز جماعت مین بھی یہی دیکھا کہ عموماً وہ سب مصلیون کے بعد مسجد سے باہر آتے، مغرب کی نماز کے بعد حیدر آباد مین وہ ملاقات کے کمرہ مین بیٹھتے، ملاقاتی ہوتے تو ملاقات کرتے ورنہ اخبار دیکھتے، رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھکر کھاتے، اس کے بعد مطالعہ شروع ہوتا، اور نہین کہا جا سکتا کہ کب تک ہوتا رہتا، انھین اوقات مین کمیٹیون کی شرکت، مدارس مین دینیات کے معاینے، تقریبات دعوتون، تقریرون، وعظون غرض ان سب ہی ضروریات کے لیے وقت نکال لیا جاتا،

لطیفہ | مین نے حیدر آباد مین اکثر دیکھا کہ مغرب کی نماز کی جس وقت شروانی صاحب امامت

کر رہے ہوتے تھے تو اس وقت بعض بڑے عہدیدار جن کا عموماً سررشتۂ تعلیمات سے تعلق تھا، ان مین ایسے بھی تھے کہ ولایت مین انگریزی تعلیم پائی تھی، نہایت آسودہ اور بے غم مغرب کی جماعت مین شریک ہونے کے بجائے کرسیون پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے، ایک دن مین نے شروانی صاحب سے کہا کہ "آپ ان مسلمانون کو ہدایت کیون نہین فرماتے کہ نماز کا احترام کرین، اور جماعت مین شریک ہوا کرین"، اس پر شروانی صاحب نے مجھے یہ جواب دیا "منتظم صاحب، ان لوگون کو ابھی ٹھوکر نہین لگی ہے، ایک ٹھوکر مین یہ سیدھے ہو جائین گے، کسی کی ہدایت کی ضرورت نہین"، اس کی تصدیق بہت جلد ہو گئی، یعنی چند ہی روز بعد مین نے ایک کو ایسا نمازی پایا کہ ریل مین بھی ان کی تسبیح اور جا نماز کا پورا اہتمام رہتا تھا، یہ ٹھوکر کھائے ہوئے تھے،

کثرت مشاغل | شروانی صاحب کی تحریر دکن کے حجم سے مجھ پر ہول طاری ہو جاتا تھا، ہر ایک مثل وہ خود پڑھتے اور سب احکام اور تجویزین اپنے قلم سے لکھتے، امور مذہبی اور صدارت العالیہ کا کام انجام دینے کے ساتھ وہ عدالت العالیہ کے خاص اور اہم دیوانی کے مقدمات مین ججون کے افسر بنائے جاتے تھے، جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبون کے وہ رکن تھے، کتب خانۂ آصفیہ، دار العلوم نظامیہ، شعبۂ تالیف و ترجمہ، دار الاشاعت، کتب درسی کا احتساب، مختلف مصنفین و مؤلفین کی تصنیفات و تالیفات پر اعلیٰ حضرت معظم کو ناقدانہ تحریری رائے کا بھیجنا، مدارس کے معائنے، دورے، امکنۂ مذہبی کی جانچ پڑتال وغیرہ، مذہبی جلسون مین وعظ، ادھر ہندوستان مین وقف کرنال، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی کے شعبون کی رکنیت، تعلیمی کانفرنس کی شرکت، صدارت کے خطبات، ندوۃ العلماء کے اہم امور مین عملی شرکت، اپنے عظیم الشان تعلقہ اور کتاب خانہ کی داشت و نگرانی، کثیر خط و کتابت، سلسلۂ تالیف، دیوانون، تذکرون اور مثنویون پر مبسوط مقدمات لکھنا، مواعظ کے مستقل رسالے بنا دینا، رسالون مین مضامین لکھنا، اس کے ساتھ کتابون کا مستقل مطالعہ، گویا وقت کا ہر ہر لمحہ کام مین

لگا ہوا، اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ایسا کام کرتے تھے جو کرنے کے لائق ہوتا تھا، نہ وہ کام جس کے کرنے کو جی چاہے، مطالعہ کا اندازہ کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے مین نے بہت دفعہ کتابین لین، کھولین اور بہت سی پڑھین بھی، لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس مین پنسل یا قلم سے شروانی صاحب کے مطالعہ صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہون، ان کی معیت مین چھ سات سال کے دوران مین ہر سال حیدرآباد سے ہندوستان کو دو دفعہ آنا اور واپس جانا ہوتا تھا، اس طولانی سفر مین ان کا عزیز شغل مطالعہ رہتا تھا، روزنامہ اخبار، ماہوار رسالے وغیرہ سبھی کچھ پڑھ لیتے تھے، کتب خانۂ آصفیہ سے ان کے مطالعہ کے لیے کتب تاریخ، سیر اور تفسیر مین برابر منگاتا اور واپس کرتا تھا،

دیانت اور تقوی | حیدرآباد مین سرکاری کام مستثنیٰ کرکے اپنے خانگی اور نجی کام مین شروانی صاحب نے کاغذ، روشنائی، قلم اپنے ذاتی استعمال کیے، خود ان کی ذات کا تو مذکور ہی کیا ہے، ان کی پیشی کے دفتر مین کسی اہل معاملہ کو کبھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ کسی ناجائز مطلب کے نکال لینے کے واسطے رشوت تو درکنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا،

کسی بڑے امیر کی ایسی تقریب مین جہان رقص و سرود ہو شروانی صاحب کبھی شریک نہ ہوئے اور جہان ایسا احتمال ہوتا وہان دعوت دینے والے امیر سے بذریعہ تحریر پوچھا جاتا تھا کہ "کوئی ایسی ویسی تفریح تو نہین ہے"؟ چنانچہ جب حیدرآباد کے امرا کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ایسی تقاریب مین جہان یہ خرافات ہونے کو ہوتے وہ شروانی صاحب کو مدعو ہی نہ کرتے تھے، ایسے ڈنر دن، دعوتون اور جلسون سے جہان کوٹ پتلون، لیڈیان، انگریز اور ہندوستانی نیم جنٹلمین جمع ہوتے شروانی صاحب کو عموماً پرہیز رہا، مین نے دیکھا ہے کہ جب کوئی "جنگ" یا "ملک" شروانی صاحب کی ملاقات کو آیا، تو سرکاری کام سے تو مجبوری تھی، مگر ان کو ایسی ملاقاتون سے وہ لطف نہ آتا تھا جو علما سے ملاقات مین آیا کرتا تھا،

بزرگانِ دین یا ان کے مزارات کا احترام کوئی شروانی صاحب سے سیکھے، مین نے ان کو حبیب عیدروس صاحب کے حضور مین حاضر ہوتے بھی دیکھا ہے، اور گلبرگہ شریف مین حضرت بابا گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اور بہاری شریف کے حضرت شاہ شرف الدینؒ اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر خلدآباد شریف مین بھی شروانی صاحب کی مخصوص حالت دیکھی ہے، اچھی قوالی کا ان پر یہ اثر ہوتا کہ وہ قطعی ساکت ہوجاتے،

جمعہ کے دن کا خاص احترام ہوتا تھا، آج شروانی صاحب سرکاری کام کو ہاتھ نہ لگاتے، نماز جمعہ کی حیدرآباد مین خاص طریقہ سے تیاری کی جاتی، عمدہ لباس، عبا، عمامہ، عطر مین بسے ہوئے، اور اس پر شیروانی صاحب کا حسن صورت، بس کچھ نہ پوچھیے، حیدرآباد کی مکہ مسجد مین ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھتے پہلی صف مین امام سے پیچھے ان کی جگہ خالی رکھی جاتی، لیکن مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اگر تین چار صفین بھرجانے پر وہ مسجد مین پہنچتے تو پھر مصلیون کو جبراور پھاند کر وہ اگلی صف مین کبھی اپنی خالی جگہ پر نہ جاتے بلکہ نہایت خاموشی سے کسی مناسب جگہ پر پیچھے ہی بیٹھ جاتے،

حیدرآباد مین مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اپنی تنخواہ، جو دو ہزار تین سو روپیہ ماہوار تھی، شروانی صاحب نے کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھی، وہ روپیہ کی حقیقت سنگ ریزہ کی برابر سمجھتے، اکثر مقروض رہتے اور حبیب گنج سے برابر روپیہ منگاتے رہتے، کبھی وہ ایسے خالی ہاتھ ہوجاتے کہ مسافر، نومسلم، حاجتمند کی امداد کو اپنے خادم سے قرض لیتے، نیا کپڑا بناتے تو عموماً استعمالی پرانے، جو بہت گفتنی پرانے کہیے، تقسیم کر دیے جاتے، یہ بات بھی مین نے اچھی طرح دیکھی ہے کہ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے عالمون کے وہ سب سے بڑے قدردان تھے، اس گروہ کی وہ انتہائی عزت کرتے تھے،

لیکن ایک چیز کی شروانی صاحب کو مین نے ضرور ہوس یا حرص دیکھی، وہ چیز کتاب تھی، نادر، کمیاب پرانی قلمی یا مطبوعہ کتاب وہ کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑتے تھے، مجھے صحیح اندازہ نہین کہ کتابین جمع کرنے مین انھون نے کس قدر روپیہ صرف کیا، حبیب گنج کے اپنے کتاب خانہ مین ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا،

منتظم صاحب، یہ کتابین میری چالیس برس کی سعی کا نتیجہ ہین"۔

تمامی عمر مین شروانی صاحب نے صرف ایک عمارت بنائی ہے، وہ بھی ان کی نہین، خانۂ خدا ہے، حبیب گنج مین جا کر اس خانۂ خدا کی جلوہ ریزی دیکھو خصوصاً جبکہ بھادون کی جھڑی برس رہی ہو، اور کالی گھٹائین چڑھی ہون، یا طلوع آفتاب سے پہلے یا چاندنی رات مین،

رمضان المبارک مین شروانی صاحب اپنی کوٹھی کے احاطہ مین ہمیشہ بہترین حافظون سے دو قرآن مجید جماعت کے ساتھ سنتے، اور حافظون کو نہایت معقول نذرانے اور خلعت دیتے، جماعت مین ان سے بائین ہاتھ کو میری جگہ مقرر تھی، وہ عموماً عطر مین ایسے بسے ہوتے تھے کہ تیز حس کے عطر کی خوشبو سے جماعت مہک جاتی، اور کبھی مجھکو جھلکیین آنے لگتین، یہی حالت افطار کے موقعون پر ہوتی،، اور افطار کے جلسہ مین سب سے زیادہ بشاش وہی ہوتے، رمضان کا فریضہ وہ نہایت اہتمام اور خوشی سے ادا کرتے، وہ نہ تمبا کو کھاتے ہین نہ حقہ پیتے ہین،

ربیع الاول شریف مین مجالس عید میلاد شروع ہوتین، یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدر آباد مین جاری رہتا اور جن پیمانون پر یہ مجالس ہوتین حیدر آباد کو یہ بات پہلے کبھی نصیب نہین ہوئی تھی، شروانی صاحب ان جلسون کے صدر ہوتے، ان جلسون مین انھون نے نہایت معرکۃ الآرا وعظ کیے، اعلیحضرت بھی بعض جلسون مین شرکت فرماتے، شروانی صاحب ان ایام مین حیدر آباد کے مسلمون مین محبوب ترین ہستی تھے، ربیعین مین راتون کو تھیٹر اور سینما خانے عموماً مسلمانون سے خالی ہو جاتے، اسلام نے ایک عملی رنگ اختیار کر لیا تھا، بعض مجالس کے حالات مین نے منظوم کیے ہین، اور اکثر وعظون کے نوٹ میرے روزنامچہ ن مین محفوظ ہین،

حیدر آباد مین خدمات کا مختصر کارنامہ | جن لوگون نے شروانی صاحب سے پہلے حیدر آباد کے محرم، رمضان، اور ربیعین وغیرہ دیکھے ہین اور حالات مذہبی پر نظر کی ہے، اب وہ اسی حیدر آباد کو شروانی صاحب کی صدارت الصدوری

کے زمانہ مین دیکھین اور دونون حالتون کا مقابلہ کرین اگر صدرالمہام فینانس جو اب ایک مسلمان ہے، مسٹر گلانسی عیسائی انگریز سابق صدرالمہام فینانس کی طرح مالی معاملات مین صیغۂ امور مذہبی کے ساتھ کشادہ دلی سے پیش آتا تو مین بڑے بڑے اسلامی رفاہ و ترقی کے واقعات دکھا دیتا، کیونکہ مین اسی امور مذہبی کے صیغہ کا سب سے بڑا سررشتہ دار تھا، اور ہر بات میرے ہی ہاتھون سے ہوتی تھی لیکن پھر بھی اس گئی گزری مالی حالت مین شروانی صاحب نے جو کچھ کر دکھایا وہ نہایت اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے،

محرم کی بدعات شنیعہ یعنی مسلمانون کا شیر، ریچھ، بھیڑیے بننا، تاڑی سیندھی کے نشہ مین چور، ہجوم و ہنگامہ آرائیان اور بدمستیان کرنا، عورتون کی اس بدمستی مین بےحرمتی کروانا وغیرہ ایسی سب باتون کی ایسی جڑ کاٹ دی کہ پھر ان باتون کا عود کرنا قطعی ناممکن ہوگیا، تاڑی اور سیندھی پیتے جانا، اور اسی حالت مین میلاد خوانی کرنا، وہ کھنی بھونڈی اردو مین نعت خوانی، بانی مجلس کا تاڑ اور سیندھی دیکر ان بدبخت میلاد خوانون کو رات بھر تنہا اپنے چھوڑ دینا اور خود گھر مین جاکر سو رہنا معدوم کر دیا گیا، یہ اس طرح کیا گیا کہ ان میلاد خوانون کے طائفے صدارت العالیہ مین طلب کیے گئے، انکی جانچ کی گئی، اہل کو میلاد خوانی کی باضابطہ اجازت دیگئی، اور نا اہلون کو یکقلم ممانعت کر دیگئی، سیندھی، تاڑی، شراب وغیرہ کی دکانین شہر پناہ سے باہر نکالدی گئین، اور شہر پناہ کے اندر مسکرات کا باہر سے لانا جرم قرار دیا گیا

اہالیان خدمات شرعیہ کا جیسے قاضی وغیرہ احتساب ہوا، امتحان لیے جانے لگے، سندین دی گئین ان کے لڑکے تکمیل تعلیم دین کے واسطے مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد مین بھیجے اور دارالاقامہ مین رکھے گئے، قاضیون کے دفتر از سر نو ترتیب دیے گئے، رویت ہلال کی صحت کا بڑی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا گیا، مسجدون مین تنخواہ دار امامون کی تعداد مین اضافہ کیا گیا، مؤذن، جاروب کش، جانمازون، برقی روشنی، پانی کے نلون، حوضون، طہارت خانون، غسل خانون، بڑی مسجد مین تنخواہ دار خطیبون وغیرہ کا اضافہ کیا گیا، عیدگاہ میر عالم کی درستی اور توسیع ہوئی، جہان اب بیس بیس ہزار مصلیون کا عید کی نماز مین ہجوم ہونے لگا، اور اس عیدگاہ کو شروانی صاحب کی صدرالصدوری مین یہ فخر پہلی دفعہ نصیب ہوا کہ اعلحضرت نظام دکن میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ نے عید کے دوگانے اسی عیدگاہ مین ادا کرنے شروع کیے، اور امرا

دارا کین سلطنت عید کی نماز کو یہان حاضر ہونے لگے، اضلاع مین دینی مدارس اور اصلاحی تبلیغی انجمنین قائم کی گئین، انگریزی مدرسون مین دینی تعلیم کا خاص نگرانی کے ساتھ انتظام ہوا، واعظین مقرر کیے گئے، جو اضلاع کے دورے کرتے اور وعظ کہنے کو شہر مدراس تک بلائے جانے لگے، ہفتہ وار مذہبی رسالے جاری ہوئے، مدارس حفاظ قائم ہوئے، محکمۂ اوقاف کی تنظیم ہوئی، امکنۂ مذہبی سے متعلق اراضیات فائدہ کے ساتھ لوگون کو دی گئین یا نگرانی سرکار مین لی گئین، مہتمم اوقاف و مساجد کے عہدے قائم کیے گئے، درگاہون کی آمدنیا خائن متولیون سے نکالی گئین، ماہ صیام مین چائے خانے، آبدار خانے اور ہوٹل دن مین بند کر دیے گئے، مسلمانون مین ذبیحہ کی نگرانی کی گئی، حاجیون کے قافلہ کا خاص انتظام کیا گیا اور سہولتین بہم پہنچائی گئین، غیر آباد مساجد بند کر کے بے حرمتی سے بچائی گئین، مختصر یہ کہ شروانی صاحب کی صدر الصدوری مین مذہبی رنگ کچھ ایسا چڑھا کہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہائی کورٹ کے جج اور حکیمون نے ججی کے فیصلون اور مطب کے ساتھ ساتھ مجالس وعظ و میلاد مین خوب خوب تقریرین کین،

شروانی صاحب نے ایسے نازک مذہبی جذبات و تعصبات کے زمانہ مین جیسا یہ زمانہ ہے تمام مذاہب کے انتظام کی باگ ایسے دانشمندانہ طریقہ سے ہاتھ مین لے کر کام کیا کہ ان کے خلاف کسی مذہبی گروہ کی آواز بلند نہ ہوئی، اور یہ ان کے عادلانہ انتظام کا کھلا ثبوت ہے،

عادت کی فلسفیت | مذہبی حسن عمل کے ساتھ شروانی صاحب کی عادت مین ایک خاص فلسفیت کا بھی مجھے تجربہ ہوا ہے، یعنی وہ دکھلاوے اور نمائش کے انسان نہین، کسی فوری جذبہ سے ان مین تبدیلی نہین ہوتی، اکثر باتین وہ نہایت بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے، نہ سب سے بڑی خوشی کے موقع پر وہ از خود رفتہ ہوتے نہ بڑے سے بڑے حادثہ یا نقصان پر وہ شکستہ دل اور مغلوب ہوتے تھے، اسی فلسفیانہ مزاج کی پرواز کا یہ نتیجہ تھا کہ سفر کے بڑے بڑے مصارف، جو میرے اہتمام سے ہوتے تھے، باورچی خانہ، روزمرہ کا دسترخوان، اور تمام حیدرآباد کے خانگی انتظامون مین چیخ پکار، غصہ غضب، اعتراض اپنی

وجاہت کے اظہار، غرض ایسی کسی بات کا مین نے ان مین نشان تک نہ دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مین ان کی ہر ادا پر عاشق ہون، ایک سطحی خیال کا آدمی تو یہ باتین دیکھکر کہے گا کہ "شروانی صاحب مین قوتِ انتظام نہین" لیکن ایک نگاہِ غائر دیکھے گی کہ ان تمامی باتون پر ایک اصل فلسفی کی طرح وہ توجہ نہین کرتے، اور ان کو قابل التفات نہین پاتے، اور شروانی صاحب کو سمجھنے کے لیے بڑی گہری مشاہدہ کرنے والی آنکھ کی ضرورت ہے، تعلیم اسلام ان مین کچھ ایسے عملی طریقہ سے پیوست ہوگئی ہے کہ جن معاملات کو ہم جیسے لوگ منجانب اللہ صرف زبانون سے کہنا سیکھتے ہین شروانی صاحب ان معاملات کے منجانب اللہ ہونے کا یقین رکھتے ہین،

قرونِ اولیٰ کے مسلمانون کو اگر آجکل کے بگڑے ہوئے لوگ دیکھتے تو ان کو (خاکم بہ دہن) احمق وخبطی کہتے، اور وہ برگزیدہ لوگ آجکل کے بندگانِ زر اور غلامانِ دنیا کو حیوان مطلق یقین کرتے،

حدیث شریف تو یہ تعلیم دیتی ہے کہ

خدمتگار کا قصور دن مین ستر بار معاف کرو، دولت وہ جمع کرتا ہے جس مین عقل نہین، سب سے بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والون سے بہت اچھا ہو، بچون پر مہربان ہو، یتیمون کے سر پر ہاتھ پھیرو، بدزبانی نہ کرو، غصہ سے دور بھاگو، خوش خلقی مسلم کی سب سے اچھی صفت ہے، وغیرہ وغیرہ

جب اس معیار پر ہم شروانی صاحب کو جانچتے ہین، اور پورے چھ سال ایک عیب جو جاسوس کی طرح ان کو دیکھا، اور اپنے روزنامچون کی تین جلدین مین نے سیاہ کی ہین، لیکن مجبور ہون کہ فیصلہ شروانی صاحب کے حق مین دینا پڑتا ہے، ہمارا روے سخن ایسے ملم رئیس کی طرف نہین ہے جو بات بات پر خدمتگارون یا ماتحتون کو اپنے زجر و توبیخ، محاسبہ اور سخت گیری سے خائف و ترسان رکھتا، جرمانے کرتا یا برطرف کرکے اپنے ناچیز وجود کو ایک بڑی ہستی ظاہر کرتا، اور خود فریبی کے مرض مین مبتلا ہے، یا اپنی دولت کی بدولت اخلاقی معصیت کا شکار ہے، اور اس کا ہمسایہ اس کے شر اور دراز دستی

سے امن مین نہین ہے،

رائے کی مضبوطی اور جرأت اخلاقی

حیدرآباد مین مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ جاہے کتنی ہی خطیر و کثیر مالیت کا دیوانی کا مقدمہ ہو لیکن تجویز مین انھون نے پہلی دفعہ جو رائے لکھ دی اس سے پھر نہ ہٹے اور ججون کے اصرار پر کہ ایک فقرے مین ذرا سی تغیر کر دی جائے کہ سب کی رائے کا اتفاق ہو جائے شروانی صاحب نے یہی جواب دیا کہ "رائے ایک دفعہ دیجاتی ہے، تجویز اعلحضرت معظم کے ملاحظہ مین بھیج دیجائے"، اور اپنی رائے مین جو پہلی دفعہ لکھ دی تھی ذرا بھی تغیر و تبدیل نہ کی، ایسا تار حبیب گنج سے حیدرآباد کے ججون کو حسب الحکم مین نے خود دیا تھا، اخلاقی جرأت کا یہ حال دیکھا ہے کہ سات لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ ہے، فریقین مین ایک طرف تو اعلحضرت معظم کے خاص اسٹاف کا بڑا حضوری افسر ہے، اور دوسری طرف ایک ناچار بیوہ ہے، یہ مقدمہ پہلے اس بڑے درباری کے حق مین اس طرح فیصل ہو چکا ہے کہ بیس مفتی علما بیوہ کے خلاف فتاوی لکھ چکے ہین، درباری افسر کو ڈگری مل چکی ہے لیکن اب وہ پرانی اور بھاری مثل اعلحضرت آخری توثیق کی غرض سے شروانی صاحب کو بھیجتے ہین، شروانی صاحب تجویز لکھتے ہین، اور بصیغۂ راز وہ تجویز مجھے دی جاتی ہے، مین اسے صاف کرتا ہون اور تجویز پر شروانی صاحب کے دستخط لیکر سر بمہر لفافہ مین یہ تجویز مع مثل کے اعلحضرت معظم کو بھیجدیتا ہون، تجویز یہ لکھی گئی ہے کہ بیسون فتاوی پر جو اسٹاف افسر کے موافق مفتیون نے لکھے تھے، مدلل تردید کا قلم پھیر دیا جاتا ہے، اسٹاف افسر ہرایا جاتا ہے، بیوہ کے حق مین ڈگری دیجاتی ہے، نہ بیس فتاوی کا لحاظ فرمایا جاتا ہے، نہ اسٹاف افسر کی وجاہت و مروت راہ انصاف مین حائل ہوتی ہے، نہ اسٹاف افسر کا خوف ہے کہ دربار سلطانی کا ہر وقت کا حاضر باش ہے آخر فقرہ اس تجویز کا یہ تھا "شرعی حکم تو یہ ہے آیندہ اختیار سلطانی" بعد کو معلوم ہوا کہ اعلحضرت نے اسی تجویز پر عمل فرمایا، جو شروانی صاحب نے دی تھی، گذارش یہ ہے کہ بیس فتاوی کی تردید کسی معمولی فقیہ کا

کا کام نہین، نہ ایک ہندوستانی دربار مین ایسی جرأت اخلاقی آسان ہے،

جب کسی کی سرکار عالی مین شروانی صاحب نے سفارش کی تو اپنی صائب رائے سے استحقاق کو ایسا ملحوظ رکھا کہ وہ سفارش کبھی نامنظور نہ ہوئی، ہان، ایک دو مثالون مین ایسا ضرور ہوا کہ شروانی صاحب نے مثلاً تیس روپیہ ماہوار کی سفارش کی تو اعلحضرت معظم نے تیس کو پچاس فرما دیا لیکن تیس کو پچیس یا بیس کبھی نہین کیا

کیسی ہی بڑی سفارش کے ساتھ کیسی ہی رایون یا تقریظون سے آراستہ کوئی تالیف و تصنیف قلمی شروانی صاحب کے پاس آئے جس کے متعلق مؤلف یا مصنف کو سرکار عالی کی سرپرستی، انعام یا وظیفہ کی بڑی توقع ہو لیکن وہ کتاب ناقص ہو، تو شروانی صاحب کبھی تو ایسا کرتے کہ اس پر رائے لکھتے ہی نہ تھے، انکار کر دیتے تھے، لیکن اگر لکھتے تو اس کتاب کے نقص نکال کر دکھا دیتے تھے، اور سفارشون یا تقریظون کا مطلق لحاظ نہ کرتے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سب سے زیادہ لائق عالم تقریظ نگار کو بلاکر وہ کتاب اس کے سامنے رکھ دیتے اور پوچھتے تھے کہ ایسی ناقص کتاب پر یہ تقریظ اس نے کس طرح لکھی اور تقریظ نگار کو معذرت کرنی پڑتی، کہ مؤلف کتاب نے اس کو جان سے تنگ کر دیا تھا،

درد کی صنعت کاری کا اثر | اس عنوان مین سب سے پہلے یہ دکھانا ہے کہ کوئی عمدہ شعر ہو شروانی صاحب پر وجدانی حالت طاری کر دیتا تھا، یہ کلیہ یاد رکھنے کا ہے کہ حساس دل پر شعر کا اثر ہوتا ہے، اور ایسا ہی دل اخلاقِ حسَن کا گنجینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے،

شعر سے یعنی نہ جس بے حس کو لذت آئے ہے ‎ ‎ ‎ اس سے اخلاقِ حسَن کی کیا توقع کیجیے،

شعر بھی نیچر کی سحرکاریون مین سے ایک سحرکاری ہے، اسی شاعرانہ طبیعت کا انسان تیز محسوسات رکھتا ہے، پھر عیب و ہنر، نیکی بدی، جھوٹ سچ سب ہی باتون کا اسے احساس ہوتا ہے، حسن و قبح سے وہ متاثر یا متنفر ہوتا ہے، کسی بے حس دل کو پتھر کا ٹول سمجھو اور ایسے دل والے سے کوئی توقع نہ رکھو

یہ بے حسی ہی تو ہے جو آدمی کو کنجوس، فریب کار، بے حیا، سنگدل، کذاب، ریاکار، نمائشی یا ابن الوقت بنا دیتی ہے، خودداری اس سے معدوم کر دیتی، اور صرف جاہ طلبی اس کا نصب العین بنا دیتی ہے،

چنانچہ فطرت کی صنعت کاری کا اثر جو میں نے خود شروانی صاحب پر دیکھا ہے یہ ہے کہ وہ بھونگیر کے دورے میں جاتے ہیں، میں ساتھ ہوں، بھونگیر کے آسمانی قلعہ پر جو صرف ایک پتھر کی چٹان پر کسی پرانے زمانہ میں تعمیر کیا گیا تھا صرف تفریح اور تاریخی تحقیقات کی غرض سے پہنچنے کو، اس رفیع الشان چٹان پر ہم چڑھنا شروع کرتے ہیں، راہ میں ٹھہرتے اور دم لیتے جاتے ہیں، آخر میں جب ہم بڑی بلندی پر پہنچتے ہیں شروانی صاحب چٹان کے ایک شگاف میں پانی بھرا پاتے ہیں جس میں نیلوفر کے صرف دو پھول کھلے ہوئے ہیں، یہ پھول دیکھتے ہی شروانی صاحب پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے، وہ اس بلندی، پہاڑی کی خشکی، پھر یہاں پانی، پانی میں نیلوفر، نیلوفر کی شادابی پر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں، ان کا برقی خیال صانع حقیقی کی قدرت اور صنعت کی طرف جا پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر ٹھہر جاتے اور اسی مبحث پر عجیب مؤثر پیرایہ میں گفتگو کرتے ہیں،

حبیب گنج کے اپنے بے نظیر باغ کے چمن میں وہ ٹہل رہے ہیں، جنوری کا مہینہ ہے، گلاب ایسا کھلا ہوا ہے، کہ چمن میں گویا آگ لگ رہی ہے، بس وہ کسی شاداب پھول، اس کے گہرے، ہلکے رنگوں اور اس کی نزاکت پر غور کرتے، اور صانع حقیقی کے کمال اور قدرت کے خیال میں غرق ہو جاتے ہیں، پھر مجھکو ایک ایک باریکی اور مصور قدرت کی قلم کاری سمجھاتے ہیں، اور اسی حالت میں سودا کا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

رنگِ گل بے طرح دھکے ہے، سن لے ابر بہار　　آشیان میرا چھڑک، لگتی ہے اب گلشن کو آگ

چمن کے قطعی حسب حال یہ شعر سنکر ان کا دل ایک اضطراری ولولے سے بھر جاتا ہے، کسی سایہ دار درخت، کسی پتے، کسی پھل میں بس فوراً صانعِ حقیقی کی قدرت گویا شروانی صاحب پڑھنے لگتے تھے،

ہم کو سرسون کے وسیع کھیتون کے کنارے بھی کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا ہے، جہان تک نظر جاتی ہے زرد پھولون کا ایک زعفران زار ہے، نظر لوٹی جاتی ہے، لیکن سب سے زیادہ روحانی لذت اس سے شروانی صاحب ہی کو ہوتی ہے، کیونکہ جمال مین وہ جمال آرا کا مشاہدہ فرمارہے ہین،

حیدرآباد کی کوٹھی امید منزل کے احاطہ مین عزیزی عبدالوحید خان نے چھرے سے ایک دفعہ ایک چڑیا ماردی، ایسی حسین چڑیا ادھر شمالی ہندوستان مین نہین ہوتی، اس شہید بےگناہ کو شروانی صاحب نے دیکھا، اور انھون نے ایک عجیب انداز سے فرمایا" وحید! کس دل سے تم نے اسے مارا، کیا اس کا حسن بھی اس کا سفارشی نہوا، کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ قدرت کا یہ حسین نقشہ کوئی یون مٹادے"

یہ ذرا ذرا سی باتین ہین جو نہ اب عبدالوحید خان کو یاد رہی ہون گی، نہ شروانی صاحب کو خیال رہا ہوگا، لیکن میرا جاسوس روزنامچہ اس حسین چڑیا کی شہادت پر ہمیشہ مرثیہ خوان رہے گا، اور شروانی صاحب کی رقیق القلبی پر گواہی دے گا، مختصر یہ کہ مین نے شروانی صاحب مین ایسی ایسی پاک صفتین دیکھی ہین کہ جنکی غالباً ان کو خود خبر نہین، اور اگر اپنے روزنامچون سے ان کی پوری تفصیل کرون تو یہ اعتراف ایک بڑی کتاب بنجائے گا،

اور تو اور شروانی صاحب کا طریقۂ تعلیم خیرات تو دیکھو کر غریب بچون کو حبیب گنج کی گڑہی مین وہ خود اپنے ہاتھ سے پیسے نہین بانٹتے بلکہ اپنے چار برس کی عمر کے پوتے سے یہ پیسے بٹواتے ہین، یعنی پوتے کو خیرات دینے کی تعلیم گہوارے مین دیجاتی ہے، مرحبا۔

نمود و نمائش سے نفرت اور عام اخلاق — شروانی صاحب کو رواجی شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو، اس کی کثرت سے مثالین مین نے دیکھی ہین، یعنی جب بڑے صاحبزادے آنریبل محمد عبدالرحمٰن خان سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادی ہوئی تو یہ شادی بڑے اونچے پیمانہ پر ہوئی تھی، لیکن کسی انگریز کو دعوت یا گارڈن پارٹی مین سنے نہ دیکھا، شمس العلماء کا خطاب انھون نے نہ لیا، اور سرکاری تجویز ابتداہی مین نامنظور

کردی، سرکار آصفیہ کے خطاب "نواب صدر یار جنگ" کی انھون نے اس لیے قدر کی کہ اسلامی سرکار سے اس کا واسطہ تھا، اور مذہبی نقطۂ نظر اس موقع پر ملحوظ تھا، حقیقی شہرت کا صحیح مفہوم وہ سمجھتے ہین احسان کرکے نہ احسان جتاتے ہین نہ محسن کے سے کبھی تیور اختیار کرتے ہین، تعلیم اسلام کا ان پر گہرا عملی رنگ چڑھا ہوا ہے، کتب سیر، اور احادیث مین شمائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انھون نے بے کار مطالعہ نہین کیا ہے، صرف ادائے فرض اور مخلوق کے ساتھ بھلائی ان کی زندگی کا مقصد ہے جس مین ریا اور نمائش کو دخل نہین اور اس زمانہ مین سب سے بڑی اور سچی یہی تعریف ہے جو کسی کی جا سکتی ہے، ان کی نیکیون مین ایسی قوت ہے کہ "اہل" ہم نشین پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہین اور یہ بات شروانی صاحب کے اخلاص اور صداقت کا بین ثبوت ہے،

آخر مین یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شروانی صاحب بھی صرف ایک انسان ہین، فرشتہ نہین، دنیا مین جتنی بڑی ہستی کا انسان ہوتا ہے، اسی قدر اس کی طرف نگاہین اٹھتی ہین او اس گروہ مین ایک بھی انسان ایسا ہم کو تاریخ مین نہین ملتا جس کو سب نے اچھا کہا ہو، اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ اسے صاحب تمیز، انصاف کی اہلیت رکھنے والے، اور بے غرض، لوگ اچھا کہین، انسان کسی دوسرے انسان کو اکثر اپنے ذاتی جذبات یا اغراض کی عینک سے بھی دیکھا کرتا ہے، اور کبھی اغراض، رشک وحسد یا خود اپنے نفس کی خباثت سے یہ عینک غبار آلود ہو جاتی ہے، جس سے نورانی چیزین صاف نظر نہین آتین بلکہ دھندھلی اور گرد آلود نظر آتی ہین، پس خطا نورانی چیزون کی نہین ہوتی، تقصیر غباری عینک کی ہوتی ہے، چنانچہ اس اعتراف مین جس پہلو کی شروانی صاحب کی تصویر نہایت دیانت وراستی سے دکھائی گئی ہے، وہ ناظرین کے سامنے ہے، اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اب ناظرین دوسرے دولت والے امیر، کبیر مسلمانون سے جن سے ناظرین اچھی طرح واقف ہون شیروانی صاحب کا مقابلہ کرین اور اگر یہ مقابلہ وموازنہ کرنے والے انصاف

فرمائین گے، تو ضرور ایک سبق آموز نتیجہ پر انشاء اللہ تعالیٰ پہنچ جائین گے۔

آخرمین نازک خیالون سے میری یہ گزارش ہے کہ مین نہایت تنہائی پسند اور قریب وحشی انسان واقع ہوا ہون، امراء کے پاس حاضر ہونے کو بہت سے عقلمند موجب فخر یقین کرتے ہین، لیکن مین امراء سے بہت ڈرتا ہون، شروانی صاحب میری یہ عادت اچھی طرح جانتے ہین، میری سادہ لیکن نہایت مصروف زندگی انھون نے خوب دیکھی ہی، صرف ادائے فرض کو مین نے خوشامد کا قائم مقام یقین کیا ہے، لیکن اس بیگانہ روش پر شروانی صاحب نے مجھ پر بڑی بڑی مہربانیان فرمائی ہین پس یہ اعتراف صرف دو وجوہ سے مین نے لکھا ہے کہ کچھ تو ادائے شکرگزاری کا فرض پورا ہو جائے اور دوسرے ناظرین یہ دیکھین کہ بڑے نفس وعلم اور مرتبہ اور دولت کا اصل مسلم کیا ہوتا ہے، امراء کو مین اپنی طرح عاجز اور درماندہ سمجھتا ہون جنکو میری ہی طرح بھوک پیاس لگتی ہے، اور میری طرح ان کے درد سر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ مین نے شروانی صاحب سے سیکھا ہے جنھون نے حیدرآباد کی ایک عظیم الشان مجلس مین اپنی تقریر کے درمیان فرمایا تھا" صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو، یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جس قدر بڑا اپنے تئین خیال کرتے ہو اسی قدر زیادہ تم درماندہ، عاجز اور محتاج ہو، یہی عادت آدمی کو انسان بناتی ہے، اور یہی اسلام کی تعلیم ہے"

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخرالدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس مین ان کے سوانح وحالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ وعلم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق انکے نظریات وخیالات کی تشریح کیگئی ہی، جو لوگ قرآنمجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور وفکر کرنا چاہتے ہین ان کیلئے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دیسکتی ہے

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت: ۶ روپے

"منیجر"

مولانا شروانی کی تصویر اُن کی تحریر کے آئینہ میں

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم ہماری پرانی تعلیم و تہذیب کے اُن نمونوں میں تھے جن کی مثال اب نہ ملے گی، اُن میں علم و عمل دین و تقویٰ اخلاق و شرافت و قار و متانت وغیرہ قدیم تعلیم و تہذیب کی تمام خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں،

وہ صاحب علم، علم دوست، علما نواز اور علم و فن کے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے، ان کی ساری زندگی علمی و تعلیمی خدمات و مشاغل میں گذری، سرسید کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک وہ مسلمانوں کی تمام مفید علمی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکوں کے حامی و مددگار رہے، کوئی اسلامی ادارہ ان کی علمی و اخلاقی امداد سے محروم نہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ اور قدیم تہذیب سے اُن کو عشق تھا، ان سب کی تفصیل نہ ایک مضمون میں سما سکتی ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہے، یہ مرحوم کے ان رفقاء اور معاصرین کا کام ہے جن کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، راقم کو صرف دو چار مرتبہ مختصر ملاقات کا موقع ملا ہے، اس لئے وہ اس پر کچھ بھی نہیں لکھ سکتا، البتہ مرحوم کی تصانیف اور تحریریں برابر نظر سے گذرتی رہیں جن میں اُن کے بہت سے خیالات رُجحانات اور خصوصیات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس مضمون میں اسی آئینہ میں اُن کی تصویر دکھانے کی کوشش کی جائے گی،

مسلمانوں کی دینی اور قدیم تعلیم سے دلچسپی

مرحوم پرانی تعلیم کی یادگار اور عالم باعمل تھے، اس لئے عربی اور دینی تعلیم سے

اُن کو بڑی دلچسپی تھی، اور انھون نے علمی و عملی دونون حیثیتون سے اُس کی خدمت کی، وہ شروع سے دار العلوم ندوۃ العلما، کے معاون و مددگار رہے، انجمن ترقی عربی الٰہ آباد کے سرپرست، اور دوسرے عربی مدارس کے ہمدرد وہوا خواہ تھے، مسلمانون کی قدیم تعلیم اور اُس کے نصب العین پر ایک رسالہ لکھا ہے جس مین مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، یہ رسالہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے،

دار العلوم ندوۃ العلما، کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت مین دینی تعلیم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے ہین

"ہمارے علما، کی یہ شان رہی ہے، کہ انھون نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، علوم دینیہ سے انھون نے خدا اور رسول کی خوشنودی مقصود رکھی، علوم دنیویہ (جس کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا) اس کی خدمت بھی بحیثیت علم کرتے رہے، یہ واقعہ زرین تاریخ کا کارنامہ ہے کہ جب بغداد مین مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا، اور وہان علما، کے گران قدر مشاہرے اور طلبہ کے بیش قرار وظائف اور سامان آسایش مہیا کئے گئے، تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہین بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا۔"

(مقالات شیروانی ص ۲۰۴)

مسلمان علما، کے حالات مین علمائے سلف اور نابینا علما، دو کتابین لکھین، اول الذکر مین علمائے سلف کے دینی، تعلیمی اور اخلاقی و معاشی حالات و واقعات تحریر کئے ہین جس کا اندازہ حسب ذیل عنوانون سے ہوگا،

طلب علم، افلاس و تنگدستی، دشواریان، سفر کی مشقتین، کتابون کی نقل و کتابت، توجہ کامل، ذوق شوق طلب، حفظ و استحضار علمی، علم کی حرص، اس کی راہ مین صرف، مسلمانانِ سلف کا علمی ذوق، امراء مین علم کا ذوق،

اختلاف و اتفاق تمہید (جس مین یہ ذکر ہے کہ مذہبی نزاع کو سلف صالحین کیسا سمجھتے تھے) اختلاف رائے صحابہ کے زمانہ مین، علمائے اہلِ سنت و جماعت کا برتاؤ، مخالف عقیدہ کے علما، کیساتھ مختلف مذہب کے علمائے اہلِ سنت کا آپس مین برتاؤ، جب نزاع کا دروازہ کھل گیا، تو خود علمائے اہلِ سنت

وجماعت باہم کس طرح مخالف ہو گئے،

حق پسندی وراست گوئی، حق پسندی حکام کے مقابلہ مین، معاصرین وہمچشمون کے مقابلہ مین، اپنے نفس کے مقابلہ مین،

حسنِ معاشرت کسبِ معاش، تجارت، حرفت، تمول، علمار کے تعلقات، سلاطین کے ساتھ اور ان کا اثر سلاطین پر، ملک پر، مخالف فرقون کی محبت علمار کے ساتھ، غیر مذہب کے لوگون کی محبت علمار کے ساتھ، علمار کی معاشرت کے بعض امور حالات لباس، جسمانی ریاضت، اپنا کام خود کرنا،

ان عنوانات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب مین قدیم تعلیم کے تمام اہم اور ضروری پہلوؤن علما کی حیثیت، ان کے فرائض اور ذمہ داریون اور ان کے اصلاح طلب اُمور کی پوری تفصیل آگئی ہے،

تعلیم جدید مین دینی روح کی ضرورت

مرحوم زمانہ کے حالات وضروریات کے پیشِ نظر جدید تعلیم کے بھی حامی تھے، اور ابتدا سے علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے معاون ومددگار اور اس کے رکن رہے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، کچھ دنون تک جامعۂ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی رہے، لیکن اُن کا دینی جذبہ جدید تعلیم مین بھی مذہبی روح دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے وہ سرسید احمد خان کی تعلیمی واصلاحی کوششون کے معترف ومداح اور ان کے معاون ومددگار رہے، لیکن اُن کے مذہبی خیالات سے اُن کو سخت اختلاف تھا، اور علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حالت سے وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے، اس کا ثبوت ان کی مختلف تقریرون اور تحریرون سے ملتا ہے، حیاتِ جاوید کے ریویو مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے، اس مین انھون نے سرسید احمد خان کے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے اختلافات تفصیل سے ظاہر کئے ہین، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالات شروانی ص ۸۰)

اسی ریویو مین کالج مین مذہبی تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر بھی اظہار تاسف کیا ہے، مولانا حالی نے حیاتِ جاوید مین یہ بھی تحریر کیا ہے کہ کالج مین مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا، مولانا شروانی اس اہتمام کے لفظ

پر تحریر فرماتے ہیں،

"جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج میں عہدِ سرسید میں رہی، میں نہیں سمجھتا کہ اس پر اہتمام کا لفظ کس طرح صادق آسکتا ہے،...... افسوس ہے کہ سرسید کے عہد ٹرسٹی شپ اور مسٹر بیک کی پرنسپلی کے زمانہ میں کالج میں جو چیز سب سے زیادہ غیر مہتم بالشان تھی، وہ مذہبی تعلیم تھی، بجائے اس کے کہ اس کی تربیت سے مذہب کی خدمت ذہن نشین ہوتی، اور نہ وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ میں دماغوں میں جاگزیں ہوتا، ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہے، وہ کیا چیز تھی، سرسید تحریر و تقریر میں ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے لیکن عالمِ عمل میں آئے تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا جس کے وہ حامی تھے"

(مقالات شروانی ص۶۰)

نان کوآپریشن کے زمانہ میں ٹرسٹیوں کے ایک جلسہ میں کالج کے طلبہ کی مذہبی لاپروائی پر ان الفاظ میں تاسف کا اظہار کیا ہے،

"حضرات میں علی گڈھ اس خوشی کے خیال کے لیے آیا تھا کہ غالباً یہ تحریک (نان کوآپریشن) کے اثر سے کالج کے طلبہ میں مذہب کا جلوہ دیکھوں گا جس کی تمنا برسوں سے دل میں تھی، جو باوجود گوناگوں کوشش کے اب تک حاصل نہ ہوسکا لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی ...... رات میں نے عشا کی نماز کالج کی مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھی میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبہ میں سرایت کر چکی ہے، (نان کوآپریشن کے اثرات مراد ہیں) تو ایک دیرینہ آرزو پوری ہوگی، اور کم از کم ایک پوری صف میں طلبہ کو دیکھوں گا، مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی،

حضرات! اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور جب تک دنیا قائم ہے، اسلام بھی قائم رہے گا، وہ زندگانی کا ایک خاص قانون لایا ہے جس کی پابندی عملاً ہر مسلمان پر واجب ہے"، (مقالات شروانی ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

مسلم یونیورسٹی میں اسلامی آرٹ کے سلسلہ میں ایک تحریر میں لکھتے ہیں،

"اسلامی آرٹ کا مفہوم تفصیل طلب ہے، سب سے بڑا اسلامی آرٹ وہ حسین زندگی ہے، جو عالم انسانی میں خالق جمیل کے جمال کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی، اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حُسن زیبائی پیدا کی حبیب کبریا، روحی فداہ کی حیات حسن وجمال سے لبریز ہے اور اسلامی آرٹ کا اشرف و اعلیٰ نمونہ اس کے بعد قرآن مجید اور خالص اسلامی علوم ہیں، پھر اسلامی تاریخ ہے، جو دلوں پر تصرف و فرمانروائی کی دلکش مثالوں سے معمور ہے..... اس کے بعد شاعری ہے، پھر عمارت و صنعت ہے، پھر خطاطی، سب سے آخر میں مصوری، چونکہ تصویر بنانا شرعاً ممنوع ہے، اس لئے کم طبیعتیں اس کی جانب مائل ہوئیں، مگر اہل کمال نے حرفوں کے نقوش میں عالم تصویر دکھایا، ایک استاد کا قطعہ ایک ہنر بین کی نگاہ میں وہی ذوق بخشتا ہے، جو ایک کامل مصور کی تصویر" (مقالات شروانی ص ۲۵۳)

اُن کی دوسری تقریروں اور تحریروں میں بھی اس قسم کے خیالات بکثرت ملتے ہیں، لیکن ہمارا مقصد صرف ہر پہلو کی جھلک دکھانا ہے، اس لئے تفصیل میں نہ پڑیں گے،

مسلمانوں کی علمی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے ذوق و شیفتگی

اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے والہانہ شیفتگی تھی، اور اُس پر انکی نگاہ نہایت وسیع تھی، اُن کی کوئی تقریر و تحریر مشکل ہی سے اس تذکرہ سے خالی ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کے اجلاسِ مدراس کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کی علمی تاریخ پر مختصر اور جامع تبصرہ ہے، فرماتے ہیں:-

"اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا، اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانوں کے دلوں میں ترقی کرتا گیا، پہلی صدی ہجری میں ممالکِ اسلامیہ دار العلوم بن گئے، اس میں کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی، تابعین ہی کے طبقہ میں عرب کی جگہ عجمیوں نے لے لی تھی، امام مکحول، عکرمہ، امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے، حدیث میں ارشاد ہے، الحکمۃ ضالۃ المومن حیث وجدھا اخذھا" اس گمشدہ

کی تلاش میں مسلمانوں نے دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا، جہاں سے خزانۂ علم حاصل نہ کیا ہو، کوئی علمی زبان نہیں چھوڑی جس کا سرمایہ عربی میں منتقل نہ کیا ہو..... جن ممالک میں مسلمان گئے علم اور علم کا شوق ساتھ لیتے گئے، حجاز، شام، یمن، عراق، ماوراء النہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، تونس، مراکو، اندلس، چین، صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر، جاوا وغیرہ، شرق الہند کے جزائر، ہندوستان؛ غرض وہ کون ملک تھا جہاں مسلمان گئے، اور وہ دارالعلوم نہ بن گیا، اُن کے شہر اور قصبے در کنار گاؤں تک مرکز علوم بن گئے، مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنؤ، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا، سطح ارض پر کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے جس مقام پر جا کر گوش عبرت سے سنئے گا، ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا، (مقالات شیروانی ص ۲۰۱)

یہ اس خطبہ کا ایک اقتباس ہے، خطبہ میں اس اجمال کی تفصیل پر نظر ڈالی گئی ہے، اُن کی بعض تصانیف اور بیشتر مضامین اسلامی علوم کی تاریخ سے متعلق ہیں، خود علمائے سلف سے اسلامی فنون کی تاریخ کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے،

مسلمانوں کی علمی دولت کی بربادی کا ماتم

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے ساتھ، اُن کے علم، دولت، اور اعمال و اخلاق پر بھی زوال طاری ہو گیا تھا، اور نا اہل اخلاف کے ہاتھوں اسلاف کرام کا علمی خزانہ بھی تلف ہونے لگا تھا، ہزاروں بیش بہا قلمی، و نادر کتابیں کوڑیوں کے مول بک کر یورپ پہنچ گئیں، جو کچھ بچا کھچا سرمایہ باقی رہ گیا تھا، سرسید احمد خاں نے اس کے تحفظ کی جانب توجہ کی تھی، چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد میں نادر قلمی کتابوں کی تلاش اور اُن کی حفاظت بھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا، کانفرنس کی باگ جب مولانا شروانی مرحوم کے ہاتھوں میں آئی، تو انھوں نے دوبارہ اُس کی جانب توجہ کی، اور ۱۹۱۵ء میں قلمی کتابوں کی حفاظت کے لئے علمی خزانوں کی بربادی کے عنوان سے ایک درد انگیز اپیل شائع کی، یہ اپیل بہت طویل ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہیں،

ہندوستان مین سلطنت مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہان مسلمانون کی دولت و ثروت کا خاتمہ شروع ہوا، اُن کی جاگیرین، زمینداری اور علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتین بھی فنا ہونا شروع ہوئین، اسی کے ساتھ ساتھ علم وفضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے، تباہ ہونا شروع ہوئے،

جو اسلاف مسندِ علم کی زینت دینے والے تھے، اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنھون نے ان انمول موتیون کی سنگریزون کے برابر بھی قدر نہ کی، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہین گذری اہلِ بصیرت کو اس کا علم ہے کہ اس زمانہ مین شہر تو شہر صدہا قصبے بھی ایسے تھے، جہان یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا، دلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، آگرہ، سورت، احمد آباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ، اور مثل ان کے بہت سے مقامات تو گویا اس بازار علم وعمل کے دساور تھے، جس مین متاع حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت وفلسفہ، اور عربی و فارسی ادب کی کتابین، نامی شعرا کے دواوین، قلمی بے بہا نسخون، مشہور خطاطی کے استادون کے قطعات اور قلمی مرقعون کی شکل مین انبار کے انبار نظر آتے تھے، اُن کے مکانات کی الماریان اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے،

کتاب خانے ایک طرف رہنے کے مکانون کا یہ عالم تھا کہ جہان آج مکانات کی زینت اور آرایش مین یورپ کی نت نئی اشیا نے جگہ حاصل کی ہے، وہان اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانون کے دیوان خانون اور گھرون کے معمولی سے دالانون کی آرایش مین جو چیزین دیگر اشیا نمایش مین نمایان نظر آتی تھین، وہ ان خوش نویس صاحب کمال خطاطون کی وصلیان اور طغرے ہوتے تھے جن مین نہایت پُر معنی اور پر کیف بیتین پُر نصیحت قطعے، پُر اخلاق جملے، دل آویز فقرے حدیث شریف اور کلام پاک کی آیت مبارکہ کے پرتاثیر جملے اس خوبی اور کمال تحریر کے ساتھ چوکھٹون مین رکھکر آویزان کئے جاتے تھے جن کے درودیوار سوتے جاگتے، اخلاق آموزی حکمت پژوہی، اور خوبی مذاق کی طرف زبان حال سے تعلیم دینے مین مصروف

رہتے تھے، اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانون کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جاہلون تک کی زندگی کا دستور العمل بن گئے،

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزون کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے دامن امید مین ان موتیون کو بھرنا شروع کیا، آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر اور نایاب کتابون کا، مسلمانون کے علوم و فنون سے دلچسپیون کا، بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ اور محققانہ موشگافیون کا، میدان علم کی تلاش و جستجو مین اُن کے پرمغز کارنامون کا پتہ لگانا چاہو تو اس کا نشان یورپ کے سوا کہین اور نہین ملے گا، جب قوم مین قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر اور اس کی بقا کی امید ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ وقعت نہین رکھتی، جب اُن کے کتب خانے اپنے معلمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہون گے، تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا مین اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شایستگی کو اس عالم مین رواج دینے کی کفیل تھی، اور ہم نے بھی یہ سبق عالم کو پڑھایا تھا،

ایسی کوشش جو مسلمانون کے قدیم قلمی و علمی ذخیرہ کو فن خوشنویسی اور خطاطی کے کمال کو اُن کی انشاء کے طور و طریق کے نمونون کو قدیم خزاین کو آیندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے، جہانتک میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ طور پر عمل مین نہین لائی گئی، اور نہ اس وقت تک لائی جارہی ہے، لہذا اس کی حفاظت کی تدبیر عملاً اختیار کرنے کا وقت حد سے زیادہ گذر چکا ہے، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر رکھا کیا جائے، اور اس کو درست حالت مین رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے۔ (مقالات ص ۲۲۲ تا ۲۲۴)

یہ اپیل بہت طویل ہے، مذکورۂ بالا عبارت محض اس کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے

کہ مرحوم کو اسلامی علوم و فنون کے ساتھ کتنا شغف اس کی بربادی کا کتنا غم اور اُن کے تحفظ کا کتنا خیال تھا، گو یہ اپیل بھی زیادہ کارگر نہین ہوئی لیکن انھون نے خود اپنی محنت تلاش سے بڑی دولت صرف کرکے نادر اور قلمی کتابون کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ جمع کیا، اور اُن کا ذاتی کتب خانہ قلمی اور نادر نسخون کے اعتبار سے ہندوستان کے بہترین کتب خانون مین ہے،

پرانی تہذیب اور قدامت و وضعداری سے شیفتگی

علمی ذوق و شوق کے بعد مرحوم کی زندگی کا نمایان پہلو قدامت و وضعداری ہے، وہ خود قدیم تہذیب کا نمونہ تھے، اور اسی کا جلوہ وہ مسلمانون کی تہذیب و معاشرت مین دیکھنا چاہتے تھے، اُن کی تحریرین اس ذکر جمیل سے بھی بہت کم خالی ہوتی تھین، اُن کے تاریخی مضامین مین کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ضرور آجاتا تھا، اور جہان ہندوستان کی قدیم اسلامی سوسائٹی، پرانی وضعداریون یا کسی پہلو سے پرانی تہذیب کے کسی رُخ کا ذکر ضرور آجاتا، وہان اُن کے قلم کی بزم آرائی، اس اُجڑی ہوئی محفل کی یاد کی تڑپ اور تاثیر دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، اور اُن کی تحریرون مین پُرانی صحبتون پُرانے بزرگون کی وضعداریون، قدیم تہذیب و آداب اور دوسری تہذیبی خصوصیات کے بڑے دلکش مرقعے نظر آتے ہین، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہون،

فارسی زبان کے فیض کے سلسلہ مین تحریر فرماتے ہین :-

"فارسی ادب کی حیات بخشی کا نادر ثبوت وہ فضا ہے، جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین ہند مین پیدا ہوئی، اسی فضا کی روح پروری سے سارے مذہبی اور فرقہ واری اختلاف صلح سے بدل گئے، ہندو مسلم شیعہ سُنّی ... کے سب ایک رنگ میں رنگ گئے، رنگ پوڈر کا نہین جمعیت و یک جہتی کا تھا، گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، گورکھی، وغیرہ جس زبان کو لوگے، ادب فارسی کی گرمی سے اس کی نبض مین جنبش پاؤگے، آج کل کی تصانیف نہین، اس زمانہ کی تصنیف پڑھو، اس رنگ بلکہ یک رنگی کا واضح ثبوت پاؤگے، عارف رومی کی دو بیتین یہان برسبیل تنزل سبق آموز ہون گی،

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد، موسی و فرعون اندر جنگ شد
چونکہ بے رنگی رسی کان داشتے موسی و فرعون دارند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈالو یہ شعر مکرر پڑھو، مرقع عبرت نگاہون کے سامنے آجائے گا،

افسوس دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزان آگئی، وہ فضا ہی سٹ گئی، خاقانی و انوری کا درس ہے مگر مٹا ہوا برائے نام بلکہ نام کو بھی نہین، کیون ادبی فضا نہین، نتیجہ آنکھون کے سامنے ہے، جو لوگ زمانہ حال کو بنا گئے، اُن کو آنکھین ڈھونڈھتی ہین، اور نہین پاتین، راجہ رام موہن رائے، پنڈت اجودھیا ناتھ سر سید احمد خان محسن الملک اور وقار الملک آج کہان ہین،......اس بے کیفی کی تاریکی مین اگر کسی طرف سے روشنی نظر آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہے، (مقالات ص ۱۲۴)

تیموری دور کے ایک صاحب علم و قلم امیر راجہ کندن لال اشکی کے حالات مین لکھتے ہین،

"اس عہد کی تعلیم بزنگاہ ڈالو علاوہ علوم کے مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنون لطیفہ، خوش نویسی، تصویر کشی وغیرہ دائرۂ تعلیم سے باہر نہ تھے، راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف اُن کی مختلف ملازمتون اور ان اہل کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے، یہ ہمہ گیر طبیعتین وہی تعلیم پیدا کر سکی، جس پر صرف قدامت کے جرم مین نفرت کی نگاہین پڑتی ہین، (مقالات ص ۱۲۵)

فارسی شاعری کے مسلّم الثبوت استاذ خواجہ عزیز لکھنوی کے حالات مین تحریر فرماتے ہین،

"لکھنؤ کی سبزی منڈی مین خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی، انسان وہان پہنچا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک پاتا رونق دوبالا ہوتی، جب علامہ شبلی بھی وہان ہوتے، اور یہ اکثر ہوتا، تو لکھنؤ کی حاضری مین خواجہ صاحب کی خدمت مین باریاب ہوتا، میرے لیے لازم تھا، جس وقت اطلاع پہنچتی، تو محلسرا سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا، ہاتھ مین چائے کا سامان بالاتر

قلبی محبت جس کا اثر تمام حرکات وسکنات مین عیان نظر آتا، مراتب پذیرائی کے بعد بیٹھتے باتین کرتے، چائے کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا، ناممکن تھا کہ مہمان ہاتھ بٹائے، چائے مین زعفران ضرور پڑتی تمام کو سادی اور صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ ..... خواجہ صاحب کے اوصاف مین وہ تاثیر تھی کہ سیدھی مختصر باتون پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا، بارہا حاضر ہوا، مگر کلام سننے یا حاصل کرنے مین اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہین ہوا، ہان دوسرون کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے علمی سوالون کا جواب شافی ملتا، ناممکن ہے کہ ان صحبتون کا ذکر ہو، اور مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے، اس کا ایک طرف خاکساری سے بیٹھنا، کلام کے مزے لینا، نکتہ سنجی، لطف کلام ایک خاص لطف رکھتا تھا، جو برسین گذر جانے کے بعد بھی آج تک نقش ہے، (مقدمہ کلیات عزیز لکھنوی ص ۲)

خواجہ صاحب با اوقات وعبادت گذار تھے، مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت اُن کے جملہ حرکات وسکنات سے خود بخود عیان ہوتی تھی، مشک آنست کہ خود ببوید، نہایت غیور اور سیر چشم تھے، کسی کا بار احسان نہ اٹھا سکتے تھے، تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کر دیتے تھے بعض دفعہ دستی بھیجنے کا موقع نہ ملا تو پارسل ڈاک مین بھیجا، باوجود وضع کی پابندی اور شان استغنا کے نہایت ملنسار اور متواضع تھا، آدمی جتنی دیر حاضر رہتا، اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا، حسن اخلاق مذہب و فرقہ کی قید سے بالاتر تھا، مسلمان، عیسائی، ہندو، سنی شیعہ سب کے ساتھ یکسان اخلاق سے پیش آتے محض ظاہری اخلاق نہین، بلکہ وہ اخلاق جسکا دل پر اثر پڑتا عارف جامی کا مشہور شعر گویا انکی زندگی کا اصول تھا

پس چنان زی کہ بعد مردن تو

ہمہ گریان بوند تو خندان

اپنے استاد مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے حالات مین لکھتے ہین،

جب اس خاکدان سفلی مین اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی، اور اس کے فیض سے ایشیا اخترِ

اور یورپ تینوں برِاعظم رشکِ گلزار بنے ہوئے تھے، اس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالکِ اسلامیہ میں قائم تھا، یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے جن سے شہر خصوصًا دارالسلطنت سرسبز و شاداب رہتے، شہری آب و ہوا، دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو سست کر دیتی، تو قصباتی اہلِ کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے، اور بزمِ حیات کو از سرِ نو منور و معمور فرماتے، دہلی مرحوم میں شاہ صاحب اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو مثالیں ہیں،

اُن کے عادات و خصائل کی تصویر یہ ہے:-

"نشست و برخاست اور گفتگو میں تہذیب و وقار کی پوری شان تھی، نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے لیکن خاموشی میں بھی ایک عالمِ شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت و اخلاق عادت تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدتِ گرما میں سر پر چادر ڈال کر دھوپ میں چلے جاتے، اس سلسلہ میں ایک جان پرور واقعہ سن لو،

گرمی کے سخت موسم میں ایک مرتبہ مدرسہ عالیہ کا امتحان لینے رامپور تشریف لے گئے، امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بج گئے، حسب عادت سر پر چادر ڈال کر پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خان صدر مدرس مدرسہ جونپور کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کے لئے زنانہ مکان میں جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے، اوّل ایک پلنگ صاف ستھرا بچھوایا، اس کے بعد مہمان محترم کی پذیرائی فرمائی،

شانِ پذیرائی غور سے سنو، یہ واقعے اب کہاں دیکھنا درکنار، سنو گے بھی نہیں، اپنے بھتیجے حافظ سعد اللہ خان کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پاؤں پر عزیز سے پانی ڈلوایا اور اپنے ہاتھ سے پاؤں دھوئے سقاہ اللہ تعالیٰ کا ساً دہاقاً،

ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے، رامپوری فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا تو

یوں کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا، ایسی دھوپ میں تکلیف فرمائی، وہ بھی پیادہ پا اپنی خدمت کا اشارہ تک نہ کیا، ایک موقع پر جب راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکر گذاری کا ذکر کیا، تو فرمایا میں نے کیا کرم کیا، مجھ کو دوپہر کہیں بسر کرنی تھی، وہیں چلا گیا، کرم تو مولوی صاحب نے فرمایا یہ کہکر پاؤں دُھلانے کا واقعہ بیان فرمایا، دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جن سے علمی فیض کے چشمے کیا دریا بہتے تھے،

آدم بر سرِ مطلب مزاج شگفتہ تھا، با مذاق تھا، تکلف سے بَری تھے، خاص صحبتوں میں مزاح بھی فرماتے، شعر کا پورا ذوق تھا، خاص صحبتوں میں شعر کا ذکر چھڑ جاتا، تو گھڑیوں جاری رہتا اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اور اردو ادب سے یکساں ذوق تھا۔۔۔۔۔ گفتگو ہر شخص سے علی قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے جس کا اثر سامع محسوس کرکے محظوظ ہوتا، تعلّی یا ادّعا کا شائبہ بھی کلام میں نہ پایا جاتا، تقدس مآبی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی، تلاوت کلام مجید بھی تخلیئے میں فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصہ میں بھی زبان سے نہ نکلتے (استاذ العلما رص ۱۳۱ تا ۱۳۳)"

علامہ شبلی مرحوم کی خصوصیات کا مرقع،

"علامہ شبلی مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے، اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے، اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا، نظر میں بلندی تھی، مزاج میں استغنا، حوصلے میں عزم تھا، مزاج میں نفاست تھی،۔۔۔ صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، کمال کی خوبیاں نظر آتیں، عقلی برتری مؤرخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے، فضول باتیں اُن کی زبان سے میں نے کبھی نہیں سنیں،۔۔۔۔

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی، اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دلگیری کے ساتھ کیا، دوسرے بھائی (مولوی اسحٰق صاحب) کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی، احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ میں میں اور وہ ایک مکان میں مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں میں ڈنک مار دیا، اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہوگئی، اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا، ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے، نمک کھانے میں تیز ہو، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے، اور کھانے میں ڈالتے جاتے، شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتیں کرتے جاتے ہیں، قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیریں کام رہتے ہیں ع

سخن ہائے شیریں بہ از قند ہست،

مرچ کی تیزی کی تاب نہ تھی، فرماتے تھے، میں نے یہیں ہتھیار ڈالے ہیں،...... نیز پانی تیز و سرد پیتے تھے، جاڑوں میں بھی یہی ہوتا تھا، اس کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے تھے، ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے، متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی، دوسرے دن خاص اہتمام سے ایک خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا، گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے، اس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے یادگار رہیں گے، چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے، صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے، عادات میں سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے، غذا بہت کم تھی، آخر آخر میں غذا کی قلت پر حیرت ہوتی تھی" (مقالات ص ۱۷۰، ۱۷۱)

منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی تصویر،

" میرے محب قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصار قصبہ کاکوری کے چشم و چراغ اور

نامور و مستحکم آئین باپ کے فرزند تھے، اُن کی صفات مین دونون کا جلوہ تھا، لکھنؤ کی شایستگی کا لباس مین، کھانے مین، نشست و برخاست مین، معاشرت مین، گفتگو مین پورا جلوہ شایستگی کا نمایان بلکہ تابان تھا، لباس مین وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا، جو عمائد لکھنؤ کا تھا، جاڑون مین شال اور جامہ وار کے جلوے، دُر جوہر نظر آتے، گرمیون مین جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی، یہی نہین شال جواہرات وعطر وغیرہ کی شناخت اسکے مالہ وماعلیہ کی واقفیت اور پرکھ مین اعلیٰ دماغ تھا، اب بھی خریدنے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھرون سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر سے آتا ہے، جب ایسا موقع ہوتا، تو مین ضرور یاد آتا، قریبًا ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا، درست کرایا جاتا، اگر کنارے حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی، توشہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا، غرض پرانا بوسیدہ ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا،

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی، خوبی مذاق، بلند حوصلگی اور لطافت کا نمونہ ہوتا تھا برسون دیکھا لطف اٹھایا، ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا، ہر کھانا دال سے لے کر بریانی اور زعفرانی تک اپنے معیار پر ہوتا، دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا، عزیز احباب صادر و وارد بھی ہوتے، سب کی نشست مدارات یکسان بلا فرق ہوتی، کھانے مین منشی صاحب کی شگفتگی لطف پر پوری جان نوازی فرماتی، کھانے ہر ہر موسم کی رعایت سے تیار ہوتے، عادات مین منشی صاحب تکلف تصنع طمطراق سے بالکل پاک وصاف تھے، اسی کے ساتھ نہایت شایستہ اور پختہ وضع، مین نے باون برس کی مسلسل رفاقت مین کبھی کوئی فرق کسی عادت مین نہین پایا، بے تکلف اور مخلصانہ صاف گوئی، کلام مین بھی، رائے مین پختہ بلکہ سخت تھے، جو کسی رعب طمع، یا خاطر داری سے مرعوب و اثر پذیر نہ ہوتی،

مذہب کے سخت پابند تھے، نماز روزہ اور اوراد و وظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم، عقائد مین مستحکم یہ اثر تھا، حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا"

نہایت فیاض تھے، عزیزون ملنے والون، صادر و وارد، حاجتمندون غربا و مساکین کی خدمت مین علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے، اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصّہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا، جو طلبہ کے لئے مخصوص تھا، متعدد مستقل ٹھہر کر تعلیم حاصل کرتے، بعض امتحانون کے موقع پر آتے تیاری کرتے امتحان دیتے چلے جاتے، اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے،

ایک حصّہ کوٹھی کا عزیزون، مہمانون، دوستون کے تصرف مین رہتا، عارضی بھی اور مستقل بھی دوستی اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف مین یون نمایان تھی، جیسے آفتاب کی کرنین ہر موقع پر ہر معرکہ مین وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی، محبت پیکر مجسّم بن کر سامنے آجاتی، بہت کچھ لکھا گیا، پھر بھی قلب اور قلم دونون کہتے ہین کہ کچھ نہین لکھا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو، ایک نمونہ تھے، قدیم پاکیزہ اخلاق وضعداری حسن مذاق شائستگی، دوستی اور اسلامی زندگی کا (مقالات ص ۳۹۹ تا ۴۰۲)"

چودھری نور اللہ خان رئیس سہاور کی خصوصیات مین تحریر فرماتے ہین،

"چوہتر برس کی عمر پائی، اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضعداری سے نباہ گئے، وہ ایک کارنامہ زندگی ہے، ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصّون نے عالم مین کس قدر تغیرات دیکھے ہین، اور کیسے کیسے انقلابون کا تجربہ کیا ہے، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی، وضع عادات و حرکات مین اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم رہے،

عادات نہایت شائستہ، مگر بحد متحکم اور مضبوط تھین، برآمدہ مین ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی اس پر مُنبّی گدا اور تکیہ لگا رہتا، صبح کی نماز اور ضروریات سے فارغ ہو کر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس پر نشست ہوتی تھی، اور آنے جانے والون کاروبار کے آدمیون اور اہلِ حاجت کے واسطہ اذن عام ہوتا، کوئی موسم ہو کیسی ہی سردی و گرمی ہو، اس مین فرق نہ آتا تھا، عصر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے واسطے جنگل کو تشریف لیجاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے، آندھی آئے بارش ہو اس مین تغیر نہ ہوتا تھا، (مقالات ص ۱۵۸)

ذوق ادب و انشار فطرۃً لطیف الطبع، نفیس مزاج اور نازک خیال تھے، خوشگوار رنگینی کی بھی ہلکی سی جھلک تھی، اُن کی لطافتِ ذوق کا اثر اُن کی پوری زندگی مین نمایان تھا، چنانچہ اردو اور فارسی دونون زبانون کے شعر و ادب کا بڑا ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے، اور اپنی تحریرون مین حسن انشار کا خاص اہتمام رکھتے تھے، اس لئے گو اُن کی تحریریتین اور باوقار ہوتی تھی، لیکن اس مین ادب و انشار کی تمام خوبیان اور لطافتین موجود ہوتی ہین، اپنے مجموعۂ مقالات کے دیباچہ مین لکھتے ہین، :-

"ایام طالب علمی مین کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی تھی، اس مین علامہ کا یہ قول بلاغت مین پڑھا تھا، کمالِ بلاغت اس مین ہے، کہ واقعات کے بیان مین جوہر بلاغت نمایان ہون، اس لئے کہ واقعہ نگاری مین بیان واقعات کے تابع ہے، لہٰذا میدان تنگ ہے، اور افسانہ و خیالی مضامین کی نگارش مین بیان آزاد ہے، اور افسانہ و مضامین تابع اس قول کو دل نے لے لیا لکھنے کا شوق واقعہ نگاری مین پورا ہوا، افسانہ اور خیالی مضامین سے طبیعت کنارہ کش رہی، خودستائی معیوب ہے تاہم بعض نکتہ سنج اربابِ ذوق نے جو خیال میری تحریرون کی بابت ظاہر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مین بحمد اللہ کامیاب ہوا، اب نظر کو بڑھائیے، مقالات پڑھئے، اور خود فیصلہ کیجئے"

بلاغت کے ان نکتون سے اُن کی کوئی تحریر خالی نہین ہے، خصوصاً شعر و ادب کے مضامین مین جوہر بلاغت زیادہ نمایان ہین، امیر خسرو کی مثنوی مجنون و لیلی کا مبسوط مقدمہ جو مرحوم کی تنقید و تصحیح کے ساتھ ساتھ شائع ہوئی ہے، اور خود مرحوم کے دیوانِ فارسی مین اُن کے قلم سے فارسی شاعری کے ادوار اور اسکی خصوصیات پر تبصرہ اُن کی ذوق ادب نکتہ سنجی اور حسن مذاق کے اچھے نمونے ہین لیکن یہ سب بہت طویل ہین اُن کے اقتباسات نقل کرنا دشوار ہے، اس لئے ان کی مختلف تحریرون سے ادب پارون کے کچھ نمونے نقل کئے جاتے ہین،

مرحوم نے اپنے زمانۂ شباب مین حیدر آباد کے رسالہ حسن مین بابر پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ۳، سال

کے بعد جب کہ اس بہار پر خزاں آچکی تھی، کتابی صورت میں شائع ہوا، اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"جون ۱۸۹۰ئ سے ستمبر سنہ مذکور تک مضمون بالا رسالہ حسن میں شائع ہوتا رہا۔ اس کو ۲۱ برس گذر گئے، وہ وقت ابتدائے شباب کا تھا، زندگی تازہ بہار تھی، امیدوں کے پھول سے دل و دماغ شگفتہ و شاداب تھے، زندگی بعینہٖ اسی دلآویزی کے ساتھ نظر کے سامنے تھی، جیسے کسی خوشنما شہر کا پہلا منظر، اب بھی مضمون کے مطالب میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، البتہ تقاضائے عمر نے فطرۃً بعض الفاظ کی شوخی و رنگینی پر چشمک زنی کی، مگر تصرف سے یہ خیال مانع رہا کہ یہ شوخی و رنگینی زندگی کے دورِ عزیز کی امانت ہے، اور امانت میں دست اندازی نا روا، وہ عزیز عہد نہ رہا، تو اس کی یادگار رہے، یا د رہے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر، "

فارسی غزل کی خصوصیات کے جلوے ملاحظہ ہوں،

فارسی غزل کو دیکھو، مضامین اس میں بھی تقریباً متحد ہیں لیکن یہاں (اردو غزل) سے وہاں (فارسی غزل) ایک بات زائد ہے یعنی خیال اس خیال کی نیرنگی نے غزل کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے جس کے جلووں کی انتہا نہیں، جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا، اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی آفت روزگار ہے، جو پہلے جلوہ گر تھا، یا اور ہے،

عربی فارسی میں جس چیز نے شور محشر بپا کر رکھا تھا، وہ تصوف ہے، فارسی عربی گویوں میں بہت سے باکمال ایسے ہوئے جن کے سینوں میں عشق حقیقی کی آگ شعلہ زن تھی، یہ شعلے جب منہ سے نکلے تو غزل کہلائے" (مقالات ص ۸۶، ۸۰)

شوکت بلگرامی نے رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعی میں کیا تھا، اس کا دیباچہ مولانا شروانی نے لکھا تھا، اس میں تحریر فرماتے ہیں :-

"رباعیون کا وزن مخصوص ہے، زبان مخصوص، خیال پورا ہونا درہو، توحید، حکمت یا عشق کا نچوڑ اس مین ہو، ان قیود کے ساتھ چارون مصرعے باہم ایسے مربوط ہون کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیان معلوم ہون، تلم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے، جو دل پر جا بیٹھے، خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی مین کھپانی پڑتی ہے، غزل کی تڑپ قصیدے کی متانت، مثنوی کا تسلسل رباعی مین ہو، اس کے ساتھ رباعی کا مخصوص اختصار میدان سخن کو تنگ کر کے اشہب قلم کی کمر توڑ دیتا ہے، حاصل کلام عطر سخن رباعی ہے،

نیشاپور کے میخانہ قدیم مین ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام مین حکمت کا امتزاج ہوا، اس امتزاج سے نشہ دوبالا ہو کر جو رنگ لایا، اس کی جھلک اس بادۂ شیراز مین ہے،

از ان افیون کہ ساقی در مے افگند   حریفان را نہ سر ماند نہ دستار

ممالک ایشیا اس نشہ سے جھوم رہے تھے، یورپ بھی جام اوّل مین بیخود ہو گیا، افلاطون کدۂ بلگرام کے خم نشین شوکت نے اس بادۂ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دور جدید سے آشنا کیا یعنی نیشاپوری شراب اردو کے ساغر مین لنڈھالی، اس مے دوآتشہ سے نشہ کی رسائی دوبالا ہوگئی، اسی مے دوآتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالنی ہے، مبادا دامن صدارت پہ دھبہ لگے، (ریاست حیدرآباد کی امور مذہبی کی صدارت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اوّل ایک شعر سنا دیتا ہون :-

نہ من تنہا درین میخانہ مستم   جنید و شبلی و عطار شد مست"

(دیباچہ مے دوآتشہ)

شیخ محمد بن طالب گجراتی کے حالات کی تمہید مین ارقام فرماتے ہین :-

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام پہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طلوع ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب ملک عرب کو گئے، اور چشمۂ رحمت کا صاف اور خالص آب حیات ول سے لگا کر لائے، شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک مین پھیلا اور سر دو رون کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلانے لگی، (مقالات ص ۲۹۵)

خواجہ میر اثر دہلوی کا سلسلہ شاعری یہ ہے، خواجہ میر درد، محمد نام عندلیب، شاہ سعد اللہ گلشن، شاہ محمد قدرت اللہ گل، یہ اصحاب شاعری کے ساتھ صاحب دل بھی تھے، مولانا شروانی خواجہ میر درد کے دیوان کے دیباچہ میں یہ شجرہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"دیکھو گل کی جلوہ نمائی سے گلشن ہوا، گلشن نے نامہ عندلیب پیدا کیا، نالۂ عندلیب سے درد جلوہ افروز ہوا، درد سے اثر پیدا ہوا،

این سلسلہ از طلائے ناب است   این خانہ تمام آفتاب است"

الندوہ کی اڈیٹری میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا شروانی کا نام بھی تھا، اس کی مصلحت یہ بیان کی ہے:۔

"جب اس رسالہ کے اجراء کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو اڈیٹری میں میرا نام اس وجہ سے ضم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکا چوند کو کم کرتی رہے گی، اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ ملے گا، (مقالات ص ۲۰)"

علی گڈھ کالج کے مشہور استاد پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کی ملاقات اور تعلقات کے علمی فوائد کی ان الفاظ سے تعبیر کی ہے،

"یہ دونون دلدادگان علم باہم ملے، اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعین باہم مل کر عالم کی روشنی کا سبب بنتی ہین"

مولانا شبلی کو شیرینی بہت مرغوب تھی، کچھ نہین تو شکر کے دانون ہی سے شغل کیا کرتے تھے، اس کا اس پیرایہ مین اظہار کیا ہے،

شیرینی حلو سوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتین کرتے جاتے ہین، قند کے دانے منہ مین ڈالتے جاتے ہین، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام ہوتے ع

ع سخنہاے شیرین بہ از قند ہست"

خواجہ عزیز لکھنوی بہت کم سخن اور خاموش تھے، ان میں شیرین بیانی نہیں تھی، دیکھئے یہ عیب حسن بیان سے ہنر بن جاتا ہے،

"کم سخن تھے، اور سادہ بیان خود ستائی سے کوسوں دور اسلئے گفتگو میں خوش بیانی نہ تھی، مگر ع

ورائے شاعری چیزے دگر بود

لیکن خواجہ صاحب کے اوصاف میں وہ تاثیر تھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا"،

ایسے ادبی شرارے جن سے پوری تحریر چمک جاتی تھی، اُن کی تحریروں میں بکثرت ملتے ہیں بلکہ ان کی کوئی تحریر بھی اُن سے خالی نہیں جس کا اندازہ اوپر کے طویل اقتباسات سے بھی ہوا ہوگا، یہ مزید مثالیں اندازہ کرنے کے لئے پوری طرح کافی ہیں، درحقیقت دوسرے مناظر زادیوں کی طرح مرحوم کا بھی ایک نہایت دلکش اور دلپذیر طرز تھا، جو انھی پر ختم ہو گیا،

صدق (جدید)

(زیر ادارت)

مولینا عبد الماجد بی اے دریابادی صاحب تفسیر القرآن

انشاء اللہ یکم دسمبر ۱۹۵۰ء سے پورے آب و تاب کے ساتھ نکلنا شروع ہو جائے گا،

قیمت سالانہ بجائے عہ کے ہیر

پتہ

حکیم عبد القوی دریابادی مہتمم "صدق جدید" کچہری روڈ، لکھنو،

صدر یار جنگ

ذاتی تاثرات

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالبعلمی کا تھا، اور مولانا شروانی ایک خاصہ پختہ کار اہل قلم، اپنی جوانی کی آخری منزلون مین تھے، اور علی گڈھ منتھلی کے مضمون نگار رہتے، یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے. چند ہی روز مین دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنو) کے سرورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے —— ایک اڈیٹر تو مولانا شبلی نعمانی تھے، اور دوسرے ان کے حبیب لبیب اور ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی۔

الندوہ مین شروانی صاحب نے لکھا لکھایا تو برائے نام ہی لیکن نام بحیثیت اڈیٹر کے برسون چھپتا رہا —— کچھ ہم رنگی اس باب مین مولانا شرر مرحوم سے حاصل رہی تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر، لیکن شاعری کا نمونہ دیکھنا چاہیے تو کسی "ریسرچ اسکالر" کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہین! مضمون شاید چند سال کی مدتِ ادارت مین ایک ہی لکھا "حیات خضر" دو نمبرون مین، باقی ان کے نام کا تلازم مولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن مین خوب جم گیا —— دو چار سال اور گذرے، اور اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ مین جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت مین رہنے لگی، تو معلوم ہوا کہ کم از کم جہاں تک معاملاتِ ندوہ کا تعلق ہے، خان شروانی اور شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا ساتعلق ہے،

ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم! ـــــ علی گڈھ اور اعظم گڈھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط، ایک اور رشتۂ توافق واتحاد!

صوری زیارت سب سے پہلے ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ مین ہوئی، سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا، ارکان مین دو پارٹیان تھین (اور مسلمانون کی کس انجمن یا ادارہ مین پارٹیان نہین!) ایک فریق کے لیڈر مولانا شبلی تھے، اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری ہملوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیون مین شریک کہ اگرکسی موقعہ پر پبلک کی مدد کی ضرورت پڑی تو تو پبلک کے نمایندہ بنکر مولانا شبلی کو کمک پہنچائی جائے گی، فلان صاحب آئے اور فلان صاحب آئے ـــــ اپنے لیے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسہ مین بیٹھنے کو مل گیا، تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! ـــــ یہانتک کہ مولانا شروانی آگئے: حسن مردانہ کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی، متانت بلائین لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست "شبلوی" ہین، دیکھنے مین یہ آیا کہ یہ اپنا دامن ہر فریقانہ آلودگی سے بچائے ہوئے، نہ گفتگو مین گرمی، نہ لہجہ مین درشتی، ایک پیکر حلم وآشتی،

سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک لغو سی کتاب (لغو، تو اب کہہ رہا ہون، اس وقت تو وجہ نازش تھی) فلسفہ اجتماع کا مقدمہ الناظر مین نکلا، اس مین دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی، اس کی تردید اور صفائی مین بہ طور شاہد عینی کے شروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر مین موجود، لیکن تردید مین نہ تلخی نہ تعریض، بس صاف اور سادہ بیان واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ ہی پر نمایان نہ تھا، قلم بھی اسی رنگ مین ڈوبا ہوا تھا،

۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شروانی صاحب حیدرآباد صدر الصدور امور مذہبی ہو کر نئے نئے پہنچے، ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا، مین اپنی زندگی کے اسی دور مین الحاد و بے دینی کے لیے بجا طور پر رسوا اور بدنام، اور عین اسی زمانہ مین ایک کتاب کے سلسلہ مین خاص طور پر حیدرآباد

کے سلم پریس کی زد مین آیا ہوا، شروانی صاحب عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہین اونچے مرتبہ پر، پہلی مرتبہ حاضری کی نوبت اتنے مخالف حالات مین ! گیا تو بہت ڈرتے ڈرتے لیکن پہلی ہی ملاقات مین معلوم ہو گیا کہ ڈر بے محل اور اندیشہ بیجا تھا، خوب ملے، اس کا سایہ بھی نہین پڑنے دیا کہ میری بدمذہبی اور بدعقیدگی ان کی شفقتون اور عنایتون کی راہ مین کچھ بھی حائل ہو رہی ہے۔— اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی دن اور حیدرآباد مین ہوا، شروانی صاحب کی فرض شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی اور کارگذاری کے چرچے سن سن کر جی خوش ہوتا رہا،

اگست مین رخصت پر لکھنؤ آیا، اور یہان سے استعفا لکھ کر بھیجا، بیکاری کو ابھی ۸ ہی ۹ مہینے ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی مین سر امین جنگ مرحوم (صدر المہام پیشگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ اعلیٰحضرت نے یاد فرمایا ہے، فوراً آجاؤ، گیا، اسٹیشن پر ہی حکم ملا کہ قیام سرکاری طور پر صدر الصدور امور مذہبی ہی کے یہان رہیگا، جانا اور رہنا پڑا، ۴، ۵ روز کے قیام مین مولانا کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ ان کی صحیح مذہبیت (جس مین تعصب و نفرت کا شائبہ نہ تھا)، دینی پختگی (جو کہ خشکی سے ناآشنا تھی)، معتدل اور متوازن خوش اخلاقی مہمان نوازی، ایک مرتب نظام اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و طرز معاشرت کی نفاست، وضعداری، ایک ایک چیز کا مشاہدہ ہو گیا، اور ایک ایک چیز دل مین اتر گئی،

اعلیٰحضرت کے یہان باریابی، اور پھر میرے لئے ماہوار تصنیفی وظیفہ کی منظوری کے سارے مرحلون مین مرحوم جس شفقت اور اخلاص کے ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے، اس کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے،

اب تعلقات بڑھے، اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے لگی، اور ذاتی، قومی، ملی، دینی سب ہی مسئلے موضوع گفتگو رہے، اور ملاقاتین کبھی لکھنؤ مین ہوتی رہین، کبھی علی گڑھ مین، اور کبھی حیدرآباد ہی مین،——

مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اس کے رکن کیا معنی رکن اعلیٰ تھے، پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ مین شریک ہوتے، علی گڑھ سے سفر کر کے لکھنؤ آتے، اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کاکوروی مرحوم

کے ہاں ان کی خیالی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی، اس معمول میں نہ فرق آنے پایا، اور علی گڈھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا، یونیورسٹی کورٹ کی ہر میٹنگ میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے۔

مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر، خواہ طوعاً خواہ کرہاً، ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں، ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خان، کل سر سلیمان کا تخت سلیمانی اتر رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ابھی نواب مزمل اللہ خان کا طوطی بول رہا ہے، تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے، ابھی نواب محمد اسمٰعیل خان ہاتوں ہاتھ لائے جا رہے ہیں، تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی پیشوائی کے لیے فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ کچھ ان کے ساتھ، اور کچھ "ان" اور "اُن" دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ ــــ شروانی صاحب کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ میں بھی تو اپنا امتیاز اسی طرح قائم رکھے ہوئے تھے، مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسر پیکار، لیکن شروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار و خوشگوار، گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال!

۱۹۲۰ء و ۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور ہوا ہے، تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان زوروں پر، ملک کا سواد اعظم شیخ الہند، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، اور علی برادران اور مولانا ابو الکلام کے ساتھ، ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے، ندوہ اور علی گڈھ دونوں زد پر اور ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکہ کا مورچہ علی گڈھ تھا، شروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے دوسرے کیمپ میں، کچھ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سننا پڑا، کیا کچھ سہنا پڑا، جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان و قلم پر قابو رہا ہے، آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے، اور کل "حبیب الرحمن" سے "حبیب الشیطان" مشہور ہوئے! ــــ یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت ہی سے سنتا رہا، سہتا رہا،

ایک زمانہ وہ تھا، ۱۳، ۱۴، سال قبل جب ابو الکلام آزاد کا شمار حلقۂ شبلی میں بندیوں میں تھا،

اور مولانا شروانی کے ہان ان کا تقرب خود ان کے لیے باعث فخر و مباہات تھا، اب دیکھتے دیکھتے وقت وہ آگیا تھا کہ مولانا ابو الکلام لیڈری کے بام بلند پر تھے، اور شروانی صاحب ایک اہل قلم، اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہان تھے وہین قائم ـــــ ظرف و شرافت کے امتحان کا اصلی وقت، دوستی و اتحاد کا نہین، مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان تو اپنی تند مزاجی کے لیے بدنام ہین، اور شروانی پٹھانون ہی کے ایک خاندان کا نام ہے، صدر یار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھون نے پٹھانون کو حلم و متانت سے یکسر معرّیٰ قرار دیا ہے، انھون نے کلیہ قائم کرنے مین جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہین علم[۵] بھی کبھی شروانیون مین ہم

مارچ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش مین ارادہ عرس اجمیر مین شرکت کا کر لیا، لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہو گیا، ان پر باوجود علم و فضل کے مشائخانہ رنگ غالب تھا، خیر صاحب اجمیر پہنچکر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطر داریان ہوئین، شروانی صاحب بھی یہان آئے ہوئے تھے، ذاتی طور پر ہر آستانۂ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی، لیکن یہان اس وقت انکی آمد سرکاری حیثیت سے تھی، مملکت حیدر آباد کے صدر الصدور محکمۂ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف سے ہاتھون ہاتھ لیے جا رہے تھے، اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے، رات کے وقت محفل سماع مین دیکھا، عام لوگون کی صف مین مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی طرح بیٹھے ہوئے! ان سے کہین بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر سے بہتر جگہ ان کے لیے خالی کرائی جا سکتی تھی، لیکن طبیعت مین یہ انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے

---

۵ اصل شعر مین بجائے 'علم' کے 'عقل' ہے

باوجود اپنے لیے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہین! —— غلبۂ تواضع کے مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا، حیدرآباد، اعظم گڈھ، علی گڈھ، لکھنؤ مین خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے، اور بعد کو بھی ہوتے رہے، ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء مین علی گڈھ مین کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا، انتخابی کمیٹی مین مولانا شروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا، "انٹرویو کے وقت جب مختلف علما آنے شروع ہوئے، تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدر یار جنگ کو بٹھا، کسی ضرورت سے باہر چلے گئے، ان حضرت نے کیا کیا کہ معاً خود بھی کرسی صدارت چھوڑ اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا! مین شرمندگی سے گڑا جاتا تھا، لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا! —— اور آخر زمانہ مین جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے، یہ تو بارہا دیکھنے مین آیا کہ لکھنؤ مین ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور حضرت صدر یار جنگ اپنی مستقل صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیاز مند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہین!

گفتگو بڑی پر لطف ہوتی تھی اور پر مغز بھی، علمی، ادبی، شعری، مذہبی، تعلیمی، سیاسی جو موضوع بھی چاہیے چھیڑ دیجیے، اور گھنٹون اس مجلس سے سیری نہ ہوگی، اللہ نے رئیس کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا، کھاتے پہنتے تو خوب تھے ہی، کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے، اور جاڑون کے موسم مین شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے، اس دعوت مین جو ایک بار بھی شریک ہو جاتا اس کا مزہ مدتون نہ بھولتا —— تحریر مین ادب سے بڑھکر انشا پردازی کی شان رکھتے تھے، متین، سلجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زائد نہ کم، بس ٹھیک اتنے ہی جتنے مؤثر ادائے مطلب کے لیے ضروری ہوتے، گویا ہوشیار اور فنکار معمار عمارت مین گڑھی ہوئی اینٹین چن چن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے! —— اور تحریر سے بڑھکر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونون مین، میدان مین خطاب عام ہو تو اور کمرہ کے اندر خطاب خاص ہو تو، زبان حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے ہوئے، دلکشی و تاثیر کے سانچے مین ڈھلے ہوئے، ۱۹۲۶ء مین جب حج و زیارت سے واپس آئے ہین تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات

مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ زبان میں اس انداز سے بیان کرتے کہ سمان بندھ جاتا، خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلا دیتے،

غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے تو کہنا چاہیے کہ پتلے ہی تھے، ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء میں اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا سر اٹھار کھا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے، خیر وہ تو جون تون کرکے ہو گیا، شروع ۱۹۳۲ء میں ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لیے حکومت وقت کی منظوری لینی ضروری تھی، صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خان مرحوم تھے، ان پر مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو چل چکا تھا، ان اثرات کو باطل کرنے کے لیے درکار ایسی ہی زبردست شخصیت تھی اور وہ صدر یار جنگ کی ذات میں ہاتھ آگئی ——— بیچارہ نے پس پردہ رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا،

اسے چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، آج سے ۲۵ سال قبل ہمارے جوار میں ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے، پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق، بڑے ذہین و شوخ نگار، ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے، علی گڑھ میگزین وغیرہ میں طالبعلمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے، اور بزرگ بھی داد دے دیتے، جس طرح ہر نومشق اور ہونہار اہل قلم کی اسکی ہمت افزائی کے خیال سے داد دیدی جاتی ہے، اللہ کا کرنا کہ ۱۹۲۲ء میں تو سجاد مرحوم کا عین شباب میں انتقال ہو گیا، اور اس کے کئی سال بعد بعض "خوش مذاق" بے فکروں نے ان کے مضامین اور ایک نا تمام ڈراما کو کتابی صورت میں چھاپ دیا، اور علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے کارکنوں کو خدا معلوم اس میں کونسی ادبی خوبیاں نظر آئیں کہ کتاب کو داخلِ نصاب کر دیا، اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بدمذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا، اور پہلے باادب تمام یونیورسٹی کے استادون

کی خدمت مین عرض معروض کیا مطلق پذیرائی نہ ہوئی، ہارکر اور مجبور ہوکر بلند آواز سے چیخنا چلانا پڑا، اور اب یہان سے شرکت صدر یار جنگ کی شروع ہوتی ہے، وسط ۳۳ء مین ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی جس کے صدر، موصوف تھے، اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوا یا، حضرت کی پوری رائے صدق ۸ر نومبر ۳۳ء مین اس کے ڈھائی تین کالمون مین درج ہو چکی ہے، یہان اس کے چند اقتباسات کافی ہون گے:-

"علی گڈھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہرحال اردو کے اعلیٰ میگزین مین نہ تھا اس مین مضامین کی اشاعت کسی بلندیٔ خیال یا پاکیزگیٔ ادب کی ضامن نہین ہو سکتی،

سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد فلسفہ، اخلاق، مذہب سب ہی سے بیزار ہین، مذہبی ادب کی عظمت کا ایک فقرہ مین بہ خیال خود خاتمہ کر دیا ہے گویا ان کے یہان کوئی اصول زندگی نہین بے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے، ان کے ہان تین محبوب ہین، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک صاف ہو، ایک غرق شباب قحبہ جو کسی کمرہ پر داد عیش دے رہی ہو، وفا در پابندی سے سخت بیزار ہو، کہ لات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف مین ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہین، اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث، ننگ انسانیت ہے۔

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے، اگر باوجود پوری کاوش کے مجھکو پتہ نہ لگا کہ ان دو لفظون کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے ہان کیا ہے، پڑھنے والا جس گناہ سے لطف لینا چاہے اسکو محبوب قرار دے لے،

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے، اول سے آخر تک شیطان اور شیطنیت کو سراہا ہے، خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے، بلکہ پیدایش عالم کی اصل حکمت،

اس کے مقابلہ مین انبیاء کرام، ملائکہ مقربین بلکہ ان کے "ڈراباز" وزخرنا" کا خدا بھی پست و بے وقعت

ہیں، حضرت جبریل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی جس طرح اس ڈراما میں شیطان کے مقابلہ میں تضحیک کی گئی ہے، اس کو پڑھکر ڈراما نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے، مذہب کے استخفاف سے محشر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، مضامین زلیخا، رد و تحریر میں جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ میں کم فہمی جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، وہ قابل صد نفرین ہے .... بہرحال میری رائے میں محشر خیال نہ ادب ہے، نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور تخئیل انصب العین کی، اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس میں رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہیں رکھتی ہے، اس کے اوصاف خود اس کے قدر دانوں نے دو تین لفظوں میں بیان فرما دیے ہیں، "شعلۂ مستعجلہ" تملما یا اور جگمگایا" بس یہی پوری تعریف محشر خیال کی ہے، رات کو جگنو جگمگایا، تلملایا، تھوڑی دیر میں شعلۂ مستعجلہ کے مانند گل اور خاموش، پھر تاریکی اور اندھیرا"

اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظر، مذہبیت سب پر خاصی روشنی پڑ گئی، مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق میں وہ ایک ستون مستحکم تھے، اور ملت کے سامنے ان کی تحریریں اردو میں ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھیں، اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہاں نظر آئے گی؟ ——— کُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ سکینڈوں بار کی طرح ایک بار پھر پڑھکر دل تھام لیجئے،

تاریخ اخلاق اسلام

اس میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتوں سے نقد و تبصرہ ہے،

(مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی) قیمت: ۱۲ عا

"منیجر"

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی
کے
خاندانی اور ذاتی حالات

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

علی گڈھ کا شروانی خاندان صوبۂ متحدہ کا نہایت ممتاز صاحبِ وجاہت اور تاریخی خاندان ہے، مسلمانون کی تعلیم جدید کا مرکز بھی علی گڈھ ہی تھا، اس لیے شروع سے اس کی امداد و اعانت مین شروانی خاندان کا بڑا حصہ رہا، نواب سر مزمل اللہ خان مرحوم شروانی عرصہ تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، اور اس کو لاکھون روپئے کے عطیے دیے، خود مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مسلم یونیورسٹی کے رکن رکین اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، ان کے علمی و تعلیمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس لیے دنیاوی دولت و وجاہت کے علاوہ اس خاندان نے علمی و تعلیمی خدمات انجام دی ہین، اس لیے مولانا شروانی کی یادگار کے سلسلہ مین اس خاندان کی مختصر تاریخ بھی لکھ دینا مناسب معلوم ہوا،

خاندانی حالات | ہندوستان مین شروانیون کا ورود بہلول لودھی کے عہد مین ہوا، ۱۴۵۱ء مین جب اس بادشاہ نے خاندان سادات سے افغانون کے لیے سلطنت ہند کو حاصل کیا، تو اس نے افغانستان کے قبائل کو ہندوستان آنے کے لیے ترغیب آمیز اور تحریص انگیز خطوط لکھے، چنانچہ نوح

قندھار سے چند سربرآوردہ قبیلے شروانی، غلزئی، لودھی، سوری، لوہانی، اور نیازی ہندوستان وارد ہوئے، ان میں سے شروانی، غلزئی اور لودھی حقیقی بھائیوں کی اولاد تھے، لودھیوں نے اپنی حکومت کا سکہ ہندوستان پر بٹھایا، اور شروانی خاندان نے مسند وزارت کو زینت دی، اور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ کے حقدار قرار پائے، بہلول لودھی کے عہد میں عمر خان شروانی وزارت کے منصب پر متمکن تھے، ان کا خطاب مسند عالی تھا، ان ہی کی کوشش سے سکندر لودھی کو دہلی کا تخت حاصل ہوا تھا، جب ابراہیم لودھی کا زمانہ آیا تو افغانی امرا، اس کی بے عنوانیوں اور مظالم سے تنگ آکر ملک کی مختلف سمتوں میں پھیل گئے، اور افغانی قبائل کا جو شیرازہ بہلول لودھی نے باندھا تھا، وہ منتشر ہو گیا، ۱۵۴۰ء میں جب شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا، تو اس نے بنگالہ میں افغانی قبائل کی مجلس مشاورت منعقد کر کے یہ تجویز پیش کی کہ وہ جس کو چاہیں اپنی مرضی سے سلطنت ہند کا مالک بنا دیں، چنانچہ عمر خان شروانی کے فرزند نے اصرار کر کے خود شیر شاہ کو تخت نشین کرایا، شیر شاہی معرکوں کے بعد جب سلاطین مغلیہ افغانوں سے برہم ہو کر ان کا قلع قمع کرنا چاہا تو خاندان شروانی کے مورثوں نے شاہی تعلقات کو چھوڑ کر مختلف مضافات میں زمینداریوں پر قبضہ کر لیا،

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کی خاندانی روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خاندان شروانی کے دو بزرگ محمد میر خان اور محمد مغیث خان نے لودھیوں ہی کے عہد میں سرکار کول (یعنی علی گڈھ) کے نواح میں آکر آباد ہو گئے تھے، محمد میر خان کی اولاد پہلے موضع پرورہ میں آباد ہوئی، پھر وہاں سے دتاولی، برلہ، سہاولی، سنہرہ، دھنساری اور بردلی کے مواضعات میں پھیل گئی، محمد مغیث خان کے تین بیٹے تھے، سالار الدین، رکن الدین اور بہار الدین، موخر الذکر کی اولاد میں سے اب کوئی باقی نہیں ہے، سالار الدین کی اولاد بھموری، بھیکم پور، دادوں، اکبر یہ بوڑھا گاؤں حسن پور، کنولی، بھاموں، ہنڈولی اور کناوہ وغیرہ میں آباد ہے، محمد مغیث خان کے دوسرے بیٹے رکن الدین کی اولاد

دیہات بریرہ، بھرسولی، علی پور، اٹوا، گھنونہ، طالپور، عنایتی وغیرہ مین آباد ہے، اور رکندی کہلاتے ہین، عبدل خان یا عبداللہ خان شروانی خاندان کے ایک بزرگ تھے جنھون نے جہانگیری عہد مین شاہی ملازمت اختیار کی، پھر تارک الدنیا ہوکر حضرت مخدوم ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار (واقع گنگیری) پر گوشہ نشین ہوگئے، اور وہین سپردخاک ہوئے، ان کی قبر وہان اس وقت تک موجود ہے، اس زمانہ مین اس خاندان کے مشاہیر مین نواب یوسف خان ساکن راج مئو وکنا وہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، انکی شان وشوکت کے بڑے قصے مشہور ہین، ان کا سال وفات ۱۶۶۳ء بتایا جاتا ہے، روایات مین یہ بھی مشہور ہے کہ نواب یوسف خان نے عہد شاہجہانی دیکھا تھا، اور شاہجہان کے دربار مین حاضری کا شرف بھی حاصل کیا تھا، اور ان کو شاہجہان آباد بنجبنہ کا موضع عطیۂ شاہی مین ملا تھا، نواب یوسف خان کی والدہ اور بہن یا لڑکی کی قبرین خاص راج مئو مین ابتک موجود ہین، خود نواب یوسف کی قبر جھاڑی گھن کنا وہ مین ایک حصار کے اندر واقع ہے، نواب یوسف خان کی شخصیت اپنے زمانہ مین بڑی ممتاز تھی، اور وہ اس وقت مرجع خلائق تھے، ان کے عروج واقبال کی کوئی انتہا نہ تھی، اس نواح مین دور دور تک کوئی رئیس ان کے مقابلہ کا نہ تھا،

۱۷۴۰ء سے ۱۷۷۰ء تک جاٹ گردی کے زمانہ مین پرگنہ علاقہ اترولی، سرکار کول کے حلقہ مین بوڑھا گاؤن بھموری، قلعہ چھرہ، دھنساری، وتاآولی، برلہ وغیرہ کے علاقے تباہ کر دیے گئے، چنانچہ اس جاٹ شاہی عہد مین شروانی خاندان کے افراد اپنی اپنی زمینداریان چھوڑکر گنگا پار، کٹھیر اور سہسوان چلے گئے، پھر طوائف الملوکی کا دور ختم ہونے کے بعد گنگا پار سے واپس آکر اپنی اپنی زمینداریو پر قابض ومتمکن ہوئے، گنگا پار سے واپس آنے والون کے سرگروہ بھموری کے باز خان صاحب تھے، جنھون نے اٹھائیس سال کی جلاوطنی مین بہت ٹھوکرین کھائی تھین، اور زمانہ کا بہت گرم وسرد دیکھا تھا، اس لیے جب وہ دوبارہ واپس آئے تو ایک پختہ کار اور تجربہ کار انسان اور زمیندار تھے،

اور انھون نے اپنی آبائی ریاست پر حسن تدبیر سے قبضہ کیا، بہت سے گاؤن بذریعہ بیع و نیلام حاصل کیے، ۱۷۵۰ء مین یہ زمینداری مین بھیکمپوری کا تعلقہ نامزد ہوا، جس مین داد و ن بھی شامل تھا، مرہٹون کے استیلاء کے زمانہ مین یہ انتظام برقرار رہا، اس لیے باز خان صاحب کا اثر و اقتدار برابر ترقی کرتا گیا، اور جب ۱۸۴۳ء مین ان کا انتقال ہوا تو انھون نے ایک وسیع علاقہ ترکہ مین چھوڑا، جس مین ۵۰ گاؤن تعلقہ بھیکمپوری بزرگ مین، اور ۲۰ گاؤن تعلقہ تاہ اور ۵۲ گاؤن تعلقہ ہردوئی مین، ۱۴ گاؤن کنکہ مین اور ۹ گاؤن رہن مین چھوڑے، باز خان خدا ترس بزرگ اور اپنے پیر کے بڑے عقیدتمند تھے، ۱۷۹۰ء مین انھون نے اپنے پیر کے حکم سے بھیکم پور کو دوبارہ آباد کیا، اور خود مع اہل و عیال بھیکمپوری سے وہان منتقل ہوگئے،

باز خان کی شادی ڈوری مین نصیب خان کی لڑکی سے ہوئی تھی، بھیکمپوری کے قیام کے زمانہ مین ۱۸۰۵ء مین ان کو اچھلے اہر سے دادون کے مقام پر ایک معرکہ پیش آیا، جس مین خاندان کے لوگون نے بھی ان کا ساتھ دیا، اس معرکہ مین باز خان صاحب کے تلوار اور برچھے وغیرہ کے کئی زخم آئے تھے، ان کا انتقال ۱۸۳۰ء مین جب وہ حج کے لیے جا رہے تھے بمقام بروده ہوا، ان کی قبر بھی بروده ہی مین ہے، ان کی بی بی جو مدینہ بی بی کے لقب سے موسوم تھین اس سفر مین ساتھ اور بڑی باہمت خاتون تھین، اس حادثہ کے باوجود انھون نے حج کا سفر ملتوی نہین کیا اور اس فریضہ کو مع الخیر پورا کیا،

باز خان صاحب کے تین بیٹے نامآور ہوئے، خان زمان صاحب جو شاخ بھیکم پور و حبیب گنج کے مورث اعلیٰ ہین، حاجی محمد داؤد خان صاحب جو شاخ ظفر منزل علی گڈھ کے جد اعلیٰ تھے، اور حاجی غلام محمد خان جو بعد تقسیم جائداد ۱۸۴۳ء مین بھیکم پور سے دادون منتقل ہوئے،

خان زمان صاحب ہی کی اولاد مین مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے، ان کے والد ماجد کا اسم گرامی محمد تقی خان صاحب تھا،

ولادت | مولانا حبیب الرحمن خان کی ولادت بتاریخ ۲۸ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء

صبح کے وقت بھیکم پور (ضلع علی گڈھ) میں ہوئی لیکن مستقل سکونت حبیب گنج میں رہی جس کو ان کے والد ماجد نے ان ہی کے نام پر آباد کیا تھا، حبیب گنج بھیکم پور سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے،

تعلیم | کلام پاک ختم ہوا تو تعلیم کی ابتدا فارسی سے ہوئی، جو قدیم مکتبی طریقہ پر گھر ہی پر دی گئی، فارسی نصاب میں سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور دیوان غنی وغیرہ ختم کر لیا، تو عربی شروع کرائی گئی، اور باقاعدہ طور پر درس نظامی کی تحصیل کرتے رہے، حضرت سید احمد کبیر قدس اللہ سرہ کے فرزندوں میں سے ایک عالم سے عربی کے ابتدائی اسباق لیے، نحو (نیز ابتدائی فقہ) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی تلمیذ مولانا لطف اللہ سے پڑھی، لیکن زیادہ فیض مولانا عبد الغنی خان صاحب سے حاصل کیا، مولانا ممدوح سے فقہ میں شرح وقایہ ہدایہ آخرین کتاب الرہن تک پڑھی، حدیث میں مشکوۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین وتفسیر بیضاوی (ابتدائی حصہ) اور علم معانی میں مختصر المعانی پڑھتے رہے، فن منطق کی تکمیل علی گڈھ میں مولانا لطف اللہ سے کی، اور ان ہی سے حمد اللہ قاضی مبارک میر زاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحیی پڑھا، حدیث میں شمائل ترمذی اور صحیح بخاری (۹ پارے) سبقاً سبقاً شیخ حسین صاحب یمنی بھوپالی سے پڑھی، اور باقی کتابوں کی اجازت وسند بھی لی، حدیث کی دو سندیں سفر حرمین میں حاصل کیں، ایک شیخ حبیب اللہ شنقیطی سے اور دوسری شیخ عمری سے، ایک حدیث مسلسل بالاولیت کی سند میاں سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی حاصل فرمائی، قرأت میں قصیدہ جزریہ قاری عبد الرحمن (مدرس احیاء العلوم الہ آباد) سے پڑھا، شاہ ولی اللہ صاحب کی چہل حدیث قاری عبد الرحمن صاحب پانی پتی سے پڑھی،

آگرہ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک انگریزی تعلیم بھی پائی، اگرچہ انٹرنس کا امتحان نہیں دیا، لیکن یکے بعد دیگرے چار انگریزوں سے انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرتے رہے، آگرہ سے واپسی کے بعد علیگڈھ میں محمڈن کالج کے ہڈ ماسٹر مسٹر پوٹ سے انگریزی لٹریچر پڑھا،

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے زمانہ کے تمام مشاہیر صلحا، وعلما، مثلاً مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنوی، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری، مولانا احمد حسن صاحب جونپوری، مولانا عبد المقتدر صاحب بدایونی، مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی، مولانا ابو الخیر صاحب مجددی، شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی، خواجہ الطاف حسین حالی، حبیب عبد روس صاحب یمنی حیدرآبادی سے گہرے مراسم قائم رکھے، اور ان بزرگون سے علمی فیض حاصل کرتے رہے، مولانا شبلی مرحوم سے قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا، اور بہت سے علمی و تعلیمی کامون مین ان کے شریک کار رہے،

بیعت کی سعادت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی قدس سرہ العزیز سے حاصل کی تھی،

علمی ذوق کا نشو ونما | علمی ذوق کا آغاز غالب کی اردوے معلی کے مطالعہ سے ہوا جس کو انھون نے اپنے والد ماجد کے حکم سے پڑھنا شروع کیا تھا، اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد گلزار داغ کا مطالعہ کیا، اگرچہ ان کے چچا صاحب نے اس ذوق پر زجر فرمایا، لیکن طبیعت کی افتاد شوق ولاتی رہی، اور رفتہ رفتہ جب وہ زمانہ آیا کہ اپنی مرضی سے کتابون کا انتخاب کرین تو عربی کی متقدمین کی تصانیف کو زیادہ پسند کیا، اسی زمانہ مین کلام پاک کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہے، فارسی مین متاخرین ایران کی سحرآفرینی سے زیادہ مسحور ہوئے، اردو مین شعراے دہلی کا کلام زیادہ پسند تھا، شاعری مین امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا، کئی سال تک استاذ سے مراسلت اور اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن دونون مین ملاقات نہ ہوسکی، فارسی شاعری کے ذوق کا نشو ونما مولانا شبلی، مولانا عبد الغنی خان، خواجہ سنجر طہرانی، خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی اور خواجہ غلام غوث خان صاحب بیخبر الہ آبادی کی صحبت مین ہوا،

مضمون نگاری | ۸۳-۱۸۸۲ء سے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، اور لسان العصر سید اکبر حسین مرحوم نے بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام کا اردو ترجمہ مستقبل اسلام کیا، تو اس پر تبصرہ لکھا جو مولوی غلام محمد خان صاحب تپش کے اخبار مشیر قیصر لکھنؤ میں شائع ہوا، یہ غالباً ان کا پہلا مضمون تھا، اس کے بعد مختلف اخبارات مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آزاد لکھنؤ، البشیر اٹاوہ، سرمور گزٹ، اکمل الاخبار دہلی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں مضامین لکھتے رہے، ۱۸۹۱ء میں رسالہ حسن (حیدر آباد دکن) میں ایک انعامی مضمون ظہیر الدین شاہ بابر پر لکھا، اور ادارے کی طرف سے ایک اشرفی انعام ملی، پھر ملک کے مختلف رسائل دلگداز لکھنؤ، مخزن لاہور، معارف علی گڈھ، زمانہ کانپور، علی گڈھ میگزین، اولڈ بوائز علی گڈھ، خاتون علی گڈھ، اردوے معلی علی گڈھ، نظام المشائخ دہلی، الندوہ لکھنؤ، اور معارف اعظم گڈھ کو اپنے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین سے رونق بخشتے رہے، رسالہ الندوہ (لکھنؤ) کی اڈیٹری میں مولانا شبلی مرحوم کے شریک ادارت تھے، جو ان کی اعلیٰ علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کا ثبوت ہے، ۱۸۸۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جتنے مضامین لکھے ان کا مجموعہ **مقالاتِ شروانی** کے نام سے علی گڈھ سے شائع ہو گیا ہے،

تصانیف | تذکرۂ بابر کے علاوہ **ذکر حبیب** اور **ذکر جمیل** کے نام سے میلاد مبارک کے لیے دو کتابیں تحریر فرمائیں، **علماے سلف** میں علماے اسلام کے حالات ہیں، **نابینا علما** میں ان علما کا ذکر ہے جنھوں نے نابینائی کی حالت میں تحصیل علم اور ناموری حاصل کی، **سیرۃ الصدیق** میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات ہیں، جس کو ابتداءً محمڈن کالج علی گڈھ کے طلبہ کے سامنے بطور لکچر پڑھا تھا، ایک رسالہ **اخلاقی لکچر** ہے جس میں اخلاق اسلامی کا بیان ہے، یہ لکچر بھی محمڈن کالج کے طلبہ کے سامنے پڑھا گیا، اور طلبہ کے نصاب میں داخل ہوا، ۱۹۱۷ء میں امیر خسرو کی مشہور مثنوی مجنون لیلیٰ کو تصحیح کرکے شائع کیا، جس کے شروع میں ان کے قلم سے ۱۱۵ صفحے

کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو جو انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا ہے، اس کا انشا پردازانہ مقدمہ ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے رسائل وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے، مثلاً (۱) **اسلامی اخلاق** جس میں اخلاق پر دلنشین بحث کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے (۲) **فقہ حنفی** جس میں فقہ حنفی کی تاریخی اور محدثانہ حیثیت پر بحث ہے (۳) **تبصرہ**، یہ تاریخ خطیب بغدادی پر عالمانہ ریویو ہے (۴) **عرض اخلاص** یہ ایک تقریر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان لڑکیاں زمانہ کے مطابق تعلیم ضرور پائیں، لیکن اسلامی شعار اور معاشرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں (۵) **سرسید کی یاد**، اس کو ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی جد وجہد کا ذکر نہایت دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے (۶) **نقش وفا** میں حقوق و فرائض زوجین پر بہت سی مفید ہدایات ہیں (۷) **استاذ العلماء** میں حضرت مفتی محمد لطف اللہ مرحوم کے سوانح ہیں، جن کے ضمن میں مفتی عنایت اللہ صاحب شہید اور استاذ الاساتذہ مولوی بزرگ علی صاحب کے کچھ حالات بھی آگئے ہیں (۸) **حالات حزین**، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس میں فارسی کے مشہور شاعر علی حزین پر ایک پر مغز مقالہ پڑھا، اس میں حزین کے کلام کا انتخاب بھی ہے (۹) **ذکر محبوب** میں حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے حالات ہیں (۱۰) **قرۃ العین** میں حضرت مجدد الف ثانی کے سوانح ہیں (۱۱) **مسلمانوں کی تعلیم قدیم** میں قدیم تعلیم کا نصب العین بتایا ہے (۱۲) **تعلیم اسلام کا اثر عمر و صحت پر**۔ اس میں بزرگان دین کی عمر کی درازی کا حال لکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی کما حقہ پابندی قیام صحت کا باعث ہوتی ہے (۱۳) **برق تجلی**، اس میں حسن و عشق کی زندگی پر تبصرہ ہے۔

میلاد النبی کے موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور تقریر فرماتے، اور اس کو قلمبند کر لیتے۔ بعض ایسے رسائل کے نام یہ ہیں **آفتاب رسالت**، **شان رسالت**، **رسالت عامہ**، **ذکر شریف**،

پیغام رحمت، شمع ہدایت،

اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے اردو اور فارسی کلام کے علٰحدہ علٰحدہ مجموعے بھی شائع کیے تھے،

نادر کتب خانہ | ان کے علمی ذوق اور اسلامی علوم و فنون سے ان کے شغف کا یہ بین ثبوت ہے کہ انھوں نے اپنی محنت سے زر کثیر صرف کرکے ایک بڑا نادر اور قیمتی کتب خانہ جمع کیا، جس مین پانچ ہزار سے زیادہ مطبوعہ اور نایاب قلمی عربی اور فارسی کتابین ہین، اردو اور انگریزی کی کتابون کا بھی ایک حصہ ہے، مولانا شبلی مرحوم کا خیال تھا کہ فارسی کلام کا جیسا اچھا ذخیرہ حبیب گنج کے کتب خانہ مین ہے، رامپور اور بانکی پور کے کتب خانہ مین بھی نہین، "حبیب گنج کا کتب خانہ کس طرح جمع ہوا" کے عنوان سے خود مولانا شروانی مرحوم نے معارف (اکتوبر ۱۹۳۱ء) مین ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے، اپنی زندگی ہی مین اس کتب خانہ کو مسلم یونیورسٹی پر باضابطہ وقف کر دیا تھا،

قومی مشاغل | سیاست سے ان کو ذوق نہ تھا، اور اس سے وہ ہمیشہ کنارہ کش رہے، لیکن مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ہمیشہ پیش پیش رہے، ہوش سنبھالا تو علی گڑھ مین سر سید احمد خان کی تحریک کا چرچا سنا، جس مین خود ان کے خاندان کے کئی افراد شریک تھے، مولانا شروانی کو اگرچہ سر سید مرحوم کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف تھا، لیکن اس کے باوجود انھون نے ان کی مفید علمی تحریک مین پورا حصہ لیا، اور سر سید نے ان کو اپنے کالج کا ٹرسٹی منتخب کیا، محسن الملک مرحوم کی معتمدی کے زمانہ مین وہ اہل سنت جماعت کے دینیات کی تعلیم کے سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ مین میرٹھ کمشنری کی کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے، اور اس سلسلہ مین متعدد وفود مین شرکت کی، اور تحریک کی اشاعت مین تقریرین کین، نقد چندہ دیا، اور جب مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی برابر کورٹ کے ممبر رہے، اور مختلف اوقات مین یونیورسٹی کی اگزکٹو کانسل، اکیڈیمک کانسل کے ممبر مقرر ہوتے رہے، اور دینیات کی تعلیم کے مستقل نگران مقرر ہوئے، ۱۹۴۲ء مین مسلم

یونیورسٹی نے ان کے علمی و تعلیمی خدمات کے اعتراف مین ان کو ڈاکٹر آف تھیولوجی کی اعزازی ڈگری دیکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا،

۱۸۹۰ء سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر تھے، ۱۹۱۷ء مین جب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو مولانا شروانی کانفرنس کے جائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد جب کالج کے آنریری سکریٹری کا عہدہ ختم ہوگیا جو کانفرنس کا سکریٹری بھی ہوتا تھا تو ۱۹۲۰ء مین مولانا شروانی کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے، اور اپنی وفات کے کچھ دنون پہلے تک اس عہدہ پر مامور رہے، بالکل آخر مین ضعف پیری کی وجہ سے اس سے مستعفی ہوگئے تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض اجلاسون کی صدارت بھی فرمائی،

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شروع سے تعلق تھا، وہ اس کے رکن رکین اور بڑے معاون و مددگار تھے، اس کے تین سالانہ اجلاسون کی صدارت بھی کی،

دار المصنفین سے بھی ان کو قلبی تعلق تھا، ۱۹۳۱ء سے آخر تک اس کی مجلس ارکان اور مجلس انتظامیہ کے صدر رہے،

کرنال کے وقف کے بھی نگران تھے، اس کا جو معاوضہ ان کو ملتا تھا، وہ اس کو کسی نہ کسی ادارہ کو دیدیتے تھے،

آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے بھی ممبر تھے، ۱۹۲۸ء مین اس کا پانچوان اجلاس لاہور مین ہوا، تو اس کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے، اس موقع پر جو خطبۂ صدارت انھون نے پڑھا، اس پر تحسین و آفرین ہوئی، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کی بھی ۱۹۳۷ء مین صدارت فرمائی، یو، پی ہسٹاریکل سوسائٹی، مسلم گرلز کالج علی گڈھ، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، انجمن حمایت اسلام لاہور اور طبیہ کالج دہلی، آرٹس سوسائٹی لندن سے بھی مختلف شکلون مین وابستہ رہے،

قیام حیدرآباد دکن | نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ کی وفات کے بعد مملکت آصفیہ کے عہدۂ صدر الصدور پر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ئ میں فائز ہوئے، اور اس منصب پر بارہ تیرہ سال رہے، صدر الصدوری سے متعلق دو صیغے تھے، صدارت العالیہ اور امور مذہبی، صدارت العالیہ خالص اسلامی صیغہ تھا، جو حضور نظام کے براہ راست ماتحت تھا، امور مذہبی ایک عاملانہ صیغہ تھا، جو ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے عام مذہبی نظم و نسق سے متعلق تھا، مولانا شروانی نے ان دونوں صیغوں کی اصلاح بڑی توجہ اور سرگرمی سے کی، جس کا صلہ ان کو ۱۳۴۱ھ میں "نواب صدر یار جنگ" کے خطاب کی شکل میں ملا، قیام حیدرآباد کے زمانہ میں یہاں کے باشندوں پر ان کی پاکیزہ سیرت کا بڑا گہرا اثر پڑا، وہاں کی تمام علمی و ادبی تحریکوں میں انکا نمایاں حصہ رہا، اور نواب عماد الملک مرحوم کے ذمہ جو ادبی فرائض تھے وہ ان کے بعد ان ہی کے سپرد کر دیے گئے، اور جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے، جامعہ کی مجلس دینیات کے بھی امیر تھے، اور اپنے قیام کے دوران میں کتبخانہ آصفیہ کی مجلس ذیلی کے صدر الصدور اور مجلس انتظامی کے نائب صدر، اشاعت علوم کے صدر، دائرۃ المعارف کے رکن، مدرسہ نظامیہ کی مجلس کے صدر اور انجمن احترام اور اماکن متبرکہ کے نگران اعلیٰ بھی رہے، انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن میں تھی، تو مولانا عبد الحق سے پہلے اس کے بھی سکریٹری تھے،

حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۰ئ میں پنشن پائی، حیدرآباد ہی کے قیام کے زمانہ میں غالباً ۱۹۲۶ئ میں حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، مکہ معظمہ میں قاری سید عبد الرحیم کو پورا کلام پاک سنایا، اور مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا، ان سے آخری سبق مسجد نبوی میں لیا، اور قرأت کی سند حاصل کی،

حیدرآباد سے سبکدوشی کے بعد ان کی زیادہ تر توجہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، دارالمصنفین اور ندوۃ العلما کی طرف رہی،

وفات ۸۰ سال کی عمر میں ایک ہفتہ کی شدید علالت کے بعد ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء مطابق ۲۷ شوال المکرم بروز جمعہ بوقت صبح عالم جاودانی کو سدھارے، دوران علالت میں زیادہ تر اللہ اور رسول کی باتیں کرتے رہے، اور انگلیوں میں پڑی ہوئی تسبیح کے ورد سے غافل نہ ہوتے، طہارت کا برابر خیال رکھتے، روح پرواز ہونے سے پانچ منٹ پہلے تک باتیں کرتے رہے، اور جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا، تو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، جنازہ ایک فوجی کار میں مسلم یونیورسٹی کے کرکٹ لان پر لایا گیا، اس کے پیچھے پیچھے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، اور شہر کے حکام، رؤسا اور معززین بھی ساتھ تھے، نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد میت علی گڈھ سے ۲۶ میل دور موضع بھوری متصل حبیب گنج کے خاندانی قبرستان میں لے جائی گئی جہاں علم و فضل، امارت و حشمت اور وقار و سنجیدگی کا پیکر پیوند خاک کر دیا گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی تربت کو ہمیشہ ٹھنڈی رکھے، آمین ثم آمین،

حیات شبلی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ اس میں انکی وفات ۱۹۱۴ء تک اسکے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ آگئی ہے، شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت، اسکی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کیے گئے ہیں،

صفحات ۸۴۶ صفحے، قیمت: مجلد عہ غیر مجلد: لعہ

"منیجر"

ادبیات

ماتم حبیب شبلی

از جناب یحییٰ اعظمی

محو آرام ہوئے جا کے قریب شبلی
آہ رخصت ہوئے دنیا سے حبیب شبلی

دانش افروز کہن، یار ادیب شبلی
ہر نوا جنکی تھی پیغام نقیب شبلی

قدردان ادب و فلسفۂ نعمانی
سرپرست ہنر کہنہ و نو شروانی

آج قائم تھا انھیں سے شرف دانش و دین
آہ تھے بزم "معارف" کے وہی صدر نشین

شکل دیکھو تو ز سر تا بہ قدم نور یقین
جن سے اس دور میں تازہ تھی سلف کے آئین

ہو گیا ختم وہ دور رنگین افسوس
تیرہ و تار ہوئی مجلس دین افسوس

کس کو توفیق نے بخشا تھا وہ گل ریز قلم
کس کو قدرت نے دیا تھا وہ دلآویز قلم

گہر افشاں، گہر آرا، گہر انگیز قلم
نظم و نثر و ادب و فن بہم آمیز قلم

جس کے ہر نقش میں رنگینی و رعنائی تھی
جس کے ہر حرف میں صد حسن و دلآرائی تھی

آج سنسان ہوا میکدۂ دانش و فن
اٹھ گیا بزم سے جو ساقیٔ صہبائے کہن

ہو گیا نذرِ خزان حکمت و عرفان کا چمن — وقفِ ماتم ہے جہانِ ادب و شعر و سخن

دیکھیے جن کو شریکِ غم و ماتم ہین سبھی

مجلسِ علم "سبھی" "دانش کدۂ قومی" بھی

آہ تنہا نہین یہ حکمت و فن کا ماتم — آہ تنہا نہین یہ شعر و سخن کا ماتم

ہے حقیقت مین یہ تہذیبِ کہن کا ماتم — سچ جو پوچھو تو ہے اک شیخِ زمن کا ماتم

غم ہے وہ حکمت و اسرار کا عارف نہ رہا

غم ہے سردفتر "اربابِ معارف" نہ رہا

اب کہان اٹھتے ہین اس وضع کے اربابِ کمال — اب کہان دولتِ تقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال

قدر والا تھا کہ سرتا بہ قدم سروِ جلال — جس مین تھا صورت و معنیٰ کا دل آویز جمال

مظہرِ علم و ہنر پیکرِ زیبائے ادب

جس کی ہر فکر و نظر سرخوشِ صہبائے ادب

اک امیر اور حقائق کے یہ اسرار و نکات — اک رئیس اور معارف کے یہ پاکیزہ صفات

کس نے پائی ہے یہ رخشندہ و تابندہ حیات — صرف اک ذاتِ گرامی کی نہین ہے یہ وفات

کاروانِ حکمت و دانش کا روان ہوتا ہے

قافلہ فضل کا آنکھون سے نہان ہوتا ہے

دورِ تابندۂ تحقیق کی رحلت یہ ہے — ثانیِ شبلیِ مرحوم کی رخصت یہ ہے

دفن سرتا قدم اسرار کی دولت یہ ہے — علم کے گنجِ گران مایہ کی تربت یہ ہے

اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور

اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

حبیب گنج
(ضلع علی گڈھ)

۲۲ جنوری ۱۹۳۸ء

مکتوب شروانی

مولانا شروانی مرحوم سنہ ۱۹۳۸ء مین دارالمصنفین تشریف لائے تھے۔ واپسی پر انھون نے حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کو یہ خط لکھا تھا، جس سے دارالمصنفین کے متعلق ان کے تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

لکھنؤ سے واپسی پر طبیعت ناساز ہو گئی اسلیے اس سے قبل

اللہ تعالیٰ شر و فساد سے ان کو محفوظ رکھ کر خدمت ملک
و ملت میں ترقی و کامیابی کے ساتھ بہرہ ور رکھے ۔

آمین ۔

حضورِ عالی کی رونق افزائی فریدکوٹ کا باعث مسرت ہوئی
روانہ پٹنہ وغیرہ سے حوصلہ ہو رہا ہے ۔

[illegible]

مطبوعات جدیدہ

اسلام کیا ہے مولفہ جناب مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ؎ غیر مجلد عا رپتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ،

آج مسلمانوں کو اسلام سے عملاً بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلام کی حقیقت تک سے نا آشنا اور اسلامی زندگی کے صحیح تصور سے بھی بیگانہ ہے، اور مسلمان نام رہ گیا ہے صرف مسلمان کہلانے کا زیادہ سے زیادہ زبان سے کلمۂ توحید پڑھ لینے اور روزہ و نماز کی ظاہری صورت کسی نہ کسی شکل میں ادا کر لینے کا، اس کے علاوہ دوسرے اسلامی فرائض کا احساس بھی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے فاضل مصنف نے جنکو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روح کو سمجھنے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے، اس کتاب میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے اسلام اور اسلامی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی ہے، اور اس کے تمام اجزاء توحید، عبادات، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، تقویٰ و پرہیزگاری، معاملات، اخلاق، معاشرتی حقوق و فرائض، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، دین سے تعلق، اس پر استقامت اس کی خدمت و نصرت و حمایت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت و دوزخ، ذکر اللہ، توبہ و استغفار وغیرہ اسلام کے جملہ ارکان اور اس کے تکمیلی عناصر یعنی اسلام، ایمان و احسان اور اسلامی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کی پوری تفصیل اور نہایت موثر اور دلنشین انداز میں اس کی تشریح اور اسکی روح بیان کر دی ہے، اور انکا یہ لکھنا بالکل صحیح ہے کہ اس کتاب میں دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن و حدیث سے وہ سب تعلیمات جس اسباق کی شکل میں جمع کر دی گئی ہیں جن سے واقف ہو کر اور جن پر عمل کر کے ایک عامی مسلمان بھی نہ صرف اچھا مسلمان

اللہ تعالیٰ شروانی صاحب کو محفوظ رکھے اور خدمت ملک

و ملت مین ترقی و کامیابی کے ساتھ مصروف رکھے

آمین

حمدیؔ صاحب کی رونق افروزی مزید برکت کا باعث ہوئی

روانہ پٹنہ وغیرہ ہو چکا ہونگا

مولوی مسعود علی صاحب کو سلام مسنون اور دیگر اصحاب

گرامی قدر رفقاء دار المصنفین کو سلام و دعا کامیابی دارین

معارف:- ؎ حمدی صاحب سے مراد سید ابراہیم صاحب حمدی ناظم کتبخانہ شیخ الاسلام مدینہ طیبہ ہیں جو اس سفر میں شروانی صاحب کے ہمراہ تھے۔

بلکہ انشاء اللہ مومن کامل اور ولی بن سکتا ہے"، اس لیے یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس سے فائدہ اٹھائے، بلکہ اس میں اسلام اور اسلامی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے، اس لیے وہ ان غیر مسلموں کے بھی مطالعہ کے لائق ہے جو اسلام کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہیں، اس سے اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے آجائے گی،

جمہوریت اور مغربی تحریکیں مترجمہ جناب مولوی عبد الوہاب صاحب ظہوری پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج، تقطیع بڑی ضخامت ۲۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے، پتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ، حیدر آباد دکن،

ڈاکٹر ایڈورڈ بنس سابق صدر جمہوریہ چیکوسلواکیہ یورپ کے مشہور سیاست دان، صحیح جمہوریت کے علمبردار، انسانی برادری میں حقیقی مساوات کے داعی اور امن عالم کے بڑے مبلغ ہیں، اس مقصد کے حصول کیلئے انھوں نے چند خطبات دیے تھے، جن کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، لائق مترجم نے اسی کا اردو ترجمہ کیا ہے، جمہوریت بلا امتیاز رنگ و نسل تمام انسانوں اور قوموں میں آزادی و مساوات کی داعی اور اس کی بڑی محافظ و پاسبان سمجھی جاتی ہے، اور اس لحاظ سے جمہوری نظام حکومت سارے نظاموں میں بہتر سمجھا جاتا ہے، لیکن یورپ میں جو جمہوریت عملاً رائج ہے، وہ صحیح جمہوری روح سے خالی ہے، اور اس میں ایسے بنیادی نقص ہیں کہ وہ آزادی مساوات اور قیام امن کے بجائے نسلی تفوق و برتری، قومی و جغرافی تفریق، طبقاتی تقسیم، معاشی ناہمواری، سیاسی کشاکش، اور جنگ و خونریزی کا ذریعہ بن گئی ہے، ان ہی نقائص کی بناپر اس کے متوازی اشتراکیت، ٹریڈ یونین اور آمریت کی تحریکیں پیدا ہو گئیں اور قومی خود غرضی اور اقتصادی ناہمواری سے جنگ و جدل کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا، جس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے امن و سکون کا خاتمہ کر دیا، اور اس کے انسداد کی جتنی تدبیریں اختیار کی گئیں وہ سب بنیادی خرابیوں کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں اور آج پھر دنیا ایک بڑی جنگ کے آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑی ہے، مصنف نے اس کتاب میں انقلاب فرانس سے لیکر جب یورپ میں جمہوریت کی بنیاد پڑی، گذشتہ جنگ کے خاتمہ تک یورپ کے سیاسی انقلابات، یورپ میں

قومون کی سیاسی واقتصادی کشمکش، ان کی لڑائیون، مختلف سیاسی نظریون اور تحریکون کی روشنی مین جمہوریت کے نقائص اور اس سے پیدا شدہ مذموم نتائج پر مفصل تبصرہ کیا ہے، جس سے یورپ کا گذشتہ چند صدیون کا پورا سیاسی مد وجزر اور اسکے اسباب ونتائج سامنے آجاتے ہین، کتاب کے آخر مین مصنف نے صحیح جمہوریت کے بارہ مین جو حقیقی آزادی ومساوات کی ضامن ہو اور جس کے ذریعہ دنیا مین امن وامان قائم ہو سکے، اپنا مشورہ پیش کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے اور یہ کتاب سیاست سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

اردو ادب کے معمار تقطیع اوسط، ضخامت ۱۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۶عہ پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن،

اردو زبان کی تعمیر وترقی کا سلسلہ صدیون سے جاری ہے، اور اس مین ہر زمانہ کے نامور شعراء اور ادیبون کی کوششین شریک رہی ہین، اس کتاب مین یہ جدت کی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی وغواصی سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے اردو زبان کے ان چھتیس شعراء اور ادیبون کے حالات، جنکا اردو کی تعمیر وترقی مین حصہ رہا ہے، موجودہ دور کے ممتاز اور نامور اہل قلم کی تحریرون سے لیکر مرتب کیے گئے ہین، لیکن یہ سمجھ مین نہین آیا کہ یہ انتخاب کس اصول پر کیا گیا ہے، اس کے دو ہی اصول ہو سکتے ہین، ایک یہ کہ کسی شاعر یا ادیب کی خدمت زبان مسلم ہو یا یہ کہ جس کے حالات کسی ادیب نے لکھے ہون، لیکن ان دونون اصولون کے لحاظ سے ہر دور کے بہت سے شعراء، ادیبون اور اردو کے معمارون کے حالات چھوٹ گئے ہین، پرانے اساتذہ مین، مومن، آتش اور ذوق جیسے معماران اردو کے حالات نہین ہین، داغ کا حال ہے مگر امیر مینائی کا نہین ہے، حالانکہ ان سب کے حالات ممتاز ادیبون کے قلم سے موجود ہین، یہ صرف چند نام لکھ دیئے گئے ہین، ورنہ اس قسم کے بہت سے شعرا خصوصاً نثر نگارون کے حالات نہین لیے گئے ہین، اور موجودہ زمانہ کے تو بہت سے مسلم شعرا اور ادیب چھوٹ گئے ہین، تاہم اس کتاب مین ایک جدت ضرور ہے، کتاب کے شروع مین اردو زبان کی مختصر تاریخ ہے،

حج بیت اللہ از جناب مولوی محمد داؤد صاحب راز، تقطیع جیبی، ضخامت ۲۲۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ: شوقی برادران، مالیگاؤں، ضلع ناسک،

اردو میں حج کے بہت سے سفرنامے اور مناسک حج پر مستقل کتابیں موجود ہیں، حج بیت اللہ اس موضوع پر نئی جامع کتاب ہے، اس میں عرب کا جغرافیہ، حرمین کی تاریخ، اس کے مقدس آثار و مقامات کی تفصیل، حج کے مناسک، اس کے متعلق ضروری مسائل، اور انکے اسرار و حکم کو اختصار و جامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، جس سے مناسک حج، اور اس کے مسائل کے ساتھ حرمین کے متعلق بہت مفید مذہبی و تاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب حج کی معلم بھی ہے اور حرمین کی تاریخ بھی، تاریخی حالات کی توضیح کے لیے حج کے مواقف اور مقدس مقامات کے متعدد نقشے اور فوٹو بھی دیے گئے ہیں،

تلقین حق از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم، اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۰، پتہ: ادارۂ تعلیمات اسلامی نمبر ۳ امین آباد پارک لکھنؤ،

مصنف کی نظر دوسرے مذاہب اور ان کے صحیفوں پر بہت وسیع ہے، یہ کتاب انھوں نے بچوں کے لیے اسلام پر تحریر فرمائی ہے، اس میں دوسرے مذاہب کے مشرکانہ عقائد اور ان کی افسانہ طرازیوں کے مقابلہ میں اسلام کی توحید خالص، اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے سامان، وحی کی حقیقت، دوسرے صحیفوں کے مقابلہ میں کلام مجید کی خصوصیات، اس کے خاص خاص مضامین سزا و جزا، روزہ، نماز، حج و زکوٰۃ، اور اسلام کی دوسری اہم تعلیمات، اس کے اوامر و نواہی، حلال و حرام، اخلاق حمیدہ و رذیلہ وغیرہ اسلام کے عقائد و اعمال کو مختصراً سادہ اور سلجھی ہوئی زبان میں تحریر کیا گیا ہے، گو یہ رسالہ بچوں کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن افادہ کے لحاظ سے ہر عمر کے اشخاص کے مطالعہ کے لائق ہے،